

لکار

7

PDFBOOKSFREE.PK

طاہر جاوید مغل



قریباً دو گھنٹے بعد ہم ایس پی حمزہ صاحب کے ساتھ ایک بار پھر جلالی صاحب کے فارم ہاؤس میں تھے۔ حمزہ صاحب پڑھے لکھے شخص تھے اور عام پولیس والوں سے قدرے مختلف نظر آتے تھے۔ اپنے سینئر دوست جلالی صاحب کی موجودہ حالت پر وہ بھی بہت افسردہ تھے۔ جلالی صاحب مسلسل کوڑے میں تھے۔ ان کی مجموعی جسمانی حالت بھی کچھ زیادہ اچھی نہیں تھی۔

فارم ہاؤس میں اور کوٹھی کے اندر باہر اُسی نظر آتی تھی۔ جلالی صاحب کے نجی چڑیا گھر کے جانور خاموش اور غمزہ نظر آتے تھے۔ ایرانی بلی اور اس کے بچوں کی نگہداشت پر ڈاکٹر عدیل خصوصاً توجہ دے رہا تھا۔ بابے طفیل کو سخت بخار تھا اور مسلسل رونے سے اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ یوں تو جلالی صاحب کی موجودگی میں سارے ملازم ان سے ڈرے سہے رہتے تھے، مگر اب جلالی نہیں تھے تو سب کو افسردگی نے گھیرا ہوا تھا۔ وہ ان کی چھوٹی چھوٹی باتیں یاد کر رہے تھے۔

ہم ایک بار پھر جلالی صاحب کے کمرے میں پہنچے۔ ابھی تک کمرے کی بیشتر اشیاء اسی حالت میں تھیں جس میں ہم چھوڑ کر گئے تھے۔ ایس پی حمزہ صاحب نے بتایا۔ ”فنگر پرنس کی رپورٹ آگئی ہے۔ اس رپورٹ سے پتا چلتا ہے کہ ڈاکٹر مہناز کے سلسلے میں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ الماریوں کے ٹوٹے ہوئے تالوں اور دیگر اشیاء پر ڈاکٹر مہناز کی انگلیوں کے نشانات ملے ہیں۔ اندازہ ہوتا ہے کہ جانے سے پہلے ڈاکٹر مہناز اور اس کے ساتھی ڈاکٹر رسام نے افراتفری میں تالے توڑے ہیں اور باکس میں سے بدھا کی مورتنی نکالی ہے۔“

اچانک عمران کو کچھ یاد آیا۔ اس نے کہا۔ ”سر! وہ ٹوٹا ہوا ٹائم پیس کہاں ہے جو یہاں رکھا تھا؟“

”ہاں، ایک ٹیم وہاں بھی گئی تھی۔ ڈاکٹر رسام کے ملنے جلنے والوں سے سوال جواب کئے ہیں۔ ڈاکٹر رسام آخری بار کوئی چھ ہفتے پہلے فیصل آباد گیا تھا۔ اس کے بعد سے اس کا کسی کو پتا نہیں۔ واقعے کے بعد سے اب تک اس کے کسی یار دوست یا جاننے والے کو اس کا فون بھی نہیں آیا ہے۔“

عمران نے پوچھا۔ ”آپ کا کیا خیال ہے جناب! کہیں ڈاکٹر مہناز اور ڈاکٹر رسام میں کوئی پرانا تعلق تو نہیں تھا؟“

”نہیں بھئی، ابھی تک اس سلسلے میں کوئی ایک شہادت بھی نہیں ملی۔ ہاں، یہ دونوں کچھ عرصہ پہلے تک سرورسپتال میں اکٹھے جاب ضرور کرتے رہے ہیں۔ غالباً اسی ناتے سے ڈاکٹر مہناز نے رسام کو یہاں مدد کے لئے بلایا ہوگا۔“

اسی دوران میں عمران کے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ وہ کال مستناباہر چلا گیا۔ یقیناً کوئی اہم کال تھی۔ کچھ دیر بعد جب ہم Zoo کی طرف آئے تو عمران نے مجھے بتایا۔ ”راجا نے کام دکھا دیا ہے۔“

”کیا کیا ہے؟“

”خبیث نے کسی بندے سے پھنڈا کیا ہے۔ اسے کار سے ٹکرائی ہے اور بے ہوشی کی حالت میں ہوٹل لے آیا ہے۔۔۔۔۔ ہوٹل لالہ زار میں۔“

”بندہ کون ہے؟“

”میرے خیال میں جاواہی کا کوئی گرگا ہے۔ اتفاقاً اسے بازار میں نظر آ گیا تھا۔“

”پھر اب کیا کرنا ہے؟“

”ہمیں فوراً ہوٹل پہنچنا ہوگا۔ کوئی اور گڑبڑ نہ ہو جائے۔“

ہم نے سپرنٹنڈنٹ حمزہ صاحب سے اجازت لی اور لاہور کے لئے واپس روانہ ہوئے۔ حمزہ صاحب اچھی طرح جانتے تھے کہ جاواہی سے ٹکرائے کے بعد عمران کی جان کو خطرہ لاحق ہو چکا ہے لہذا انہوں نے اصرار کر کے ہمیں پولیس کی گاڑی میں ہی واپس بھیجا۔

راستے میں عمران سے جو تھوڑی بہت گفتگو ہوئی، اس سے پتا چلا کہ راجا اپنے دوست، ہوٹل کے مالک اشفاق رانا کی کار میں باہر نکلا تھا۔ ”لاہور ہوٹل“ کے نزدیک اس نے ایک بندے کو جاتے دیکھا۔ یہ جاواہی کے ساتھیوں میں سے تھا اور انڈسٹریل ایریا والی کوٹھی میں راجا اسے دیکھ چکا تھا۔ راجا کی افلاطونی طبیعت میں ہلچل ہوئی۔ کچھ آگے جا کر اس نے اس شخص کو پیچھے سے کار کی زوردار ٹکرائی۔ وہ شخص ایک کھبے سے ٹکرایا اور زخمی ہو کر گر گیا۔ دیکھنے

”میرے پاس ہے۔“ حمزہ صاحب نے کہا اور جیب سے چابی نکال کر ایک الماری کھولی۔ اس میں کچھ دیگر اشیاء کے علاوہ وہ ٹائم پیس بھی رکھا تھا۔ ٹائم پیس کی سوئیاں ایک بج کر تیس منٹ پر رکی ہوئی تھیں۔ یہ بات اب تک وضاحت سے سامنے آ چکی تھی کہ بے ہوش ہونے سے چند سیکنڈ قبل جلالی صاحب نے اپنا ہاتھ دواؤں تک پہنچانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں سائینڈ نیبل پر رکھا ہوا یہ ٹائم پیس گرا۔ ایک طرح سے یہ ٹائم پیس جلالی صاحب کے بے ہوش ہونے کا وقت بتا رہا تھا۔

عمران نے کہا۔ ”جناب! جہاں تک مجھے یاد پڑ رہا ہے، گیٹ پر آمدورفت کے رجسٹر میں مہناز اور اس کے ساتھی کی روانگی کا وقت ایک بج کر پانچ منٹ لکھا ہوا ہے۔ اگر واقعی ایسا ہے تو پھر مہناز جلالی صاحب کی بے ہوشی سے بیس پچیس منٹ پہلے یہاں سے نکل چکی تھی۔“

حمزہ صاحب نے غالباً ابھی تک رجسٹر کو غور سے نہیں دیکھا تھا یا شاید دیگر مصروفیات میں انہوں نے ٹائم پیس اور رجسٹر میں اندراج کے وقت کا موازنہ نہیں کیا تھا۔

انہوں نے ایک اے ایس آئی کو کہا اور وہ فوراً انچارج گارڈ کو رجسٹر سمیت لے آیا۔ عمران کا تجزیہ تقریباً درست ثابت ہوا۔ رجسٹر میں روانگی کا اندراج ایک بج کر پانچ منٹ تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ مہناز اور ڈاکٹر رسام جب یہاں سے نکلے تو جلالی صاحب اپنے ہوش و حواس میں تھے۔ اگر جلالی صاحب کی موجودگی میں ان کی مرضی کے خلاف الماریوں اور باکس کے تالے توڑے جاتے تو وہ یقیناً آواز دے کر دوسرے ملازمین کو بلا سکتے تھے۔

اس سے بہ آسانی یہ معنی اخذ کئے جاسکتے تھے کہ ڈاکٹر مہناز اور رسام اگر فاسٹنگ بدھا کی مورتی یہاں سے لے کر گئے ہیں تو جلالی صاحب کی مرضی سے لے کر گئے ہیں۔ اب سوال یہ تھا کہ وہ کہاں گئے ہیں؟ کیا وہ جلالی صاحب کی ہدایت پر کسی خاص جگہ چھپے ہوئے ہیں یا پھر انہوں نے موقع محل کے مطابق اپنی مرضی سے فیصلہ کیا ہے؟

ایس پی حمزہ صاحب نے گفتگو کے دوران میں بتایا۔ ”پچھلے اڑتالیس گھنٹوں میں ڈاکٹر رسام کا کھوج لگانے کی کافی کوشش کی گئی ہے۔ ڈاکٹر رسام کا تعلق فیصل آباد سے ہے۔ اس کی فیملی کے سارے لوگ ابوظہبی میں رہتے ہیں۔ ڈاکٹر رسام یہاں اپنے ایک دوست رضا کے ساتھ کرائے کے مکان میں رہتا تھا۔ رضا کا کہنا ہے کہ اسے پچھلے دو روز سے اس کا کچھ پتا نہیں۔ جاتے وقت اس نے بس اتنا کہا تھا کہ ایک ایمر جنسی ڈیوٹی پر شیخوپورہ جا رہا ہوں، کل دوپہر تک آ جاؤں گا۔“

عمران نے کہا۔ ”فیصل آباد سے بھی پتا کرایا ہے آپ نے؟“

والوں کو یہ سب کچھ ایک ایکیڈنٹ کی طرح ہی لگا۔ راجا نے پھرتی سے زخمی کو اپنی کار میں ڈالا۔ ایک معزز راہ گیر بھی راجا کے ساتھ بیٹھ گیا۔ بظاہر یہ لوگ اسپتال کی طرف روانہ ہوئے۔ کچھ آگے جا کر راجا نے گاڑی روک دی اور ساتھ بیٹھنے والے شخص کو منرل واٹر کی بوتل لانے کو کہا تھا کہ زخمی کو پانی پلانے کی کوشش کی جائے۔ وہ بوتل لینے کے لئے اترتا تو راجا نے گاڑی بھگا دی اور چکر کاٹ کر سیدھا لالہ زار ہوٹل آ گیا۔ اب وہ زخمی نیم بے ہوشی کی حالت میں راجا کے کمرے میں تھا۔

ہم تقریباً ایک گھنٹے میں ہوٹل لالہ زار پہنچ گئے۔ ہماری ہدایت کے مطابق پولیس والے ہمیں ہوٹل سے کچھ فاصلے پر ہی اتار کر واپس چلے گئے۔ ہم کمرے میں پہنچے۔ راجا کے علاوہ اشفاق رانا بھی کمرے میں ہی تھا۔ قالین پر ایک ترپال بچھا کر زخمی کو لٹایا گیا تھا۔ اس کی ایک پنڈلی پیٹوں میں جکڑی ہوئی تھی اور صاف طور پر ٹوٹ چکی تھی۔ اس کی پیشانی بھی سفید پیٹوں میں جکڑی ہوئی تھی۔ یہ پٹیاں راجا..... اور اشفاق نے خود ہی کی تھیں۔ زخمی کی شکل دیکھ کر میں بری طرح چونکا۔ یہ سیکرٹری ندیم تھا۔ وہ پینٹ شرٹ میں تھا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی عینک ایک طرف تپائی پر رکھی تھی۔ عینک کے بغیر بھی وہ کوئی نفیس قسم کا بینک آفسر یا پروپرائٹر ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس کی اصلیت بس ہم جانتے تھے۔ وہ جلالی صاحب کے فارم ہاؤس میں گھومنے والی وہ کالی بھیڑ تھا جس نے جلالی صاحب کو بہت زیادہ نقصان پہنچایا تھا۔ آج یہ عدا شخص اپنے اعمال کا شکار ہو کر یہاں اس کمرے کے فرش پر موجود تھا اور بالکل بے بس نظر آتا تھا۔ راجا نے اپنا سینہ پھیلایا اور فریہ انداز میں میری طرف دیکھا پھر عمران کو دیکھ کر بولا۔

”کیوں عمو! کیسا رہا یہ شکار؟“

”شکار تو ٹھیک ہے لیکن اگر کوئی مصیبت کھڑی ہوگئی تو؟“

”کیا مطلب؟“

عمران نے ایک نظر اشفاق رانا کی طرف دیکھا اور بولا۔ ”اگر کسی نے گاڑی کا نمبر وغیرہ نوٹ کر لیا ہوتا تو؟“

راجا بولا۔ ”اوئے چھڈ یار! یہ میرا اور رائے کا معاملہ ہے۔ تو اس کی فکر نہ کر۔ یہ بتا، کام ٹھیک ہوا ہے یا نہیں؟“

”ہاں کام تو واقعی ٹھیک ہے۔“ عمران نے سر ہلایا۔

راجا کے انداز نے مجھے اور عمران کو سمجھا دیا تھا کہ اس کا ردوائی میں کوئی گڑبڑ نمبر والی گاڑی استعمال ہوئی ہے۔

راجا نے اپنی اکلوتی سلامت آنکھ سے اشفاق رانا کو اشارہ کیا۔ وہ باہر چلا گیا۔ اب ہم تینوں تھے اور ہمارے سامنے ترپال پر زخمی سیکرٹری ندیم پڑا تھا۔ وہ شخص جسے صرف بہتر گھنٹے پہلے میں نے اور راجا نے بڑے ٹھانٹوں میں دیکھا تھا۔ اس کے ہاتھ میں سنہری دھسکی اور بغل میں سنہری عورت تھی۔ انڈسٹریل ایریا کی اس کوٹھی میں وہ کسی سرکاری سائٹ کی طرح چند اتا پھرتا تھا۔ اس نے پُر غرور انداز میں مجھے سنگین ترین نتائج کی دھمکیاں دی تھیں اور پھر ان دھمکیوں کو عملی جامہ بھی پہنایا تھا۔ اگر قدرت، راجا کی شکل میں اور پھر ریان گروپ کے حملہ آوروں کی شکل میں مدد فراہم نہ کرتی تو شاید اب فتح محمد کی طرح میری لاش بھی اس کوٹھی میں کہیں کیڑوں کی خوراک بن رہی ہوتی۔

عمران نے راجا سے پوچھا۔ ”کچھ بتایا تو نہیں اس نے؟“

”نہیں یار! ابھی ہوش میں ہی نہیں آیا۔ منہ دوج ہی کچھ بڑبڑ کر رہا تھا۔ شاید اپنی بے بے کوچ پر جانے سے منع کر رہا تھا۔“

”سلاش لی ہے اس کی؟“

”ہاں، یہ دیکھو۔ راجا نے تکیے کے نیچے سے ایک قیمتی کولٹ پستل نکال کر عمران کو دکھایا اور بولا۔ ”خانہ خراب نے اپنی پنی (پنڈلی) پر ربڑ کے بینڈ سے باندھ رکھا تھا..... اور یہ چیزیں بھی ملی ہیں۔“ راجا نے ایک دراز کھول کر کچھ چیزیں دکھائیں۔ دو چار رسیدیں تھیں، ایک قلم، ایک لائٹر، سگریٹ کا پیکٹ، ساٹھ ہزار روپے کا ایک کراس چیک..... چار پانچ سو روپے کیش تھا۔

جیسا کہ بعد میں پتا چلا کیش زیادہ تھا۔ یعنی قریباً ساڑھے آٹھ ہزار روپے۔ باقی آٹھ ہزار راجا نے ”آف دی ریکارڈ“ رکھ کر اپنی جیب میں غرق کر لئے تھے۔

”موبائل نہیں ملا؟“ عمران نے پوچھا۔

”نہیں لگتا ہے کہ موقع پر ہی کہیں گر گیا ہے۔“

”ٹھیک سے دیکھ لیا ہے؟“

”آہو یار، اتنا اندھا بھی نہیں ہوں۔“

اندازہ ہو رہا تھا کہ موبائل کے بارے میں وہ ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔

اشفاق رانا نے راجا کے کہنے پر ارد گرد کے تین چار کمرے خالی کر لئے تھے۔ ہوٹل کے اس حصے کی طرف کسی کو آنے کی اجازت نہیں تھی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد سیکرٹری ندیم ہوش میں آ گیا۔ اس کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی تھی۔ اس

میں نے اس کے سر کے بال مٹھی میں جکڑے۔ ”ہاں سیکرٹری صاحب: اب ہماری باری ہے۔ سلطانی گواہ بننا چاہو گے یا چھترول کے دوران میں فوت ہونا پسند کرو گے؟“ وہ کراہنے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔ یہ بے بسی کی معراج تھی اور ایسی ہی بے بسی سے وہ مجھے دوچار کر چکا تھا۔ اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ بے ڈھنگے طریقے سے ہوا میں جھول رہی تھی اور اس کا پورا جسم کانپ رہا تھا۔

عمران نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ”سیکرٹری صاحب! اسی لئے ہر پنجابی فلم میں ہیرو، ولن سے یہ کہتا ہے کہ اتنا ہی ظلم کرنا چودھری جتنا سہہ سکتے ہو۔“ اسی دوران میں دروازے پر مدھم دستک ہوئی۔ راجا نے دروازہ کھولا۔ اشفاق رانا نے دہلی آواز میں پوچھا۔ ”خیریت ہے؟ بڑی زور کی آواز آئی تھی؟“

”ہاں..... ہاں خیریت ہے۔ تم ذرا ٹیپ اونچی آواز میں چلاتے رہو۔“ راجا نے مشورہ دیا اور دروازے کو پھر سے اندر سے کنڈی چڑھا دی۔ چند منٹ کے وقفے سے اس نے سیکرٹری ندیم کی پیٹھ پر ایک اور چھترول اٹیک کیا۔ وہ مچھلی کی طرح تڑپنے لگا۔ اگلے چار پانچ منٹ میں اس کی حالت غیر ہو گئی۔ اور منہ سے پانی بہنے لگا۔ اس نے ہاتھوں کے اشاروں سے ہمیں کہا کہ ہم اسے نیچے اتار دیں۔

راجا نے اس کی رسی ڈھیلی کی اور وہ دوبارہ خون آلود ترپال پر آ گیا۔ ہم دیکھ رہے تھے کہ اس کی تن فن بالکل ختم ہو چکی ہے۔ اب اگر ہم اس کے منہ سے جراثیم نکال بھی دیں گے تو وہ شور و غل نہیں کرے گا۔ پھر بھی عمران نے پہلے اس سے یقین دہانی حاصل کی اور تب جراثیم اس کے پھولے ہوئے گلے میں سے نکالیں۔

دو تین منٹ بعد اس کی حالت قدرے بہتر ہوئی۔ عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”سیکرٹری صاحب! تمہیں پھر سے النالکا لگانے میں ہمیں ایک منٹ سے زیادہ نہیں لگے گا لیکن پھر ہم اتنی جلدی تمہیں اتاریں گے نہیں۔ بہتر ہے کہ جو پوچھتے ہیں، ٹھیک ٹھیک بتاتے جاؤ۔“

ندیم سخت جان نہیں تھا۔ نہ ہی شاید وہ بڑے دل گردے کا مالک تھا۔ غالباً دولت کی چمک اور عیاشی کا نشہ اسے پھسلا کر کہیں کا کہیں لے گیا تھا۔ اس نے عمران کی بات کے جواب میں اثبات میں سر ہلایا اور پانی مانگا۔ راجا نے اسے پانی پلایا۔ ٹانگ کی تکلیف اسے بے حال کر رہی تھی۔ عمران نے کہا۔ ”لاہور ہوٹل کے پاس تم کیا کر رہے تھے؟ اور جو بتانا چاہتا تھا۔“ وہ ٹوٹی پھوٹی آواز میں بولا۔ ”میں فیصل آباد جا رہا تھا۔“

بات کا کوئی خطرہ نہیں تھا کہ وہ کسی طرح کی مزاحمت کر پائے گا۔ لہذا اسے باندھنے کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔

ہوش میں آنے کے کچھ دیر بعد ندیم نے مجھے اور راجا..... کو دیکھا اور اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اس کا چہرہ جو ٹانگ کی تکلیف کی وجہ سے پہلے ہی زرد تھا، مزید زرد ہو گیا۔ اس نے طوطے کی طرح گردن گھما کر چاروں طرف دیکھا اور خود کو ایک بند کمرے میں ہمارے درمیان پایا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر راجا نے ٹانگ کی دھکیل سے اسے لینا رہنے پر مجبور کر دیا اور پھنکارا۔ ”اگر رولا شولا پانے کی کوشش کی تو تمہارے منہ میں رانا..... کی سڑی ہوئی جراثیم گھسیں دوں گا اور اوپر سے کس کے پٹی باندھ دوں گا۔“

ندیم کراہتے ہوئے بولا۔ ”مم..... مجھ سے کیا چاہتے ہو تم؟“

”بدلہ۔“ راجا نے اطمینان سے کہا۔ ”جو کچھ وہاں تم نے ہم دونوں کے ساتھ کیا، وہی ہم تمہارے ساتھ کریں گے۔ نہ تھوڑا کم نہ زیادہ۔“

”تمہیں بری طرح پچھتانا پڑے گا۔ جاوا صاحب تمہیں زمین کی ساتویں تہ سے ڈھونڈ نکالیں گے۔“

میں نے کہا۔ ”ہم زمین کے اوپر ہیں تو وہ ساتویں تہ سے کیسے ڈھونڈ نکالے گا؟ وہ تو پچھلے دو تین دن سے شاید خود ساتویں تہ میں گھسا ہوا ہے۔“

ندیم سمجھ گیا تھا کہ وہ کسی پرائیویٹ جگہ پر نہیں، ہوٹل میں ہے اور یہ ایک گنجان بازار ہے۔ اس نے اچانک چلانا شروع کر دیا۔ ان نے جست لگائی اور اس کا منہ دبوچ لیا۔ وہ بمشکل ایک آواز ہی نکال سکا تھا۔ راجا نے ایک طرف سے موٹی بدبودار جرابوں کا جوڑا نکالا اور پھرتی سے ندیم کے منہ میں گھسیڑ دیا۔ اوپر سے اس نے صاف کس کر باندھ دیا۔

ندیم زور مار رہا تھا اور خود کو چھڑانے کی کوشش میں تھا۔ راجا نے نائیکوں کی ایک مضبوط رسی اس کے گتھے سے باندھی اور اس کا دوسرا سرا چھت والے پتھنے کے کنڈے میں سے گزار دیا۔ چند ہی سیکنڈ بعد ندیم کمرے میں النالکا نظر آ رہا تھا۔ وہ شور مچا رہا تھا مگر منہ سے بس غوغاں کی آوازیں ہی نکل رہی تھیں۔

راجا نے جو اتار کر تین چار کمراری ضربیں اس کے کولہوں پر لگائیں۔ تراخ تراخ کی زوردار آوازوں کے بعد وہ قدرے شانت ہو گیا۔ اس کے چہرے پر تکلیف کے شدید ترین آثار تھے۔

کے سبب وہ کسی بھی وقت بے ہوش ہو جائے گا۔ عمران نے پرچی پر ایک پین کلر انجکشن لکھا اور راجا سے کہا کہ بازار سے منگوالے۔

اسی دوران میں عمران کے فون کی بیل ہونے لگی۔ اس نے فون سنا۔ کچھ دیر ہوں، ہاں کرتار ہا پھر باہر نکل گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے ہوٹل کے کوریڈور میں آ گیا۔ دو چار منٹ بعد عمران نے فون بند کیا اور گہری نظروں سے میری طرف دیکھا۔

”کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جیلانی تیرے رقیب روسیہ کے بارے میں معلومات دے رہا تھا۔ اس نے بتایا ہے کہ ماسی حمیدین سے جو کچھ ہمیں معلوم ہوا ہے، وہ بالکل درست ہے۔ یوسف کی جرمن بیوی اسے چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ جاتے جاتے وہ اپنی ہر چیز اپنے ساتھ لے گئی ہے۔ اس کے دوستوں اور کزنز کا ایک ٹولہ اس کے ساتھ تھا اور ان لوگوں نے یوسف فاروقی کو دھمکیاں دی ہیں۔“

”لیکن..... طلاق وغیرہ تو نہیں ہوئی ہے نا؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں ہوئی ہے تو ہو جائے گی۔ جیلانی نے ایک اور خاص بات بتائی ہے۔ تمہارا رقیب روسیہ یعنی یوسف ثانی اس وقت فورٹریس کے ایک شاندار شاپنگ پلازا میں موجود ہے اور شاپنگ فرما رہا ہے۔ اس نے بہت سے بیش قیمت لیڈرز ڈریس خریدے ہیں اور ابھی مزید چیزیں خرید رہا ہے۔“

”یار! کیوں نہ اس بندے کو ایک بار دیکھا جائے۔“ میں نے کہا۔

”بے شک ہم جاسکتے ہیں۔ ویسے بھی اب ہمیں جاوا کے گروں کا ڈر نہیں ہے۔ کم از کم مجھے تو نہیں ہے۔“

”مجھے بھی نہیں ہے اور اگر کہیں ان سے ملاقات ہو بھی گئی تو کیا ہوا۔ تم نے خود ہی تو ایک بار کہا تھا کہ لاہور کی سڑکوں پر دھینگا مشتی کرنے کا اپنا ایک مزہ ہے۔“

”یعنی تم مارا ماری کے لئے بھی تیار ہو؟“

”ایک سوا ایک فیصد۔ جن سڑکوں پر ایک عمر ڈسٹریکٹ کر گزری ہے، اب ان پر سینہ چوڑا کر کے چلنے کو دل چاہتا ہے۔“ میں نے کہا اور جیب سے ندیم کا قیمتی کولٹ پستل نکال کر اس کا میگزین چیک کیا۔ ایک فالتو میگزین بھی ساتھ موجود تھا۔

اسی دوران میں انجکشن آ گیا۔ ساتھ میں سرخ وغیرہ بھی تھی۔ عمران نے ندیم کی مضروب و سرخ پیٹھ پر انجکشن ٹھونکا اور راجا سے کہا۔ ”ہو سکتا ہے کہ ابھی تھوڑی دیر میں یہ سو

وہ چند سیکنڈ کے توقف کے بعد بولا۔ ”مہناز کا ساتھی ڈاکٹر رسام..... وہیں کارہنہ والا ہے۔ جاوا صاحب نے میرے ذمے یہ کام لگایا تھا۔“

”کیا کام لگایا تھا؟“

”یہی کہ اس کا کھوج لگاؤں۔ آپ لوگوں کو پتا چل ہی گیا ہوگا کہ ڈاکٹر مہناز اور رسام بدھا کی مورتی سمیت غائب ہیں۔“ وہ انک انک کر بول رہا تھا۔

”تم پیدل ہی فیصل آباد جا رہے تھے، خیر سے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں گاڑی تھی..... ڈرائیور اور..... ایک گارڈ بھی تھا۔ وہ صنوبر سینما کی طرف کھڑے تھے۔ میں بس دو منٹ کے لئے نیچے اتر اٹھا، ایک دوست سے چیک لینے کے لئے۔“

”جاوا حرامی اب کہاں ہے؟“ عمران نے پوچھا۔

اس سوال کے جواب میں ندیم نے کچھ تذبذب سے کام لیا۔ مگر جب عمران کے اشارے پر راجا جانے پھر سے رسی کی طرف ہاتھ بڑھایا تو وہ دوبارہ بولنے لگا۔ جاوا کے بارے میں ندیم نے جو کچھ بتایا، وہ ہمارے لئے کافی حوصلہ افزا تھا۔ ندیم کی باتوں سے پتا چلا کہ وہاں بمبئی میں جاوا پر ایک افواہ آئی ہے۔ ایک خروماغ پولیس افسر نے جاوا کے چھوٹے بھائی کو اس کی گرل فرینڈ سمیت گولیوں سے چھلنی کر دیا ہے اور فرار ہو گیا ہے۔ اس پولیس افسر کا یارانہ ریان گروپ کے لوگوں سے بتایا جا رہا ہے۔ اس واقعے کے بعد جاوا فوراً اپنے لاؤ لاشکر سمیت بمبئی چلا گیا تھا۔ اس کی حالت بہت بری تھی۔ وہ اپنے سامنے آنے والے ہر شخص کو گالیاں دے رہا تھا۔ بھائی کے قتل کی اطلاع دیر سے دینے کی پاداش میں اس نے اطلاع لانے والے کو موقع پر ہی گولی مار کر شدید زخمی کر دیا تھا۔ ندیم نے اس کے اندھا دھند شراب پینے کا ذکر بھی کیا۔

میں نے چونک کر کہا۔ ”لیکن تمہاری اطلاع کے مطابق تو اس نے کوئی بھرت وچن رکھا ہوا تھا۔ شراب اور عورت کو ہاتھ نہ لگانے کی قسم کھائی ہوئی تھی؟“

وہ کراہتے ہوئے بولا۔ ”وہ بھرت وچن بھی فی الحال ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے کہا ہے نا جاوا صاحب کی حالت بہت بری ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بمبئی میں بڑا خون خرابا ہوگا۔“

عمران نے سگریٹ کا ایک طویل کش لیا اور شعلے فلم کے گبرنگھ کے انداز میں بولا۔

”اب تیرا کیا ہوگا کالے! تیرا تو ختم ہی تجھے چھوڑ کر بھاگ گیا۔“

ندیم نے آنکھیں بند کر رکھی تھیں۔ پیشانی پسینے سے تر تھی۔ لگتا تھا کہ ٹانگ کی تکلیف

”بھی تم سے بات تو کی تھی۔“
 ”لیکن کب کی تھی، یہ بھی تو دیکھئے نا۔ لگتا ہے کہ آپ روز بہ روز مصروف ہوتے جا رہے ہیں اور یہ مصروفیت کچھ خطرناک بھی ہے۔ مجھے لگتا ہے کہ وہاں پاکستان میں آپ اپنے دوست عمران صاحب کے ساتھ مل کر کچھ کر رہے ہیں۔ میں نے آپ کے دوست عمران صاحب کے بارے میں ایک چھوٹی سی نیوز بھی دیکھی ہے ٹی وی چینل پر۔“
 ”میں نے بھی دیکھی تھی۔ اس میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔“

”لیکن میری موجودگی میں آپ نے ریسٹورنٹ کے اندر جوڑائی کی وہ تو حقیقت تھی نا؟ چلیں اس بارے میں بعد میں بات ہو جائے گی۔ اس وقت آپ کو ایک بڑی اہم اطلاع دینے کے لئے فون کیا ہے جناب۔“
 ”کیسی اطلاع؟“

”ہم پاکستان واپس آ رہے ہیں۔ ایک ہفتہ پہلے بڑا لمبا چوڑا۔“ چیک اپ“ ہوا ہے آپ کی اس بہن کا۔ ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ ابھی فوری طور پر آپریشن کی ضرورت نہیں۔ وہ دواؤں کے ذریعے پہلے مجھے اچھا کرنا چاہتے ہیں اس کے بعد آپریشن کی باری آئے گی۔ جیسے بکرے کو پہلے کھلاتے پلاتے ہیں پھر پھری چلاتے ہیں۔ چچا احمد نے سینئر ڈاکٹر صاحب سے تفصیل کے ساتھ مشورہ کیا ہے۔ اگر ہم یہاں دینا میں ہی رہیں گے تو ڈھائی تین ماہ میں کافی سارا خرچہ آ جائے گا۔ لہذا فیصلہ ہوا ہے کہ ہم پاکستان آ جائیں اور پہلے میڈیکیشن کا کورس پورا کریں۔“

”یہ تو اہم خبر سنائی ہے تم نے۔ لیکن پہلے میری بات احمد چچا سے کراؤ۔“ میں نے کہا۔
 نصرت کی آواز سنائی دی۔ وہ احمد چچا کو پکار رہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد احمد چچا کی آواز ابھری۔ وہ بھی مطمئن اور خوش محسوس ہوتے تھے۔ نصرت کے بارے میں چچا احمد سے میری تفصیلی بات ہوئی۔ انہوں نے بھی یہی بتایا کہ ابھی آپریشن ملتوی ہوا ہے اور غیر متوقع طور پر نصرت کی حالت بھی بہتر ہے۔ اگر وہ میڈیکیشن کے لئے اسپتال میں ایڈمٹ رہتی ہے تو کافی خرچہ آ جائے گا۔ ڈاکٹروں کے مطابق مناسب یہی ہے کہ وہ چند ماہ کے لئے پاکستان چلی جائے۔

ہماری اس گفتگو کے بعد عمران نے وہیں بیٹھے بیٹھے فوراً ریان ولیم سے فون پر رابطہ کیا۔ ریان صاحب اور پروفیسر رچی کے ساتھ عمران کا ٹیلی فونک رابطہ ہوتا ہی رہتا تھا۔ وہ انہیں جلالی صاحب اور آرا کوئے کے حوالے سے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ رکھتا تھا۔ ریان

جائے۔ نہ سویا تو تھوڑی سی چرس پلا دینا اس کو۔ تمہارے پاس تو ہر وقت موجود ہوتی ہے۔ لیکن ہوشیار رہنا۔“

”اس کی فکر نہ کرو عمو! یہ دوسری، تیسری بار بھی پیدا ہو جائے تو مجھے دھوکا نہیں دے سکتا۔۔۔۔۔ لیکن تمہاری واپسی کس ویلے تک ہوگی؟“
 ”بس ایک دو گھنٹے تک۔“ عمران نے کہا۔

”ہم نیچے آئے اور ایک ٹیکسی میں سوار ہو کر فورٹریس پہنچ گئے۔ جیلانی سے فون پر ہمارا رابطہ تھا۔ ہمیں اس تک پہنچنے میں زیادہ دشواری نہیں ہوئی۔ وہ شاندار شاپنگ پلازا کے سیکنڈ فلور پر موجود تھا اور کولڈ ڈرنک پی رہا تھا۔ اس نے ہمارے لئے بھی ڈرنک منگوائے۔“ کہاں ہے رقیب روسیہ؟“ عمران نے جیلانی سے پوچھا۔

جیلانی نے ایک گوشے کی طرف اشارہ کیا۔ یہاں شاندار قسم کا اٹالین فرنیچر سیل کے لئے موجود تھا۔ لمبی ناک والا ایک خوش رو جوان بڑے اسٹائل سے ”شیشہ“ پی رہا تھا اور ساتھ ساتھ فرنیچر کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کا لباس جدید تراش کا اور قیمتی تھا۔ ایک ڈرائیور نائب شخص اس کے قریب مؤدب کھڑا تھا۔ ”یہی ہیں یوسف فاروقی صاحب۔“ جیلانی نے سرگوشی کی۔

ہم کیفے میریا کی کرسیوں پر بیٹھ گئے اور اس کی حرکات و سکنات ملاحظہ کرنے لگے۔ اس نے ایک دو بار اپنے شاندار سیل فون کے ذریعے کسی سے بات بھی کی۔ یہ سوچ کر میرے دل میں نہیں سی اٹھی کہ شاید یہ بات اس نے ویانا میں ثروت سے ہی کی ہو۔

اس نے لکڑی کی دو فولڈنگ کرسیاں ”پرچیز“ کیں۔ کریڈٹ کارڈ کے ذریعے ادائیگی کی اور ڈرائیور کرسیاں اٹھا کر نیچے لے گیا۔ تب اس کی نظریں قیمتی لکڑی کے ایک شاندار Swing پر اٹک گئیں۔ ایسے خوب صورت جھولے عموماً نو بیاہتا جوڑوں کو تحفہً دئے جاتے ہیں۔ تھوڑی سی چھان پھانک کے بعد یوسف نے یہ جھولا بھی خرید لیا۔

”بڑی تیاریاں ہیں بھئی۔“ عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی دوران میں میرے موبائل پر کال آئی۔ میں نے دیکھا، یہ ویانا سے نصرت کا نمبر تھا۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے نصرت کی بے تاب آواز ابھری۔ ”تائیش بھائی! آپ کہاں غائب ہو جاتے ہیں؟ بائی گاڈ بڑے کھنور ہیں آپ۔ نہ سچ کا جواب دیتے ہیں، نہ کال ریسیو کرتے ہیں۔“

ولیم کو عمران کی بے پناہ ”لک“ پر کچھ انوکھا سا بھروسہ ہو گیا تھا۔ حالانکہ موجودہ صورت حال آرا کوئے کے حوالے سے اتنی حوصلہ افزا نہیں تھی لیکن ریان ولیم کو یقین تھا کہ عمران کی کوششوں کا حتمی نتیجہ مثبت ہی نکلے گا..... جیسے کونز شواور لکٹری طیارے کا نکلا تھا۔ جاوا گروپ سے کھلم کھلا ٹکراؤ کے بعد ریان ولیم کے نزدیک عمران کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔ عمران نے جس طرح جاوا کے دست راست نادر ٹی ٹی کو موت کے گھاٹ اتارا تھا، وہ ریان ولیم کے لئے بہت اہم تھا۔ بہر حال، ریان ولیم کی خواہش تھی کہ عمران اور ریان گروپ کا تعلق پوشیدہ ہی رہے۔

عمران نے ریان ولیم سے چند لاکھ روپے منگوائے جو فوراً ہی عمران کو آن لائن ٹرانسفر کر دیئے گئے۔ اس کے لئے جیلانی کا اکاؤنٹ نمبر استعمال ہوا۔

اسپتال سے نصرت کے عارضی ڈسچارج کے لئے یہ رقم ویانا بھجوانے کی ضرورت پیش آ سکتی تھی۔

ثروت والا معاملہ بڑی تیزی سے ایک نئی کروٹ لے رہا تھا۔ ثروت آسٹریا سے واپس آ رہی تھی اور یہاں اس کا شوہر یوسف فاروقی اس کے استقبال کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ اپنی مین ایجر جرمن بیوی سے زخم کھانے کے بعد اسے ثروت کا خیال آیا تھا..... اسے احساس ہوا تھا کہ اس نے سب کچھ نہیں کھویا، بہت کچھ اس کے پاس ہے اور جو کچھ اس کے پاس ہے، وہ بھی کم پرکشش نہیں۔

میں اور عمران دیکھ رہے تھے، وہ فرنچر مارٹ پر مختلف اشیاء کا جائزہ لینے میں مصروف تھا۔ بہر حال اس نے دو کرسیاں اور ساگوانی جھولا خریدنے پر ہی اکتفا کیا۔

عمران نے کہا۔ ”اس سے رابطہ کرو تاہی! اس کو مزید جاننے میں مدد ملے گی۔“

”اس سے کیا فائدہ ہوگا؟ پتا نہیں کیوں میرا دل چاہتا ہے کہ میں اس معاملے سے دور رہوں۔“

”یار! پھر وہی دلیپ کماری..... میں رادھا کے جیون پر اپنی چھایا..... وغیرہ وغیرہ۔“

ابھی ہم باتیں ہی کر رہے تھے کہ یوسف فارغ ہو گیا۔ دو ملازم بیک شدہ جھولا لے کر برقی سیڑھیوں کی طرف چلے گئے۔ یوسف بھی لمبے ڈگ بھرتا ہوا خارجی راستے کی طرف بڑھا۔ مجھے یہ خطرہ نہیں تھا کہ وہ مجھے پہچان پائے گا۔ بے شک ایک مرتبہ فون پر اس سے بات ہو چکی تھی لیکن وہ مجھے شکل سے نہیں جانتا تھا۔

مگر جب وہ..... قریب سے گزرا تو مجھ پر طائرانہ نظر ڈالنے کے بعد تھوڑا سا چونک گیا

میں گڑبڑا کر دوسری طرف دیکھنے لگا۔ مجھے لگا کہ اس کی نگاہیں میرے چہرے پر ہیں۔ کچھ قدم آگے جا کر وہ رکا اور پھر پلٹ کر ہماری طرف آ گیا۔ اس کی تیز نگاہیں اب بھی مجھ پر تھیں۔ میرے پاس آیا اور مسکرا کر بولا۔ ”معاف کیجئے، مجھے آپ کی شکل کچھ پہچانی ہوئی لگ رہی ہے۔ کہیں دیکھا ہے آپ کو۔“

میں نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا۔ اس کے ہاتھ نرم تھے اور انداز میں گہرا اعتماد تھا۔

”آپ کا عثمان صاحب کی فیملی سے تو تعلق نہیں ہے؟ عثمان صاحب جو میکلوڈ روڈ پر کیمیکلز کا اسٹور بھی چلاتے تھے؟“ اس نے پوچھا۔ عثمان، ثروت کے والد مرحوم کا نام تھا۔

میں نے دل ہی دل میں اس کی تیز نگاہی کی داد دی اور کہا۔ ”آپ کا اندازہ درست ہے۔ آپ جن عثمان صاحب کا ذکر کر رہے ہیں وہ رشتے میں میرے خالو تھے۔“

”ادھ گاڈ! آپ تابش تو نہیں ہیں؟“ اس کی بھوری آنکھوں میں بے پناہ چمک ابھر آئی۔

”ہاں، میرا نام تابش ہے۔“

”میں نے فیملی البم میں آپ کی تصویریں دیکھی ہیں۔ ایک آدھ فیملی ویڈیو میں بھی آپ کو دیکھا ہے..... ونڈر فل۔ مجھے بالکل توقع نہیں تھی کہ اس طرح آپ سے ملاقات ہو جائے گی۔“

”اور آپ کی تعریف؟“ میں نے انجان بن کر پوچھا۔

وہ ایک بار پھر مسکرایا۔ مسکراتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آس پاس سلوٹیں پڑتی تھیں۔ ”آپ مجھے پہچاننے کی کوشش کیجئے۔ چند دن پہلے فون پر آپ سے تفصیلی بات ہو چکی ہے۔ میں نے آپ سے ملاقات کی خواہش بھی کی تھی۔“

”میں نے کہا۔“ کہیں آپ یوسف تو نہیں؟ ثروت کے ہسبند؟“

اس نے ایک بار پھر ممٹانے کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ ”آپ جناب نے بالکل ٹھیک پہچانا۔“

”زبردست۔“ میں نے کہا۔ ”آپ کی نظر واقعی کافی تیز ہے۔ چند تصویروں کی مدد سے آپ نے مجھے شناخت کر لیا اور تصویریں بھی چار پانچ سال پرانی ہوں گی۔“

”کچھ چہرے ہوتے ہیں جن پر وقت کی دھول زیادہ نہیں پڑتی اور پڑتی بھی ہے تو جستی نہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ آپ کا تعلق کسی طور ثروت کی فیملی سے ہے۔“

کچی دیر بعد عمران بھی اس گفتگو میں شریک ہو گیا۔ میں نے اس کا تعارف اپنے

دوست کے طور پر کرایا۔ جیلانی، عمران کے اشارے پر موقع سے کھسک چکا تھا۔ ہم وہیں کیفے ٹیریا میں بیٹھ گئے۔ میں نے تین کپ کوئلہ کافی منگوائیں۔ یوسف نے مجھے ویانا کی تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا اور بتایا کہ ثروت اور نصرت اسی ہفتے پاکستان واپس آرہی ہیں۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مجھے اس خبر کا علم نہیں؟ میں نے انکار میں جواب دیا۔ وہ بہت جلد بے تکلف ہو جانے والا شخص تھا اور تو اتر سے باتیں کر رہا تھا۔ اس سلسلے میں عمران بھی کچھ کم نہیں تھا۔ وہ باتوں کا چمپئن تھا۔ آدھ پون گھنٹے کے اندر ہی دونوں نے کئی موضوعات چھیڑ اور سیٹے۔ یوسف، میرے اور عمران کے کاروبار کے حوالے سے ٹوہ لینا چاہ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ ہم ایک دوست کے ساتھ مل کر ”کارڈیولگ“ کر رہے ہیں۔ نیل روڈ پر ہمارا شوروم ہے۔ یہ دراصل جیلانی کا شوروم تھا۔ عمران کبھی کبھار وہاں جا بیٹھتا تھا۔ کاروں اور گاڑیوں کی بات چلی تو یوسف نے بتایا کہ اسے خوبصورت اور یونیک گاڑیوں کا شوق ہے۔ اس نے کہا۔ ”میرے پاس 75 ماڈل کی ایک شاندار مرسیڈز ہے جو کافی عرصے سے ایک اہم سیاسی شخصیت کے زیر استعمال بھی رہی ہے۔“ اس نے ہمیں گاڑی کی تفصیل بتائی۔

عمران متاثر ہوا۔ اس نے کہا۔ ”کسی وقت ہمیں دکھائیے۔“
وہ بولا۔ ”کسی وقت کیوں، آپ کے پاس وقت ہے تو ابھی چلے میرے ساتھ گاؤں ٹاؤن۔“

وہیں بیٹھے بیٹھے یوسف کے گھر چلنے کا پروگرام بن گیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ ہم پر اپنی امارت کا رعب بھی ڈالنا چاہتا تھا ہے۔ اس کے علاوہ اسے میرے بارے میں کافی جستجو تھی۔ عمران اور میں ٹیکسی میں یہاں آئے تھے لیکن عمران نے یوسف کو بتایا کہ ہماری ہنڈاسی پارکنگ میں کھڑی ہے اور ڈرائیور اسے خود ہی لے آئے گا۔ ہم یوسف کی شاندار ٹویوٹا میں بیٹھے اور اس کے ساتھ اس کے گھر پہنچ گئے۔ یہ دو بجے کا وقت تھا۔ موسم خوشگوار تھا۔ یہی وہ گھر تھا جہاں میں نصرت کا بچپن کرتے ہوئے پہنچا تھا اور پھر میں نے ثروت کی پہلی جھلک بھی دیکھی تھی۔ وہ جھلک جو مجھے کئی برس کے جان لیوا انتظار کے بعد نصیب ہوئی تھی۔

مجھے زیادہ خطرہ ملازمہ حمیدن کی طرف سے تھا۔ اگر وہ گھر میں موجود ہوتی اور ہمیں پہچان کر کسی رد عمل کا اظہار کرتی تو مسئلہ کھڑا ہو سکتا تھا۔ بہر حال، خیریت گزری۔ حمیدن کی عقل کا امتحان ہی نہیں ہوا۔ وہ گھر میں موجود نہیں تھی۔ کم از کم ہمیں تو دکھائی نہیں دی۔ میری معلومات کے مطابق یوسف کا یہ گھر کرائے کا تھا۔ اس کا ذاتی شاندار گھر قریب ہی ایک پوش علاقے میں بن رہا تھا۔ پھر بھی اس رہائش گاہ کو اس نے خوب سجاایا ہوا تھا۔ غالباً اس سجاوٹ

کی ایک وجہ ثروت کی آمد بھی تھی..... ثروت جس کے حوالے سے یوسف کا حق ملکیت اور احساسِ محبت اچانک جاگ گیا تھا۔ کوٹھی کے ایک کوریڈور میں رنگ و روغن ہو رہا تھا، گرا سی لائوں کو خوبصورتی سے تراشا گیا تھا۔ یوسف نے ہمیں گھر کے اندرونی حصے دکھائے یہاں تک کہ بیڈروم بھی دکھا دیا۔ بیڈروم کو بڑے لگژری انداز میں تیار کیا گیا تھا۔ بیڈ اپنی ”سہولتوں“ کے اعتبار سے زبردست تھا۔ یہاں ایک دیوار پر یقیناً حال ہی میں ثروت کی ایک بڑی تصویر بھی لگائی گئی تھی۔ یہ وہی تصویر تھی جس کا ذکر حمیدن نے مجھ سے کیا تھا۔

یوسف نے مجھے مخاطب کیا اور مسکرا کر بولا۔ ”تاہم صاحب! آپ نے پہچان ہی لیا ہو گا۔ یہ ہیں آپ کی کزن اور میری اہلیہ ثروت۔ دو چار دن میں یہاں پہنچ جائیں گی۔ پھر آپ کو کھانے پر بلائیں گے بلکہ میرا تو پروگرام بن رہا ہے کہ ثروت کی آمد پر ایک چھوٹی سی تقریب کر دی جائے۔ ایک مزیدار سا گیٹ ٹو گیدر۔“

”اچھی بات ہے۔“ میں نے کہا۔

وہ کمرے کی آرائش اور فرنیچر وغیرہ کے بارے میں معلومات فراہم کرنے لگا..... مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھے یہ بیڈروم دکھا کر اور اس کوٹھی میں گھما پھرا کر لطف لے رہا ہے۔ جیسے اس نمود و نمائش سے اس کے کسی اندرونی جذبے کی تسکین ہو رہی ہے۔

اسی دوران میں اس کے فون پر کال آگئی۔ اس نے کال اٹینڈ کی۔ تھوڑی ہی دیر بعد مجھے اندازہ ہوا کہ یہ ثروت کی کال ہے۔ ثروت اس سے کسی ملازم کے بارے میں بات کر رہی تھی، جس کی بیوی کو کل فالج ہوا تھا۔ وہ یوسف سے کہہ رہی تھی کہ وہ اس کی مالی مدد کرے۔ تین چار منٹ یہ بات جاری رہی۔ پھر بالکل غیر متوقع طور پر یوسف نے کہا۔ ”ثروت! تمہارے ایک جاننے والے میرے پاس موجود ہیں۔ لو ان سے بات کرو اور پہچانو۔“

اس نے ایک دم سیل فون میری طرف بڑھا دیا۔ میں اس صورت حال کے لئے تیار نہیں تھا۔ چند لمحے کے لئے گڑبڑا گیا۔ دوسری طرف سے ثروت کی مترنم آواز آرہی تھی۔ ”ہیلو..... ہیلو کون؟“

میں نے ہنکھار کر گلا صاف کیا۔ ”ہیلو..... کیسی ہیں آپ؟“

ثروت نے ایک لچلے میں آواز پہچان لی۔ اس کے ساتھ ہی اس نے فون بند کر دیا۔ میں نے دو تین بار ہیلو کہا پھر یہ کہتے ہوئے فون یوسف کی طرف بڑھا دیا۔ شاید لائن کٹ گئی ہے۔

”ہاں، لمبے فاصلے کی کال میں لائن اکثر کٹ جاتی ہے اور کبھی صرف محسوس ہوتا ہے کہ کٹ گئی ہے۔“ اس کا لہجہ بظاہر عام تھا مگر اس کی تہ میں معنی خیزی چھپی ہوئی تھی۔

مجھے احساس ہوا کہ ثروت کو اس طرح بے وجہ فون بند نہیں کرنا چاہئے تھا۔ شاید وہ حواس باختہ ہو گئی تھی۔

ہم قریباً ایک گھنٹا یوسف کے ساتھ رہے۔ اس نے شاندار چائے پلائی۔ اپنی گفتگو میں اس نے کہیں اپنی رسوا کن محبت کا ذکر نہیں کیا۔ نہ ہی ہمیں بتایا کہ اس کی چیتتی جرمن بیوی بھی اس کے ساتھ اس گھر میں رہتی تھی۔ اس چیتتی بیوی کی صرف ایک نشانی ہمیں یہاں نظر آئی۔ یہ ایک شیفرڈ کتا تھا جو ڈاگ ہاؤس میں گوشت پر منہ مار رہا تھا۔ حمیدن کے مطابق یہ گرلیں کا کتا تھا۔ وہ شوہر کی طرح اس کتے کو بھی غیر اہم جان کر یہاں چھوڑ گئی تھی۔

یوسف ہمیں کھانا بھی کھلانا چاہتا تھا مگر مجھے ملازمہ حمیدن کی طرف سے اندیشہ تھا۔ ہم نے کھانے سے معذرت کی۔ یوسف نے ہم سے وعدہ لیا کہ ثروت اور نصرت کی آمد پر اگر پارٹی اریج ہوئی تو ہم دونوں اس میں ضرور شرکت کریں گے۔ مجھ سے پہلے عمران نے وعدہ کر لیا۔ میں نے کولٹ پسل ایک ربز بینڈ کے ذریعے اپنی پنڈلی سے باندھ رکھا تھا۔ اس پسل کا ہلکا سا ابھار پینٹ میں سے نظر آتا تھا۔ مجھے شروع سے آخر تک یہی فکر رہی کہ کہیں یہ ابھار یوسف کی نگاہوں میں نہ آ جائے۔

عمران دس منٹ پہلے ہی فون کر کے جیلانی کو ہدایت دے چکا تھا کہ وہ ہنڈاسوک لے کر گارڈن ٹاؤن پہنچ جائے۔ اس نے یوسف کا ایڈریس بھی سمجھا دیا تھا۔



قریباً پندرہ منٹ بعد ہم ہنڈاسوک پر یوسف سے رخصت ہو رہے تھے۔ میرے فون پر بار بار عاطف کی کال آرہی تھی۔ میں نے گاڑی میں بیٹھ کر کال اٹینڈ کی۔ عاطف کی پریشان آواز سنائی۔ ”بھائی جان! وہ آنٹی جلیلہ جاگ گئی ہیں۔ بہت فکر مند ہیں۔ مسلسل رو رہی ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ ان کی بیٹی مہناز کو کچھ ہو گیا ہے اور ہم لوگ ان سے چھپا رہے ہیں۔ وہ بار بار اسے فون بھی کر رہی ہیں مگر وہاں سے کوئی جواب نہیں آ رہا۔“

”ٹھیک ہے، ہم دس منٹ میں پہنچ رہے ہیں۔ تم ان کے پاس بیٹھو اور باتوں میں لگاؤ۔“ دس پندرہ منٹ بعد ہم ڈیفنس والی کوچی میں موجود تھے۔ آنٹی جلیلہ واقعی رو رو کر ہلکان ہو رہی تھیں۔ درحقیقت ان کی بیماری کی وجہ بھی بیٹی کا رویہ ہی تھا۔ اب بیٹی کی گمشدگی نے انہیں مزید تباہ حال کر دیا تھا۔

انہوں نے عمران کو کندھوں سے تھام کر جھنجھوڑنا شروع کر دیا۔ ”تم لوگ مجھے ٹھیک بات بتاتے کیوں نہیں ہو؟ کیا ہوا ہے میری مہناز کے ساتھ؟ کہاں گئی ہے وہ؟ اس نے تو کبھی اس طرح اپنا فون بند نہیں کیا تھا۔ وہ خبیث جلالی بھی فون نہیں اٹھا رہا۔ اللہ کرے مر گیا ہو وہ۔ جنازہ نکل جائے اس کا۔ اس نے میری بیٹی کو تماشا بنا دیا ہے۔ پتا نہیں، کیا تعویذ گھول کر پلا دیئے ہیں اسے۔“ وہ ایک بار پھر جلالی کو کونے لگیں۔

عمران نے کہا۔ ”آنٹی جی! میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ مہناز کے ساتھ کچھ ایسا دوسرا نہیں ہوا۔ وہ خطرے سے بچ کر نکل گئی ہے۔ آپ خود سوچیں اگر وہ کسی مصیبت میں آ گئی ہوتی تو پھر اسے ڈھونڈنے والے اسپتال کیوں آتے اور آپ کو پکڑنے کی کوشش کیوں کرتے؟ وہ اصل میں ڈاکٹر مہناز ہی کو تلاش کر رہے ہیں۔“

”کیوں کر رہے ہیں؟ میری بیٹی نے کیا بگاڑا ہے کسی کا؟ اگر کسی کو دشمنی اس خبیث بڑھے کے ساتھ ہے تو اس میں میری بچی کا کیا قصور ہے؟“

ہم اسے کیسے بتاتے کہ وہ اس ”خبیث بڑھے“ کی بیوی ہے اور اس کی ہر اچھائی برائی میں اس کی حصے دار بن چکی ہے۔ بالفاظ دیگر وہ اس سارے معاملے میں پوری طرح ملوث ہو چکی ہے۔

ہم دونوں نے آنٹی سے تسلی بخشی کی باتیں کیں اور انہیں کافی حد تک پرسکون کر دیا۔ میں نے کہا۔ ”آنٹی! آپ اپنا سیل فون ہر وقت کھلا رکھیں۔ کسی بھی وقت ڈاکٹر صاحبہ کی کال آپ کے نمبر پر آ سکتی ہے۔“

عمران نے کہا۔ ”اس کے علاوہ آپ ایک دو ایس ایم ایس بھی اسے کر دیں۔“

”مجھے نہیں کرنا آتا۔“ آنٹی جلیلہ نے انشک بار لہجے میں کہا۔

عمران نے آنٹی جلیلہ کی طرف سے دو ایس ایم ایس مہناز کے نمبر پر بھیج دیئے۔ ان میں آنٹی کی بیماری کا ذکر تھا، اسپتال کا ذکر تھا اور مہناز سے کہا گیا تھا کہ وہ فوراً رابطہ کرے۔

آنٹی کو وہ دو ایس ایم ایس زبانی یاد تھیں جو انہیں اسپتال میں دی جا رہی تھیں۔ عاطف نے بازار سے وہ دو ایس ایم ایس لادی تھیں۔ فرح نے ہمارے سامنے آنٹی کو دوا کھلائی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ غنودگی محسوس کرنے لگیں۔ ان کو آرام دینے کے پیش نظر ہم ان کے کمرے سے نکل آئے۔ فرح نے کہا۔ ”رات کا کھانا تیار ہے۔ ڈرائنگ روم میں آ جائیں۔“

”کیا پکایا ہے ہماری بہن نے؟“ عمران نے پوچھا۔

”آپ کی بہن نے نہیں، آپ کی انہوں نے پکایا ہے۔ زبردست قسم کے قیہ کر لیں،

نمودار ہوئی اور ہم ایک دوسرے سے علیحدہ ہو گئے۔ فرح اور عاطف مسلسل ہنس رہے تھے۔ شاہین نے واقعی نہایت مزیدار کھانا پکایا تھا۔ کون کہہ سکتا تھا کہ سرکس میں جسمانی کرتب دکھانے والی یہ ہوش ربا لڑکی، گھر گرہستی بھی کر سکتی ہے۔

شاہین اور عمران کی صلح کی خوشی میں، میں نے سب کو آکس کریم کھلائی اور ارد گرد کی گھمبیر پریشانیوں سے خود کو جدا کر کے کچھ اچھا وقت گزارا۔

بالواس نے ماحول میں بہت خوش تھا۔ وہ اپنی توہلی زبان میں بابا..... تاتا کرتا تھا۔ ہر کوئی اسے گود میں اٹھائے پھرتا تھا۔ زری بھی اس ماحول میں خود کو ایڈجسٹ کر چکی تھی۔ وہ اب باقاعدہ فرح سے پڑھ بھی رہی تھی۔ اس کے طور اطوار اب کافی سلجھ گئے تھے۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں گھاگرا چولی پہن کر اپنے جسم کی نمائش کرنے والی اور آنکھوں آنکھوں میں توبہ شکن اشارے پھینکنے والی زری اب ایک نئے سانچے میں ڈھلتی جا رہی تھی۔

زری نے شروع شروع میں کئی بار کہا تھا۔ ”میرا من نہیں لگتا۔ مجھے زرگان کی یاد آت ہے، میں واپس جانا چاہت ہوں۔“ مگر اب وہ یہ فقرہ جیسے بھول ہی گئی تھی..... میرے سامنے آتے ہوئے وہ اوزھنی سے اپنا سینہ خوب ڈھانپ کر رکھتی تھی اور اس کی نگاہ بھی نیچی رہتی تھی۔ یہ اسباق اسے بھانڈیل اسٹیٹ میں سلطانہ نے ہی پڑھائے تھے۔

کھانا کھانے کے کچھ ہی دیر بعد عمران نے کہا۔ ”چلو اب چلیں۔“

”کہاں؟“ میں نے دبی آواز میں پوچھا۔

”کہیں بھی، یہاں سے تو نکلیں۔ یہ نہ ہو کہ یہ ساری خوشی دھری کی دھری رہ جائے.....“

اور ہم دونوں کے درمیان پھر جنگ چھڑ جائے۔“ اس کا اشارہ اپنے اور شاہین کی طرف تھا۔

جب ہم اچانک جانے کے لئے تیار ہو گئے تو وہ سب لوگ کافی مایوس ہوئے۔ ان کا خیال تھا کہ اب ہم آئے ہیں تو ایک دو دن رہیں گے اور بلاگلا ہوگا۔ خاص طور سے شاہین چپ نظر آنے لگی۔ وہ واقعی دل کی گہرائیوں سے عمران کو چاہتی تھی۔ عمران کی طرف کیا صورت حال تھی، اس کا کچھ اتنا پتا نہیں چلتا تھا۔

عمران نے سب کو تسلی دی کہ وہ ایک دو دن میں ضرور واپس آئیں گے اور پھر ہو سکتا ہے کہ ویک اینڈ ان کے ساتھ ہی گزاریں۔

میں سمجھ گیا کہ عمران کو کیوں جلدی ہے۔ ہم ایک مصیبت سیکرٹری ندیم کی شکل میں ہوٹل لالہ زار کے کمرے میں چھوڑ آئے تھے۔ اس مصیبت کی نگرانی پر بھی ایک مصیبت کو ہی مقرر کیا گیا تھا مجھے اور عمران کو پورا یقین تھا کہ ندیم کی جیب سے زیادہ کیش نکلا ہے۔ راجا نے

ساتھ میں دہی کی نمکین لسی اور گرم گرم روٹیاں۔“

عمران بولا۔ ”اگر یہ اہتمام شاہین نے کیا ہے تو پھر اس نے ضرور اس میں زہر ملایا ہو گا۔“

”زہر نہیں جی، محبت ملائی ہے۔ وہ آپ کی ناراضی دور کرنا چاہتی ہیں۔“

”میری بہن! چھری خربوزے پر گرے یا خربوزہ چھری پر، زخم تو خربوزے کو ہی لگتا ہے۔ پہلی ناراضی دور ہو گئی تو پھر اگلی لڑائی کے لئے جگہ بنے گی نا۔ کیا زبردست شعر کہہ گئے ہیں اس بارے میں مولانا حسرت موہانی۔ سانوں نہروالے پل تے بلا کے تے ماہی خورا کتھے رہ گیا۔“

فرح اور عاطف ہنس ہنس کر دہرے ہونے لگے۔ انہیں ہنسنے دیکھ کر بالو بے وجہ قلقلیاں مارنے لگا۔ فرح نے کہا۔ ”عمران بھائی! یہ شعر تو نہیں ہے اور یہ نہر کے پل کی بات کہاں سے آگئی؟“

وہ فلسفیانہ انداز میں بولا۔ ”محبت اور جنگ میں سب کچھ جائز ہوتا ہے۔ اور یہاں تو محبت بھی ہے اور جنگ بھی۔“

میں نے کہا۔ ”واقعی“ محبت والے اونٹ“ کی کوئی کل سیدھی نہیں ہوتی۔ اب یہی دیکھو، وہ بے چاری تمہاری وجہ سے دکھی بھی ہوئی ہے اور تمہیں مناتی بھی ہے..... تم سے معافی بھی مانگتی ہے۔“

”بہت خوب۔“ عمران نے دیدے نچائے۔ ”اس نے مجھے اڑنگا مار کر گرایا۔ میرے سینے پر سوار ہوئی، میرے بال نوچے اور تم اب بھی مجھے ہی جابر خاں قرار دے رہے ہو۔ ٹھیک ہی کہا تھا فلسطینی رہنما بروس لی نے، بے وقوف دوست سے عقل مند دشمن اچھا ہوتا ہے۔“

”بروسی لی، فلسطینی رہنما نہیں تھا اور نہ ہی اس نے کوئی ایسی بات کہی تھی“ عاطف مسکرایا۔

”اوئے چھہر! اگر تم حسرت موہانی کے شعر پر نہیں بولے تو بروسلی کے مقولے پر تمہیں کیوں تکلیف ہوئی ہے۔ یہ تو سراسر نسلی تعصب ہے بلکہ ہرول بھر شاٹ ہے۔“

”ہرول بھر شاٹ؟ یہ کیا ہوتا ہے عمران بھائی؟“ عاطف نے پوچھا۔

میں نے عمران کا گریبان پکڑ لیا۔ ”اب ایک لفظ بھی منہ سے نکالا..... تو میں گھونسا جڑ دوں گا۔“

اس سے پہلے کہ باقاعدہ ہماری دھینگا مشتی شروع ہو جاتی، کچن کے دروازے پر شاہین

صرف پانچ سو روپے شوکے تھے۔



ہم ہوٹل لالہ زار پہنچے۔ یہاں راجا..... بالکل راجا اندر بنا بیٹھا تھا۔ اس نے اپنی ٹانگیں اٹھا کر میز پر رکھی ہوئی تھیں، وہ کسی سے شغل کر رہا تھا اور کوئی چار درجن پری پیکر لڑکیاں اس کے سامنے رقص کر رہی تھیں۔ یہ لڑکیاں دراصل فی وی اسکرین پر تھیں۔ راجا نے کوئی گرامر اٹرن فلم لگا رکھی تھی۔ وہ سب ناچتی تھیں۔ کئی سیناؤں کو ایک ہی نظر اور ایک ہی آنکھ سے دیکھ رہا تھا۔ نیچے ٹرپل پرندیم اسی طرح بندھا پڑا تھا۔ ہاں، یہ تبدیلی ضرور آئی تھی کہ اس کی ٹانگ پر باقاعدہ پلاسٹر چڑھا ہوا تھا اور سر ہانے دو انیوں کی کئی بوتلیں اور سرخیں وغیرہ نظر آ رہی تھیں۔ یقیناً راجا..... اور اشفاق نے مل کر اس کے لئے کسی ڈاکٹر کا انتظام کیا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، یہ اشفاق رانا کا ایک پڑوسی اور ہم راز ڈاکٹر تھا۔

ایک لحاظ سے اچھا ہی ہوا تھا ورنہ ندیم کی زندگی کو خطرہ لاحق ہو سکتا تھا۔

”اب اس کا کیا کرنا ہے؟“ میں نے عمران سے پوچھا۔ میرا اشارہ نیم بے ہوش پڑے ندیم کی طرف تھا۔

وہ بولا۔ ”بہتر تو یہی تھا کہ حضرت جلالی صاحب یہاں ہوتے۔ وہ اپنے طریقے کے مطابق اس نمک حرام کو کوئی یادگار سبق سکھاتے۔ لیکن وہ تو خود اس وقت زندگی موت کے درمیان جھول رہے ہیں۔ اس غیبت سے حساب ہمیں ہی برابر کرنا ہوگا۔“

”اب کیا کرو گے؟“

”کچھ نہیں، ابھی تو اسے کسی محفوظ ٹھکانے پر پہنچاتے ہیں جہاں یہ اطمینان سے ہماری مہمان نوازی کا لطف اٹھا سکے۔“ اس کے ساتھ ہی عمران نے اقبال کو فون کیا اور اس سے کہا کہ ندیم کے قیام طعام اور دشنام وغیرہ کا مناسب انتظام کیا جائے اور اسے لالہ زار ہوٹل سے بحفاظت اٹھا بھی لیا جائے۔

مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران کے پاس شہر میں کوئی ایسی خاص جگہ موجود ہے جہاں کی کی دخل اندازی کا ڈر نہیں اور وہ دو چار بندوں کو وہاں مستقل مہمان بنا کر رکھ سکتا ہے اور ان سے پوچھ گچھ بھی کر سکتا ہے۔

میرے فون پر میسج پر میسج آ رہے تھے۔ یہ نصرت کے میسج تھے۔ وہ مجھ سے جاننا چاہتی تھی کہ یہاں لاہور میں اصل صورت حال کیا ہے۔ کیوں باجی ثروت کے ساتھ یوسف بھائی کے روپیے میں نمایاں تبدیلیاں آئی ہیں؟ کیا وہاں اندرون خانہ کوئی اتھل پھل ہوئی ہے؟ یہ

جنگ شاید نصرت کو بھی پڑ چکی تھی کہ یوسف کی جرمن بیوی اسے چھوڑ کر جا چکی ہے۔

اب میرے پاس اس حوالے سے مکمل معلومات موجود تھیں لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل چاہتا تھا کہ یہ معلومات میرے ذریعے نصرت اور ثروت تک نہ پہنچیں۔ میرے دل میں یہ بات گھر کر چکی تھی کہ یوسف کے بارے میں، میں جو بھی منفی بات کروں گا، ثروت اس کا الٹا اثر لے گی۔ وہ بھی سمجھے گی کہ میں اس کی طرف اپنا راستہ ہموار کرنے کے لئے یوسف کے معاملات کو اچھا ل رہا ہوں۔

میں نے اس سلسلے میں عمران سے مشورہ کیا۔ اس کی رائے مجھ سے کچھ مختلف تھی۔ وہ بولا۔ ”دیکھو جگر! ہمیں اس بندے کی کیمیکری کا پتا چل چکا ہے۔ یہ کافی حد تک موقع پرست اور شاید نفس پرست بھی ہے۔ اپنی جرمن محبوبہ کے عشق میں ڈوب کر اس نے جن لڑکی کو برسوں تک قابل اعتبار نہ سمجھا، اب اس کی طرف رجوع کر رہا ہے۔ اب اسے یہ احساس ہو رہا ہے کہ وہ ”بتیل“ کے عشق میں سونے کو نمٹی میں رول رہا تھا۔ شاید ایسے ہی موقع کے لئے کہا جاتا ہے کہ ایک ٹکٹ میں دو مخرے۔ محبوبہ بیوی کا نشہ ہرن ہوا ہے تو اب اسے ثروت نظر آ رہی ہے۔ وہ اسے اپنی قرینیت منایت کرنا چاہ رہا ہے۔ دوسری طرف اس کے والد فاروقی صاحب بھی اس تبدیلی سے خوش ہوں گے۔ یعنی ایک تیرے دو دھکار۔ یہ محبت نہیں سراسر مطلب پرستی ہے اور ثروت کو اس مطلب پرستی سے آگاہ ہونا چاہئے۔“

”وہ آگاہ ہو جائے گی یا! کچھ بھٹک تو دونوں بہنوں کو پڑی چکی ہے، ہاتی سب کچھ یہاں پاکستان آ کر معلوم ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے جو ہمارے خیال ہیں، وہ نصرت کے بھی ہوں گے۔ وہ ثروت کو ہراؤ بیچ سے آگاہ کرے گی۔“

”پھر بھی تاہی! تمہیں خاموش نہیں رہنا چاہئے۔ چلو ثروت سے نہیں تو نصرت سے ایک بار تفصیل سے بات کر لو۔ اسے سمجھا دو کہ جو شخص پچھلے دو ڈھائی سال ثروت کو ہٹک آمیز طریقے سے نظر انداز کرتا رہا ہے، اب اس کا شوہر بننے پر کیوں تلا ہوا ہے۔“

میں نے عمران سے وعدہ کیا کہ میں نصرت کو فون کروں گا لیکن میں نے کیا نہیں۔ ہاں میں نے ایک عام سامیج ضرور کر دیا۔ اس میں، میں نے نصرت کے اس شبے کی تصدیق کی کہ یوسف اور گرلس میں بگاڑ پیدا ہو گیا ہے اور گرلس اسے چھوڑ کر واپس جرمن جا چکی ہے۔

فائنل بیکنی لاجہ ہے کہ اب یوسف، ثروت کو اہمیت دینے پر مجبور ہو رہا ہے۔

مجھے یقین تھا کہ ہاتی کا کام نصرت خود کرے گی۔ لیکن یہاں مسئلہ یہ تھا کہ ثروت اپنے مشرقی مزاج کے مطابق یوسف کو مجازی خدا کا درجہ دے بیٹھی تھی۔ اس کی ساری ستم ظریفیوں

بجاتے رہے۔ زندگی میں تنگینی اور رنگینی ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اس بات کا علم صرف مجھے اور عمران کو تھا کہ جہاں یہ محفل برپا ہے، وہیں زمین میں سراج کے خطرناک غنڈے کی لاش بھی دبی ہوئی ہے۔

اس تقریب کے دوران میں ہی میرے سیل فون پر کال آئی۔ یہ یوسف کی طرف سے تھی۔ یوسف نے مجھے بتایا کہ..... پرسوں ثروت آسٹریا سے واپس آ رہی ہے۔ اس خوشی میں ایک گیٹ ٹو گیدر ہے۔ مجھے اور عمران کو ہر صورت آنا ہے۔ وقت رات نو بجے کا تھا۔ میری دھڑکنیں تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ میری اور ثروت کی کہانی ایک نئے موڑ پر آ رہی تھی۔

اگلے دو روز میں کوئی خاص واقعہ رونما نہیں ہوا، سوائے اس کے کہ ایک بار آنٹی جیلہ کے فون پر ایک گمنام نمبر سے کال آئی۔ آنٹی نے ریسو کی تو دوسری طرف مہنا تھی۔ اس نے بس اتنا ہی کہا۔ ”ہیلو امی! میں مہنا بول رہی ہوں۔“ اس کے بعد کسی وجہ سے لائن کٹ گئی۔ آنٹی جیلہ دیوانہ وار ہیلو ہیلو کہتی رہیں۔ ہم نے اس موبائل نمبر کا پتا کروایا جس سے کال آئی تھی۔ حسب اندیشہ وہ نمبر گمنام ہی نکلا۔ ایمن آباد کے ایک مزدور شرافت علی کا ایڈریس تھا۔ اس بے چارے کا بس شناختی کارڈ ہی استعمال ہوا تھا۔ اس کال سے کم از کم اتنا تو ثابت ہوا کہ مہنا جہاں کہیں بھی ہے، زندہ سلامت ہے۔

جلالی صاحب بدستور کوڑے کی حالت میں تھے۔ ان کے بارے میں ڈاکٹر یقین سے کچھ نہیں کہہ پا رہے تھے۔ ان کی عمر تو مزاحمت کرنے والی نہیں تھی لیکن ان کی سخت جانی دیکھتے ہوئے امید کی جاسکتی تھی کہ شاید وہ موت کے فرشتے پر بھی گریں اور اسے اس کے کام سے باز رکھنے کی کوشش کریں۔ ایس پی حمزہ صاحب دیگر پولیس افسران کے ساتھ مل کر خاصی تکد و دو کر رہے تھے لیکن ابھی تک مہنا ز اور رسام کا کوئی کھون ملا تھا اور نہ ہی آرا کوڑے کا کوئی سراغ ہاتھ آیا تھا۔

ہسپتال سے آنٹی جیلہ کے اغوا کی کچی رپورٹ بھی درج ہوئی تھی۔ تاہم ہم نے ایس پی حمزہ صاحب کو آگاہ کر دیا تھا کہ آنٹی ہمارے پاس حفاظت سے ہیں۔ حمزہ صاحب نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی تھی کہ ہم انہیں اپنے پاس رکھیں۔

ہسپتال کے سامنے اندھا دھند فارنگ میں زخمی ہونے والے اے ایس آئی گل احمد کی حالت اب ہسپتال میں خطرے سے باہر تھی۔ میں نے فون پر اس کی مزاج پرسی کی تھی۔ جاوہر گروپ کی ہنگامہ خیزی بھی کچھ ماند پڑ گئی تھی اور یقیناً اس کی وجہ یہی تھی کہ جاوا کو

کواب تک خندہ پیشانی سے جھیلتی رہی تھی اور اب بھی جھیلنے کا ارادہ رکھتی تھی۔ کئی مواقع ایسے آئے تھے جب وہ یوسف کے خلاف خلع بہ آسانی حاصل کر سکتی تھی..... لیکن بقول نصرت اسے خلع یا طلاق جیسے لفظ سے ہی نفرت تھی۔ اس کے ذہن میں کچھ واہے بری طرح بیٹھ چکے تھے اور ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ اس نے یوسف سے طلاق لینے کا سوچا اور اس کا جوان بھائی ناگہانی موت کا شکار ہو گیا۔ اب وہ نصرت کی تنگین بیماری کو بھی اپنے ازدواجی حالات اور سوچوں سے تنہی کر چکی تھی۔ یہ خیال کسی عقیدے کی طرح اس کے ذہن میں راسخ تھا کہ وہ طلاق لینے والا گناہ کرے گی تو نصرت کی موت پر مہر تصدیق لگائے گی۔ میں نے اور عمران نے اس موضوع پر کئی بار بحث و تبصرہ کیا تھا۔ آخر کیوں ایسے واہے..... ایسے بے بنیاد عقیدے انسان کے ذہن میں پلتے ہیں اور پروان چڑھتے ہیں؟ کیا یہ انسان کے اندر کی کمزوریاں ہوتی ہیں جو وہ ان واہوں میں جکڑا جاتا ہے؟ میں فلاں کام کروں گا تو اس کی سزا مجھے فلاں طریقے سے بھگتنا پڑے گی۔ میں اس طرح سے خوشی حاصل کروں گا تو اس کا خمیازہ مجھے اس ایسے کی صورت میں بھیلنا پڑگا۔ اب بظاہر ”ایک گمراہ اور قدر ناشناس شوہر سے رخ پھیرنے میں“ اور چھوٹی بہن کے بیمار ہونے میں کوئی تعلق نہیں تھا مگر ثروت نے اپنے ذہن میں یہ تعلق بنایا ہوا تھا۔ اس تعلق پر ایک زوردار ضرب لگائے جانے کی ضرورت تھی۔ بے بنیاد واہے کے اس بت کو یقین کے کلبھائے سے چکنا چور کیا جانا ضروری تھا۔ ہم واہوں کے خلاف لڑ رہے تھے اور اب واہے کا ایک اور سومات ہمارے سامنے تھا۔ لیکن پتا نہیں کہ اس سومات پر میں خود کوئی کلبھاڑا چلانا نہیں چاہتا تھا۔ میں چاہتا تھا کہ اس سومات کو توڑنے والی خود ثروت ہو۔



اگلے روز میں اور عمران ڈیفنس والی کوشی میں واپس آ گئے۔ خوب رونق رہی..... باربی کیو کا جو پروگرام کافی عرصے سے ملتوی ہو رہا تھا، پایہ تکمیل کو پہنچا۔ میڈم صفورا بھی اس خوشگوار تقریب میں شریک ہوئی۔ وہ ہلکا پھلکا رقص بھی کر لیتی تھی۔ اس کے رقص نے محفل کو دو بالا کیا۔ اس نے کھینچ کر عمران کو بھی اپنے ساتھ شریک کر لیا۔ عمران بھی ہرفن مولا شخص تھا۔ اس سے پہلے میں نے اسے پرانے محلے میں چاچے نذیر کی شادی پر رقص کرتے دیکھا تھا۔ بڑی خوبصورتی اور لے تھی اس کی حرکات و سکنات میں۔ کون کہہ سکتا تھا کہ ریشم کی طرح نرم یہ شخص وقت آنے پر فولاد بلکہ دبا ہوا فولاد بن جاتا ہے۔ شاہین اور زری نے بھی اس ہلکے پھلکے رقص میں شرکت کی۔ فرح اور عاطف نے گٹار بجانے پر اکتفا کیا۔ میں اور اقبال تالیاں

مند نظر آ رہی تھی۔ خوب سچی ہوئی بھی تھی۔ اسے دیکھ کر کون کہہ سکتا تھا کہ وہ ایک سنگین بیماری سے فائدہ کر رہی ہے۔

یہ ایک اچھی تقریب ثابت ہوئی۔ میوزک..... تہقہ کھانا..... ڈرنک، سب کچھ موجود تھا۔ بس اس تقریب میں دو باتیں کچھ علیحدہ سی تھیں۔ ایک تو یوسف کی تیز نظریں جو گاہے بگاہے میرے اندر کچھ ٹٹولنے لگتی تھیں اور دوسرے ثروت کے بظاہر مسکراتے چہرے کے پیچھے چھپی ہوئی بیزاری آمیز اداسی۔ ایک دو بار اس سے نظریں ملیں لیکن یہ نظریں کسی بھی طرح کا ابلاغ نہیں کر سکتیں۔ عمران اپنے مخصوص انداز میں بولا۔ ”اس موقع پر ایک پیاؤ ضرور ہوتا ہے اور ہیرا اس پر گانا گاتا ہے۔ ایک چہرے پر کئی چہرے سجا لیتے ہیں لوگ..... یا پھر، جھوم جھوم کے ناچو آج، گاؤ آج.....“

”میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اگر تم گانا چاہو تو گا سکتے ہو۔“ میں نے بیزاری سے کہا۔

اسی دوران میں تین چار مہمان عمران کے پاس آن کھڑے ہوئے۔ ان میں دولڑکیاں اور ایک جوان سال شخص تھا۔ ”ہیلو جی!“ جوان سال شخص نے بڑی گرجبوشی کے ساتھ عمران سے مصافحہ کیا۔ ”ہم نے آپ کو پہچان لیا ہے جی۔ بڑی خوشی ہوئی ہے آپ جیسے انٹرنیشنل فنکار کو یہاں دیکھ کر۔“ اس نے کہا۔

”انٹرنیشنل فنکار؟“ عمران نے حیرت سے کہا۔ ”میں نے تو کسی فلم میں کام نہیں کیا۔“ ایک لڑکی ہنسی۔ ”فلموں میں کام کرنے والے تو مصنوعی ہیرو ہوتے ہیں جی۔ اصل امت و جرات تو آپ لوگ دکھاتے ہیں۔ ہم نے اسٹار سرکس میں دو تین بار آپ کا شوق دیکھا ہے۔“

دیکھتے ہی دیکھتے عمران کے گرد بھیڑ لگ گئی۔ دو چار دیگر معزز مہمانوں نے بھی اسے Acrobat کی حیثیت سے پہچان لیا۔

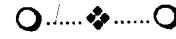
نصرت نے عمران کا بازو تھام لیا۔ ”عمران بھائی! دیکھیں لوگ آپ سے کتنی محبت کرتے ہیں۔ اس وقت تفریح کا ماحول بنا ہوا ہے..... آپ کچھ تھوڑا بہت دکھائیں نا۔“

”تمہارا مطلب ہے میں یہاں قلابازیاں لگانا شروع کر دوں؟“

”نہیں، لیکن کوئی چھوٹا موٹا ٹرک۔ کوئی ہاتھ صافائی۔“

عمران نے اپنی خوب صورت ٹائی پر ہاتھ چلاتے ہوئے کہا۔ ”میرا تو ایک ہی ٹرک“ لوگوں کو زیادہ پسند ہے۔ ریوالور میرا گولی رکھ کر اور چرخہ گھما کر اپنے آپ پر

اپنے ایک دوسرے پھڑے کے سلسلے میں فوراً بٹئی جانا پڑ گیا تھا۔ جاوا کے کئی قریبی اور سرگرم ساتھی بھی جاوا کے ساتھ ہی گئے تھے۔ عمران نے ریان ولیم سے جو رقم نصرت کے ”اسپتال کے بل“ کے لئے لی تھی، اس کی ضرورت نہیں پڑی تھی۔ یوسف آج کل حاتم طائی کی قبر پر لات مار رہا تھا اور خاص طور سے ثروت پر مہربانوں کی بارش کر رہا تھا۔ نصرت نے ہمیں بتایا تھا کہ اسپتال کا بل یوسف بھائی کی طرف سے ادا کیا جا چکا ہے۔



اور یہ ایک رنگین شام تھی۔ گارڈن ٹاؤن میں یوسف فاروقی کی رہائش گاہ جھلگا رہی تھی۔ کونجی کے اندر باہر کئی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ وسیع لان میں خوب صورت شامیانہ لگا کر کیئرنگ کا اہتمام کیا گیا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ یوسف اپنی شادی کو ”ریٹو“ کر رہا ہے۔ آج کئی ماہ بعد میں نے ثروت کو دیکھا۔ جھللاتے ستاروں والی نیلگوں ساڑھی میں وہ دلکش نظر آتی تھی۔ ساڑھی کے ستاروں کی جھللاہٹ میں اس کا چہرہ چاند کی طرح تھا مگر یہ چاند روشن ہونے کے باوجود اُداس تھا۔ اس کی تہ میں کہیں اداسی اور پڑمردگی ایک سرد اندھیرے کی طرح بیٹھی ہوئی تھی۔

یوسف لی موجودگی میں ہمارے درمیان بس یہ گفتگو ہوئی۔

”ہیلو تابش!“

”ہیلو ثروت! کیسی ہوتی؟ بہت کم تبدیلی آئی ہے تم میں۔“

”لیکن آپ میں تبدیلی آئی ہے اور اتنا عرصہ کہاں غائب رہے ہیں آپ؟ نصرت بتا رہی تھی کہ آپ کہیں انڈیا وغیرہ چلے گئے تھے۔“

”ہاں، کچھ عرصہ رہا ہوں انڈیا میں بھی۔ امی کے جانے کے بعد دل ایک دم اچاٹ سا ہو گیا تھا۔ کہیں نکل جانے کو جی کرتا تھا۔ تمہیں پتا ہی ہوگا، ان کی موت جن حالات میں ہوئی۔“

ثروت نے اثبات میں سر ہلایا اور دکھ بھری سانس لی اور موضوع بدلتے ہوئے بولی۔ ”فرح اور عاطف کیسے ہیں؟ سنا ہے کہ وہ بھی لاہور میں ہیں۔ ان کو بھی لے آئے آپ۔ مدت ہوگئی انہیں دیکھے ہوئے۔“

”چلیں، اب کسی دن ان سے بھی ملاقات ہو جائے گی۔“

بس اسی طرح کی چند رسمی باتیں ہوئیں۔ قریب کھڑی نصرت نے جب دیکھا کہ باتیں چل رہی ہیں اور بے محل ہوگئی ہیں تو اس نے مداخلت کی اور چپکے لگی۔ وہ اس وقت صحت

کیجئے۔ سب لائیے۔ آپ کے لئے اچھا موقع پیدا ہو رہا ہے۔“
محفل کشت زعفران بن گئی۔ میری نظر ایک بار پھر ثروت کی طرف اٹھی۔ وہ اس شور شرابے میں بھی بالکل تنہا تھی۔ اکیلی..... اداس..... اس کی اداسی جیسے اڑاڑ کر میرے سینے تک بھی پہنچ رہی تھیں اور میرے اندر ایک صحرا سا آباد کر رہی تھی۔ ہم دونوں کے درمیان چند میٹر کا فاصلہ تھا لیکن یہ صدیوں پر محیط تھا۔ وہ یوسف فاروقی کی بیوی بن کر بھی اس کی بیوی نہیں تھی۔ اس کے ہونٹوں پر میرے ہونٹوں کی مہر کے سوا ابھی کوئی مہر نہیں تھی۔ لیکن اب صورت حال بدل رہی تھی۔ کیا واقعی صورت حال بدل رہی تھی؟

ہم دونوں رات دو بجے کے لگ بھگ یوسف، ثروت اور نصرت سے رخصت ہو کر واپس لوٹے۔ رات اوس میں بھیگی ہوئی تھی۔ نہر کنارے چاندنی کا پڑاؤ تھا۔ وہ ریوالور جس سے عمران نے محفل میں تماشا دکھایا تھا، سیٹ کے نیچے پڑا تھا۔ اسپید بریکر پر جھکا لگنے سے وہ میرے پاؤں کی طرف کھسک آیا۔ میں نے اسے اٹھایا اور اچھی طرح الٹ پلٹ کر دیکھا پھر ایک جھانپڑ عمران کی گردن پر مارا۔ ریوالور نفی نہیں تھا۔



وہ بڑی جان لیوا شب تھی۔ میں کمرے میں بے چین ٹہل رہا تھا۔ میرے اندر وہی کیفیت پیدا ہو رہی تھی، جب میرا دل چاہتا تھا کہ میں اپنے جسم کو بڑی بے رحمی سے اذیت کی بھٹی میں جھونک دوں۔ کچھ ایسا کروں کہ میرے مساموں سے پسینے کے بجائے لہو رسنے لگے۔ میری ہڈیاں جھج جائیں اور سینہ پھٹ جائے۔

اگلی صبح نو بجے کے لگ بھگ نصرت کا فون آ گیا۔ ”کیسے ہیں تابش بھائی؟“ اس نے نارل آواز میں پوچھا۔
”ٹھیک۔“

”اتنا مختصر جواب..... کیا یہ اور مختصر نہیں ہو سکتا تھا؟“

میں خاموش رہا۔ وہ گہری سانس لے کر بولی۔ ”بھائی جان! میں آپ کی دلی کیفیت سمجھ رہی ہوں۔ یوں لگتا ہے کہ جو کچھ آپ جھیل رہے ہیں، میں بھی آپ کے ساتھ جھیل رہی ہوں۔ لیکن ہمارے پوائنٹ آف ویو سے ایک اچھی اطلاع بھی ہے جو میں آپ کو پہنچانا چاہتی ہوں۔“

”کیسی اطلاع؟“ میں نے پشمرہ آواز میں پوچھا۔

”باجی ثروت میں کچھ تبدیلیاں آئی ہیں۔ یوسف بھائی کے لئے ان کی بے دام کی

فائر کرنا۔“

”نہیں، نہیں۔ ایسا خطرناک کام نہیں۔“ کچھ اور۔“ نصرت نے ٹھنک کر کہا۔
”تو اپنے تابش بھائی سے کہو نا۔ اب یہ بھی کچھ کم فکا نہیں ہے۔ برف کے بلاک کو دو کٹڑے کر سکتا ہے۔ مگر مار کر درخت کو اکھاڑ سکتا ہے۔ ڈبل اینٹیں چبا سکتا ہے۔“
”آپ مذاق نہ کریں۔“ نصرت نے اس کا کندھا جھنجھوڑا۔
”اچھا کچھ دیکھتا ہوں۔ شاید گاڑی میں کوئی چیز مل جائے۔“

وہ گاڑی میں گیا اور کچھ دیر بعد ایک ریوالور لے آیا۔ سب اس کے گرد اکٹھے ہو گئے۔ نصرت نے احتجاج کیا۔ ”یہ کیا عمران بھائی! آپ پھر یہ ہتھیار لے آئے۔“
”اور کچھ تھا ہی نہیں۔ تابش کے پتوں وغیرہ کے کھیل تو آپ لوگوں کو پسند نہیں آئیں گے نا۔“

عمران نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”مجھے بھی پتا ہے۔ اسی لئے نفلی ریوالور لایا ہوں۔ صرف پٹا خا چلے گا لیکن آپ اس کو اصلی گولی سمجھئے اور دیکھئے میری ”لک“ کام کرتی ہے یا نہیں۔ میں تین مرتبہ ٹریگر دباؤں گا اور مجھے یقین ہے، تینوں بار گولی نہیں چلے گی۔“

یوسف نے ریوالور الٹ پلٹ کر دیکھا۔ یہ واقعی ”ڈی“ نظر آ رہا تھا۔ لوہے پر برش سے رنگ کیا گیا تھا۔ عمران نے ریوالور تھیلی پر رکھا اور ٹریگر دبایا۔ ”ٹریج“ کی آواز نکل کر رہ گئی۔ دوسری بار پھر چرخی گھمائی گئی۔ اس مرتبہ بھی گولی نہیں چلی..... تیسری مرتبہ بھی گولی اور ”بیم“ آسنے سامنے نہیں آئے۔ عمران نے کہا۔ ”بات صرف اعتماد اور یقین کی ہوتی ہے۔ جب آپ یقین کے ایک خاص لیول کو چھو لیتے ہیں تو پھر غیر مرئی طاقتیں آپ کا ساتھ دینے لگتی ہیں۔ آپ کے پانے سیدھے پڑنے لگتے ہیں۔“ عمران نے دونوں فائر ہوا میں کئے۔ دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔

ایک فیشن ایبل لڑکی نے انگریزی میں پوچھا۔ ”مسٹر عمران! آپ اصلی گولیوں سے بھی کھیلتے ہیں..... اس وقت آپ کے احساسات کیا ہوتے ہیں؟“
”ویسے ہی جیسے اب ہیں۔“ عمران نے سیدھا جواب دیا۔
”ایک خاتون نے کہا۔“ سنا ہے آپ کا نشانہ بھی بہت اچھا ہے۔“

عمران نے کہا۔ ”غالباً آپ نے ٹھیک ہی سنا ہے۔ آپ اپنے سر پر سب رکھیں، میں ابھی اڑانے کو تیار ہوں۔“

ایک شخص نے خاتون کے شوہر کو مخاطب کر کے ہانک لگائی۔ ”شاہ صاحب! جلدی

نے حیرت ناک لہجے میں کہا۔ ”ادہ تابش بھائی! آپ یہاں؟“
میں اٹھ کھڑا ہوا اور ان دونوں سے ملا۔ میں سمجھ گیا کہ نصرت نے ڈراما کیا ہے اور اب مجھے بھی یہ ظاہر کرنا ہے کہ یہ ملاقات اتفاقیہ ہوئی ہے۔

میں نے دونوں کو بیٹھنے کی دعوت دی۔ چند لمحوں کے لئے تو یوں لگا جیسے ثروت پلٹ جائے گی یا پھر کسی اور میز پر بیٹھے گی۔ لیکن جب نصرت بیٹھ گئی اور شو لڈر بیک میز پر نکا دیا تو مجبوراً ثروت کو بھی بیٹھنا پڑا۔ وہ پریشان نظر آ رہی تھی اور بے چین نظروں سے دائیں بائیں دیکھ رہی تھی۔ اتفاقاً میں ایک نیم تاریک گوشے میں بیٹھا ہوا تھا۔ یہ جگہ باقی ہال سے کچھ کٹی ہوئی تھی۔ ثروت کے جسم سے اٹھنے والی ”پروٹسی“ کی خوشبو یادوں کے تار چھیر رہی تھی۔

”آپ کیا لیں گی؟“ میں نے نصرت اور ثروت کو مشترکہ طور پر مخاطب کیا۔ ثروت سے پہلے ہی نصرت بول اٹھی۔ ”کھانے کا وقت ہے پیزا منگوا لیجئے۔ میرا خیال ہے کہ تم تینوں شوق سے کھالیں گے۔“

”نہیں نصرت! میں کچھ نہیں کھاؤں گی۔ اور مجھے جلدی واپس بھی جانا ہے۔ تم صرف کوئی کولڈ ڈرنک منگوا لو۔“

”خدا کا خوف کریں باجی۔ اگر اتفاقاً تابش بھائی ہاتھ آ ہی گئے ہیں تو ان کی جیب کچھ ہلکی کرنی چاہئے۔“

”پلیز نصرت! مسخری مت کرو۔ میں یہاں زیادہ دیر نہیں ٹھہر سکتیں“ ثروت نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ اس کے بالوں کی لٹ اس کے سرخ ہوتے چہرے پر چھوٹنے لگی تھی۔

”اچھا بابا! کولڈ ڈرنک ہی منگوا لیتے ہیں۔“

میں نے کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا۔

ثروت بدستور لال بھبھو کے چہرے کے ساتھ بیٹھی تھی نصرت نے لجاجت سے کہا۔
”پلیز باجی! اگر اتفاق سے تابش بھائی مل ہی گئے ہیں تو آپ اس طرح آگ بگولا تو نظر نہ آئیں۔“

”میں اتنی بے وقوف نہیں ہوں۔“ وہ تپے ہوئے لہجے میں بولی۔

”کیا مطلب؟“

”تم جان بوجھ کر مجھے یہاں لائی ہو۔ تم نے پلان کیا ہے۔ یہ کوئی ٹی وی ڈراما نہیں ہے، زندگی ہے..... اس میں اس طرح کے ناکہ نہیں چلتے.....“ اس کے خوب صورت منہ سے بلبل رہے تھے جیسے وہ بھی طیش میں لرز رہے ہوں۔

غلامی میں کچھ فرق پڑا ہے۔ وہ یوسف بھائی سے کچھ کچی ہوئی ہیں۔ رات کو بھی وہ ماسٹر بنڈ روم میں سونے کے بجائے اس کمرے میں سوئی ہیں جہاں گریس کی موجودگی میں سویا کرتی تھیں..... اور پر والی منزل میں۔“

”اس سے کیا ہوگا نصرت؟“

”مجھے نہیں پتا لیکن انہوں نے یوسف بھائی کو کم از کم یہ تو بتا دیا ہے کہ وہ چابی والا کھلونا نہیں جسے جب چاہا الماری میں پھینک دیا، جب چاہا نکالا اور چابی گھا کر چلا لیا۔“

نصرت کی باتیں میرے دل میں عجیب سی امید جگا دیتی تھیں۔ اس وقت بھی اس کی باتوں نے امید جگائی۔ یوں لگا جیسے میں ابھی مکمل طور پر ڈوبا نہیں ہوں۔ ہاتھ پاؤں چلانے کی گنجائش باقی ہے اور شاید سہارے کے لئے دو چار تنکے بھی میرے ہاتھ آ گئے ہیں۔

نصرت کہہ رہی تھی۔ ”..... تابش بھائی، پلیز! آپ نے ہمت نہیں ہارنی۔ اگر آپ نے ہمت ہار دی تو قسم سے میں بھی ہار دوں گی۔ میں وقت سے پہلے ہی مرجاؤں گی۔ میں اگر اب تک زندہ ہوں تو صرف اس لئے کہ میں آپ کے چہرے پر امید دیکھ رہی ہوں۔ وہ امید جو آپ کو اور باجی کو ایک کر سکتی ہے۔“

میں خاموش رہا۔ وہ بولی۔ ”مجھے آپ سے ایک بہت ضروری بات کرنی ہے۔ آپ مجھے بتائیں، میں آپ سے ملنے کہاں آؤں؟“

”کیا بات ہے نصرت؟“

”وہ ایسے نہیں، مل کر ہی ہو سکے گی۔ آپ بتائیں بھی آپ کہاں مل سکتے ہیں اور کب؟“

میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔ ”اگر ضروری ہے تو پھر جس طرح تم چاہو۔ تم مجھے اپنی سہولت کے مطابق بتا دو۔ میں پہنچ جاؤں گا۔“

”ٹھیک ہے تابش بھائی! کل دوپہر گلبرگ کے ”فوڈ پوائنٹ“ پر۔ آپ ایک بجے تک پہنچ جائیں۔“

اگلے روز میں مقررہ وقت پر ریٹورنٹ پہنچ گیا اور نصرت کا انتظار کرنے لگا۔ میں جانتا تھا کہ ہماری گفتگو ثروت اور یوسف کے حوالے سے ہی ہوگی لیکن مجھے ہرگز معلوم نہیں تھا کہ اس گفتگو میں ثروت خود بھی موجود ہوگی۔ مجھے تب پتا چلا جب نصرت اور ثروت دونوں ریٹورنٹ میں داخل ہوئیں۔ نصرت کا وزن کافی کم ہو چکا تھا مگر وہ ہشاش بشاش تھی۔ اس نے دور ہی سے مجھے دیکھ لیا لیکن ظاہر نہیں کیا۔ جب وہ دونوں بالکل قریب پہنچ گئیں تو نصرت

نصرت نے گہری سانس لے کر بڑی بہن کی طرف دیکھا پھر اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔ ”اچھا جو بھی ہے، اب اپنا موڈ ٹھیک کریں۔ ہم ڈرنک لے کر چلے جاتے ہیں یہاں سے۔“

وہ درد سے بولی۔ ”تم لوگ..... یہ کیوں نہیں سمجھتے کہ یہ آگ کا کھیل ہے۔ اس کی کوئی ایک چنگاری بھی میرے گھر کو برباد کر سکتی ہے..... اور میں..... ہرگز یہ نہیں چاہتی۔ اور نہ کسی کو ایسا کرنے کی اجازت دوں گی۔“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ثروت! یقین کرو، مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ یہاں تم دونوں سے ملاقات ہوگی۔ میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں؟“

”لیکن آپ کو یہ تو پتا ہوگا کہ نصرت آپ سے ملنے آ رہی ہے۔ وہ کیوں آ رہی تھی۔ آپ دونوں میرے بارے میں ہی ڈسکس کرنا چاہتے ہوں گے نا۔“

”نصرت نے صرف اتنا کہا تھا کہ ایک بہت اہم بات ہے اور اس کے لئے میرا آنا بہت ضروری ہے۔ یہ روہانی ہو رہی تھی۔“

نصرت نے کہا۔ ”اچھا باجی! ان باتوں کو چھوڑیں..... پلیز چھوڑیں۔ میں آپ سے..... بلکہ آپ دونوں سے بس..... اور بس اتنا کہنا چاہتی ہوں کہ خدا کے لئے ان حالات کے بارے میں ٹھنڈے دل دماغ سے سوچیں..... آپ دونوں سمجھ دار ہیں، پڑھے لکھے ہیں، جھوٹ اور جھج میں فرق کر سکتے ہیں۔ خود کو رسوں، رواجوں کی جھینٹ نہ چڑھنے دینا۔ اگر کوئی راستہ نکل سکتا ہے تو نکال لیتا۔ میں نے دیکھا ہے باجی کہ.....“

ثروت کا چہرہ سرخ تر ہو گیا۔ وہ ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔ ”میں جا رہی ہوں۔“

نصرت نے بیٹھے بیٹھے اس کا بازو تھام لیا۔ ”پلیز باجی..... ایسا نہ کریں۔ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ اگر آپ جانا چاہتی ہیں تو ہم دونوں چلتے ہیں۔ آپ دومنٹ بیٹھ جائیں۔“

”نصرت! چھوڑو مجھے۔“ ثروت نے تلخ لہجے میں کہا اور ہاتھ پیچھے کھینچا۔ اس کی کہنی لگنے سے کھٹکے کا گلاس گر کر ٹوٹ گیا۔

”پلیز باجی۔“ نصرت نے التجا کی۔ اس کی آواز جیسے کسی گہرے کنوئیں سے آئی تھی۔

یہ جیسے اس کی آواز ہی نہیں لگ رہی تھی۔ میں نے بھی ثروت کی طرح چونک کر نصرت کو دیکھا۔ اس کا چہرہ ہلدی ہو رہا تھا۔ ہونٹ ایک دم ہی نیلے سے پڑ گئے تھے۔ پھر اس نے ثروت کا ہاتھ بھی چھوڑ دیا اور دونوں بازو میز پر رکھ کر ان پر اپنا سر جھکا دیا۔ اس کے جسم میں لرزش تھی۔

”کیا ہوا نصرت؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔

ثروت بھی ایک دم ٹھنک گئی..... اس نے شولڈر بیک پھر سے میز پر رکھا اور کرسی پر بیٹھ گئی۔ ”نصرت..... نصرت!“ اس نے اس کا شانہ ہلایا۔

نصرت اسی طرح بیٹھی رہی۔ لمبی سانسیں لیتی رہی۔

”ویٹر! پانی لاؤ۔“ میں نے پکار کر کہا۔

ارد گرد کے لوگ چونک کر ہماری طرف دیکھنے لگے تھے۔ ایک کونے میں پیانو بجاتے فنکار ملازم نے بھی اپنے ہاتھ روک لئے۔

”یا اللہ خیر۔“ ثروت بولی۔

ویٹر پانی لایا۔ ہم نے نصرت کو پلانے کی کوشش کی۔ وہ صرف ایک گھونٹ ہی بھر سکی۔ اس کے ہونٹ خشک تر اور نیلگوں ہوتے جا رہے تھے۔

”تابش! اس کو اسپتال لے جانا ہوگا۔“ ثروت نے کپکپاتی آواز میں کہا۔

میں نے ریسٹورنٹ کے ایک سینئر ملازم کو ثروت کی گاڑی کی چابی دی کہ وہ اسے ڈرائیو کر کے دروازے کے عین سامنے لے آئے۔ میں اور ثروت، ڈگمگانی نصرت کو سہارا دے کر دروازے پر لے آئے۔ اسے گاڑی میں سوار کر کے ہم تیزی سے قریبی کلینک کی طرف روانہ ہوئے۔ میں ڈرائیونگ سیٹ پر تھا، نصرت پچھلی سیٹ پر نیم دراز تھی اور اس کا سر ثروت کی گود میں تھا۔ ثروت مسلسل اسے دلاسا دے رہی تھی۔ میں نے تیز ڈرائیونگ کی اور چار پارچ منٹ میں کلینک پہنچ گئے۔ نصرت کو فوراً ایمرجنسی میں پہنچایا گیا۔ اس کی گردن پسینے سے تر تھی اور وہ تیز سانس لے رہی تھی۔ اتفاقاً نصرت کی ایک میڈیکل فائل گاڑی میں ہی تھی۔ اس میں اس کی بیماری سے متعلق کئی اہم کاغذات موجود تھے۔

ثروت نے ایک سینئر ڈاکٹر کو یہ فائل دکھائی۔ فوری طور پر نصرت کے واسٹل سائنز چیک کئے گئے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”گھبرانے کی بات نہیں، وقتی اثرات ہیں۔ ان شاء اللہ یہ ابھی ٹھیک ہو جائیں گی۔“

نصرت کو ایمرجنسی میں ہی گلوکوز ڈرپ لگا دی گئی۔ ایک دو انجکشن بھی اس میں لگائے گئے۔ ہم دونوں نصرت کے ارد گرد بیٹھے تھے۔ ثروت کا چہرہ اس کی شدید اندرونی پریشانی کا غماز تھا۔ دس پندرہ منٹ بعد نصرت کی حالت بہتر ہونا شروع ہو گئی۔ اس کی سانس ہموار ہونے لگی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ میں نے دیکھا، اس کی آنکھوں کے باہری گوشے نم ہوئے پھر ان میں سے دو موٹے آنسو نکل کر اس کے کانوں کی طرف ریگ گئے۔

ثروت نے اس کی پیشانی چومتے ہوئے اسے پکپکارا۔ ”نہیں میری گڑیا! نہیں، ایسا نہیں کرتے۔“

وہ خاموش رہی۔ اس نے اپنے ہونٹوں کو مضبوطی سے ایک دوسرے پر جمایا ہوا تھا۔ شاید ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس نے اپنے ایک ہاتھ میں میرا اور دوسرے میں ثروت کا ہاتھ تھام لیا اور عجیب آواز میں بولی۔ ”میں آپ دونوں کے لئے جی رہی ہوں۔ آپ دونوں کو خوش دیکھنا چاہتی ہوں۔ میں آپ سے..... اور کچھ نہیں کہتی، صرف اتنا کہتی ہوں..... آپ اپنے حالات کو سمجھیں۔ اپنے بارے میں جو فیصلہ کریں، پوری سچائی کے ساتھ کریں۔ زمانے پر نہ جائیں۔ یہ زمانہ تو کسی حال میں خوش نہیں ہوتا۔“

ثروت نے نرمی سے کہا۔ ”اچھا..... ابھی تم چپ رہو۔ خود کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرو۔“

”آپ خوش ہوں گے، تو میں خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔ سچ کہتی ہوں باجی! خود ہی ٹھیک ہو جاؤں گی۔“ وہ رونے لگی۔

ثروت جھکی اور بے چین ہو کر اس کا سر اپنے سینے سے لگا لیا..... اسے پکپکارنے لگی۔ ہم دونوں کے ہاتھ ابھی تک نصرت کے ہاتھ میں تھے۔ ہتا نہیں کس جذبے کے تحت اس نے یہ دونوں ہاتھ باہم ملا دیئے اور انہیں اپنی گردن کے نیچے سینے پر رکھ لیے۔ ثروت کی نگاہیں ایک لمحے کے لئے میری نگاہوں سے ٹکرائیں..... اور پھر جھک گئیں۔

ڈرپ ختم ہونے تک ہم دونوں نصرت کے دائیں بائیں موجود رہے اور اس سے دل بہلاوے کی باتیں کرتے رہے۔ پرانے دنوں کی چھوٹی چھوٹی باتیں جن کے پیچھے یادوں کے تانے بانے پھیلے ہوئے تھے۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے میں ڈرپ ختم ہو گئی۔ نصرت کی طبیعت اب کافی سنبھل چکی تھی۔ ڈاکٹر نے جانے کی اجازت دے دی۔ ثروت جلد از جلد گھر واپس لوٹنا چاہتی تھی..... میری گاڑی ابھی تک شاپنگ پلازا میں ہی کھڑی تھی۔ نصرت اور ثروت اپنی گاڑی پر گھر روانہ ہو گئیں تو میں رکشا پکڑ کر شاپنگ پلازا کی طرف چل دیا۔ میرے ہاتھ پر ابھی تک ثروت کے ہاتھ کا لمس موجود تھا اور کسی سنہری روشنی کی طرح چمک رہا تھا۔ لاہور میرے ارد گرد تھا۔ اس کے گلی کوچوں میں زندگی اپنی بھرپور روانی کے ساتھ بہہ رہی تھی۔ وہی جانا پہچانا شور، وہی دیکھے بھالے مناظر اور مناظر سے بہت اوپر نیلا آسمان، جس نے لاہور کے گنبدوں، میناروں اور شاہراہوں پر سایہ کر رکھا تھا۔ اس آسمان پر سفید کبوتر اٹھیلیاں کرتے تھے اور رنگ برنگی چنگلیں فراٹے بھرتی تھیں۔ یہ ایک خوشگوار شام تھی۔ میں اس شام کے اثر

میں ڈوب گیا۔ مجھے لگا رکشا ڈرائیور عقب نما آئینے میں میرے ”ہاتھ“ کو دیکھ رہا ہے..... اور اس ”ہاتھ“ پر چمکتا ہوا سنہری لمس اسے نظر آ رہا ہے۔ میں نے بے ساختہ اس ہاتھ کو دوسرے ہاتھ سے ڈھانپ دیا۔

اسی دوران میں عمران کی فون کال آ گئی۔ اس نے پوچھا۔ ”کہاں ہو؟“

میں نے کہا۔ ”ڈیفنس کی طرف ہی آ رہا ہوں۔“

وہ بولا۔ ”اب ڈیفنس کی طرف نہ آؤ۔ سیدھے تھانہ گلبرگ آ جاؤ۔ میں یہیں پر ہوں۔“

”کیا ہوا؟ لاہور کالج کی کسی لڑکی سے جوتے تو نہیں کھائے تم نے؟“

”لگتا ہے کہ تمہیں کوئی تلخ تجربہ ہو چکا ہے۔ لیکن ایسی کوئی بات نہیں۔ میں پکڑا نہیں گیا ہوں بلکہ کسی کو پکڑنے کے لئے یہاں آیا ہوں۔ ایک اہم کھوج ملا ہے ڈاکٹر مہناز کا۔ اس کے ساتھی ڈاکٹر رسام کی مہران کار ٹریس ہو گئی ہے۔“

”اوہ، یہ تو واقعی خاص خبر ہے..... میں آ رہا ہوں۔“ میں نے کہا اور رکشا والے کو رکشا موڑنے کی ہدایت کی۔

پندرہ بیس منٹ بعد میں مطلوبہ پولیس اسٹیشن میں موجود تھا۔ عمران یہاں پہلے سے موجود تھا اور فون پر جلالی صاحب کے دوست ایس پی حمزہ سے بات کر رہا تھا..... بیس ایکس سال کا ایک لڑکا انسپکٹر کے سامنے خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے گندی گال پر ایک دو طمانچوں کے نشان تھے۔ تھانے کے احاطے میں سفید رنگ کی مہران کار میں پہلے ہی دیکھ چکا تھا۔ کار کی ونڈ اسکرین پر ”ڈاکٹر“ کا سٹیکر بھی لگا ہوا تھا۔

حمزہ صاحب سے بات ختم کر کے عمران نے میری طرف دیکھا اور میلے کچیلے لڑکے کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ”ان سے ملو، یہ ہیں ڈاکٹر مہناز کے چھوٹے بھائی گلو صاحب۔ پورا نام غلام علی ہے۔ لاہور کی سڑکوں پر تین ٹانگوں والے ایک جانور کے ساتھ کرتب دکھاتے ہیں، میرا مطلب ہے کہ رکشا چلاتے ہیں۔“

ڈاکٹر مہناز کا بھائی اور رکشا چلاتا ہے؟ اور اس کی تو صورت بھی بالکل نہیں ملتی؟“

”گیا بھائی نہیں ہے یار، بس اسے باجی کہتا ہے۔ اس نے علاج دلاج کیا تھا اس کا دو تین سال پہلے۔“ عمران نے دبلے پتلے لڑکے کی چٹلون کا پانچواں اوپر کر کے اس کی ٹانگ دکھائی۔ ٹانگ کی شکل بگڑی ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ کچھ عرصہ پہلے وہ چمٹا پور ہو گئی تھی اور گوشت کے ٹکڑے جوڑ جوڑ کر اسے پھر سے ”تغیر“ کیا گیا ہے۔ ٹانگ بہت دہلی بھی تھی۔

اندھیرے مہناز اور رسام کہیں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ گلو کے بار بار پوچھنے پر مہناز نے صرف اتنا ہی بتایا کہ کچھ غنڈے ان کے پیچھے ہیں اور وہ ان سے بچنے کے لئے پشاور کی طرف جارہے ہیں۔ بہر حال گلو کو اس بات کا یقین نہیں تھا کہ وہ پشاور کی طرف ہی گئے تھے۔ جاتے ہوئے مہناز نے گلو کو مہراں کار کی چابی دی اور اس سے کہا کہ وہ سورج نکلنے سے پہلے ہی گاڑی کو یہاں سے لے جائے۔ اس نے کہا کہ وہ اسے مین سڑک کے پاس کسی گلی میں چھوڑ آئے گا اور دوبارہ وہاں نہ جائے۔ گلو سمجھ گیا کہ یہ گاڑی ان ”غنڈوں“ کی نظر میں آچکی ہے جو مہناز اور رسام کا پیچھا کر رہے ہیں۔ گلو سے یہ غلطی ہوئی کہ اس نے گاڑی کے حوالے سے مہناز کی تاکید کو نظر انداز کیا۔ بجائے اس کے کہ وہ اس کی ہدایت کے عین مطابق عمل کرتا اور اسے کہیں چھوڑ آتا، اس نے تھوڑی سی تفریح کرنا چاہی۔ محلے کی ایک لڑکی فوزیہ سے اس کی دوستی چل رہی تھی۔ اس نے سوچا فوزیہ کے ساتھ ایک چکر ریس کورس پارک کا لگایا جائے۔ اس غلطی کی پاداش میں اب گلو تھانے میں تھا اور گاڑی باہر احاطے میں کھڑی تھی۔ فوزیہ کی منت سماجت کی وجہ سے ایس ایچ او نے اسے جانے کی اجازت دے دی تھی۔

قریباً ایک گھنٹے بعد ہم گلو کے ساتھ اس کے گھر میں موجود تھے۔ گلو زیر حراست تھا اور دو پولیس اہلکار سادہ لباس میں اس کے ساتھ موجود تھے۔ گلو نے ہمیں وہ کمراد دکھایا جہاں ڈاکٹر مہناز نے رات گزاری تھی۔ ایک بوسیدہ سا پلنگ تھا۔ ایک خستہ حال جستی الماری بھی یہاں موجود تھی۔ عمران نے گلو سے پوچھا۔ ”ڈاکٹر رسام کہاں رہا تھا؟“

گلو نے کہا۔ ”وہ باجی مہناز کے ساتھ ہی رہا تھا جی۔ پرسوتے وقت باہر برآمدے میں آ گیا تھا۔“

”جس تھیلے کی تم بات کر رہے ہو، وہ کہاں تھا؟“

”وہ باجی مہناز نے اپنے پلنگ کے نیچے رکھا ہوا تھا، پر بعد میں انہوں نے تھیلا الماری میں رکھ دیا تھا اور تالا لگا کر چابی اپنے پرس میں ڈال لی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”تم نے مہناز سے پوچھا نہیں کہ تھیلے میں کیا ہے؟“

”جب انہوں نے خود نہیں بتایا تو پھر مجھے پوچھنا چکا نہیں لگا تھا۔“

”تمہارا اپنا کیا خیال ہے کہ اس میں کیا تھا؟“

”کوئی وزنی سی شے تھی۔ باجی مہناز اسے بڑے آرام سے اٹھاتی اور رکھتی تھی۔ شاید وہ شمشے کی بنی ہوئی کوئی تھی۔“ پھر وہ ذرا توقف کر کے گلو گیر لہجے میں بولا۔ ”پڑمجھ کو مانف کڑ دیں جی۔ مجھ سے بڑی غلطی ہوئی ہے۔ میں باجی کو کیا منہ دکھاؤں گا۔“ وہ مجھے اور عمران کو بھی

عمران نے کہا۔ ”دو تین سال پہلے یہ سروسز اسپتال میں داخل تھا۔ وہیں پر ڈاکٹر مہناز سے اس کی دوستی ہوئی۔ یہ اسے باجی کہتا ہے۔ ایکسیڈنٹ میں ٹانگ کے ساتھ ساتھ اس کا رکشا بھی چمکانچوڑ ہو گیا تھا۔ یہ جب ٹھیک ہوا تو مہناز نے اسے پھر سے پاؤں پر کھڑے ہونے میں مدد دی۔ اس کا آگے پیچھے کوئی نہیں تھا۔ مہناز نے ایک این جی او کے تعاون سے اسے رکشالے کر دیا اور کرائے کا مکان بھی دلویا۔“

”لیکن آج ڈاکٹر مہناز اور رسام والی گاڑی اس کے پاس کیسے آگئی؟“ میں نے پوچھا۔

جلالی فارم ہاؤس سے نکلنے کے بعد ڈاکٹر مہناز اور رسام پناہ کے لئے گلو کے مکان پر ہی آئے تھے۔ وہ ایک دن اور ایک رات گلو کے مکان پر رہے۔ اس دوران میں یہ مہراں گاڑی باہر گلی میں کھڑی رہی۔ اس کے اوپر غلاف چڑھا دیا گیا تھا تاکہ یہ شناخت نہ وہ سکے۔

گلو مسلسل سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس کے چہرے سے شرمساری فیک رہی تھی۔ میں نے عمران سے پوچھا۔ ”لیکن اس گاڑی کا پتا کیسے چلا؟“

عمران نے کہا۔ ”یہ لاٹ صاحب، گاڑی پر اپنی گرل فرینڈ کو سیر کرانے نکلے تھے، پکڑے گئے۔“ پھر عمران نے گلو کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”گلو صاحب! کچھ اپنی زبان سے بھی بیان فرمائیے۔“

وہ چپ رہا تو ایس ایچ او نے اس کے کندھے پر ضرب لگائی اور دہاڑ کر کہا۔ ”اوئے بولتا ہے یا کسی اور طریقے سے تیری زبان کھولوں؟“

اگلے چار پانچ منٹ میں گلو نے خالص لاہوری لہجے میں انک انک کر جو کچھ بتایا، اس سے پتا چلا کہ وہ کنال پارک کی گنجان آبادی میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہتا ہے۔ باجی مہناز منگل کی رات اس کے گھر آئی۔ اس کے ساتھ ایک اور ڈاکٹر بھی تھا۔ دونوں اسی مہراں گاڑی پر تھے۔ ان کے پاس کیونز کا ایک بیگ تھا جس میں کوئی قیمتی چیز تھی..... لیکن اس قیمتی چیز کے بارے میں باجی نے اسے کچھ نہیں بتایا۔ گلو کو صاف اندازہ ہو رہا تھا کہ باجی مہناز اور اس کے ساتھی ڈاکٹر کو کچھ لوگوں کی طرف سے خطرہ ہے اور وہ اپنی جان کے ڈر سے یہاں چھپے ہوئے ہیں۔ گلو نے ان دونوں کو ہر طرح سہولت پہنچانے کی کوشش کی۔ اگلے روز گلو کے دو تین دوست اس سے ملنے آئے مگر اس نے انہیں دروازے سے ہی ٹر خادیا۔ اگلی رات بھی مہناز اور رسام نے گلو کے گھر میں ہی گزاری۔ مہناز کے کہنے پر گلو نے ایک برقع کا انتظام بھی کر دیا تھا۔ یہ برقع وہ باغبانپورہ سے اپنی ایک خالہ کے گھر سے لے کر آیا تھا۔ صبح منہ

”یہ بھی پتا نہیں چلا کہ وہ مرد تھا یا عورت؟“
 ”میرا خیال ہے کہ عورت تھی۔“
 ”اچھا، اس کے بعد کیا ہوا؟“ مہناز اور رسام کا سارا دن کیسے گزرا؟“ عمران نے پوچھا۔

”باجی مہناز تو بہت پریشان رہیں۔ انہوں نے ساڑا دن کچھ کھایا پیا بھی نہیں۔ ڈاکٹر رسام ان سے تسلی کی باتیں کرنا رہا۔ پتا نہیں انہیں کیا سمجھا تا بچھا تاڑھا.....“
 باتیں کرتے کرتے اچانک عمران کی نظر کسی چیز پر گئی اور وہ چونک گیا۔ کمرے کی دہلیز سے باہر چار پائی کے نیچے اسے کچھ دکھائی دیا تھا۔ وہ چار پائی کی طرف گیا اور جھک کر کسی شے کو غور سے دیکھنے لگا۔ اس نے وہاں سے کچھ اٹھایا۔ یہ کالج کی سبز چوڑیوں کے دو تین ٹکڑے تھے۔ میں نے پہچان لیا۔ ایسی سبز چوڑیاں میں نے ڈاکٹر مہناز کی خوبصورت کلائی میں دیکھی تھیں۔

عمران نے ٹکڑے گلو کو دکھاتے ہوئے کہا۔ ”یہ یہاں کیسے آئے؟“
 وہ فوراً بولا۔ ”میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ فون پر بڑی خبر سننے کے بعد باجی نے فوراً اسپتال جانا چاہا تھا۔ ڈاکٹر رسام نے انہیں پکر کر مشکل سے روکا تھا۔ اسی کھینچا تانی میں یہ چوڑیاں ٹوٹی تھیں۔ باجی کی کلائی سے خون بھی نکلا تھا۔“
 ”لیکن یہ چوڑیاں تو یہاں کمرے کے سامنے پڑی ہیں۔ تم بتا رہے ہو کہ ڈاکٹر رسام نے تنہا ہی باجی کو صحن میں روکا تھا۔“

”ہاں رڈ کا تو صحن میں ہی تھا۔ شاید ایک دو ٹوٹے یہاں بھی گر پڑے ہوں۔“ گلو نے کہا۔

میں اور عمران دھیان سے گلو کو دیکھنے لگے۔ کیا گلو کے پیچھے بھی کوئی کہانی تو نہیں تھی؟
 بظاہر تو گلو بہت زیادہ ہوشیار چالاک نظر نہیں آتا تھا۔ مہناز کا نام بھی وہ بڑی عزت سے لے رہا تھا۔ بہر حال اس موقع پر کچھ بھی یقین سے کہنا مشکل تھا۔

”اچھا اس کے بعد کیا ہوا؟ مہناز اور رسام کب روانہ ہوئے یہاں سے؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ رات کو بس تھوڑی دیر کے لئے ہی سوئے ہوں گے۔ باہی مہناز تو آدھی رات کو ہی اٹھ گئی تھیں۔ وہ باڑاڑ کسی کو فون بھی کڑ رہی تھیں۔ پھر وہ دونوں جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ ڈاکٹر رسام نے باجی کو زبردستی بس تھوڑا سا دودھ پلایا تھا۔ جاتے وقت باجی نے ایک

پولیس والے ہی سمجھ رہا تھا، اس لئے مجھ سے معافی کا طلبگار تھا۔
 عمران نے کہا۔ ”معافی تمہیں ایک ہی صورت میں مل سکتی ہے۔ جو کچھ تمہیں معلوم ہے صاف صاف اور کھل کر بتاؤ۔ یہاں جو جو کچھ ہوا، اس کا پورا نقشہ بیان کر دو۔“
 ”مم..... میں کیا بتاؤں گی؟“
 ”شروع سے بتاؤ۔“

”وہ دونوں رات ڈھائی تین بجے کے قریب یہاں پہنچے تھے۔ دونوں کافی پریشان تھے۔ باجی نے بتایا کہ کچھ لوگ ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میں فوراً باہر گلی میں جا کر گاڑی پر کپڑا ڈال آؤں۔ اس کے بعد وہ دونوں کمرے میں چلے گئے اور کھسرو پھسر کرتے رہے۔ جلد ہی صبح ہو گئی۔ باجی باڑاڑ کہیں فون کر رہی تھی، پڑوہ مل نہیں رہا تھا۔ میرا خیال ہے کہ کوئی بندہ بیٹاڑ تھا اور باجی اس کی طبیعت کے باڑے میں پوچھنا چاہ رہی تھیں۔ وہ باڑاڑ ڈاکٹر رسام سے کہہ رہی تھیں کہ پتا نہیں انہوں نے فلاں دوا کھائی ہے کہ نہیں۔ فلاں ٹیکا لگوا یا ہے کہ نہیں۔ وہ شاید کوئی بڑی عزم کا بندہ تھا۔ باجی اس کا عجیب سا نام لے رہی تھیں..... مجھے اب..... یاد نہیں آ رہا.....“

”جلائی تو نہیں کہہ رہی تھیں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”ہاں..... شاید یہی کہہ رہی تھیں۔ انہوں نے کوئی پند ڈاٹیس دفعہ فون کیا پڑ نہیں ملا۔ پھر انہوں نے کسی اوڑ کو فون کیا۔ اس بندے نے کوئی اچھی خبر نہیں سنا۔ اس نے بتایا کہ وہ جس بندے کا پوچھ رہی ہیں، وہ شاید بے ہوش ہو گیا ہے اور اسے لاہوڑ کے اسپتال میں لایا گیا ہے۔ اس کے بعد باجی کی پڑیشانی اوڑ بھی بڑھ گئی۔ وہ رونے لگ پڑیں۔ انہوں نے ڈاکٹر رسام سے کہا کہ وہ ابھی اسپتال جانا چاہتی ہیں۔ انہوں نے اپنا چھوٹا بیگ اٹھایا اور جانے کے لئے تیار ہو گئیں۔ ڈاکٹر رسام غصے سے بولا کہ وہ ایسا کیوں کر رہی ہیں۔ وہ پکڑے جائیں گے۔ اس موقع پر ڈاکٹر رسام نے پولیس کی بات بھی کی۔ جس سے مجھے اندازہ ہوا کہ ان دونوں کو غنڈوں کے علاوہ پولیس سے بھی خطرہ ہے۔ بعد میں ڈاکٹر رسام باجی مہناز کو کھینچ کر کمرے میں لے گیا۔ اس کے بعد دونوں میں جو باتیں ہوئیں، اس کا مجھے کچھ پتا نہیں۔“

عمران نے کہا۔ ”مہناز نے جس دوسرے بندے کو فون کیا اور جس نے اسے جلائی کی خراب حالت کے بارے میں بتایا اس کا نام تم نے سنا؟“
 ”نہیں جی۔“

”وہ اس لئے خوش نہیں ہیں کہ باجی ان سے خوش نہیں ہیں۔ باجی مسلسل میرے ساتھ اوپر والی منزل پر سو رہی ہیں۔ وہ کھانا بھی زیادہ تر اپنے کمرے میں ہی کھاتی ہیں۔ اس رویے کی وجہ سے یوسف بھائی بہت بیچ و تاب کھا رہے ہیں۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اس بات کا اندازہ مجھے فنکشن والے روز ہی ہو گیا تھا کہ یوسف کو ثروت کی طرف سے وہ پذیرائی نہیں ملے گی جس کی وہ توقع کر رہا ہے۔“

نصرت بولی۔ ”باجی ثروت بالکل ٹھیک کر رہی ہیں..... بلکہ ابھی ”ٹھیک“ سے کچھ کم ہی کر رہی ہیں۔ عورت کو اپنی تفریح کا ذریعہ سمجھنے والوں کے ساتھ یہی رویہ ہونا چاہئے۔ کل بڑا مزہ آیا۔ حمیدن کی بڑی بیٹی شانو کی مہمانی ہو گئی۔ جناب یوسف بھائی باجی کے لئے جو کپڑے لائے تھے، ان میں سے دو جوڑے باجی نے شانو کو عنایت کر دیئے اور کئے بھی یوسف بھائی کے سامنے ہی۔“

”کیا مطلب؟“

”یہ بڑے مہنگے جوڑے تھے۔ پندرہ پندرہ ہزار سے کم کیا ہوں گے لیکن باجی کو کچھ چست تھے۔ باجی نے شانو کو دے دیئے۔ جناب یوسف تلملے تو بہت ہوں گے لیکن موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے چپ رہے۔ آج بھی وہ مجھے اور باجی کو باہر بونے ڈنر پر لے جانا چاہ رہے تھے لیکن باجی نے طبیعت کی خرابی کا کہہ کر ٹال دیا ہے۔ اب وہ منہ بنا کر اکیلے ہی چلے گئے ہیں۔ کسی دوست کو ساتھ لے گئے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”نصرت! لیکن ایسا کب تک چلے گا؟ ظاہر ہے کہ ثروت اس کی قانونی بیوی ہے۔ وہ بھی اسے اپنا قانونی شوہر سمجھتی ہے۔ تم خود یہ کہتی ہو، وہ معافی تلافی کرنا بھی خوب جانتا ہے۔ جلد یا بدیر وہ ثروت کو منانے میں کامیاب ہو جائے گا۔ پھر وہی ہوگا جو وہ چاہتا ہے۔“

”آپ ہمیشہ مایوسی کی باتیں ہی کیوں کرتے ہیں؟ ایک طرف آپ مجھے ہمت دلاتے ہیں کہ میں مایوسی کو اپنے قریب بھی نہ پھٹکنے دوں، دلیری سے اپنی بیماری کا مقابلہ کروں۔ دوسری طرف خود ہمت ہارے ہوئے نظر آتے ہیں۔ خدا کے لئے تابش بھائی! یہ آگے بڑھنے کا وقت ہے۔ اپنے آپ کو اور اپنی محبت کو منوانے کا وقت ہے۔ آپ بڑے اچھے وقت میں..... ہاں، بڑے ہی اچھے وقت میں..... اس کہانی میں انٹر ہوئے ہیں۔ یہ بہت سنہری وقت ہے تابش بھائی! آپ کو شش کریں تو بہت کچھ بدل سکتا ہے۔ جو کچھ ناممکن نظر آ رہا ہے، وہ بالکل ممکن ہو سکتا ہے۔“

بار پھر مجھے تاکید سے کہا کہ میں گاڑی کو فوڑا کہیں چھوڑ آؤں۔ بس جی میٹری بھیڑی قسمت کہ میں نے ان کی بات نہ مانی۔“

ہم نے غلام علی عرف گلو سے قریباً ایک گھنٹے تک سوال جواب کئے۔ ڈاکٹر رسام کی مہران کار کی تلاشی ہم تھانے میں ہی اچھی طرح لے چکے تھے۔ اس میں سے کوئی خاص چیز برآمد نہیں ہوئی تھی۔ گلو سے پوچھ گچھ کے نتیجے میں دو باتیں وضاحت سے سامنے آئیں۔ پہلی تو یہ کہ عمران کا اندازہ شاید درست تھا۔ ڈاکٹر مہناز نے کوئی چکر نہیں چلایا تھا بلکہ جلالی صاحب کی ہدایت کے مطابق آرا کوئے کو لے کر فارم ہاؤس سے بھاگی تھی۔ فارم ہاؤس سے نکلنے کے بعد اسے جلالی صاحب کی از حد فکر رہی تھی اور ان کی بے ہوشی کا سننے کے بعد وہ بے حد غمزدہ ہو گئی تھی۔

دوسری بات یہ سامنے آئی تھی کہ جلالی صاحب کو فون کرنے میں ناکام ہونے کے بعد مہناز نے کسی اور کو فون کیا تھا اور اس نے مہناز کو جلالی صاحب کی خراب حالت کے بارے میں بتایا تھا۔ یہ اطلاع دینے والی غالباً کوئی عورت تھی۔ یہ کون عورت تھی؟ یقیناً وہ فارم ہاؤس میں ہی تھی۔ لیکن اس نے پولیس تفتیش کے دوران میں یہ بات چھپائی تھی کہ اسے، جلالی صاحب کی بے ہوشی کے بعد ڈاکٹر مہناز کا فون آیا ہے۔ کیا یہ عورت ڈاکٹر مہناز کی ہم راز تھی؟ اگر وہ ہم راز تھی تو پھر یقیناً وہ مہناز کے موجودہ پتے ٹھکانے سے بھی واقف ہو سکتی تھی۔

میں اور عمران ایک بار پھر جلالی فارم ہاؤس پہنچے۔ اگلے دو تین روز ہم نے اسی کھونج میں گزارے کہ یہاں سے جانے کے بعد ڈاکٹر مہناز نے فون پر کس سے رابطہ کیا تھا۔ گینگ ریپ کا شکار ہونے والی زرینہ اور رخشی کے علاوہ مزید دس پندرہ عورتیں بھی جلالی کی رہائش گاہ میں موجود تھیں۔ ان میں سے کوئی بھی ہو سکتی تھی۔ یہ تیسرے روز کی بات ہے، میرے فون پر نصرت کی کال آئی۔ میں اس وقت فارم ہاؤس کی چھت پر تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ نصرت کی آواز میں ہلکی سی شوخی تھی۔ رسمی کلمات کی ادائیگی کے بعد وہ بولی۔ ”تابش بھائی! میں خوش ہوں۔“

”کیوں؟“

”اس لئے کہ یوسف بھائی خوش نہیں ہیں۔“ یوسف بھائی کہتے ہوئے اس کے لہجے میں عجیب سی تلخی سراپت کر جاتی تھی۔

”یہ کیا بات ہوئی؟ وہ خوش نہیں ہے تو تم خوش ہو۔ وہ کیوں خوش نہیں ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

پیچھے تھا۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر فرسٹ فلور پر پہنچے۔ یہاں کوٹھے والوں نے راجا کو ایک کمرے میں بند کیا ہوا تھا اور پولیس کی آمد کا انتظار کر رہے تھے۔ راجا سخت نشے میں لگتا تھا، وہ اندر سے گالیاں بک رہا تھا۔ باہر سے نایکا اور دیگر عورتیں اس کے لتے لے رہی تھیں۔

پتا چلا کہ راجا یہاں گانا سننے آیا تھا۔ اس نے زیادہ مقدار میں پی لی اور پھر وہی ہوا جو اکثر ایسی جگہوں پر ہوتا ہے۔ اس نے ایک لڑکی کو گھسیٹ کر کمرے میں لے جانا چاہا۔ نایکا نے راجا سے کہا۔ ”یہ تمہاری بہن صرف گانا گاتی ہے، پیشہ نہیں کرتی۔ بھاگو یہاں سے۔“ راجا نے کہا۔ ”تم سب بکاؤ مال ہو۔ صرف قیمت بڑھانے کے لئے خنجر کرتی ہو۔“ اور یہ بات راجا ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔

تکرار بڑھ گئی تو راجا نے ایک دلال کے منہ پر تھپڑ جڑ دیا۔ اس کے بعد باقاعدہ ہنگامہ ہو گیا۔ چار چھ ہندوں نے مل کر راجا کو گرایا اور کمرے میں بند کر دیا۔ راجا کا دوست اشفاق جو اس کے ساتھ ہی یہاں آیا تھا، موقع کی نزاکت دیکھ کر کھسک گیا اور ہمیں فون کیا۔

اسی دوران میں نیچے سڑک سے پولیس کار کا سائرن سنائی دینے لگا۔ سیڑھیوں پر بھاری قدموں کی آواز گونجی اور تھوڑی ہی دیر بعد ایک سب انسپکٹر اپنے چار پانچ اہلکاروں کے ساتھ دندانہ ہوا اور پہنچ گیا۔ وہ بہت طیش میں دکھائی دیتا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ نایکا سے بات شروع کرتا، عمران اس کے قریب پہنچا اور اس سے مصافحہ کرنے کے بعد اس کے کان میں کچھ کہتا ہوا اسے ایک طرف لے گیا۔ دو منٹ بعد میں نے دیکھا کہ وہ اپنے سیل فون کے ذریعے سب انسپکٹر کی بات کسی سے کر دار ہا تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، یہ ایسی پی حزمہ صاحب تھے۔ سب انسپکٹر ایک دم مودب نظر آنے لگا تھا۔ اس کے فوراً بعد میں اور عمران کوٹھے سے نیچے اتر آئے۔ اور کچھ آگے جا کر اپنی گاڑی میں آ بیٹھے۔

”اب کیا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ نایکا کو دو تین ہزار روپیہ نذرانہ دینا پڑے گا سب انسپکٹر کو اور راجا صاحب کو بھی باعزت رہا کرنا پڑے گا۔ بھی یہاں جس کی لاشی اس کی بھینس..... اور جس کی ندوق اسی کا مولیشی خانہ ہوتا ہے۔“

عمران نے درست ہی کہا تھا۔ پندرہ بیس منٹ بعد ہم نے راجا کو بڑے ٹھاٹ سے بیڑھیاں اترتے دیکھا۔ پولیس والے اس کے ساتھ تھے۔ انہوں نے اسے گاڑی میں بٹھایا اور لے گئے۔ پروگرام کے مطابق بازار سے دور جا کر انہوں نے اسے چھوڑ دینا تھا۔ میں نے عمران سے کہا۔ ”یار! اس کا کچھ کرو، نہیں تو یہ ہمیں کہیں بری طرح پھنسا دے گا۔“

”لیکن نصرت..... وہ تو میری ہر بات کو الٹ لیتی ہے۔ یہ سمجھتی ہے کہ میں بس اس کا گھر توڑنا چاہتا ہوں!“

”کون سا گھر تابی بھائی! یہاں کوئی گھر نہیں ہے۔ یہاں کچھ نہیں ہے۔ بس مطلب پرستی کی آگ ہے جس میں باجی کو بڑی ”محبت“ سے جھلسایا جا رہا ہے۔“

”لیکن وہ تو ایسا نہیں سمجھتی نا۔“

”وہ بھی سمجھنا شروع ہو گئی ہیں۔ جو کچھ میں آپ کو بتا رہی ہوں، اس سے کیا مطلب نکلتا ہے۔ کیا آپ سمجھ نہیں رہے یا پھر سمجھنا نہیں چاہ رہے؟“ وہ ایک بار پھر جذباتی ہو رہی تھی۔ مجھے ریٹورنٹ والا واقعہ یاد آ گیا جب اس کی طبیعت ایک دم خراب ہوئی تھی۔ میں نے موضوع بدل دیا اور کچھ دیر تک اس سے گفتگو کرنے کے بعد سلسلہ منقطع کر دیا۔

اس کے بعد بھی ہم تین چار گھنٹے تک فارم ہاؤس میں رہے لیکن میرا ذہن مسلسل ثروت میں اٹکارا۔ میں اپنا دھیان ہٹانے کی کوشش کرتا تھا لیکن ہر بار اس کی سوچیں کلاوا کاٹ کر حملہ آور ہو جاتی تھیں۔ رات نوبے کے لگ بھگ ہم شیخوپورہ سے لاہور واپس آ گئے۔ راستے میں عمران نے تین چار خاص جگہوں پر گاڑی روکی اور اپنی جانی پچپانی فیاضی کا مظاہرہ کیا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے بڑی خاموشی سے بہت سے ضرورت مندوں کا وظیفہ لگا رکھا تھا وہ کسی نہ کسی طرح ان لوگوں تک پیسے پہنچاتا رہتا تھا..... وہ لوگ اس پر جان چھڑکتے تھے..... ہم راوی کے پل پر سے گزر رہے تھے جب عمران کے سیل فون پر راجا کے دوست ہوٹل اوزر اشفاق رانا کی کال آئی۔ اس نے بتایا کہ راجا نے بازار حسن میں ایک پھنڈا کر دیا ہے، ہم فوراً وہاں پہنچیں ورنہ وہ حوالہ پولیس ہو جائے گا۔

عمران نے راجا کو غائبانہ چند صلواتیں سنائیں اور پھر بازار حسن کی طرف رخ کر لیا۔ ہم زیادہ دور نہیں تھے۔ قریباً دس منٹ بعد ہم اشفاق رانا کے بتائے ہوئے ایڈریس پر پہنچ گئے۔ گاڑی ہم نے کچھ فاصلے پر ہی کھڑی کر دی تھی۔ رات ساڑھے نو دس کا وقت تھا۔ بازار کی رونق عروج پر تھی۔ ایک طرف زندہ دکانیں بجی ہوئی تھیں، دوسری طرف خریداروں کے پھیرے تھے۔ پکوانوں کی خوشبو، پھولوں کے ہار اور گجرے، چھنا چھن کی آوازیں اور فحش اشارے، سب کچھ یہاں موجود تھا۔ ایک سہ منزلہ کوٹھے کے سامنے کئی افراد کھڑے نظر آئے۔ وہ بالائی کھڑکیوں کی طرف اشارے کر رہے تھے۔ ہم اندر داخل ہونے لگے تو ایک گارڈنما شخص نے ہمیں روکا۔ عمران اسے بے پروائی سے دھکیلتا ہوا اندر چلا گیا۔ میں اس کے

لیکن اندر خانے سب کچھ ہوتا ہے۔ اس کا تھوڑا بہت تعلق اسٹوڈیو والوں سے بھی ہے۔ فلموں میں ایکسٹرا لڑکیاں بھی سپلائی کرتی ہے۔“

”یوسف یہاں کیا کرنے گیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ظاہر ہے کہ ان گمراہ لوگوں کو نصیحت وغیرہ ہی کرنے گیا ہو گا۔“ عمران نے جھٹ کہا۔ ”انہیں بتانے گیا ہو گا کہ یہ اچھا دھندا نہیں ہے۔ اس سے باز آ جائیں اور اگر بہت ضروری ہے اور مجبوری ہے تو پھر اچھے لوگوں کے ساتھ کام کریں۔“

جیلانی نے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ یہ دسیم نامی لڑکا یوسف کو گھیر گھا کر یہاں لایا ہے اور اب یہ دونوں اوپر بیٹھے گانا سن رہے ہیں۔“

عمران نے کہا۔ ”یہ گھیر گھا کر لانے والی بات بھی تم نے خوب کہی ہے۔ بھئی وہ عاقل بالغ بندہ ہے۔ اس کی اپنی مرضی ہے تو اس کے قدم اس ”بیوٹی کلیٹک“ میں پڑے ہیں نا۔“

ہمارے ارد گرد لاہور کا بازار حسن اپنے پورے ہلارے میں تھا۔ کھوے سے کھواچھل رہا تھا۔ دودھیا قفصوں کی روشنی کے پس منظر میں ٹھنکروں کی جھنکار اور طبلے کی تھپا تھپ تھی۔ کھڑکیوں میں رنگین آنچل تھے اور گلی کوچوں میں بے شمار خوشبوئیں چکرا رہی تھیں۔ جیسے کسی کمرے کا تعفن دور کرنے کے لئے اگر تینوں اور گلدستوں کا سہارا لیا گیا ہو۔

”ایک بات سمجھ میں نہیں آرہی۔“ عمران نے کہا۔ ”یہ کافی امیر بندہ ہے۔ اس ”شوق“ کے لئے وہ کسی اس سے بہت اچھی جگہ پر بھی جاسکتا تھا۔ آج کل تو بہت سی فیشن ایبل آبادیوں اور اونچے ہوتلوں میں بھی یہی کاروبار ہو رہا ہے۔“

جیلانی نے کہا۔ ”آپ کا مطلب ہے کہ یہ لوگ یہاں گانا سننے نہیں، کسی اور کام سے آئے ہیں؟“

”یہ ہو بھی سکتا ہے۔“ عمران نے کہا۔

”لیکن آپ کا یہ خادم اندر تک ہو کے آیا ہے۔ وہاں پورا پورا فلمی سین ہے۔ باقاعدہ چاندنی بچھی ہے، گاؤں تکیے رکھے ہیں، سازندے براجمان ہیں۔ نائیکا پاندان، سیٹھ حضرات..... سارے لوازمات موجود ہیں۔ یہ دونوں صاحبان بھی بڑے سلیقے سے خاندانی لواہوں کی طرح بیٹھے ہیں۔“

..... ہم تینوں قریباً آدھ گھنٹا مزید وہاں موجود رہے۔ پھر ہم نے چند تماش بین ٹائپ افراد کو زینے اترتے دیکھا۔ ان میں ہمیں یوسف بھی نظر آیا۔ اس نے پینٹ شرٹ پہن رکھی تھی۔ آنکھوں پر رات کو لگائے جانے والے گلاسز تھے۔ اس نے پی کیپ بھی پہن رکھی تھی۔

عمران نے ٹھنڈی سانس لی۔ ”جس کا اب تک کچھ نہیں ہوسکا، اب کیا ہو گا۔“

”میرا خیال ہے کہ یہ یہاں وہی روپے خرچ کرنے آیا تھا جو اس نے ندیم کے بٹوے سے غائب کئے تھے۔“

عمران کے جواب دینے سے پہلے ہی میں بری طرح چونک گیا۔ میری نظر عمران کے ساتھی جیلانی پر پڑی تھی۔ وہ کچھ فاصلے پر ایک بارونق پان شاپ پر کھڑا پان لگوار ہا تھا۔ میں نے عمران کی توجہ جیلانی کی طرف دلاتے ہوئے کہا۔ ”کیا بات ہے، تمہارے سارے یار دوست اسی بازار میں گھومتے پھرتے ہیں؟“

عمران کے چہرے پر سنجیدگی طاری رہی۔ وہ بولا۔ ”اگر یہ جیلانی یہاں ہے تو پھر ضرور کوئی خاص بات ہے۔“

اچانک میری سمجھ میں عمران کی بات آ گئی۔ عمران کی ہدایت کے مطابق آج کل جیلانی، یوسف کی نقل و حرکت پر نگاہ رکھ رہا تھا۔ اسی دوران میں جیلانی نے گھوم کر دیکھا تو اس کی نگاہ بھی ہماری گاڑی پر پڑ گئی۔ اس نے دھیان سے نمبر پلیٹ دیکھی۔ یقیناً وہ اس گاڑی کو پہچانتا تھا۔ وہ چونکا ہوا نظر آیا۔ تاہم وہ تذبذب میں تھا کہ گاڑی کی طرف آئے یا نہیں۔ عمران نے اس سے موبائل پر رابطہ کیا۔ ”ہیلو جیلانی! کیا عیاشی ہو رہی ہے؟“

”گاڑی میں آپ ہی ہیں؟“ جیلانی نے پوچھا۔

”بالکل، میں ہی ہوں بقلم خود..... آ جاؤ۔“

”ٹھیک ہے۔“

چند سیکنڈ بعد جیلانی ٹھہلتا ہوا ہماری گاڑی کی طرف آیا اور دروازہ کھول کر اندر بیٹھ گیا۔ الپنچی سپاری پان کی خوشبو گاڑی میں پھیل گئی۔ جیلانی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ اس کے پاس کوئی بہت اہم خبر ہے۔ وہ حیران لہجے میں بولا۔ ”آپ دونوں یہاں کیسے پہنچ گئے؟“

عمران نے کہا۔ ”یہ بعد میں بتائیں گے۔ پہلے تم کچھ کہو۔“

وہ جذباتی لہجے میں بولا۔ ”یوسف یہاں موجود ہے۔ ساتھ میں اس کا دوست ”فلم ایڈیٹر“ دسیم ہے۔ انہوں نے اپنی گاڑی ساتھ والی سڑک پر پارک کی ہے۔“

”کہاں گئے ہیں وہ؟“ عمران نے پوچھا۔

جیلانی نے گاڑی کے اندر سے ہی ایک شاندار پلازا انما بلڈنگ کی طرف اشارہ کیا۔ یہ دراصل ایک جدید کوشیا چوہا رہ تھا۔ سامنے دو تین گاڑیاں بھی کھڑی نظر آرہی تھیں۔ جیلانی نے کہا۔ ”یہ مشہور نائیکا شاہ بابا کا ڈیرا ہے۔ کہنے کو تو بس ناچ گانے کا کام ہی کرتی ہے

وہ ایک اونچا لمبا قبول صورت شخص تھا۔ بظاہر شریف النفس بھی نظر آتا تھا مگر آج ہم اس کا ایک بالکل مختلف روپ دیکھ رہے تھے۔ ایک ایسا روپ جو شاید ثروت وغیرہ کے گمان میں بھی نہیں تھا۔ تاہم ابھی یقین سے کچھ نہیں کہا جاسکتا تھا۔ بہت کچھ سامنے آنا باقی تھا۔

یوسف اور وسیم نامی لمبے بالوں والا لڑکا ”بے فکر“ کے انداز میں سگریٹ پھونکتے اور باتیں کرتے ایک گلی میں اوجھل ہو گئے۔ جیلانی ان کے پیچھے گیا۔ پانچ منٹ بعد اس نے آکر اطلاع دی کہ دونوں قریبی سڑک سے اپنی ہنڈا اکارڈ میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے ہیں۔ مطلب یہ تھا کہ وہ دونوں بس ناچ گانا دیکھنے ہی یہاں آئے تھے۔

عمران نے کہا۔ ”مجھے کچھ شک ہو رہا ہے۔ ایک کام کرتے ہیں۔“
”کیا؟“

عمران نے کچھ کہنے کے بجائے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ اس نے جیلانی کو ہدایت کی کہ وہ محتاط طریقے سے یوسف اور لمبے بالوں والے وسیم کی نگرانی جاری رکھے۔ اس کے علاوہ رپورٹ بھی دیتا رہے۔ جیلانی ”اوکے“ کہتا ہوا اپنی موٹر سائیکل کی طرف چلا گیا۔ عمران نے تیزی سے گاڑی موڑی اور رش میں سے چابک دستی کے ساتھ راستہ بناتا ہوا ڈیفنس کی طرف روانہ ہو گیا۔

سڑکوں پر رش کم تھا۔ صرف آدھ گھنٹے میں ہم ڈیفنس والی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ عمران نے کہا۔ ”مجھے ڈرائیونگ شین ہوتا ہے، مطلب ہے کہ ذرا اچھے والے کپڑے پہنتے ہیں۔“
”تم کہیں شاربہ بائی کے کوٹھے پر جانے کا ارادہ تو نہیں کر رہے ہو؟“
”سمجھ دار ہوتے جا رہے ہو لیکن رفتار سُست ہے۔“ عمران نے کہا۔
”میں تو نہیں جا رہا۔“

”تم کیوں نہیں جا رہے؟ بھی ہر بڑے آدمی کے ساتھ ایک اسٹنٹ یا سیکرٹری ٹائپ کا بندہ تو ہوتا ہے نا۔ اور تم ماشاء اللہ صورت سے بھی اس کردار کے لئے بالکل فٹ ہو۔ لباس بھی تمہارا ٹھیک ہی ہے۔ بلکہ ٹھیک سے بھی کچھ کم ہی ہے۔“
”ضرورت سے زیادہ غلط فہمی ہے تمہیں اپنے بارے میں۔“

”غلط فہمی، ضرورت کے مطابق ہو ہی نہیں سکتی..... اچھا مجھے صرف دس منٹ دو، میں لباس تبدیل کر کے آتا ہوں۔ تم اپنے بالوں کو تھوڑا سا اور تتر بتر کر لو، ایسے لگے کہ کسی سے جھانپڑ کھائے ہیں۔“

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، وہ تیزی سے اپنے کمرے میں اوجھل ہو گیا۔

”کھیں جہاں گورنر مگر کسے سامنے جہاں کا تو اسے کیا کھانچے گا۔ اسے پتا چلے گا کہ کسی کی جگہ اور کون کتنی بھی گا۔“ میں سوچ رہی تھی۔ کسی اس کا دل کھو جانے کا اور میں کیا پتا چلتا ہو۔“

شاہین نے لبک کر کہا: ”مقررہ انداز دل بٹھا کر نے کی خواہش اور صلاحیت موجود ہے۔“
 قیصر اس کے لئے کوئی کارکنش کرنے کی ضرورت نہیں، ہم میں سے کئی ایک کے دل تیار رہی
 طرف سے کہنے اور بچے ہیں۔“
 ”ابھرا مطلب یہ ہے کہ۔“

”اگرچہ یہ ممکن ہے کہ وہ جانتی ہو کہ میں عرصوں کی بات کاٹ کر لائی۔“ تم اب ہرگز
 سے کہہ دو۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ”میرے ہی چارویں ہوں یہاں سے۔ اب مجھے ملے گی کہ کاشف
 نہ کرنا ہو۔“

[illegible]

اس کے بعد اس نے مختصر اٹھارہ مہینے چائین کو تیار کر دیا جس سے مراد ابھی ایک ہفتہ نہیں دو کام سے جا رہا تھا اس کام کا محض دواڑھا سا دستہ نہ دے گاے مٹا دے ہے۔ پہلے تو چائین نے یقین نہیں کیا مگر وہ کسی طلبہ غریب سے میری طرف کیجی گئی۔ میں نے مرغان کی بات کی تاہم ایک دو آسہ یا کچھ جی ہولی دواڑھی ملی گئی۔ ہم کبھی سے اس پر غور کر رہے تھے اور اب یہ دواڑھے بے ایک خاندان پر لپکتے کہ وہ کھڑی تھی۔ مرغان کا ساجھی ہٹھا اس میں بددی و زار تھائی کی جیت سے مراد وہ تھی۔ دواڑھی دالے ایک سب کا دالے جلدی سے اس کے لئے دواڑھ کھولا۔ میں نے غور سے اسے دیکھا اور مرغان دواڑھ اقبال قرار پہنچا۔ آج وہ ان کچھوں میں مرغان نے کوئی نہ جانکے کرنی تھی۔

لاہور کی سٹیشن پر لوگوں نے فرار ہونے لگی تھی گاڑی ڈال کر مسجد کی شب بھر ادا ہوئی تھی کی طرف دوڑا ہوا تھا جس نے عراق کو قابض کر کے کہا۔ ”مجھے میرے بچے بھی ڈال دیے اور میری

”کہہ گا میں نہیں۔ اسے شاد۔ پہلی کے کوٹھے پر جائیں گے۔ ایک بچہ کی راجہ ہے۔
 کہہ سونے کو دیکھیں گے۔ عہد پہلی روزہ راجہ عہد و طبع و دانش کے اور دیکھیں کہ وہ

Wang, J. and J. Wang, 2005, 'The Effect of the Exchange Rate on the Trade Balance in China', *Journal of International Trade and Development* 16(1): 1-14.

”مکتبہ کے کسی طرح کا فہرہ ہر دے نہیں دے گا۔“ میں نے کہا۔

میں نے اس پر نہیں سمجھا تھا۔ یہ تو وہاں جہاد کا دعویٰ ہے جو دہائی کے ہو رہا ہے۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ اپنی اپنی جہاد پر اس کے لئے شہرہ اپنی کے لئے لے رہا ہے جو جہاد ہے اس کا کیا حال اس سے کافی اچھا ہے۔ اس کے علاوہ شہر کی کسی گلی میں یہ سورج چلا دیکھنا جتنے علماء یا پھر جہاد میں حصہ لے رہے ہیں۔

[illegible]

جس نے ہمیں اپنا زمانہ اور جگہ کے سامنے بھیجے تھے یہاں پہنچا تھا۔ اپنی اپنی جگہ
 ان کے سامنے کھڑی تھی۔ جیسے اپنی کے حواسوں نے ہماری آواز کو گھسیٹ لیا۔ میری
 سمیت ہم سب کو اپنا کردار بھی طبع معلوم تھا۔ انتظار دارانہ کے طور پر گاڑی میں رہا۔
 خال خال گاڑی کے طور پر اور میں اس وقت کی حقیقت کے طور پر ساتھ ساتھ گیا۔ ہم جنگ
 عرصہ کی چیزیں، چڑھ کر اور ایک ایک کر کے سامنے پہنچے۔ یہاں وہی خوش فہم جو جوانی نے بنا
 تھا۔ اس کے جگہ کرشمہ نگاہ کی حقیقت سے کھل گیا تھا۔ غائب بھی ابھی ایک نشستہ غم جی
 تھی۔ سارا نہ جانتے ہی، ہے تھوڑا سا تھیں، یہ بھی جوانی کی سطر میں رہتے کی جادوی
 محبت۔

[illegible]

جلو ہی ہمارے لئے تھی مریض و مظلوم کرسیاں حاضر کر دی گئیں۔ عی ورا مہوہ

انداز میں عمران کی دائیں جانب بیٹھ گیا۔ اقبال گارڈ کی حیثیت سے ایک طرف کھڑا رہا۔ یہاں خوب صورت لڑکیوں کی جھلک نظر آ رہی تھی اور ان کے تھکے تھکے سے قہقہے بھی سنائی دے رہے تھے۔ وہ سکی اور روٹ گوشت کی ہلکی سی بو سارے ہال میں چکرا رہی تھی۔ نایکا شاربہ بائی اور عمران میں چند رکمی باتیں ہوئیں۔ ان باتوں میں عمران نے شاربہ بائی کو بتایا کہ وہ اس میدان کا پرانا کھلاڑی ہے مگر یہاں اس کو ٹھے پر پہلی بار آیا ہے۔ اس نے خود کو زمیندار شوکیا جس کی شیخوپورہ کے نواح میں کوئی تیس مربع نہری زمین تھی، اس کے علاوہ ”کار ڈیلنگ“ کا کاروبار بھی دو تین شہروں میں پھیلا ہوا تھا۔

شاربہ بائی بہت گھاگ تھی تاہم مرعوب نظر آنے لگی۔ کچھ دیر بعد شاربہ کے اشارے پر تین سچی سنوری لڑکیاں ہال میں داخل ہوئیں اور فرش پر پچھی چاندنی پر آ بیٹھیں۔ ان تینوں نے باقاعدہ گھنگرو باندھ رکھے تھے اور ایک دوسری سے چہلیں کر رہی تھیں۔ انداز یہی تھا کہ پسند کرو ہمیں۔ ہماری قیمت ادا کرو اور آج شب کے لئے ہماری ساری جملہ خدمات حاصل کر لو۔

اپنی ”منہ دکھائی“ کے بعد وہ چلی گئیں۔ عمران نے کوئی خاص رد عمل ظاہر نہیں کیا تو ایک اور لڑکی آ گئی۔ یہ ان تینوں سے زیادہ خوبصورت تھی۔ عمر بھی بس اکیس بائیس سال رہی ہو گی۔ اپنی پیشہ ورانہ مہارت کا استعمال کرتے ہوئے وہ اس انداز سے بیٹھی تھی کہ اس کے تراشے ہوئے جسم کی ہر خوبی نمایاں تر ہو گئی تھی۔ یوں لگ رہا تھا جیسے خریدار کا خرہ دیکھتے ہوئے دکاندار نے اپنا بہترین مال سامنے رکھ دیا ہو۔

نایکا شاربہ نے بھویں اچکا کر کہا۔ ”ابھی نئی نئی کام میں آئی ہے۔ دو ڈھائی مہینے ہوئے ہیں ”نتھ اتروائی“ کو..... ڈانس میں تو لکھنؤ والیوں کو بھی مات دیتی ہے۔“

عمران نے تعریفی انداز میں سر ہلایا لیکن کسی خاص رد عمل کا اظہار نہیں کیا۔ اس کے بعد شاربہ بائی نے یکے بعد دیگرے دو اور لڑکیاں سامنے کیں۔ ان میں سے ایک بہت گوری چنی تھی لیکن نقش عام سے تھے، ایک خوب صورت لیکن عمر میں بڑی تھی۔

عمران نے بیڑ کا گھونٹ لیتے ہوئے کہا۔ ”میں نے تو آپ کا بڑا چرچا سنا تھا..... پر..... طبیعت کچھ جم نہیں رہی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”بائی جی..... یہ کوئی عام بندہ نہیں ہے، چودھری عمران صاحب شیخوپورہ والے آپ کے پاس آئے ہیں، کوئی ایسا مال دکھائیں جو کھر ابا بندھ کر رکھا ہوا ہے۔“

”اچھا ایک بار وہ پہلے والی کا قصہ تو دیکھ لیجئے۔“ نایکا نے کاروباری لہجے میں کہا۔ اس

کا اشارہ دوسرے بھر پر آنے والی لڑکی کی طرف تھا۔

عمران نے کسی خاص دلچسپی کا اظہار نہیں کیا پھر بھی نایکا شاربہ بائی نے مسکراتے ہوئے سازندوں کو اشارہ کیا۔ انہوں نے ساز چھیڑ دیئے۔ انڈیا کا کوئی فلمی گیت تھا۔ لڑکی آئی۔ اس نے جھک کر ”مجرا“ پیش کیا اور پھر گانے کی لے پر قص کرنے لگی وہ واقعی اپنے فن میں ماہر تھی۔ جسم کی بوٹی بوٹی پھرتی محسوس ہوتی تھی۔ اس کے باوجود عمران کے چہرے پر کسی خاص پسندیدگی کے تاثرات نظر نہیں آئے۔ اس نے جیسے طے کیا ہوا تھا کہ شاربہ بائی کو مایوس ہی کرنا ہے۔ بہر حال رقاصہ کی حوصلہ افزائی کے لئے عمران نے دو تین بار جیب میں ہاتھ ڈالا اور بڑی فراخ دلی سے کرنسی نوٹ اس پر لٹائے۔ یہ ہزار ہزار کے نئے نوٹ تھے۔ عمران نے ہلک جھپکتے میں ڈیڑھ دو لاکھ روپیا لٹا ڈالا۔ شاربہ بائی کی آنکھیں کھلی گئیں۔ وہ کچھ اور بھی مرعوب دکھائی دی۔

یہ وہی رقم تھی جو عمران نے ریان ولیم سے چند دن پہلے وصول کی تھی تاکہ نصرت کو آسٹریا بھجوائی جاسکے۔ بعد ازاں اس کی ضرورت پیش نہیں آئی تھی کیونکہ اسپتال کا بل یوسف فاروقی نے پہلے ہی چکنا کر دیا تھا۔ اب یہ رقم اس بالا خانے میں کام آ رہی تھی۔

رقص کے بعد عمران اٹھنے کے لئے تیار نظر آنے لگا۔ نایکا شاربہ بائی بے قرار نظر آئی۔ وہ عمران سے کھسر پھسر کرنے لگیں چند سیکنڈ بعد اس نے سازندوں کو اشارہ کیا۔ وہ جو بڑی مستعدی سے نوٹ سمیٹ رہے تھے، اشارہ پا کر باہر نکل گئے۔ دو ملازماں بھی باہر چلی گئیں۔ عمران نے چودھریانہ انداز میں اپنے ”گارڈ“ یعنی اقبال کو بھی باہر جانے کا اشارہ کیا۔

اب ہال کمرے میں شاربہ بائی کے ساتھ بس میں اور عمران تھے۔ شاربہ بائی نے سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھا، عمران نے جلدی سے کہا۔ ”نہیں..... یہ یہیں رہے گا، اس سے کوئی پردہ نہیں۔“

شاربہ بائی نے دو چار فقروں میں تمہید باندھی۔ اس کے بعد رازداری کے لہجے میں بولی۔ ”ایک زبردست ”پیر“ ہے۔ آپ کی شان کے مطابق۔ طبیعت خوش ہو جائے گی۔ ایسا موقع قسمت ہی سے ملتا ہے۔“

”موقع؟“ عمران کے لہجے میں حیرت تھی۔

”ہاں، چودھری صاحب! موقع ہی سمجھو۔ اس بازار کی چڑیاں جب کسی اونچے مقام پر پہنچ جاتی ہیں تو پھر ان کو عقاب کے پر لگ جاتے ہیں۔ آسانی سے کسی کے ہاتھ نہیں

آئیں۔ بڑا اونچا لیول ہو جاتا ہے ان کا۔ یہ تو مجبوری ہے جس میں یہ عقاب کے پروں والی چڑیا پھنسی ہوئی ہے۔ کچھ پیسے تو خرچ ہوں گے آپ کے پرچی خوش ہو جائے گا۔“

”تم تو بھارتی بھجورہی ہو آئی۔“ عمران نے کہا۔

وہ دے دے جوش کے ساتھ مسکرائی۔ دائیں بائیں دیکھا اور پھر ایک سائیڈ بورڈ کے اندر سے ایک فلمی میگزین نکال کر ہمیں دکھایا۔ میگزین کے بیک ٹائٹل پر ایک جوان سال پاکستانی ہیروئن کی تصویر تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں اس نے کافی نام کمایا تھا۔ شروع شروع میں اردو فلموں میں آئی..... پھر پنجابی فلموں کی طرف رخ کیا اور قسمت نے ایسی یادری کی کہ دیکھتے ہی دیکھتے صف اول کی ہیروئنوں میں شامل ہو گئی۔ اپنے معصومانہ نقوش اور رقص میں مہارت کے سبب یہ بے شمار دلوں کی دھڑکن بن گئی۔ اب کچھ عرصے سے فلموں کے مجموعی حالات کے سبب اس کی مارکیٹ ویلیو میں تھوڑی سی کمی واقع ہوئی تھی۔ اس کے باوجود اسے ہر جگہ ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا۔

”اسے پہچانا آپ نے؟“ نایکا شاربہ بائی نے پوچھا۔

”اسے کون نہیں پہچانتا لیکن..... بات کیا ہے؟“ عمران نے کہا۔

”چودھری صاحب! میں اس کی مجبوری کا ذکر کر رہی تھی۔ یہ آپ کو مل سکتی ہے، اگر آپ کچھ پیسے خرچ کرنے کے لئے تیار ہو جائیں تو۔“

”تم مذاق تو نہیں کر رہی ہو؟“ عمران کے لہجے میں ہلکا سا جوش تھا۔

”نہیں، مذاق والی کوئی بات نہیں۔“

”لیکن..... لیکن تمہارے ساتھ اس کا لنک کیسے ہو گیا؟“

نایکا شاربہ بائی نے ذرا فخریہ انداز میں کہا۔ ”اپنے بازار کا ہیرا ہے۔ ہمارے سامنے پل بڑھ کر جوان ہوئی ہے۔ اب بھی ملتی ہے تو گھنٹوں کو ہاتھ لگاتی ہے۔ جن بچیوں کو اس طرح ترقی ملتی ہے، ان میں کچھ نہ کچھ گن تو ہوتا ہے نا پھر۔“

”مجھے تو اب بھی یقین نہیں آ رہا۔“

شاربہ بائی نے دائیں بائیں دیکھا پھر ایک گاؤں کے نیچے سے کچھ دن پرانا ایک اخبار نکال کر عمران کے سامنے کیا۔ اندرونی صفحے پر ایک دو کالمی اشتہار پر انگلی رکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ دیکھیں جی۔“

عمران نے پڑھنا شروع کیا۔ گردن میڑھی کر کے میں نے بھی اشتہار پر نگاہ ڈالی۔ متن کچھ اس طرح تھا۔ ”جو ہر ٹاؤن میں دو کنال کی کوٹھی۔ نئی بنی ہوئی۔ 80 فٹ سڑک.....

پارک کے سامنے۔ مالک ضرورت مند۔ فوری فروخت، نہایت مناسب قیمت۔“

نیچے فون نمبرز وغیرہ لکھے تھے۔

شاربہ بائی نے کہا۔ ”یہ چندو کی کوٹھی ہے (مشہور پاکستانی ہیروئن کا گھریلو نام)۔ ابھی دو سال پہلے بڑے چاؤ سے بنوائی تھی اس نے۔ چار کروڑ سے کم قیمت نہیں ہے اس کی۔ لیکن اب مجبوری کی وجہ سے تین بلکہ اس سے بھی کم پر دینے کو تیار تھی۔ پر اللہ کی مرضی ہے کوئی ڈھنگ کا گاہک ہی نہیں مل رہا۔ ویسے بھی علاقے میں پراپرٹی کا کام بڑا مندا جارہا ہے۔“

”پر مجبوری کیا ہے اسے؟“ عمران نے پوچھا۔

”ان کا رو باری لوگوں کو سو طرح کی مصیبتیں ہوتی ہیں۔ چندو کو بیٹھے بٹھائے اپنی فلم بنانے کا شوق چرایا تھا۔ یہ پچھلے سال کی بات ہے۔ کافی سارا روپیہ خرچ کر دیا اس نے، پر فلم بیٹھ گئی۔ کافی سارا نقصان ہوا۔ اب وہی نقصان پورا نہیں ہو رہا۔ قرض واسطے سر پر چڑھے ہوئے ہیں، کچھ قرض بینک سے بھی ہے۔ میں نے کہا ہے نا کہ مجبوری ہے ورنہ اس بازار کی چڑیاں جب اونچا اڑنے لگتی ہیں تو پھر ہاتھ نہیں آتیں۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ.....“ عمران نے جان بوجھ کر فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

”ہاں، اسے کوئی ڈیڑھ کروڑ روپے کی فوری ضرورت ہے۔ ظاہر ہے یہ کوئی اکیلا بندہ تو نہیں دے سکتا۔ اس نے خاص خاص گاہکوں کے لئے اپنا تھوڑا سا ٹائم بیچا ہے۔“

شاربہ بائی نے ٹائم کے لفظ پر ماہرانہ زور دیا۔

عمران تھوڑی دیر تک اپنی ٹھوڑی کھجائو ہا پھر ذرا رنگ بازی کے انداز میں بولا۔ ”کیا ہاؤ نکالا ہے چندو جی نے ٹائم کا؟“

شاربہ بائی نے پان کی گھوری عمران کو پیش کی اور ٹشو پیپر سے ہاتھ صاف کر کے بولی۔ ”دس لاکھ ایک رات کے لئے..... ہفتے کی بلنگ ہو تو چالیس۔“

”کچھ زیادہ ہیں آئی۔“

”چودھری جی! یہ بھی تو دیکھو کہ کس کے لئے دے رہے ہو۔ جس کی جھلک دیکھنے کے لئے لوگ اسٹوڈیو کے دروازے پر دھکے کھاتے ہیں۔“

عمران کچھ دیر تک غور و فکر کے انداز میں خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”اگر ہفتے کی بلنگ ہو تو کہیں باہر بھی جاسکتے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ بھور بن وغیرہ..... یا پھر دینی شوہی؟“

”نہیں..... اس میں دو چار شرطیں ہیں اور ایک شرط یہ بھی ہے کہ چندو کہیں جائے گی نہیں اور جگہ بھی اس کی مرضی کے مطابق ہوگی۔“

بت خوا..... راہگیروں کو زجھار ہی تھی۔ میں نے مذاقاً کہا۔ ”یاد رکھنا! یہ ناچنے والا کہیں راجا ہی تو نہیں۔“

اقبال بولا۔ ”نہیں، آج اسے کافی سبق مل گیا ہے۔“

عمران بولا۔ ”یہ تمہاری غلط فہمی ہے یارو..... جو سبق حاصل کر لے وہ راجا ہو ہی نہیں سکتا۔“

ہم ناچنے والے ادھیڑ عمر شخص کے قریب سے ہوتے ہوئے بڑی سڑک کی طرف آ گئے۔ یوں لگا جیسے ایک دم تازہ اور پاکیزہ ہوا پھپھڑوں میں گھسی ہے۔



”یہ کیا چکر چل رہا ہے یار! گلتا تو نہیں کہ شاربہ بائی جھوٹ بولے گی۔“ میں نے کہا۔ ”گناہ کے اکثر کام بڑی نیک نیتی اور سچائی کے ساتھ کئے جاتے ہیں۔“ عمران نے فلسفہ بگھارا اور پھر اپنا ایک واقعہ سنانے بیٹھ گیا جب جیلانی کے محلے میں ایک چور مسجد سے لاؤڈ اسپیکر وغیرہ چرانے کی نیت سے داخل ہوا۔ اس نے مؤذن کے سر پر چوٹ لگائی اور باندھ کر حجرے میں ڈال دیا۔ جب وہ سامان سمیٹ کر جانے لگا تو فجر کی اذان کا وقت نکلا جا رہا تھا۔ اس نے مسروقہ لاؤڈ اسپیکر سے پہلے باقاعدہ اذان دی، اس کے بعد غائب ہوا۔

میرا ذہن گھڑ دوڑ کا میدان بنا ہوا تھا۔ یوسف فاروقی اپنے مقام سے بہت گرا ہوا نظر آ رہا تھا۔ وہ آج رات ایک ایسی جگہ پر پایا گیا تھا جس کے بارے میں ثروت شاید سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اسے مجازی خدا کا درجہ دیتی تھی اور یہ مجازی خدا خود ہوس کے کوچے میں ٹھوکریں کھا رہا تھا۔ میرا دل چاہا کہ ابھی ثروت کا نمبر ملاؤں اور اس سے وہی زبان بولنے لگوں جو نصرت اس سے بولتی تھی۔ اسے بتاؤں کہ وہ پیتل کو سونا سمجھ رہی ہے۔ سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہے۔ اپنی زندگی ایک ایسے شخص کے لئے خراب کر رہی ہے جو بگڑے امیر زادوں والی ہر برائی اپنے اندر رکھتا ہے۔

لیکن کیا واقعی صورت حال وہی تھی جو ہم نے آج محسوس کی تھی؟ کیا واقعی یوسف اس بازار حسن میں ایک خریدار بن کر آیا تھا؟ یا پھر یہ کوئی اور چکر تھا، اس کے پیچھے کوئی اور وجہ تھی؟ میں جلد بازی کرنا نہیں چاہتا تھا۔ مجھے ثروت کی اس نگاہ ملامت کا خوف تھا جو یوسف کی بدنامی کے حوالے سے مجھ پر پڑتی۔ میں اس نگاہ کا شکار ہو جاتا تو پاتال سے زیادہ گہرائی میں جا گرتا۔ جب تک کوئی ٹھوس ثبوت سامنے نہ آتا، میں نصرت سے بھی اس اہم واقعے کا ذکر کرنا نہیں چاہتا تھا۔

عمران خود کو پُرجوش ظاہر کر رہا تھا۔ اس کی نگاہ گاہے بگاہے میگزین کے بیک ٹائٹل کی طرف بھی اٹھ جاتی تھی۔

اس حوالے سے شاربہ بائی اور عمران میں دس پندرہ منٹ تک مزید رازدارانہ بات چیت ہوئی۔ کچھ ضروری امور طے ہوئے۔ شاربہ بائی نے کھلے ڈلے انداز سے بات چیت شروع کر دی۔ اس نے عمران کو بتایا کہ اگلے چھ سات دن میں چند وکی دو بنگلہ اور ہیں تیسری بنگلہ اس کی ہو سکتی ہے۔

عمران نے کہا۔ ”میں صاف بات کرنے کا عادی ہوں آنٹی! مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا۔ کیا اس معاملے میں کوئی دھوکا تو نہیں ہے؟“

وہ ذرا گردن اکڑا کر بولی۔ ”چودھری صاحب! آپ پہلی بار میرے پاس آئے ہیں اس لئے اتنے سوال پوچھ رہے ہیں۔ جب پھر آئیں گے تو کچھ نہیں پوچھیں گے، بس پیسے نکال کر رکھ دیں گے۔ اس بازار میں میرا ایک نام ہے۔ ایک ساکھ ہے۔ ہم زبان سے پھرنے والے لوگ نہیں ہیں۔“

عمران نے اٹھتے ہوئے کہا۔ ”ٹھیک ہے آنٹی! میں کل شام تک اپنے بندے کے ہاتھ دو لاکھ ایڈوانس بھیج دوں گا۔“

”نہیں نہیں چودھری! اس کی بھی لوز نہیں۔ جب دو شریف“ بندوں کے درمیان زبان ہو گئی تو بس ہو گئی۔“ اس نے رسماً کہا لیکن یقینی بات تھی کہ وہ ایڈوانس رقم کی خواہش رکھتی تھی۔

اب ہمیں اس سوال کا جواب ملنا شروع ہو گیا تھا کہ یوسف فاروقی جیسا ”ہائی جینٹری“ کا بندہ اس عام سے کوٹھے پر کیوں آیا تھا۔ اس کے ساتھ فلم لائن کا وسیم احمد تھا۔ ان دونوں کو ان درمیانی شکل و صورت والی لڑکیوں سے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ وہ ناچ گانے میں بھی کوئی بہت اونچا معیار نہیں رکھتی تھیں۔ یوسف فاروقی اور وسیم کی یہاں آمد کی وجہ کچھ اور تھی اور یہ یقیناً وہی وجہ تھی جو ابھی ہمارے سامنے آئی تھی۔ یہاں انہیں کوئی بہت خاص الخاص مال مل سکتا تھا۔ فلمی دنیا کا ایک ایسا ستارہ جسے عام لوگ اسکرین پر دیکھنے کے لئے بھی دھکے کھاتے تھے۔

ہم شاربہ بائی کے بالا خانے کی مرمریں سیڑھیاں اترنے کے بعد اپنی لینڈ کرور میں آ بیٹھے۔ ایک نشئی مست ہو کر بیچ بازار میں ناچ رہا تھا اور کھڑکیوں میں سے چند بجزوے اس پر آوازیں کس رہے تھے۔ چوباروں سے موسیقی کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور بالکونیوں میں

ہم سپیدہ سحر نمودار ہونے سے پہلے ہی ڈیفنس والی کوٹھی میں پہنچ گئے۔ ہم احتیاطاً کوٹھی سے ایک بلاک پہلے ہی اتر گئے۔ ہم اکثر ایسا ہی کرتے تھے۔ باقی کا فاصلہ بیدل طے کیا جاتا تھا۔ اس رات کی جانے والی اس احتیاط نے ہمیں بہت فائدہ دیا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔ امتیاز اور اقبال لینڈ کروزر لے کر واپس چلے گئے۔ کوٹھی جا کر عمران نے بستر پر جست لگا دی۔ میں حسب معمول فرش پر لیٹا۔ جسم تھکن سے بھر تھا۔ ہم نے صورت حال پر تبصرہ کرنے سے گریز کیا اور سو گئے۔

دس بجے کے قریب عمران نے مجھے جگایا۔ ناشتے کے فوراً بعد ہم راجا کی خبر لینے نکل گئے۔ وہ ہوٹل لالہ زار میں ہی تھا اور رات کی مارکنائی کے بعد اس کا خراب حلیہ مزید خراب ہو گیا تھا۔ ہم ہوٹل پہنچے تو وہ کمرے میں ہی لیٹا تھا۔ اس کی سوجی ہوئی آنکھ کے نیچے بھی ایک گومز نمودار ہو چکا تھا۔ ایک ہاتھ اور گھٹنے پر بھی چوٹ آئی تھی۔ تاہم ان چوٹوں کی اسے کوئی خاص پروا نہیں تھی۔ اسے اس بات کی خوشی تھی کہ عمران نے بروقت اپنے تعلقات استعمال کر کے اسے مکھن کے بال کی طرح نکال لیا تھا۔ اب وہ اس بات کا بکا فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ بازار حسن کی اس لڑکی کا غرور ضرور توڑے گا جس نے اس کی پیشکش کو ٹھکرایا ہے اور اس کی درگت بنوائی ہے۔ اس لڑکی کو حاصل کرنے کے لئے اب وہ بڑی سے بڑی رقم خرچ کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ مجموعی طور پر اس کا موڈ درست تھا اور جب موڈ درست ہوتا تھا تو وہ بے تکان بولتا تھا۔ عمران نے کہا۔ ”بھاراجا! مارکھانے کے بعد تو تمہاری زبان قینچی کی طرح چل رہی ہے۔“ وہ بولا۔ ”تم نے بالکل کنڈم مثال دی ہے۔ قینچی کی طرح زنانیوں کی زبان چلتی ہے۔“ ”چلو قینچی کی جگہ خنجر کا لفظ لگا دیتے ہیں۔“

”ہاں، یہ ٹھیک ہے اور یہ خنجر کل یا پرسوں پھر اسی کوٹھے پر جا کر چلے گا۔ ایک ایک کی بولتی بند نہ کر دوں تو نام راجا نہیں.....“ پھر بات کرتے کرتے وہ ذرا سا چونکا۔ میری طرف دیکھ کر بولا۔ ”ہاں، ایک بات یاد آئی۔ پرسوں رات کو تم دونوں کسی خنجر کی بات کر رہے تھے۔ کوئی قیمتی چاقو یا خنجر تھا، گینڈے کی ہڈی کے دستے والا جو وہاں شیخوپورہ والی کوٹھی میں رہ گیا تھا۔“

”وہ بڑا خاص خنجر تھا بھاراجا۔“ عمران نے کہا۔ ”تائش نے اس خنجر سے انڈیا میں ایک بہت بڑے ڈان کا پیٹ پھاڑا تھا لیکن تم نے اس کا ذکر کیوں کیا ہے؟“ ”مجھے پتا ہے اب وہ خنجر کس کے پاس ہے؟“ راجا نے دانتوں میں خلال کرتے ہوئے کہا۔

”کس کے پاس ہے؟“ میں نے چونک کر پوچھا۔ ”اسی کوٹھی میں سلطان چنے کے ایک چمچے کے پاس دیکھا تھا..... اور میرا خیال ہے کہ وہ اب بھی اسی کے پاس ہوگا۔“

”کیا نام ہے اس کا؟“ عمران نے پوچھا۔ ”نام شام کا تو مجھے پتا نہیں۔ پر شکل دیکھتے ہی فوراً پہچان لوں گاتے کے ختم کو۔“ عمران نے کہا۔ ”تمہیں کیسے یقین ہے، کہ یہ وہی خنجر ہے؟“ ”مچھلی کی طرح دستہ ہے نا اس کا۔ کناروں سے سفید اندر سے کالا۔ ایک طرف لال رنگ کا نگ بھی لگا ہوا ہے۔“ ”نشانیاں تو تم بالکل ٹھیک بتا رہے ہو۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن کیسے؟“

”بس یار! یہ چھوڑنا مجھ پر۔ ایک بندے کو پیچھے لگاتا ہوں۔ تھوڑا سا مال پانی خرچ کرنا پڑے گا۔ پر کوئی گل نہیں، میں کر لوں گا۔ بندے کا پتا لگ گیا تو پھر اس کا پیٹ پھاڑ کر بھی نکال لوں گا اپنی چیز۔“

میں نے کچھ کہنا چاہا لیکن عمران نے آنکھ کے اشارے سے مجھے منع کر دیا۔ وہ راجا کا رمز شناس تھا۔ اس کے ذہن کی گتھیوں کو سمجھتا تھا۔ ”کچھ دیر بعد جب راجا کسی کام سے باہر گیا تو عمران نے ہولے سے کہا۔ ”جگر! مجھے لگتا ہے کہ تیرا کام بن گیا ہے۔“ ”کیا مطلب؟“

”پہلے وعدہ کرو کہ ابھی بات اپنے تک ہی رکھو گے۔“ میں نے فوراً وعدہ کر لیا۔ وہ دیدے گھما کر بولا۔ ”مجھے شک ہے کہ خنجر راجا کے پاس ہے یا اس کے پاس پہنچ چکا ہے۔“ ”ہائیں۔“

”یہ بڑی گڑبڑ ہے۔ تم کچھ نہیں جانتے اس کے بارے میں۔“ عمران نے کہا۔ ساتھ ساتھ اس کی نظریں تیزی سے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اچھا تم ایسا کرو کمرے سے نکل کر کھڑے ہو جاؤ۔ جب راجا کوریڈور کے سرے پر نظر آئے تو ذور سے کھانس کر مجھے اشارہ دے دینا..... اس طرح۔“ عمران نے مجھے کھانس کر دکھایا۔ میں کوریڈور میں کھڑا ہو گیا۔ عمران تیزی اور چابک دستی سے راجا کے کمرے کی تلاشی

لینے لگا۔ جلد ہی اس نے جو شیلے انداز میں مجھے پکارا۔ میں نے چند قدم پیچھے ہٹ کر کمرے میں جھانکا۔ ایک الماری کے اندرونی خانے میں پرانے اخباروں کے نیچے جو شے نظر آ رہی تھی، یہ وہی یادگار خنجر تھا جس کے بے مثال پھل نے بھانڈیل میں جارج گورا کے پیٹ کی سیر کی تھی۔ اس چاقو نما خنجر سے، مجھے ایک خصوصی تعلق پیدا ہو چکا تھا۔

مجھے خنجر کی جھلک دکھانے کے بعد عمران نے اسے فوراً تہ شدہ اخباروں سے ڈھک دیا اور خانے کو بند کر کے الماری کے پٹ بھیڑ دیئے۔ میں خوشی آمیز حیرت محسوس کرتا ہوا کمرے میں واپس آ گیا۔ راجا کے کُن سامنے آ رہے تھے۔ عمران نے کہا۔ ”تمہارا کیا خیال ہے، یہ چاقو راجا کے پاس کیسے پہنچا؟“

میں نے کہا۔ ”مجھے کیا پتا؟ تمہارا ہی یار ہے۔“

”لیکن اس آسمانی تحفے کو ڈھونڈ کر تو تم ہی لائے ہونا۔“ عمران نے کہا اور چند لمبے توقف کر کے بولا۔ ”میرا اندازہ ہے کہ یہ چاقو ندیم کی تلاشی میں برآمد ہونے والی چیزوں میں ہی موجود تھا۔ راجا جانے آٹھ ہزار روپے کی طرح اس چاقو کے بارے میں بھی ہمیں نہیں بتایا۔ اب اسے پتا چلا ہے کہ یہ چاقو تو تمہارے لئے بہت اہم ہے اور تم اس کی گمشدگی پر پریشان ہو۔ اب وہ ہم سے اس کے پیسے کھرے کرنا چاہ رہا ہے لیکن میرے اندازے کے مطابق یہ نہیں بہت سستے میں مل جائے گا۔ زیادہ سے زیادہ چار پانچ ہزار روپیا۔ یہ اس کی اصل قیمت کا سواں حصہ بھی نہیں ہے۔“

”لیکن کیا یہ پیسے دینے ضروری ہیں؟“

”نہیں، راجا سے بنا کر رکھنا ضروری ہے۔ یہ جیسا بھی ہے لیکن ہے کام کا بندہ۔ تم دیکھتے رہنا۔“

اس گفتگو کے دوران میں ہی میری نظر کچھ اشیاء پر پڑی۔ یہ وہ چیزیں تھیں جو چند دن پہلے ندیم سے برآمد ہوئی تھیں۔ دو چار رسیدیں، ایک قلم، ایک لائٹر، سگریٹ کا پیکٹ، ساٹھ ہزار کا کراس چیک اور چار پانچ سو کیش۔ ابھی کچھ دیر پہلے الماری کی تلاشی کے دوران میں عمران نے یہ اشیاء سامنے والی دراز سے نکالی تھیں۔ میں یونہی الٹ پلٹ کر ان چیزوں کو دیکھنے لگا۔ اچانک ایک مڑے تڑے وزینگ کارڈ نے مجھے چونکے پر مجبور کر دیا۔ کارڈ پر لکھا تھا۔ میوزک اینڈ ڈانس اکیڈمی۔ شام کی ریگولر کلاسز۔ بہترین ماحول۔ زیر سرپرستی مسز شاربہ غیاث۔ نیچے جوائڈر لیس تھا وہ میرا جانا پہچانا تھا۔ یہ بازار حسن کے اسی کونے کا تھا جہاں ہماری ملاقات نایکا شاربہ بانی ہے ہو چکی تھی۔

میں نے یہ کارڈ عمران کو دکھایا۔ اس کی پیشانی پر بھی سوچ کی لکیریں پھیل گئیں اور آنکھوں میں چمک نمودار ہو گئی۔

چند ہی منٹ میں ہم ایک انکشاف انگیز نتیجے پر پہنچ چکے تھے۔ اس بات کے واضح اشارے مل رہے تھے کہ شاربہ بانی اور جاوا گروپ کے لوگوں میں تعلق ہے۔ جاوا کا تعلق بھی فلم لائن سے تھا، دوسری طرف شاربہ بانی بھی فلمی اداکاراؤں سے رابطوں کا دعویٰ کر رہی تھی۔

میں نے کہا۔ ”یار! یہ کہیں وہی ڈبل گیم تو نہیں جو ہم اس سے پہلے بھی دیکھ چکے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”وہی ”ہم شکلی“ والا چکر۔ جاوا کے لوگ مشہور فلمی چہروں کی نقلیں جمع کر رہے ہیں۔ دو تین انڈین اداکاراؤں کی زبردست کاپیاں ہم دیکھ چکے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ دو چار پاکستانی اداکاراؤں کے ڈبل کیٹ بھی ان لوگوں کو مل چکے ہوں۔“

”بالکل ایسا ہو سکتا ہے۔“ عمران نے ہر جوش انداز میں سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔

”اس کا تو یہ مطلب بھی ہے کہ کل شاربہ بانی نے تم سے جو سودا کیا ہے وہ بھی کسی ”ڈمی“ لڑکی کے لئے ہوگا۔ کوئی ایسی لڑکی جو بہت حد تک ہماری فلمی ہیروئن سے مشابہ ہو گیر۔ ایسے لوگوں کے لئے اس قسم کے کھیل کھیلنا زیادہ مشکل نہیں ہوتا۔“

”بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو۔ مہینا ڈیڑھ مہینا پہلے میں نے ایک اردو روزنامے میں اشتہار دیکھا۔ کچھ اس طرح کا مضمون تھا کہ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی صورت کسی مشہور اداکار یا اداکارہ یا کسی ”سیلیبریٹی“ سے ملتی ہے تو ہم سے رجوع کریں۔ ہمارے پاس آپ کے لئے اچھی آفرز ہیں۔ میرے خیال میں اس طرح کے اشتہارات سے کوئی شخص بھی مشہور چہروں سے ملنے جلتے چہرے اکٹھے کر سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ان درجنوں چہروں میں سے کوئی ایک آدھ چہرہ ایسا بھی ہو جو واقعی حیرت انگیز مشابہت رکھتا ہو۔ اور جب یہ کام وسیع پیمانے پر کیا جائے تو پھر مشابہ چہرہ ملنا اور بھی ممکن ہو جاتا ہے۔“

”یہ تو بڑا زبردست گیم لگ رہا ہے۔ مشہور لوگوں سے ملنے جلتے لوگ اکٹھے کرو اور پھر انہیں مختلف کاموں کے لئے استعمال کرو۔“

”بالکل، مجھے ایک عریاں فلم یاد آ رہی ہے۔ عریاں فلمیں دیکھنے والوں میں وہ کافی مقبول ہوئی تھی۔ تماش بین طبقے نے اس فلم کو ایک مشہور اداکارہ کی فلم سمجھ کر دیکھا تھا اور دانتوں میں انگلیاں دبائی تھیں۔ لیکن بعض لوگ پورے یقین سے کہتے ہیں کہ وہ اس اداکارہ

کی نہیں بلکہ اس کی ہم شکل کی فلم تھی۔“

”میرے خیال میں تو اس طرح مشہور لوگوں کو اپنے مقاصد کے لئے بلیک میل بھی کیا جاسکتا ہے۔ یعنی خرابی بسیار کے بہت سے طریقے موجود ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن..... تمہارا کیا اندازہ ہے عمران..... اخبار میں کوٹھی کی ”فوری فروخت کا“ وہ اشتہار بھی ڈمی تھا؟“

”یہ تو کوئی ایسا مشکل کام نہیں۔ ڈرامے میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لئے ڈیڑھ دو ہزار خرچ کر کے کوئی بھی ایسا ایڈ دے سکتا ہے۔“

میں نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔ عمران موضوع بدلتے ہوئے بولا۔ ”تمہارا کیا اندازہ ہے جگر! کیا یوسف فاروقی واقعی مشہور فلمی ہیروؤں کے ساتھ رنگ رلیاں منانے کے لئے شاربہ بانی کے ڈیرے پر پہنچا ہے؟“

”بظاہر تو یہی لگ رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”فلم ایڈیٹر وسیم احمد بھی اس کے ساتھ تھا۔ اس کے ساتھ یوسف کی یاری لگتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یوسف کا غم غلط کرنے کے لئے اس نے یوسف کو یہ انوکھی راہ دکھائی ہو۔“

”غم غلط سے تمہاری کیا مراد ہے؟ کیا وہی ثروت والا معاملہ؟“

”ہاں، نصرت جو کچھ بتا رہی ہے اس سے یہی پتا چلتا ہے کہ گھر میں تناؤ ہے۔ ثروت اوپر کی منزل پر نصرت کے ساتھ سوتی ہے۔ میاں بیوی آپس میں بس ضروری بات چیت کرتے ہیں۔“

”اپنے آپ کو بڑے ہلکے کردار کا ثابت کر رہا ہے یہ بندہ۔“ عمران نے کہا۔

”لیکن ابھی تک ہمارے پاس کوئی ٹھوس ثبوت بھی تو نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ویسا نہ ہو جیسا ہم سمجھ رہے ہیں۔ یہ بھی تو ہوتا ہے کہ کئی شوہر اپنی بیویوں کو ”راہ راست“ پر لانے کے لئے اس طرح کے جھٹکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ بیوی، شوہر کو غلط ماحول سے بچانے کے لئے اس کی ہر بات ماننے کو تیار ہو جاتی ہے۔“

اسی دوران میں راجا واپس آ گیا۔ وہ تھوڑا سا لنگڑا کر چل رہا تھا۔ یہ رات والی مارا ماری کا نتیجہ تھا۔ عمران نے پکا منہ بنا کر کہا۔ ”یار بھاراجا! تم ایک دودن میں وہ چاقو یا خنجر جو بھی ہے تابی کو لا دو، ورنہ یہ سوکھ کر کاٹا ہو جائے گا۔ لیکن ذرا ہاتھ پاؤں بچا کر، کہیں کوئی اور پھنڈا کھڑا نہ کر دیتا۔“

”اوئے عمو..... میں خود تھوڑا جاؤں گا اوکھلی میں سر دینے کے لئے۔ ایک کرائے کے بندے کو بھیجوں گا۔ تو فکر نہ کر سب ٹھیک ہو جائے گا..... ایک دم ٹیٹ۔“

عمران نے جیب سے تین ہزار روپے نکال کر اسے دیئے۔ ”یہ خرچے کے لئے رکھ لو نا..... باقی بعد میں دیکھ لیں گے۔“

راجا نے تھوڑا سا تذبذب دکھا کر روپے رکھ لئے۔ عمران کے چہرے پر ممنونیت برس رہی تھیں میں نے مسکراہٹ دبانے کے لئے منہ دوسری طرف پھیر لیا۔

راجا کے پھٹھر موبائل پر کال آ گئی۔ وہ اسے سنتا ہوا ہا ہر چلا گیا۔ ہم ایک بار پھر پرانے موضوع پر آ گئے۔ عمران نے سگریٹ کا کش لیتے ہوئے کہا۔ ”اگر واقعی جاوا گروپ کے لوگوں کا تعلق شاربہ بانی سے ہے تو پھر ان لوگوں کا اس کے ہاں آنا جانا بھی ہوگا۔ ہم کل رات شاربہ بانی کے کوٹھے پر تھے۔ کہیں ایسا نہ ہوا ہو کہ جاوا کے کسی بندے نے ہمیں پہچان لیا ہو۔“

”یہی بات میں سوچ رہا ہوں۔ ہم کوٹھے سے سیدھے ڈیفنس والی کوٹھی چلے گئے تھے۔ ہم ایک بلاک پہلے تو اتر گئے تھے لیکن پھر بھی خطرہ تو موجود ہے۔“

عمران نے کہا۔ ”لیکن میرا خیال ہے کہ گاڑی سے اترنے کے بعد کسی نے ہمارا پیچھا نہیں کیا۔ میں نے عقب میں نگاہ رکھی تھی۔ اگر کوئی ہمارے تعاقب میں ہوگا بھی تو وہ لینڈ کروزر کا پیچھا کرتے ہوئے آگے نکل گیا ہوگا۔“

”یعنی ایسی صورت میں اقبال اور امتیاز اس کی نظر میں آ گئے ہوں گے۔ اقبال کل یہاں ہوٹل میں بھی آیا تھا۔ اس طرح یہ ہوٹل بھی جاوا گروپ کی نظر میں آ سکتا ہے۔“

ابھی بمشکل میرا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ عمران چونک گیا۔ اس کی نگاہ ادھ کھلے دروازے سے باہر گئی تھی۔ ایک بیراہتوں میں رات کے کھانے کی ٹرے لئے گزر رہا تھا۔ عمران اٹھ کھڑا ہوا۔ ”کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ میں بھی اس کے پیچھے گیا۔ بیراہتیں چڑھ کر اوپر والی منزل پر جا رہا تھا۔ ہم بھی سیڑھیوں کی طرف آئے۔ بیرے نے مڑ کر ہمیں دیکھا اور چونکا..... وہ اوپر والے کوریڈور میں پہنچا تو ایک بار پھر اس نے گھوم کر دیکھا۔ اس نے کھانے کی ٹرے ایک طرف پھینکی۔ سائن، روغنی نان اور سلا دوغیرہ ہوا میں اڑتے نظر آئے۔ بیرے نے اپنے لباس میں سے پستول نکالا اور اندھا دھند عمران پر گولی چلائی۔ عمران اس سے پہلے ہی فرش پر گر چکا تھا۔ فارخالی گیا۔ جواب میں عمران کی چلائی ہوئی گولی حملہ آور کے پیٹ میں لگی۔ وہ اوندھے منہ بوسیدہ قالین پر گرا۔

عمران اور میں تیزی سے واپس پلٹے۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے عمران نے سنسنی خیز لہجے

میں کہا۔ ”یہ جاوا گروپ کا بندہ ہے۔ سلطان چٹا کا گن مین۔“

ہم سیڑھیاں اترے تو ایک اور ہٹا کنٹھ شخص نظر آیا۔ اسے بھی ہم نے اس سے پہلے ہوٹل میں نہیں دیکھا تھا۔ اس کے سانولے چہرے پر زلزلے کے آثار تھے اور وہ اپنے لباس سے کوئی ہتھیار نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ عمران نے اسے ایک لحظے کا موقع بھی نہیں دیا۔ سیڑھیاں اترتے اترتے اس نے بلندی سے ہی اس شخص پر جست لگائی۔ عمران کے دائیں ہاتھ میں موجود پستول کا آہنی دستہ پورے زور سے اس شخص کے سر پر لگا اور وہ بے سدھ ہو کر ایک طرف گر گیا۔

میں اور عمران بھاگتے ہوئے اپنے کمرے میں پہنچے۔ میں نے بازار کی طرف کھلنے والی کھڑکی کو کھول کر دیکھا۔ ایک بار پھر وہی نقشہ نظر آیا جو دس بارہ دن پہلے پرائیویٹ اسپتال کے باہر نظر آیا تھا۔ کم از کم تین مشکوک گاڑیاں ہوٹل لالہ زار کے سامنے موجود تھیں۔ ان کے قریب جو ایک دو غنڈا ٹائیپ افراد نظر آ رہے تھے، وہ یقیناً جاوا گروپ کے ہی تھے۔

راجا بھی آ گیا تھا اور حیرت سے منہ کھولے ہماری طرف دیکھ رہا تھا۔ عمران نے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے کہ ہوٹل کو جاوا کے لوگوں نے گھیر لیا ہے۔“

”کیا کرنا ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں سے نکلنا ہوگا۔“ عمران نے کہا۔

”یہاں پچھلی طرف ایک دروازہ ہے۔ آؤ میرے ساتھ۔“ راجا نے کہا۔ ہم راجا کے پیچھے دوڑے۔ چند سیڑھیاں اتر کر ہم ہوٹل کے کچن میں داخل ہو گئے۔ دھڑا دھڑا کڑاہی گوشت اور بجی وغیرہ تیار ہو رہی تھی۔ کھانا پکانے والے ہماری اس اندھا دھند مداخلت پر حیران رہ گئے۔ راجا نے کچن کا بیرونی دروازہ کھولا۔ لیکن ابھی اس نے ایک قدم ہی آگے بڑھایا تھا کہ عمران نے کالر سے پکڑ کر اسے واپس کھینچ لیا۔ اس دروازے کے عین سامنے بھی ایک گاڑی نظر آ رہی تھی اور اس کے قریب ایک مسلح باوردی گاڑی بالکل چوکس کھڑا تھا۔ راجا کو دیکھتے ہی اس نے رائفٹل سیدھی کر لی تھی۔ اس کے باوجود کہ ہم نے کچن کا دروازہ بند کر دیا تھا، پمپ ایکشن گن کا ایک فائر ہوا اور کڑاہی گوشت بنانا ہوا ایک باورچی فرش پر گر کر تڑپنے لگا۔

”لالے! بری طرح پھنس گئے ہیں۔ ایک دم ٹیٹ کام ہوا ہے۔“ راجا نے کہا۔

”کوئی اور راستہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، آؤ میرے پیچھے۔“ راجا نے کہا اور ہوٹل کے اس حصے کی طرف بھاگا جہاں ایک

چھوٹے سے صحن میں ہوٹل کے ملازموں اور گاہکوں وغیرہ کے سائیکل اور موٹر سائیکل کھڑے رہتے تھے۔ ہم اس صحن..... سے گزر کر ایک چھوٹی سی دکان کے عقب میں پہنچے۔ راجا نے اپنے کندھے کی زوردار ضرب سے دکان کی عقبی کھڑکی توڑ دی۔ ہم کو در دکان میں گھسے۔ یہ ربڑی اور فالودے کی دکان تھی۔ دو خواتین سمیت چار پانچ گاہک موجود تھے اور ربڑی والے دودھ کے گھونٹ لے رہے تھے۔ ان کی ہوائیاں اڑ گئیں۔ عورتیں چلاتی ہوئی باہر کی طرف بھاگیں۔ ہم کرسیاں الٹاتے ہوئے لوگوں سے ٹکراتے باہر بازار میں آ گئے۔ یہاں اچھی خاصی رونق تھی لیکن اگر ہمارا خیال یہ تھا کہ ہم بچ نکلے ہیں تو یہ غلط تھا۔ جونہی ہم بازار میں نکلے، ایک طرف سے دو ہوائی فائر ہوئے۔ پھر ہم نے کچھ افراد کو اپنی طرف لپکتے دیکھا۔ وہ لوگوں میں سے راستہ بناتے ہوئے ہماری طرف جھپٹتے چلے آ رہے تھے۔ ان کی تعداد کسی طرح بھی ایک درجن سے کم نہیں تھی اور یقیناً ارد گرد مزید افراد بھی موجود ہوں گے۔ ہوٹل لالہ زار کا بڑا مکمل گھیراؤ کیا گیا تھا..... اور گھیراؤ کرنے والوں کے ارادے نہایت خطرناک تھے۔ ہمیں دائیں جانب کچھ عافیت نظر آئی۔ ہم اسی طرف بھاگے۔ رش اتنا زیادہ تھا کہ یہاں فائرنگ نہیں کی جاسکتی تھی، ورنہ اب تک ہم پر گولیوں کی بوچھاڑ ہو چکی ہوتی۔ دوسری طرف ہمارے پاس ایک پستول کے سوا اور کچھ نہیں تھا اور اس میں سے بھی ایک گولی عمران ہوٹل کے اندر نپٹی بیرے پر داغ چکا تھا۔

ایک ایک دائیں طرف سے جھپٹتے والے دو تین افراد ہمارے سر پر پہنچ گئے۔ ان کی آنکھوں میں شعلے رقصاں تھے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں مجھے گراہی دار چاقو صاف نظر آیا۔ میرے قریب پہنچتے ہی اس شخص نے میرے گریبان پر ہاتھ ڈالا اور ایک غلیظ گالی کے ساتھ چاقو میرے پہلو میں گھونپنا چاہا۔ اگر اس نے مجھ پر حملہ کیا ہوتا تو شاید کامیاب ہو جاتا لیکن اس نے باروندا جی کی شاگرد پر حملہ کیا تھا اور شاگرد بھی وہ جس نے کئی ماہ دیوانہ وار اپنے استاد کی مار کھائی تھیں میں نے بھاگتے بھاگتے اس کا خطرناک وار اپنی کلائی پر روکا اور اس کی بائیں پسلیوں کے نیچے ایک مخصوص جگہ گھسنے کی کارگر ضرب لگائی۔ وہ مردہ پھٹکی کی طرح سڑک پر گر گیا اور ہجوم کے پاؤں تلے روند گیا۔ دوسری طرف میں نے ایک اور شخص کو عمران کے سر کی زوردار ٹکڑا کر دودھ کے کڑاہے میں گرتے دیکھا..... لاہور کی سڑکوں پر دھینگا شتی کی ہماری خواہش اس طرح پوری ہو رہی تھی کہ ایک خلقت انگشت بدنداں تھی کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ بھگدڑ سی مچی ہوئی تھی۔ ہمیں اچھی طرح معلوم تھا کہ اگر ہم کھلی جگہ پر نکل آئے تو جاوا کے درجنوں گر گئے ہمیں بھون کر رکھ دیں گے۔ ہم رش

ایک دائیں بائیں موجود تھی۔ اس کے علاوہ درجنوں افراد تھے جنہوں نے یہاں وہاں پوزیشنیں لے رکھی تھیں۔ یقینی بات تھی کہ عقبی جانب بھی ایک دو گاڑیاں موجود ہوں گی۔ ہم جس عمارت میں تھے، یہ بمشکل دوڑھائی مرلے میں ہوگی۔ تاہم اس کی تین منزلیں تھیں، ہم دوسری منزل پر موجود تھے۔ تیسری منزل کا پتا ہمیں ابھی چلا تھا۔

میری نظر جاوا گروپ کی ایک کوسٹرنائپ گاڑی پر پڑی۔ اس کی چھت پر کوئی چیز نصب تھی، جیسے کوئی بڑی گن وغیرہ ہو۔ تاہم غور سے دیکھنے پر اندازہ ہوا کہ یہ ایک مووی کیمرہ ہے۔

”وہ دیکھو اس گاڑی کی سائیڈ پر کیا لکھا ہے؟“ عمران نے کہا۔
میں نے پڑھا۔ یہ ”ایس ایم گل فلز لمیٹڈ“ کے الفاظ تھے۔ نیچے ملتان روڈ لاہور کا پتا درج تھا۔

”یہ تو کوئی شوٹنگ والوں کی گاڑی لگتی ہے۔“ میں نے کہا۔
ابھی مشکل سے میرا فقرہ مکمل ہوا ہی تھا کہ اس گاڑی کے عقب سے ہم پر رائفل کے تین چار فائر ہوئے۔ دھماکوں سے فضا گونج اٹھی۔ ہم جس کمرے میں موجود تھے، اس کے سامنے والے شیشے چمکنا پھوڑ ہو گئے۔ ایک گولی راجا کے سر کے پاس سے گزری، وہ ہڑبڑا کر بیٹھ گیا۔

”یہ لوگ آج ہمارے جنازے تیار کرنے کا پورا ارادہ رکھتے ہیں؟“ عمران نے سگریٹ کا دھواں فضا میں چھوڑتے ہوئے کہا۔

”اور اس صورت حال سے بچنے کے لیے ہمارے پاس صرف ایک پستول اور پانچ گولیاں ہیں۔“ میں نے عمران کا فقرہ مکمل کیا۔

”پانچ نہیں دو۔“ عمران نے مغموں انداز میں کہا۔ ”ایک ایک گولی تو ہمیں بھی چاہیے ہوگی، آخر میں خودکشی فرمانے کے لیے۔“

راجا نے کہا۔ ”یار! ایک دم کندم کام ہوا ہے۔ ہر وقت بیخ بیخ کلو کے پستول ساتھ لیے پھرتے ہیں اور ارج لوڑ پڑی ہے تو تین بندوں کے پاس صرف ایک پستول ہے۔“

ایک ایک پھر فائر ہوئے۔ یہ آٹو میٹک رائفل کے فائر تھے۔ چھ سات گولی کا برسٹ تھا۔ ہماری دائیں جانب والی دیوار کا بہت سا پلاسٹر اکھڑ کر نیچے جا گرا۔ المونیم کی ایک سیڑھی اچھل کر دیوار کے ٹکرائی اور پھر راجا کے سر میں لگی۔ اس نے سیڑھی اور سیڑھی گرانے والوں کو گالیاں دیں۔

والے حصوں میں گھس رہے تھے۔ مگر یہ بھی اندیشہ تھا کہ اس طرح ہم عام لوگوں کی زندگیاں خطرے میں ڈال دیں گے۔
اچانک ہمیں لگا کہ اب ہم قدرے کھلی جگہ پر آ گئے ہیں اور اب کسی بھی وقت ہم پر فائرنگ ہو جائے گی۔

”اس سامنے والی بلڈنگ میں۔“ عمران نے پکار کر کہا اور انگلی سے اشارہ بھی کیا۔
یہ ایک چھوٹی سی دو منزلہ عمارت تھی۔ نیچے میڈیکل اسٹور تھا۔ اسٹور کے ساتھ اوپر جاتی ہوئی سیڑھیاں تھیں ہم سیڑھیوں میں داخل ہوئے اور آہنی دروازہ اندر سے بند کر دیا۔ فائر ہوئے اور ایک گولی دروازے میں لگی۔ ہم سیڑھیاں چڑھ کر اوپر والے پورشن میں آ گئے۔ یہاں کوئی نظر نہیں آیا۔ ہم نے سیڑھیوں کا بالائی دروازہ بند کر دیا۔

میں نے محتاط انداز میں ایک کھڑکی تھوڑی سی کھولی اور نیچے جھانکا۔ ہمارا تعاقب کرنے والے ارد گرد پوزیشنیں لے رہے تھے۔ دو گاڑیاں تیز رفتاری سے آئیں۔ ان کے بریک چرچرائے اور ان میں سے بھی مسلح افراد نکل کر ارد گرد پھیل گئے۔ ان میں سلطان چٹا بھی نظر آیا۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ راجا نے ہانپی ہوئی آواز میں پوچھا۔
عمران نے اپنے پستول کی گولیاں چیک کیں اور بولا۔ ”اب تو جو کرنا ہے، شیر نے ہی کرنا ہے۔“

”اور شیر کون ہے؟“ راجا نے دریافت کیا۔
”اس کا فیصلہ ابھی تھوڑی دیر میں ہو جائے گا۔“ عمران نے کہا۔

لائسنس آف ہو رہی تھیں۔ دکانوں کے شردھڑا دھڑگر رہے تھے۔ لوگ اپنی سوار یوں کی طرف دوڑ رہے تھے۔ سامنے والے ایک میوزک سینٹر میں دکاندار اپنا ٹیپ ریکارڈر آن چھوڑ کر بھاگ گیا تھا۔ آواز بلند ہو رہی تھی۔ اک راستہ ہے زندگی جو تھم گئے تو کچھ نہیں۔ یہ قدم کسی مقام پر جو جم گئے تو کچھ نہیں۔
..... اور یہ لاہور کی ایک سنگین رات تھی۔



عمران نے سگریٹ سلگایا اور دیوار کے ساتھ لگ کر کھڑکی کے باہر کا منظر دیکھنے لگا۔
میں اور راجا بھی اس کام میں اس کے ساتھ شریک ہو گئے۔ جاوا کے لوگوں نے زبردست منصوبہ بندی کے ساتھ ہمیں گھیرا تھا۔ کم از کم دو گاڑیاں سامنے سڑک پر نظر آرہی تھیں۔ ایک

گئی۔ اس نے تشویش ناک انداز میں ہونٹ سکیڑے۔ یہ ایک زبردست چال تھی بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ سلطان چٹا نے عمران ہی کی ایک زبردست چال کو اس پر اُلٹ دیا تھا۔ اس بھرے پُرے بازار میں ہم پر اندھا دھند فائرنگ کی جا رہی تھی اور بیشتر لوگ یہی سمجھ رہے تھے کہ یہ شوٹنگ ہو رہی ہے۔ بڑے بڑے کمرے، سرچ لائنس، اسٹوڈیو کی گاڑیاں، یہ سب کچھ لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے کافی تھا لیکن ایک بات حیرت کی بھی تھی۔ پولیس والے بھی دھوکے میں آ گئے تھے۔

میں نے عمران سے کہا۔ ”یہ کیا چکر ہے بھی..... کیا پولیس والوں کو پتا نہیں چل رہا کہ فائرنگ اصلی ہے؟“

”یہ ہماری پولیس ہے۔ نقلی پولیس مقابلے کر کر کے اصلی نقلی کا پہچان کھو چکی ہے۔“ عمران نے کہا۔

”مجھے تو یہ بھی چکر ہی لگ رہا ہے۔“ راجا نے ایک الماری کے پیچھے دبکے دبکے کہا۔ ”ہوسکتا ہے یہ پلیسے ساتھ ملے ہوئے ہوں۔“

اس وقت تو ہم نے راجا کی بات کو زیادہ اہمیت نہیں دی لیکن بعد ازاں راجا کی بات بالکل درست ثابت ہوئی تھی۔ چند مقامی اہلکاروں نے رشوت کھائی تھی اور جان بوجھ کر موقع سے دور رہے تھے۔

سرچ لائنس کے زاویے درست ہوئے اور ایک بار پھر ہم پر اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ اب فائرنگ کا زاویہ بدل گیا تھا۔ بائیں طرف سے جو ترچھا فائر آ رہا تھا، وہ ہم سے ڈھائی فٹ چوڑی دیوار والی پناہ گاہ بھی چھین رہا تھا۔ گولیاں سرسراتی ہوئی ہمارے پہلو سے گزر رہی تھیں۔ فائرنگ کا یہ دورانیہ قریباً چار منٹ کا تھا۔ لوہے کی الماریوں میں درجنوں سوراخ ہو چکے تھے اور ان میں سے چھ سوراخ آ رہے بھی تھے۔ اس بار جب فائرنگ تھی تو پولیس اہلکار موقع سے اوجھل نظر آئے۔ وہ اس ”دلچسپ ترین“ شوٹنگ کو اس کے حال پر چھوڑ کر کسی اور طرف نکل گئے تھے۔

”موبائل ہے تمہارے پاس؟“ عمران نے مجھ سے پوچھا۔

میں نے موبائل نکالا۔ اس کی چار جنگ آخری اسٹیج پر تھی۔ عمران نے جلدی جلدی ایس پی حمزہ صاحب کا نمبر ڈائل کیا۔ ابھی تین چار بار بیل ہی ہوئی تھی کہ چار جنگ ختم ہو گئی اور موبائل خاموش ہو گیا۔ ”اوہ شٹ!“ عمران نے موبائل میری طرف پھینکا جسے میں نے دبوج لیا۔

یہی وقت تھا جب یکے بعد دیگرے تین چار سرچ لائنس روشن ہو گئیں۔ ان لائنس نے اس چھوٹی سی بلڈنگ کو بقیہ نور بنا دیا۔ ہم جہاں موجود تھے، یہ قریباً پندرہ ضرب تیس فٹ کا ایک ہال نما کمرہ تھا۔ یہاں دواؤں کے خالی کارٹن پڑے تھے۔ دواؤں کی الماریاں تھیں۔ دو تین المونیم کی کرسیاں تھیں۔

ہم آہنی الماریوں میں پیچھے پناہ لے سکتے تھے یا پھر دیوار کا ایک چھوٹا سا حصہ تھا جو ہمیں سامنے سے تحفظ فراہم کر سکتا تھا۔ یکا ایک اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ گولیاں مینہ کی طرح ہمارے ارد گرد برسیں۔ یوں لگا کہ حملہ آور ہمارے سمیت اس پورے کمرے کو چھلنی کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم ڈھائی تین فٹ چوڑی دیوار کے عقب میں دبک گئے اور ہال کمرے کا کبازا ہوتے دیکھتے رہے۔

تین چار منٹ کی زوردار فائرنگ کے بعد ایک دم خاموشی چھا گئی۔ اس فائرنگ میں چھوٹے بڑے ہر طرح کے ہتھیار استعمال ہوئے تھے۔ گولیوں کی بوچھاڑ سے پورا ہال کمرہ شیشے کی کرچیوں، پلاسٹر کے ٹکڑوں اور لکڑی کے پرچوں سے بھر گیا۔ خاموشی ہوئی تو ہمیں لوگوں کی پکارتی ہوئی آوازیں آئیں۔ اس کے ساتھ ہی سائرن سنائی دیا۔ شدید فائرنگ کی آواز نے پولیس کو متوجہ کر لیا تھا۔ چند سیکنڈ بعد ہم نے دیکھا کہ دو موٹر سائیکلوں پر سوار چار پولیس والے سامنے سڑک پر نظر آئے۔ وہ صورت حال کا جائزہ لے رہے تھے۔ ہم نے انہیں گنجنے سروالے ایک موٹے شخص سے باتیں کرتے بھی دیکھا۔ ان کے قریب سلطان چٹا کی جھلک بھی نظر آئی۔ ہمیں یوں لگا کہ پولیس والے صورت حال کی سنگینی کو شدت سے محسوس نہیں کر رہے۔ ان کی موجودگی میں ہی ہماری طرف آٹھ دس فائر مزید ہوئے۔ وہ ایک طرف کھڑے تماشہ دیکھتے رہے۔ اسی دوران میں میری نظر ایک مووی کیمرے پر پڑی۔ سڑک کے پار وہ کیمرہ ایک برآمدے کے ستون کی اوٹ میں تھا۔ اچانک میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ میں نے کہا۔ ”عمران! لگتا ہے یہاں ہمارے ساتھ وہی ڈرامہ ہو رہا ہے جو ہم نے کچھ دن پہلے مال روڈ پر سلطان چٹے کے ساتھ کیا تھا۔“

”کیا مطلب؟“

”وہاں ہم شوٹنگ کی آڑ میں سرعام سلطان چٹے کو اس کے ٹھکانے سے نکال کر گن پوائنٹ پر گاڑی میں لے آئے تھے۔ شاید اب یہاں شوٹنگ میں ہمارا کام تمام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے۔“

اسی دوران میں عمران کی نظر بھی مارکیٹ کے ستون کے ساتھ موجود مووی کیمرے پر پڑ

میں نے پلٹ کر راجا کا بازو دیکھا۔ وہ لہولہاں تھا۔ گولی اس کی کہنی کے پاس سے گوشت چیرتی ہوئی نکل گئی تھی۔ میں نے اس کا خون بند کرنے کے لیے کس کر رومال باندھ دیا۔

”کتے کے بچے، چور..... نکال۔“ عمران غصے سے بڑبڑایا۔

”کون چور؟“ راجا نے پوچھا۔

”یار! یہی جاوا اور سلطان چٹا۔ یہ نقالی اور چربہ سازی نہیں تو اور کیا ہے۔ انہوں نے ہماری اجازت کے بغیر ہمارا طریقہ استعمال کیا ہے اور ہم پر ہی استعمال کیا ہے۔ یہ کاپی رائٹس کی خلاف ورزی نہیں تو اور کیا ہے۔ میں تو اس بارے میں شور مچاؤں گا اپنے چینل پر۔ ان پر کیس کروں گا۔ دیکھو کیسی دیدہ دلیری ہے۔ وہی کیمرے، وہی شوٹنگ کا بہانہ، وہی سب کچھ۔ چوروں، ڈاکوؤں اور قاتلوں کے بھی کچھ اصول ہوا کرتے تھے لیکن اب تو زمانہ ہی خراب آ گیا ہے۔“

”یہ طنز و مزاح کا وقت نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”شاید تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ آؤ میرے ساتھ۔“ وہ بولا۔

ہم دونوں فرش پر تقریباً ریگتے ہوئے سیڑھیوں تک پہنچے اور پھر دوسری منزل کی چھت پر آ گئے۔ یہاں پہنچ کر ہمیں معلوم ہوا کہ اس مختصر بلڈنگ کی تیسری منزل بھی ہے۔ وہاں تک لوہے کی سیڑھی جاتی تھی۔ اوپر منڈیر وغیرہ کوئی نہیں تھی۔ بس پانی کی ٹنکی رکھی تھی۔ ہم دونوں بڑی احتیاط سے چھت پر پہنچے۔ اوندھے منہ لیٹے لیٹے ہم نے اطراف کا جائزہ لیا۔ آس پاس ایسی کوئی چھت نہیں تھی جس پر کوہر اس جان لیوا گھیرے سے نکلا جاسکے۔ قریب ترین چھت کا فاصلہ بھی پچیس فٹ سے کم نہیں تھا۔ درمیان میں ایک سڑک تھی۔ اگر ہم دونوں میں سے کوئی یہ چھتا کہ چھلانگ لگا کر اس خلا کو عبور کر لے تو یہ ممکن نہیں تھا۔ کم از کم میرے لیے تو نہیں تھا۔ شاید میں اس کا دو تہائی فاصلہ بھی عبور نہ کر سکتا۔ عمران سرکس کا ننھا ہوا فنکار تھا اور ایک پروفیشنل بازیگر بھی لیکن میرے اندازے کے مطابق اس کے لیے بھی یہ کام ممکن نہیں تھا۔ چھت پر بھاگ کر چھلانگ لگانے اور پھر ناکام رہ جانے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں تھا کہ بھاگنے والا پینتیس چھتیں فٹ نیچے پختہ سڑک نما گلی میں گرتا۔ شدید زخمی ہوتا اور پھر جاوا کے غنڈوں کے ہتھے چڑھ جاتا۔

عمران نے نگاہوں نگاہوں میں فاصلے کو بھانپا، اپنے جسم کو تولا مگر کوئی عملی قدم اٹھانے پر خود کو آمادہ نہ کر سکا۔ وہ دلیر تھا مگر بے وقوف نہیں۔ دوسری طرف یہ بھی ضروری تھا کہ ہم میں

”تمہارا موبائل کہاں ہے؟“ عمران نے راجا سے پوچھا۔
راجا نے شلوار کی جیب میں سے اپنا رنگ دار پھٹا موبائل نکالا۔ عمران نے اس پر نمبر پریس کیے اور پھر سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ ”تم سے یہی امید تھی بھاراجا۔“
”کیا ہوا؟“

”وہی تمہاری کنجوسی اور غربت کا اشتہار چل رہا ہے۔ کال ملانے سے پہلے اپنا اکاؤنٹ ری چارج کر لیجیے۔ اللہ تمہارے حال پر رحم کرے بھاراجا۔“

عمران کی تشویش درست تھی۔ اس وقت فوری ضرورت اس بات کی تھی کہ ہم کسی طرح باہر رابطہ کریں اور اپنے لیے مدد طلب کریں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ مجھے ٹیلی فون کا مونا سا کالا تار الماریوں کے عقب میں جاتا نظر آیا۔ میں نے اس تار کا تعاقب کیا اور سیڑھیوں کے قریب ایک سائینڈ بورڈ میں رکھے ہوئے فون سیٹ تک پہنچ گیا۔ فون کوتالے میں رکھا گیا تھا۔ عمران نے پستول کے دستے کی پے در پے ضربوں سے تالا توڑ دیا۔ میں نے ریسور اٹھایا، بار بار کریڈل دبایا لیکن فون بالکل بے جان تھا۔ اندازہ ہوا کہ اس کا تار شاید باہر سے کاٹ دیا گیا ہے۔ بعد ازاں یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا۔

”ہاں بھی یہ تو باندھ کر مار رہے ہیں۔“ عمران نے پرتشویش نظروں سے میری طرف دیکھا۔

سائینڈ ٹیبل کے پیچھے سے چوں چوں کی مدھم آواز آرہی تھی۔ ہم نے دیکھا، یہ رنگین طوطوں والا ایک درمیانے سائز کا پنجرہ تھا۔ معصوم پرندے صورت حال کی سنگینی سے بالکل بے خبر اپنی خوش الحانی جاری رکھے ہوئے تھے۔ یکا یک میں چونک گیا۔ یہ خوش الحانی نہیں، نوحہ تھا شاید پنجرے کے قریب خون کی ایک لکیر نظر آرہی تھی۔ غور سے دیکھا تو کئی طوطے مرے پڑے تھے اور ایک زخمی حالت میں پھر پھڑپھڑا رہا تھا۔ یہ خون ریزی اس اندھا دھند فائرنگ کا نتیجہ تھی جو کچھ دیر پہلے تک ہم پر جاری رکھی گئی تھی۔

ٹیلی فون تک پہنچنے کی کوشش میں ہم اس آڑ سے آگے نکل آئے تھے جو ہمیں تحفظ فراہم کر رہی تھی۔ دفعتاً پھر فائرنگ ہوئی۔ عمران کے ہاتھ میں پکڑا ہوا ٹیلی فون سیٹ اس کے ہاتھ سے نکل کر دیوار سے ٹکرایا اور کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا۔ ایک گولی راجا کو لگی۔ وہ بازو پکڑ کر دہرا ہوا اور پھر فرش پر لیٹ گیا۔ ہم فرش پر ریگتے ہوئے پھر اس سامنے والی دیوار کے پاس پہنچ گئے جس کی ڈھائی فٹ چوڑائی ابھی تک ہماری زندگی کی ضمانت بنی ہوئی تھی۔

عمران نے کہا۔ ”کچھ کرنا پڑے گا۔ نہیں تو مارے جائیں گے۔“

سے کم از کم کوئی ایک ساتھ والی بلڈنگ تک پہنچ جائے اور وہاں سے بذریعہ فون یا موبائل فون حمزہ صاحب سے رابطہ کرے۔ انہیں بتائے کہ یہاں مزگنگ چوگی کے قریب کیسا سنگین ڈرامہ ہو رہا ہے۔

اسی دوران میں ایک بار پھر میڈیکل اسٹور والی بلڈنگ کی دوسری منزل کو اندھا دھند فائرنگ کا نشانہ بنایا جانے لگا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ لوگ دیکھے بغیر گولیاں چلا رہے ہیں اور بلڈنگ سمیت ہر شے کو فنا کر دینا چاہتے ہیں۔ ہم ایک بار پھر نیچے والی چھت پر آ گئے۔ نیچے سے راجا کی پکارتی ہوئی آواز آئی۔ ”اوائے عمو! لگتا ہے کہ ہمارا آخری ویلا آ گیا ہے۔ بڑا ٹیٹ کام ہو گیا ہے۔ وہ ذلیل ہو رہا ہے۔ پورے کمرے کوچ فائر رہا ہے۔“

”تم چھت پر آ جاؤ۔“ عمران نے پکار کر کہا۔

جواب میں راجا نے کچھ کہا لیکن اس کی آواز ایک خوفناک دھماکے میں دب کر رہ گئی۔ یوں لگا کہ بلڈنگ کی ساری دیواریں ہل گئی ہیں۔ ”یہ دستی بم تھا۔“ عمران نے سرسراتی آواز میں کہا۔ اس کے ساتھ ہی وہ راجا کو آوازیں دینے لگا۔ ”راجا..... راجا! کہاں ہو؟“

دوسری طرف خاموشی رہی۔ پھر چند سیکنڈ بعد راجا کی کھانستی ہوئی آواز آئی۔ وہ جاوے کی ماں بہن ایک کر رہا تھا اور دھوئیں میں سے راستہ بناتا ہوا چھت کی طرف آ رہا تھا۔ ایک لحاظ سے اس نے عمران کی ہدایت پر کمر اچھوڑ کر ٹھیک ہی کیا تھا۔ اب وہ پورا کمر گولیوں کی زد میں تھا۔ میں نے ایک زخمی طوطے کو دیکھا جو اڑنے کی کوشش میں چھت پر چلا آیا تھا اور اب جان کنی کے عالم میں پھڑپھڑا رہا تھا۔

”چھلانگ لگانی پڑے گی۔“ عمران نے مجھ سے مخاطب ہو کر زیر لب کہا۔

”لیکن کیسے؟“

”ایسے۔“ اس نے ایک چھتری پکولی۔ ”جیزر بانڈ کی طرح اسے کھول کر نیچے کود جاتا ہوں۔“

”بکواس نہ کرو۔“

اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ایسی حماقت نہیں کرے گا۔ اس کے ذہن میں کوئی اور بات تھی۔ اس نے مجھ سے اپنا پستول لیا اور پھر اس کے ذریعے اپنی نشانہ بازی کا بہترین مظاہرہ کیا۔ اس کی چلائی ہوئی دو گولیوں نے دوسرے لائٹس کو چھناکوں کے ساتھ تاریک کر دیا۔ یہی لائٹس تھیں جو بالائی چھت کو روشن کر رہی تھیں۔ جونہی چھت تاریک ہوئی، عمران چھتری سمیت بالائی چھت پر پہنچا۔ میں جانتا تھا کہ اب اسے روکنا فضول ہے۔

چھتری ابھی تک بند تھی۔ عمران نے اسے الٹا پکڑا ہوا تھا۔ میں نے اسے چھت پر دوڑتے ہوئے دیکھا۔ مجھے ایک بار پھر اسی عمران کی جھلک نظر آئی جو اسٹار سرکس میں پچاس فٹ کی بلندی پر بغیر کسی حفاظتی جال کے خطرناک آئٹمز کرتا تھا اور لوگوں کی سانسیں سینوں میں اٹک جاتی تھیں۔ اس نے بھرپور چھلانگ لگائی۔ اس کے سامنے بجلی کے تین عدد مین تار تھے۔ اس نے چھتری کا مڑا ہوا دستہ سب سے نیچے والی تار میں اٹکا دیا اور ایک ہی حرکت میں اپنے جسم کو جھلاتا ہوا دوسری چھت پر پہنچ گیا۔ اس کی یہ برق رفتاری موومنٹ بالکل اسی جست کی طرح تھی جو وہ سرکس میں لگاتا تھا۔ ایک جھولے سے چھلانگ لگا کر دوسرے جھولے کو پکڑنا اور پھر اپنے جسم کو جھلا کر تیسرے جھولے پر پہنچ جانا۔ پچاس فٹ کی بلندی پر دکھائے جانے والے اس کرتب کے دوران میں اس کے نیچے کوئی حفاظتی جال بھی نہیں ہوتا تھا۔ آج بھی اس نے کچھ ایسی ہی مہارت دکھائی تھی۔ اس چھلانگ کی خوبصورتی کو لفظوں میں بیان کرنا شاید میرے لیے ممکن نہ ہو۔ اس نیم تاریک چھت پر اس کی یہ ”موومنٹ“ بس دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

میں اور راجا اب چھت پر تھے۔ اس طرف فائرنگ کا زور کم تھا مگر اسے بتدریج بڑھنا تھا۔ ہم کسی جانب سے کوئی بھی نہیں سکتے تھے۔ دستی بم کے دھماکے کے سبب راجا کا چہرہ سیاہ ہو رہا تھا اور اس کے کان بند ہو گئے تھے۔ مجھے اس سے چلا کر بات کرنا پڑ رہی تھی۔ اس کا زخمی بازو بھی مسلسل خون اُگل رہا تھا۔ وہ کراہا۔ ”ہمارے پاس ہتھیار نام کی کوئی شے نہیں۔ وہ اوپر آ گئے تو ہمیں سیدھا ذبح ہونا پڑے گا۔“

”گھبراؤ نہیں یار! تمہارا عمو ضرور کچھ نہ کچھ کرے گا۔“

اور واقعی اس نے کیا اور اس میں زیادہ دیر بھی نہیں لگی۔ مشکل سے چار پانچ منٹ گزرے ہوں گے کہ ہمیں فائرنگ کے شور کے بیچ میں کافی فاصلے پر ایک بار پھر سارن کی آواز سنائی دی۔ ہم بجا طور پر توقع کر سکتے تھے کہ یہ پولیس گاڑیوں کے سارن ہوں گے۔ نیچے فائرنگ میں بہت شدت آ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ حملہ آور وحشت میں ہر شے کو اڑا دینا چاہتے ہیں۔ پھر دستی بم کا ایک اور دھماکہ ہوا اور اوپر والا ہال کمرادھوئیں سے بھر گیا۔ کسی گوشے میں آگ بھی بھڑک اٹھی تھی۔

آوازوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اب حملہ آور میٹرھیوں کے بالکل پاس پہنچ گئے ہیں۔ وہ کسی بھی وقت اوپر آنے کی کوشش کر سکتے تھے۔ میں نے خود کو مارا ماری کے لیے تیار کر لیا۔ بدن میں عجیب سی ترنگ جاگ اٹھی۔ اب ایسی صورت حال مجھے لرزہ بر اندام کرنے کے

”اچھا..... اس کے بعد؟“

”اس کے بعد سیدھا سیدھا چلتے ہیں شاربہ بانی کے پاس۔ اس کو دو لاکھ روپیہ دیتے ہیں اور ”چند“ جی کے لیے اپنی بنگلہ کچی کر لیتے ہیں۔ یار جی بات ہے، کبھی کبھی تو میرے دل میں آتا ہے کہ اس سنہری موقع سے فائدہ اٹھا ہی لوں۔ سلور اسکرین کے ایسے جگمگاتے ستارے کے ساتھ شب بسر کا موقع مل رہا ہے۔ اسے اپنی حماقت سے ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ یار! کیا رقص کرتی ہے وہ لگتا ہے کہ کسی شعلے کو برف کے کپڑے پہنا دیئے گئے ہیں۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“ میر نے کہا۔

”یار! جب شعلے کو برف کے کپڑے پہنائیں گے تو وہ کم ہوتے جائیں گے نا۔ یہی کچھ ہماری اس ہیر و من کے رقص میں ہوتا ہے۔ ادھر کپڑے پکھلتے ہیں، ادھر لوگ پکھلتے ہیں۔ ایک دو بار تو ٹی وی پر اس کا جلوہ دیکھ کر میں نے بھی آہیں بھری ہیں۔“

”لیکن تم یہ کیوں بھول رہے ہو کہ ہمارے تجزیے کے مطابق شاربہ بانی جس ”ہیر و من“ کی بنگلہ کرے گی، وہ اصلی نہیں ہوگی۔ کرشمہ کپور اور ایثوریار کے کی طرح ڈمی ہوگی۔“ میں نے اسے یاد دلایا۔

عمران نے مغموں چہرہ بنالیا۔ ”ہاں..... یہ بات تو میں بھول ہی گیا تھا۔“ پھر ذرا توقف سے بولا۔ ”لیکن یار! کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا تو بہتر ہے۔ کہتے ہیں کہ کئی دفعہ نقل، اصل سے بھی بڑھ جاتی ہے۔“

میں نے کہا۔ میں جانتا ہوں تم صرف مسخری کر رہے ہو۔ اب تم شاربہ بانی کی طرف نہیں جاسکتے، نہ ہی میں یا اقبال جاسکتے ہیں۔ شاربہ بانی کے کوٹھے سے ہی تو یہ لوگ ہمارے پیچھے لگے تھے۔“

”لیکن جگر! اگر ہم وہاں نہیں جائیں گے تو تمہارے رقیب روسیہ یوسف ثانی کے بارے میں ثبوت کیسے ملیں گے؟ اور جب ثبوت نہیں ملیں گے تو تم ثروت کا ذہن کیسے بدلو گے اور اگر تم اس کا ذہن نہیں بدلو گے تو وہ اپنی ”شوہر پرستی“ کے گھیرے سے کیسے نکلے گی؟ اور اگر وہ گھیرے سے نہیں نکلے گی تو تمہاری بانہوں کے گھیرے میں کیسے آئے گی..... اور اگر وہ تمہاری بانہوں کے گھیرے میں نہیں آئے گی تو..... تو مجھے ٹھنڈ کیسے پڑے گی۔“

”تمہیں ٹھنڈ پڑے نہ پڑے پھنڈ ضرور پڑ جائے گی۔“ میں نے اس کی طرف مکا تانا۔ وہ سہم جانے کی اداکاری کرتا ہوا چپ ہو گیا لیکن میں جانتا تھا کہ اس کا ذہن تیزی سے

بجائے جوش سے بھر دیتی تھی۔ بہر حال اس کی نوبت نہیں آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے سائرن کی آوازیں قریب آ گئیں۔ اندازہ ہوا کہ تین چار پولیس موبائلز آس پاس پہنچ گئی ہیں۔ یکا یک فائرنگ تھم گئی۔ میں گھنٹوں اور کہنیوں کے بل چلتا ہوا جھست کے سامنے والے حصے کی طرف گیا اور احتیاط سے نیچے جھانکا۔ سڑک پر افراتفری تھی۔ دوسرے لائٹس تو عمران نے توڑ دی تھیں، باقی بھی بجھ گئی تھیں۔ ایس ایم فلز والی گاڑی تیزی سے پوٹرن لے کر مین روڈ کی طرف بھاگ رہی تھی۔ حملہ آوروں کی دیگر گاڑیاں بھی حرکت میں تھیں۔ چند ہی سیکنڈ بعد دو پولیس موبائلز شور مچاتی ہوئی موقع پر پہنچ گئیں۔ پولیس اہلکار چھلانگیں لگا کر نیچے اترنے لگے۔ میں اور راجا نیچے جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھے۔ یہ اس حملے کا ڈراپ سین تھا۔

درحقیقت یہ عمران کی ایمرجنسی فون کال ہی تھی جس پر حمزہ صاحب فوراً حرکت میں آئے اور انہوں نے وائرلیس پر ہنگامی پیغام چلویا۔ اس کے فوراً بعد علاقے میں موجود گاڑیاں ”خونی شونک“ کو ختم کرانے کے لیے موقع واردات کی طرف بھاگ کھڑی ہوئی تھیں۔



ہم نے سب سے پہلے راجا کے بازو کی مرہم پٹی ایک پرائیویٹ کلینک سے کروائی۔ اس کے بعد عمران کے اندرون شہر والے گھر میں پہنچ گئے۔ اس گنجان بازار میں عمران کے بہت سے پرستار تھے جو اس کی آمد پر خوشی سے کھل اٹھتے تھے۔ وہ ان سب کا ہیرو بھائی تھا۔ بڑی عمر کے لوگ اسے ہیرو پتر یا عمران بیٹا کہہ کر پکارتے تھے لیکن جس وقت ہم محلے میں پہنچے، ہو کا عالم تھا۔ رات کے تین بج رہے تھے۔ سب سو چکے تھے۔

میری یاد دہانی پر عمران نے سب سے پہلے اقبال کو فون کیا اور اسے بتایا کہ وہ اور امتیاز، جاوا کے ساتھیوں کی نظر میں آچکے ہیں، لہذا اپنے کسی بھی ٹھکانے سے دور رہیں۔ خاص طور سے ڈیفنس والے گھر تو بالکل بھی نہیں جائیں۔ میں نے ڈیفنس میں جیلانی کو فون کر کے یہی ہدایات دے دیں اور کوٹھی کی سکیورٹی مزید سخت کرنے کے لیے بھی کہا۔

”اب کیا کرنا ہے؟“ اگلے روز صبح دس بجے کے لگ بھگ میں نے ناشتے کے بعد عمران سے پوچھا۔

”سب سے پہلے تو راجا کے یار اشفاق رانا کی خبر لینی ہے۔ سنا ہے کہ صبح سویرے اسے پولیس پکڑ کر لے گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کے ہوٹل میں گولی چلی ہے۔ دو بندے شدید زخمی ہوئے ہیں۔ ایک تو ممکن ہے کہ راہی عدم ہو جائے۔“

تیاگ دوں گا لیکن یہ ہرول بھر شاٹ مجھ سے نہیں ہوگا۔ خدا کے لیے یا! خدا کے لیے آنکھیں کھولو۔ حقیقت کو دیکھو۔ ہم ثروت کے شوہر پر کوئی جھوٹا سچا الزام تو نہیں لگا رہے، صرف اصلیت جاننے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”لیکن اگر.....“

”کچھ نہیں ہوگا یا! ہم جو کچھ کریں گے، ایک فاصلے پر رہ کر کریں گے۔ بڑے محتاط طریقے سے۔“



دس بجے کے فوراً بعد ہم جیلانی کی بتائی ہوئی جگہ پر پہنچ گئے۔ یہ گلبرگ کے نزدیک ایک پوش کالونی میں ایک کنال کی کٹھی تھی۔ کٹھی کے ارد گرد درختوں کی بہتات تھی۔ جیلانی اپنی موٹر سائیکل پر یوسف کی کار کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں پہنچا تھا۔ جونہی ہماری مہران گاڑی سڑک کے کنارے ایک سنسان نرسری کے قریب رُکی، ایک جانب تاریکی میں سے جیلانی برآمد ہوا اور گاڑی میں آ بیٹھا۔

عمران اسے بے تکلفی سے شیخ یا ”یا شیخ“ کہتا تھا، وہ بولا۔ ”یا شیخ! کیا رپورٹ ہے؟“

جیلانی بولا۔ ”میرا اندازہ درست تھا۔ یوسف وہیں پر پہنچا ہے جہاں اسے پہنچنا چاہیے تھا۔ کٹھی کے گیٹ پر غیاث احمد جیونا کی نیم پلیٹ لگی ہوئی ہے۔ آپ کو بتائی ہوگا۔ شاربہ بانی بھی اپنے نام کے ساتھ غیاث کا نام استعمال کرتی ہے۔ یہ یقیناً اس کا کوئی عاشق یا سابقہ شوہر وغیرہ ہے۔“

”یوسف اکیلا ہی آیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں جی..... کافی بناٹھنا ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ اتنی بڑی فلمی ہیروئن سے ملاقات ہے۔“

اس کے پہنچنے ہی گیٹ کھول دیا گیا تھا۔ گاڑی سیدھی پورچ میں لے گیا ہے۔“

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا، ہم تینوں چونک کر سڑک کی طرف دیکھنے لگے۔ ایک نئے ماڈل کی ٹویوٹا کار کٹھی کے قریب پہنچ کر آہستہ ہوئی اور گیٹ کی طرف مڑ گئی۔ کار کی پچھلی کھڑکیوں پر پردے کھچے ہوئے تھے۔ پھر بھی سامنے سے آنے والی کسی گاڑی کی روشنی کار کے اندر لگی تو ایک سیکنڈ کے لیے ہمیں اندرونی جھٹک نظر آئی۔ پچھلی نشست پر کوئی جھلملاتی ہوئی حسینہ موجود تھی۔ ہم اس کے خدو خال نہیں دیکھ سکے۔ صرف اتنا اندازہ ہوا کہ ایک خوب رو چہرہ وہاں موجود تھا۔

کار کے پہنچنے ہی باوردی گاڑی نے گیٹ کھول دیا اور کار کے اندر داخل ہوتے ہی دوبارہ

کام کر رہا ہے۔ وہ یقیناً شاربہ بانی، یوسف اور فلمی ہیروئن کے بارے میں ہی سوچ رہا تھا اور اس انوکھی ڈیل کے بارے میں سوچ رہا تھا جو ایک دن پہلے شاربہ بانی اور یوسف کے درمیان ہوئی تھی۔

ایس پی حمزہ صاحب بھرپور کوشش کر رہے تھے لیکن ڈاکٹر مہناز اور ڈاکٹر رسام کا ابھی تک کوئی پتا نہیں چلا تھا۔ نہ ہی ابھی تک ڈاکٹر مہناز نے اپنی والدہ یعنی آنٹی جیلہ سے کوئی رابطہ کیا تھا۔ آنٹی ابھی تک ہماری حفاظتی تحویل میں تھیں۔ جیلانی رکشہ ڈرائیور لگو کی نگرانی بھی کروا رہا تھا کہ شاید اسی کی طرف سے مہناز کا کوئی سراغ لگ جائے۔ یقیناً مہناز شدید خطرے میں تھی۔ یہ بات اب کوئی بھی نہیں رہی تھی کہ وہ جلالی صاحب کے گھر سے بدھا کی مورتی آرا کوئے لے کر اوجھل ہو گئی ہے۔ اب درجنوں لوگ اور گروہ آرا کوئے کے پیچھے تھے۔ وہ ان میں سے کسی کے ہتھے بھی چڑھ سکتی تھی۔ وہ اپنی ذات میں عجیب لڑکی تھی۔ اس نے ایک بوڑھے کی میٹائی کی اور اس میٹائی میں اتنا آگے چلی گئی کہ اس جاں بلب شخص کی بیوی تک بننا پسند کر لیا۔

جلالی صاحب بدستور کومے کی حالت میں تھے۔ حمزہ صاحب نے ان کی حفاظت کے لیے ہسپتال میں خصوصی گارڈ مہیا کر دیے تھے۔ عمران کو بھی اس بات کا شبہ تھا کہ جلالی صاحب کے ارد گرد دہرا سر اسر گر میاں جاری ہیں۔۔

عمران کی ہدایت کے مطابق جیلانی بدستور یوسف کی نگرانی کر رہا تھا۔ اسی رات نوبے کے قریب ہمیں جیلانی کی طرف سے ایک اہم کال موصول ہوئی۔ اس نے عمران کو بتایا کہ اس کے اندازے کے مطابق آج کی رات کافی اہم ہے۔ لگتا ہے کہ آج یوسف مشہور فلمی ہیروئن کے ہاں جائے گا اور شاید رات گئے تک وہاں رہے گا۔ دوسرے لفظوں میں وہ بتا رہا تھا کہ یوسف اور شاربہ بانی میں جو ڈیل ہوئی تھی، وہ آج پایہ تکمیل کو پہنچے گی۔

عمران نے مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”چلو بھی تیار ہو جاؤ۔“

”کس لیے؟“

”اپنے رقیب رویاہ کورنگے ہاتھوں پکڑنے کے لیے۔“

”نہیں عمران! میں کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جس کی وجہ سے مجھ سے مزید بدظن ہو جائے۔ اگر یوسف غلط کاریاں کر رہا ہے تو وہ خود ہی ایکسپوز ہو جائے گا۔“

”یار! پھر وہی ہندی فلموں والے ڈائلاگ..... نہیں کرنا! میں کوئی ایسا کرتے نہیں کروں گا جس کے کارن رادھا کے من میں میری طرف سے میل آ جائے۔ میں اپنا جیون

بات کرنے کے لیے راضی تھی۔ یہ اس کا نمبر نوٹ کر لو۔“

اس کے بعد جان صاحب نے عمران کو ایک موبائل اور ایک پی ٹی سی ایل نمبر نوٹ کرایا۔ عمران نے شکریہ کہہ کر جان صاحب سے بات ختم کر دی اور پی ٹی سی ایل نمبر پر کال کی۔ کئی دفعہ کوشش کے باوجود رابطہ نہیں ہو سکا۔ بس تیل جا رہی تھی۔ عمران نے موبائل نمبر ڈائل کیا۔ ہیر وئن کی کسی سیکرٹری نے فون اٹھایا۔ سیکرٹری کی آواز کے ساتھ بہت سا شور و غل بھی سنائی دے رہا تھا۔ عمران نے اپنا تعارف کرایا تو کچھ دیر بعد معروف ہیر وئن خود لائن پر آ گئی۔ اس کی آواز ہم سب کے لیے جانی پہچانی تھی۔ آواز کے پس منظر میں سپورٹس کاروں اور موٹر بائیکس وغیرہ کا بہت سا شور سنائی دے رہا تھا۔ اندازہ ہوا کہ کوئی شوٹنگ ہو رہی ہے۔ بعد ازاں یہ اندازہ بالکل درست نکلا۔ ہیر وئن نے بتایا کہ وہ شوٹنگ پر ہے اور اس کا اگلا شات تیار ہو رہا ہے۔ اس نے کہا۔ ”جان صاحب نے آپ کا ذکر کیا تھا..... اس وقت تو میں مصروف ہوں۔ کسی دن شام کے وقت فون کر کے سنوڈیو آ جائیں، آپ سے بات ہوگی۔“

”بہت مہربانی..... بہت شکریہ۔“ عمران نے ریشہ خطی ہوتے ہوئے کہا۔ ”میں ضرور حاضر ہوں گا۔ اپنے اسٹنٹس کی ویڈیو بھی لاؤں گا۔“

”اوکے۔“ ہیر وئن صاحبہ نے کہا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

نہ عمران کو وہاں جانا تھا، نہ اسے جانے کی ضرورت تھی۔ وہ فلمی نہیں اصلی ہیر و تھا۔ سلور اسکرین کے ہیرو، ہیر وئن اس کے سامنے پانی بھرتے تھے۔ ہم جو جانا چاہتے تھے، ہم نے جان لیا تھا۔ معروف فلمی ہیر وئن اس کو بھی میں نہیں کسی فلم کی لوکیشن پر تھی۔ یہاں یوسف فاروقی کے پاس دو نمبر مال تھا۔ پرنٹیشن بیڈروم کی ریشمی نیم تیرگی میں غالباً، نشے میں ڈوب کر یوسف جن پسندیدہ خدو خال پر اپنی بے تائیاں نچھاور کر رہا تھا، وہ اصلی نہیں تھے۔ یقیناً یہ کوئی زبردست قسم کی مشابہت ہوگی، جس سے گھاگ ترین گاہکوں کو دھوکا دیا جاسکتا ہوگا۔ مجھے کرشمہ کپور اور ایشوریا رائے سے مشابہت رکھنے والی لڑکیاں یاد آئیں۔ خاص طور سے سوینی نامی لڑکی کی فلمسٹار ایشوریا رائے سے مشابہت تو حیرت انگیز تھی۔ راجا اس کا قرب حاصل کرنے کے بعد اس کا دیوانہ سا ہو رہا تھا۔

ہماری مہراں ایک درخت تلے گرین بیلٹ کے ساتھ کھڑی تھی۔ بظاہر یہی لگ رہا تھا کہ ہم کسی ساتھ والی کوٹھی میں بطور مہمان آئے ہیں۔ خواتین شاید اندر گئی ہیں اور ہم باہر ان کا انتظار کر رہے ہیں۔ دو تین بار گارڈ ہمارے قریب سے گزرا لیکن اس نے ہم پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ یوسف کو کوٹھی کے اندر گئے اب قریباً ڈیڑھ گھنٹہ ہونے والا تھا۔ ابھی اس کی واپسی

بند کر دیا۔ چاروں طرف ایک بار پھر وہی خاموشی چھا گئی۔ یہ خالص رہائشی علاقہ تھا۔ اس اندرونی سڑک پر بس کبھی کبھار ہی کسی گاڑی کی روشنی چمکتی تھی۔ ہماری بائیں جانب واقع زمسری میں سے ہلکی ہلکی خوشبو اُٹھ رہی تھی لیکن یہ خوشبو بھی تاریکی میں لپٹی ہوئی تھی۔ کوٹھیوں کے دروازے بند تھے اور چار دیواریاں خاموش تھیں۔ یہ چار دیواریاں ہی جانتی تھیں کہ ان کے اندر کیا کچھ ہو رہا ہے یا شاید یہ چار دیواریاں بھی نہیں جانتی تھیں۔ ان کی حیثیت ان گارڈز اور دربانوں جیسی تھی جو پُر شکوہ کوٹھیوں اور محلات کے گرد موجود ہوتے ہیں۔ اندر آنے اور باہر جانے کی اصل مصروفیات کے بارے میں جان نہیں سکتے۔ بالکل جیسے ہم تینوں اندازے تو لگا رہے تھے اور شاید ٹھیک اندازے لگا رہے تھے لیکن چشم دید گواہ نہیں ہے۔

ہم جانتے تھے کہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ایک پری چہرہ اندر داخل ہوئی ہے اور اس سے بھی تھوڑی دیر پہلے اس کا خریدار اندر داخل ہوا تھا۔ اب وہ دونوں کسی پرنٹیشن کمرے میں موجود تھے۔ کسی نے اپنا ”وقت“ بیچنا تھا اور کسی نے اپنی ادائیگی کی قیمت وصول کرنا تھی۔ عمران نے کہا۔ ”میرے خیال میں یہ اچھا موقع ہے کہ ہم جان سکیں کہ ہیر وئن اصلی ہے یا نقلی۔“

”کس طرح؟“ میں نے پوچھا۔

عمران نے اپنا سیل فون نکالا اور کسی کے نمبر پر پریس کرنے لگا۔ رابطہ قائم ہوا تو اس نے فون کا پیکیج آن کر دیا تاکہ ہم بھی گفتگو سن سکیں۔ دوسری طرف اشار سرکس کے مالک اور عمران کے پُرانے محسن جان محمد صاحب تھے۔ علیک سلیک کے بعد عمران نے کہا۔ ”جان انکل! میں نے پرسوں ایک کام کہا تھا آپ سے۔“

”کون سا؟“

”وہی ہیر وئن صاحبہ والا۔ ایک بار اس کی آوازیں لوں تو دل کو تسلی ہو۔ آج کل بڑا دل آیا ہوا ہے اس پر۔ اپنی نئی ٹی وی سیریل میں تو اس نے مجھ جیسے کنواروں کی جان نکال کر رکھ دی ہے۔“

”تم بہت بڑے بد معاش ہو۔ میں جانتا ہوں یہ کوئی اور چکر ہے۔“ جان صاحب نے کہا پھر ذرا توقف سے بولے۔ ”کل میں نے رابطہ کیا تھا چندو سے۔ کسی میٹنگ میں تھی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے سرکس کا سپر سٹار عمران دانش تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔ وہ تھوڑا بہت جانتی ہے تمہارے بارے میں۔ کم از کم نام تو سنا ہوا ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ عمران آج کل زبردست ”اسٹنٹ“ کر رہا ہے۔ تمہاری اگلی فلم کے لیے شاندار کام کر سکتا ہے۔ وہ

پڑے۔ وہ امیر گھرانوں کے ہٹے کٹے لڑکے تھے۔ ان میں سے ایک تو خاصا گرائڈیل تھا۔ شارہ بائی کی کوشی سے نکلنے والے دو چوکیداروں نے لڑکوں کی مزاحمت کرنے کی کوشش کی مگر لڑکوں نے ان کو بھی پیٹ ڈالا۔ یوسف نیچے گر پڑا تھا اور دو لڑکے اسے روئی کی طرح دھنک رہے تھے۔ عمران نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”لو بھئی..... تمہارا کام نکلا ہے۔ ذرا اپنی کواٹی دکھاؤ ان لوٹوں کو۔“

واقعی لگ رہا تھا کہ اگر ہم نہ پہنچتے تو یہ بھرے ہوئے نوجوان یوسف صاحب کی ہڈی پہلی برابر کر دیں گے۔ میں آگے بڑھا۔ پہلے میں نے یوسف کو ان سے چھڑانے کی کوشش کی لیکن جب میرے منہ پر بھی ایک زوردار گھونسہ پڑ گیا تو پھر میں نے جوابی کارروائی کی اور یہ کافی سخت کارروائی تھی۔ لڑکوں کو ایسی مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ میں نے ایک لڑکے کے چہرے پر ٹکڑی رسید کی، وہ تورا کر گرین بیلٹ پر جا گرا۔ ان کے گرائڈیل ساتھی نے عقب سے میری گردن پر ہاتھ مارا۔ کافی سخت ہاتھ تھا۔ آنکھوں میں ستارے سے ناچ گئے۔ میں نے سنبھل کر اس کے پیٹ میں ٹانگ رسید کی اور ٹھوڑی پر گھونسا جڑا۔ وہ ڈگمگایا ضرور لیکن گرا نہیں۔ میں نے ایک اور گھونسا مارا، وہ پشت کے بل اپنی پجارو کے بونٹ سے ٹکرایا اور اس کا سائڈ مروتوڑ دیا۔ اس کے ایک ساتھی نے مجھے عقب سے بازوؤں میں جکڑ لیا لیکن ابھی اس کی گرفت مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ میری کہنی کی ضرب نے اس کے پہلو کو مہلک بوسہ دیا۔ میں نے اس کی پہلی چنچنے کی آواز سنی اور اس کے ساتھ ہی اس کی کراہ بھی۔ میں نے اسے دھکا دیا تو وہ گرائڈیل لڑکے کے اوپر جا گرا۔ میری شدید مزاحمت نے یقیناً بھرے ہوئے لڑکوں کو ہلا دیا تھا۔ وہ یوسف سے توجہ ہٹا کر میری جانب آ گئے۔ یوسف سے بس ایک لڑکا برسر پیکار رہ گیا۔ میرا خیال تھا کہ صورت حال کی سنگینی دیکھ کر عمران بھی لپکتا ہوا پہنچ جائے گا لیکن وہ ابھی تک خاموش تماشا بنی بنا ہوا تھا۔ شاید میرا ٹیسٹ لے رہا تھا۔

مار دھاڑ کی وجہ سے ارد گرد کی بیشتر کوشیوں کے مکین جاگ گئے تھے، کئی کھڑکیاں روشن نظر آنے لگی تھیں۔ ایک لڑکے نے گاڑی کے جیک کے ساتھ میرے سر پر زوردار وار کیا، میں نے خود کو بمشکل بجایا اور پھر اسے اپنے کئی کی طاقت کی پہچان کرائی۔ یہی وقت تھا جب ایک اور گاڑی موقع پر پہنچی۔ یہ ہنڈا سوکھی۔ اس کے بریک چرچرے اور وہ لہراتی ہوئی ہمارے بالکل سامنے رک گئی۔ اس میں سے چار پانچ مزید لڑکے جارحانہ انداز میں اترے۔ مجھے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ یہ پجارو والوں کے ساتھی ہیں۔ انہیں دیکھ کر پہلے سے برسر پیکار لڑکوں کا جوش دگنا ہو گیا۔ انہوں نے لکارے مارے اور گالیاں دیں۔ ان کا نشانہ سب سے

کے کوئی آثار نہیں تھے۔ ہم نے جیلانی کو وہیں چھوڑا اور خود لبرٹی مار کیٹ آ گئے۔ اگلے روز ایک تہواری چھٹی تھی، لہذا ایک اینڈ کا ساما حول تھا۔ رات کا ایک بج چکا تھا مگر مار کیٹ میں چہل پہل نظر آتی تھی۔ ہم ایک ریسٹورنٹ میں بیٹھ گئے۔ ٹی وی کے کسی غیر ملکی چینل پر فٹ بال کا ایک زبردست میچ جرمنی اور اسپین کے درمیان دکھایا جا رہا تھا۔ ہم چائے پیتے رہے اور دلچسپی سے میچ دیکھتے رہے۔ پتا ہی نہیں چلا کہ کب تین بج گئے۔ سیل فون پر جیلانی کی کال موصول ہوئی۔ اس نے عمران کو بتایا۔ ”مجھے لگ رہا ہے کہ یہ لوگ اب یہاں سے جانے والے ہیں۔“

”کیسے اندازہ ہوا؟“ عمران نے پوچھا۔

”بس پورج میں تھوڑی سی ہلچل نظر آ رہی ہے۔ ایک دو کروں کی لائٹس بھی روشن ہوئی ہیں۔“

”ٹھیک ہے۔ اگر ہمارے پہنچنے سے پہلے لڑکی روانہ ہو جائے تو تمہیں اس کا پیچھا کرنا ہے۔“ عمران نے جیلانی کو ہدایت دی۔

ہم فوراً ریسٹورنٹ سے روانہ ہو گئے۔ فاصلہ زیادہ نہیں تھا۔ ہم صرف پانچ منٹ کی ڈرائیونگ کر کے موقع پر پہنچ گئے۔ عین اس وقت کوشی کے پورج میں کسی گاڑی کی روشنیاں آن ہوئیں۔ جیلانی درست ہی کہہ رہا تھا کہ اب یہ لوگ یہاں سے جا رہے ہیں۔ جیلانی تاریکی سے نکل کر ہمارے قریب آ گیا۔ اسی دوران میں کوشی کا مین گیٹ کھل گیا۔ ایک گاڑی مین گیٹ کی طرف آئی۔ ہمارا خیال تھا کہ پہلے شاید ”ڈی ہیروئن“ نکلے گی لیکن یہ یوسف فاروقی تھا۔ اس کی شاندار ٹیوٹا گاڑی گیٹ کی طرف آئی پھر تیزی سے موڑ کاٹ کر سڑک پر پہنچی لیکن موڑ کاٹتے ہوئے یوسف سے تھوڑی سی غفلت ہوئی۔ اس نے اپنی دائیں جانب ٹھیک سے نہیں دیکھا۔ ادھر سے ایک نیلی پجارو آ رہی تھی۔ اس کی رفتار بھی خاصی تیز تھی۔ رات کے سنانے میں پجارو کے بریک زور سے چرچرائے اور دور تک آواز گئی۔ پجارو والے نے کافی کوشش کی پھر بھی اس کی گاڑی لہراتی ہوئی یوسف کی گاڑی کی دائیں سائڈ سے ٹکرائی۔ دونوں گاڑیاں ڈگمگاتی ہوئی رک گئیں۔ پجارو کی ایک ہیڈ لائٹ ٹوٹ گئی تھی۔ یقیناً بائیں سائڈ کا بھی نقصان ہوا تھا۔ غلطی یقیناً یوسف ہی کی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، وہ نشے میں بھی تھا۔ پجارو میں سے تین چار لڑکے نکل آئے۔ دوسری طرف یوسف بھی گاڑی میں سے نکل آیا۔ ٹوٹکار شروع ہوئی۔ قریبی کوشیوں کے دو تین چوکیدار بھی وہاں پہنچ گئے۔ ہم اپنی جگہ موجود رہے۔ اچانک نہ جانے کیا ہوا، پجارو سے نکلنے والے نوجوان یوسف پر پل

پہلے میرا ساتھ دینے والا ایک پٹھان چوکیدار بنا۔ وہ کالی بھڑوں کی طرح اس سے چمٹ گئے۔ دو تین میری طرف بڑھے۔ ان کے ہاتھوں میں کند آلات نظر آرہے تھے۔ اب عمران کی شرکت فرمائی ضروری ہو گئی تھی۔ میں نے دیکھا، وہ دائیں طرف سے آ رہا تھا۔ اس کی دید ہمیشہ میرے حوصلوں کو مہیز کرتی تھی۔ اب بھی ایسا ہی ہوا۔

اگلے تین چار منٹ میں رہائشی علاقے کی اس نیم تاریک سڑک پر گھمسان کارن پڑا۔ وہ تعداد میں زیادہ تھے اور لڑائی بھڑائی بھی جانتے تھے لیکن ان کا واسطہ اس میدان کے آزمودہ کھلاڑیوں سے پڑا تھا۔ پہلے ڈیڑھ دو منٹ کے اندر ہی پانسلا پلٹ گیا۔ پھرے ہوئے لڑکے جارحیت کے بجائے دفاع پر آ گئے۔ ان میں سے دو تین شدید زخمی ہو کر ”ریٹائرڈ ہرٹ“ ہو گئے۔ ان میں پجوارو سے نکلنے والا گرانڈیل تھا اور وہ زمین پر پڑا لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ بدلی ہوئی صورت حال دیکھ کر کوٹھیوں کے چوکیداروں نے بھی ہمت کی اور اس دست بدست لڑائی میں شریک ہو گئے۔ ان میں پٹھان چوکیدار پیش پیش تھا۔ میں نے دیکھا، جیلانی زخمی یوسف کو سہارا دیتا ہوا زسری کی طرف لے جا رہا تھا۔ یوسف کا لباس تار تار تھا اور وہ بُری طرح لنگڑا کر چل رہا تھا۔

میری کہنی کی ضرب سے جس دراز قد لڑکے کی پسلی ٹوٹی تھی، وہ جا کر ہنڈاسوک کی پچھلی نشست پر گر گیا تھا اور اس نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ دولڑکوں کو میں نے مکوں اور ٹھنڈوں پر رکھا ہوا تھا، ایک کو عمران نے۔ عمران کی ہدایت پر جیلانی اس کا رخ میں شریک نہیں ہوا تھا اور زخمی یوسف کے قریب موجود تھا۔ یہی وقت تھا جب سو ڈیڑھ سو میٹر کی دوری پر پولیس کی گاڑی کا سائرن سنائی دیا۔ پولیس تیزی سے موقع کی طرف آ رہی تھی۔ یہ صورت حال دیکھتے ہوئے تین چار لڑکے تو فوراً ہنڈاسوک میں بیٹھے اور وہاں سے نکل گئے، باقی وہیں پر رہے۔ ان میں ٹوٹے ہوئے بازو اور لہولہان چہرے والا گرانڈیل لڑکا بھی تھا۔ وہ خود کو ایک بڑے سرکاری افسر کا بیٹا بتا رہا تھا اور عمران کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہا تھا۔ وہ بار بار اپنے سیل فون پر کوئی نمبر ملانے کی کوشش بھی کر رہا تھا۔

عمران نے مجھ سے کہا۔ ”لگتا ہے کہ یوسف زیادہ زخمی ہے، تم اسے لے کر نکل جاؤ۔ میں اور جیلانی یہاں کا معاملہ سنبھال لیں گے۔ یہ لو چاہی۔“ اس نے گاڑی کی چابی میری طرف اُچھالی۔

پٹھان چوکیدار اور دیگر گاڑ زبھی یہاں موجود تھے، میں نے عمران کی ہدایت پر عمل کرنا مناسب سمجھا۔ میں جب مہران کی ڈرائیونگ سیٹ پر پہنچا، دور سڑک کے موڑ پر پولیس موبائل

کی نیلی جتی نظر آنا شروع ہو گئی تھی۔ یوسف کو جیلانی میری ساتھ والی سیٹ پر بٹھا چکا تھا۔ یوسف نے اپنی ران دونوں ہاتھوں سے تھام رکھی تھی اور تکلیف میں نظر آتا تھا۔ لڑائی کے دوران میں ہی اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور اس حوالے سے اس کے چہرے پر خاصی حیرانی تھی۔

”ہیلو یوسف صاحب! کیسے ہیں آپ؟“ میں نے گاڑی آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔
”کوئی ٹھیکیلی چیز لگی ہے یہاں گھٹنے سے اوپر..... گوشت پھاڑ کر رکھ دیا ہے۔“ وہ کراہتے ہوئے بولا۔ اس کی ڈینم کی نیلی پتلون ران پر سے لہولہان ہو رہی تھی۔

”کیا خیال ہے؟ کسی پرائیویٹ کلینک چلیں؟“ میں نے پوچھا۔
”جیسے آپ کی مرضی۔“ اس نے کہا۔ اس کی ناک سے بھی خون رس رہا تھا۔ وہ ذرا توقف کر کے بولا۔ ”یہ تو بڑا اچھا اتفاق ہوا ہے کہ آپ یہاں آ گئے، ورنہ ان خبیثوں نے تو میرا بھرتہ بنا دینا تھا۔ آپ نے مجھے دیکھا تھا، یا ویسے ہی رُک گئے تھے؟“

”ہم آگے نکل گئے تھے مگر جب گاڑیوں کے بریک زور سے لگے اور پھر ٹکر کی آواز آئی تو ہم ٹھہر گئے۔ پھر ہمیں پتا چلا کہ تین چار بندے ایک بندے کو گرا کر پیٹ رہے ہیں تو ہم گاڑی سے نکل آئے۔ اس وقت تک ہمیں بالکل پتا نہیں تھا کہ یہ آپ ہیں۔“

”لیکن اس وقت آپ یہاں سے کیسے گزر رہے تھے؟“
”ہم تو ایک شادی میں شرکت کے بعد آئے ہیں۔ گھر کے اندر ہونے والا یہ فنکشن ڈھائی تین بجے تک جاری رہا ہے اور آپ؟“ میں نے پوچھا۔

”میں یہاں دو چار دوستوں کی کمپنی میں تھا، بس وہاں دیر ہو گئی۔“ یوسف نے مبہم جواب دیا۔

ہم تیزی سے فیروز پور روڈ کے ایک پرائیویٹ ہسپتال میں پہنچ گئے۔ ران پر سے یوسف کی پتلون چرگئی تھی اور اس کا خون کسی طرح بند ہونے میں نہیں آ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ مارا ماری میں گاڑی کا کوئی تیز دھار کنارہ یا کوئی ایسی ہی چیز لگی ہے جس نے گہرا گھاؤ ڈالا ہے۔ اندر کی نسیں کٹ گئی تھیں اور مسلز بھی متاثر ہوئے تھے۔ ہسپتال کی ایمرجنسی میں یوسف کو ابتدائی طبی امداد دی گئی۔ اس کا خون بند کیا گیا اور انجکشن وغیرہ لگائے گئے۔ اس کی حالت قدرے بہتر ہو گئی لیکن صاف پتا چلتا تھا کہ ابھی اسے ہسپتال میں ہی رہنا پڑے گا۔ صبح جب سینئر ڈاکٹر اسے دیکھے گا تو پھر ہی ناکے وغیرہ لگانے کا فیصلہ ہوگا۔

یوسف میرا بہت شکر گزار نظر آ رہا تھا۔ وہ میرے دونوں ساتھیوں کے بارے میں بھی

پولیس اسٹیشن میں ہے۔ دونوں گاڑیاں بھی پولیس اسٹیشن میں ہیں۔ معاملہ طے ہو رہا ہے، کچھ دیر میں کام منٹ جائے گا۔ میں جانتا تھا کہ عمران ایسے کاموں میں ماسٹر ہے۔ اس کی مقناطیسی شخصیت کام کرتی تھی اور وہ بہت جلد ایسی گتھیاں سلجھا لیتا تھا۔ نہ صرف سلجھا لیتا تھا بلکہ نئے دوست بھی پیدا کر لیتا تھا۔

سویرے دس بجے کے قریب دو سینئر سرجنز نے یوسف کے زخم کا معائنہ کیا اور ماتحت ڈاکٹر کو اسٹینجنگ اور مرہم پٹی وغیرہ کے بارے میں ضروری ہدایات دیں۔ ان ہدایات میں ایک دونوں کو جوڑنے کا کام بھی شامل تھا۔ اسی دوران میں یوسف نے دو تین جگہ فون پر بھی بات کی۔ ان میں سے ایک کال وسیم احمد کے فون پر بھی تھی۔ یہ وسیم احمد وہی فلم ایڈیٹر تھا جس کے ذریعے شاربہ بائی کے بالا خانے پر ”شب ب سری“ کا سودا ہوا تھا۔ وسیم سے گفتگو کے دوران میں یوسف مبہم زبان استعمال کر رہا تھا، لہذا اسے ”پرائیویسی“ فراہم کرنے کے لیے میں کچھ فاصلے پر چلا گیا۔ بہر حال دور کھڑے ہو کر بھی میں یوسف کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا۔ میں اندازہ لگانا چاہتا تھا کہ وہ اپنی ”شب ب سری“ سے مطمئن ہے یا نہیں؟ دوسرے لفظوں میں کیا اسے شک تو نہیں ہوا کہ اسے منہ مانگے داموں کے عوض دو نمبر مال فراہم کیا گیا۔

بغور جائزہ لینے کے باوجود میں یوسف کے تاثرات سے کوئی اندازہ نہیں لگا سکا۔ یوسف بات ختم کر کے فون بند کر رہا تھا جب میں بُری طرح چونک گیا۔ مجھے ایمر جنسی وارڈ کے دروازے پر ایک جانی پہچانی صورت نظر آئی۔ یہ خود شاربہ بائی تھی لیکن اب وہ ایسے حلیے میں تھی کہ کوئی اس کے اصل پیشے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اونچے گھرانے کی بیگمات کی طرح اس نے سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ ایک قیمتی شال نے نہ صرف اس کا سراپا چھپا رکھا تھا بلکہ نصف چہرہ بھی اوجھل کر رکھا تھا۔ اس کے کندھے پر قیمتی بیگ تھا۔ میں پہلے ہی یوسف سے کافی فاصلے پر تھا، مزید احتیاط کے لیے ایک ستون کی اوٹ میں ہو گیا۔

مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ شاربہ بائی یوں اپنے گاہک کی عیادت کے لیے اس پرائیویٹ ہسپتال میں چلی آئے گی۔ شاربہ کے ساتھ ایک ڈرائیور نما شخص تھا۔ دوسرا موٹی موٹی آنکھوں والا ایک پہلوان نما بندہ تھا۔ اس نے پتلون اور دھاری دار شرٹ پہن رکھی تھی۔ رنگ سرخ و سپید تھا۔ ہاتھ نہیں کیوں مجھے لگا کہ شاربہ بائی کی طرح یہ بھی کوئی ”اچھی شخصیت“ نہیں۔ خاص طور سے اس کی آنکھوں میں ایک بجرمانہ سی چمک پائی جاتی تھی۔ یہ لوگ تھوڑی دیر یوسف کے بستر کے پاس کھڑے ہو کر باتیں کرتے رہے۔ وہ اس سے رات کو پیش آنے

پوچھ رہا تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ وہ معاملے کو سنبھالنے کے لیے موقع پر ہی موجود ہیں۔ میر نے اسے تسلی دی کہ عمران کے ہوتے ہوئے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ وہ صورت حال کو اچھی طرح ہینڈل کر لے گا۔

یوسف کے منہ سے الکل کی ہلکی سی بوا بھی اُٹھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے ایک سیڈنٹ سے پہلے ایک پُر نشاط شب گزاری ہے۔

اس کے سیل فون پر بیل ہوئی۔ اس نے نمبر دیکھا اور قدرے شکر نظر آنے لگا۔ بہر حال اس نے کال اٹینڈ نہیں کی۔ دوسری بار بھی ایسا ہی ہوا تو یوسف نے مجھ سے کہا۔ ”گھر سے ثروت کا فون ہے۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ دو ڈھائی بجے تک آ جاؤں گا لیکن اب پانچ بجنے والے ہیں۔ وہ پریشان ہو رہی ہے۔“

کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے ثروت کا نمبر پر یس کیا اور اس سے بات کی۔ اس کے لب و لہجے میں ناراضی اور روکھے پن کی جھلک تھی۔ وہ بولا۔ ”ہیلو..... یہاں ایک تھوڑا سا مسئلہ ہو گیا ہے۔ نہیں نہیں..... ویسے میں ٹھیک ہوں..... بس گاڑی کا ایک سیڈنٹ ہو گیا تھا۔ بعد میں جھگڑا ہو گیا۔ ٹانگ پر تھوڑی سی چوٹ آئی ہے۔“ دوسری طرف سے کچھ کہا گیا، جواب میں یوسف بولا۔ ”نہیں..... ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں فیروز پور روڈ پر ایک دوست ڈاکٹر صاحب ہیں۔ ان کی طرف آیا ہوا ہوں۔ دو چار سٹیج لگتے ہیں۔ اس کے بعد گھر آ جاؤں گا۔ نہیں..... نہیں اس کی ضرورت نہیں..... اور اچھی بات یہ ہے کہ تمہارے فرسٹ کزن صاحب میرے پاس ہیں۔ بھی اپنے تابش صاحب اور کون؟ بلکہ انہوں نے بڑی مدد کی ہے میری۔ اس وقت بھی میرے پاس ہی بیٹھے ہوئے ہیں۔ فرشتہ سیرت بندے ہیں بھی۔“

یوسف فاروقی سے ثروت نے غالباً پوچھا کہ وہ رات اتنی دیر تک کہاں تھا۔ جواب میں یوسف سپاٹ لہجے میں بولا۔ ”تمہیں بتایا تو تھا ایک چیریٹی شو ہے۔ شو سے نکلے تو دو تین پُرانے دوستوں سے ملاقات ہو گئی۔ انہیں کچھ وقت دینا پڑا۔ ان سے رخصت ہوا تو یہ جھگڑا ہو گیا۔“

وہ سفید جھوٹ بول رہا تھا۔ اس نے امپورٹڈ دھسکی پی کر جس جگہ ”چیریٹی شو“ میں شرکت کی تھی، اس کا صلہ اس نے آخرت کے بجائے یہیں وصول کر لیا تھا اور مطمئن تھا کہ یہ معاملہ یہیں ختم ہو گیا ہے مگر ابھی قدرت کے کھاتوں میں حساب کتاب ہونا باقی تھا۔

کچھ دیر بات کرنے کے بعد یوسف نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں نے فون پر عمران سے بات کی اور اس سے صورت حال پوچھی۔ اس نے بتایا کہ وہ

والے واقعے کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ اس ساری گفتگو کے دوران میں میری نظر کئی بار دھاری دار شرٹ والے شخص کی طرف اٹھی۔ وہ مسلسل بڑے دھیان سے یوسف کا جائزہ لے رہا تھا۔ جیسے نگاہوں میں اسے تول رہا ہو۔ یوسف پہلے ادھر ادھر نگاہ گھما کر مجھے ڈھونڈتا رہا۔ پھر اس نے سیل فون کے ذریعے مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی لیکن میں اس کے سامنے آکر اپنے پاؤں پر کلبھاڑی مارنا نہیں چاہتا تھا۔ شاربہ بائی مجھے فوراً پہچان لیتی۔ وہ اپنے بالا خانے پر مجھے ”جو دھری عمران“ کے ساتھ اس کے ہمراہ دوست کی حیثیت سے دیکھ چکی تھی۔ یہ بڑی گڑبڑ ہو جاتی۔ کچھ دیر بعد شاربہ بائی اور اس کے دونوں ساتھی یوسف کو خدا حافظ کہہ کر چلے گئے۔ میں نے پہلے کھڑکیوں میں سے جھانک کر یہ تسلی کی کہ وہ گاڑی پر بیٹھ کر رخصت ہو گئے ہیں، اس کے بعد یوسف کے پاس چلا گیا۔

سہ پہر کے وقت عمران ہسپتال آکر یوسف کی عیادت کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے فون پر منع کر دیا۔ میں نے بتایا کہ شاربہ بائی یہاں آئی تھی، عین ممکن ہے کہ اس کا کوئی ساتھی یا ملازم اب بھی ہسپتال میں موجود ہو لہذا وہ فون پر ہی یوسف کی خیریت دریافت کر لے۔ عمران نے ایسا ہی کیا۔ اس کے علاوہ اس نے یوسف کو بتا دیا کہ جھگڑے والا معاملہ خوش اسلوبی سے حل ہو گیا ہے۔ دونوں طرف کے افراد کو چوٹیں لگی ہیں اور دونوں گاڑیوں کو بھی نقصان پہنچا ہے۔ لہذا مخالف پارٹی قانونی کارروائی کے بجائے مک مکا پر تیار ہو گئی ہے۔ امید ہے کہ کل تک راضی نامہ تحریر ہو جائے گا۔ یوسف کی گاڑی بھی واپس اس کے گھر پہنچ چکی تھی۔

اس زبردست تعاون پر یوسف نے عمران کا بہت شکریہ ادا کیا۔ اسی دوران میں یوسف کا دوست فلم ایڈیٹر وسیم احمد بھی پہنچ گیا۔ اس کے آنے کے بعد میرے لیے گنجائش پیدا ہو گئی کہ میں گھر واپس جا سکوں اور کپڑے وغیرہ بدل سکوں۔ میں نے یوسف سے شام تک واپسی کا وعدہ کیا اور عمران کے اندرون شہر والے گھر واپس آ گیا۔ عمران اور جیلانی بھی وہیں موجود تھے۔ میرے پہنچنے سے پہلے ہی صورت حال پر تبصرہ ہو رہا تھا۔ یہ بات اب کوئی ڈھکی چھپی نہیں رہی تھی کہ معروف فلمی اداکاراؤں کے ہم شکل ڈھونڈنے اور انہیں استعمال کرنے کا کام بڑے منظم طریقے سے کیا جا رہا ہے۔ یہ کام جاوا اور اس کے گروپ کے لوگ کر رہے تھے۔ اگر لالچ کی تھیوری پر عمل کرتے ہوئے جاوا آرا کوئے والے معاملے میں ہاتھ نہ ڈالتا اور یوں ہم اس کے مال روڈ والے ٹھکانے پر نہ پہنچتے تو ہمیں بھی ان ڈمی اداکاراؤں والے معاملے کا پتہ نہ چلتا۔

اندازہ ہو رہا تھا کہ گھاگ قسم کے لوگ ”ٹیلنٹ ہنٹ“ طرز کی مہم پر نکلے ہوئے ہیں۔

یہ لوگ اشتہار بازی اور دیگر ذرائع سے معروف چہروں کے ہم شکل چہرے تلاش کرتے ہیں۔ ان کی چھاننی وغیرہ کی جاتی ہے اور آخر میں کچھ چہرے منتخب کر کے اگلے مرحلے میں پہنچا دیئے جاتے ہیں۔

میں نے نہادھو کر کپڑے بدلے۔ خوب بھوک لگ رہی تھی۔ عمران نے قریبی بازار سے گرم نان، مرغ پننے اور بریانی پر مشتمل ریڈی میڈ کھانا منگوا یا۔ سویٹ ڈش کے طور پر لاہوری فالودہ تھا۔ کھانے سے فارغ ہو کر میں برتن سمیٹ رہا تھا جب میرے سیل فون پر نصرت کی کال آئی۔ ”ہیلو نصرت گڑیا! کیا حال ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”میں بالکل ٹھیک ہوں بھائی جان! لیکن یہ آپ نے کیا چکر چلایا ہے۔ باجی بتا رہی ہیں کہ یوسف کا کوئی لڑائی جھگڑا ہوا ہے اور چوٹ آئی ہے اسے..... کیا واقعی؟“

”ہاں..... ایسا ہوا تو ہے۔ اس کی گاڑی کی ٹکر ہو گئی تھی جس کے بعد جھگڑا ہوا۔“

”گاڑی تو میں نے بھی دیکھی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے دو بندے گیراج میں چھوڑ کر گئے ہیں۔ ایک طرف سے بچکی ہوئی ہے لیکن..... لیکن یہ سمجھ میں نہیں آ رہا کہ آپ وہاں کیسے پہنچے؟ کیا یہ اتفاق تھا یا آپ کو پہلے سے کچھ معلوم تھا؟“

”بس اتفاق ہی سمجھو۔“

”یعنی آپ کو تھوڑا بہت اندازہ تھا کہ یوسف فلاں وقت پر فلاں جگہ موجود ہوگا۔ کہیں آپ کا کوئی دوست اس کا پیچھا تو نہیں کر رہا تھا؟“

”اس بارے میں تمہیں پھر تفصیل سے بتاؤں گا پیاری بہن! ابھی ایک دو اور ضروری کام کرنے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اچھا صرف ایک بات بتا دیجیے تابش بھائی! کیا یوسف واقعی کوئی چیرٹی شو دیکھنے گیا ہوا تھا؟“

”تمہیں کیا لگتا ہے؟“

”مجھے تو اس سے ہرگز کسی اچھے کام کی توقع نہیں ہے۔ وہ ضرور کسی اور چکر میں ہوگا۔“

”کم از کم مجھے اس چکر کا پتا نہیں۔ میں وہی جانتا ہوں جو یوسف صاحب نے مجھے بتایا ہے۔“

”اس کا نام اتنی غزت سے مت لیں تابش بھائی! مجھے نفرت ہو گئی ہے اس بندے سے۔ باجی اس کے لیے انسان نہیں ایک اثاثے کی طرح ہیں اور وہ اپنے اس اثاثے سے ہر قسم کا فائدہ حاصل کرنا چاہتا ہے اور..... اور مجھے لگتا ہے کہ آپ بھی مجھ سے بہت کچھ چھپا

رہے ہیں۔ اگر آپ یا آپ کا کوئی دوست اس کا پیچھا کر رہے تھے تو پھر آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ وہ رات کے اس پہر چیرٹی شو دیکھ کر آ رہا تھا یا کوئی اور کام دکھا رہا تھا۔“

”میں سچ کہتا ہوں نصرت! مجھے ابھی اتنا ہی معلوم ہے جتنا میں نے تمہیں بتایا ہے۔“

میں نے دروغ مصلحت آمیز سے کام لیا۔
میں نے نصرت سے بمشکل پیچھا چھڑایا۔



مجھے ہسپتال سے آئے ہوئے اب تین چار گھنٹے ہو چکے تھے۔ میں نے سوچا کہ یوسف کو فون کر کے صورت حال دریافت کروں۔ میں نے اس کا نمبر ملایا۔ نیل ہوتی رہی مگر کال ریسیو نہیں کی گئی۔ کچھ دیر بعد میں نے دوبارہ کوشش کی۔ اس مرتبہ فون ہی بند ملا۔ میں وقفے وقفے سے قریباً آدھ گھنٹے تک فون کرتا رہا لیکن فون آف تھا۔ میرا اندازہ تھا کہ وسیم احمد، یوسف کے پاس ہی ہوگا مگر مجھے اس کا فون نمبر معلوم نہیں تھا۔“

اس دوران میں عمران نے ہسپتال کا نمبر معلوم کر لیا۔ میں نے اس نمبر کے ذریعے ایمرجنسی وارڈ میں رابطہ کیا۔ موقع پر موجود نرس نے بتایا کہ بیڈ نمبر 6 پر کوئی مریض موجود نہیں ہے۔

میں نے کہا۔ ”انہوں نے روم میں شفٹ ہونا تھا۔ آپ دیکھیں، وہ روم میں تو نہیں ہیں۔“

کاغذ کے الٹ پلٹ ہونے کی آوازیں آتی رہیں، پھر نرس نے بتایا۔ ”نہیں..... وہ کسی روم میں شفٹ نہیں ہوئے۔“

”تو کہاں جا سکتے ہیں وہ؟ واش روم وغیرہ میں تو نہیں گئے؟“
نرس کے بجائے ڈیوٹی ڈاکٹر کی مردانہ آواز سنائی دی۔ ”آپ بیڈ نمبر 6 کے یوسف فاروقی کے باسے میں پوچھنا چاہ رہے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ میں نے کہا۔
”آپ ان کے کیا لگتے ہیں؟“

”میں ان کا دوست ہوں۔ میں ہی انہیں لے کر آیا تھا۔“
ڈیوٹی ڈاکٹر نے کہا۔ ”یوسف صاحب کچھ بھی بتائے بغیر چلے گئے ہیں اور ابھی واپس نہیں آئے۔“

”کیا مطلب؟“

”مطلب تو ہمیں معلوم نہیں جی! ان کے دو ساتھی آئے تھے۔ وہ انہیں وہیل چیئر پر باہر لے جا رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ وہ کہاں جا رہے ہیں اس حالت میں؟ کہنے لگے سامنے گاڑی تک جا رہا ہوں۔ ابھی پانچ منٹ میں آ جاتا ہوں۔ میں نے کہا کہ ان کو اس حالت میں جانا نہیں چاہیے۔ انہوں نے کہا کہ مجبوری ہے۔ اب دو گھنٹے ہو گئے ہیں، ان کا کچھ پتا نہیں۔“

میں نے فون بند کیا اور عمران سے کہا۔ ”یہاں بھی گڑبڑ ہو گئی ہے۔ یوسف ہسپتال سے کہیں چلا گیا ہے۔“

”کہاں جا سکتا ہے؟“ عمران نے پُرسوج لہجے میں کہا۔
جیلانی بولا۔ ”بعض لوگ ہسپتال تبدیل کرتے وقت بھی بتاتے نہیں اور بہانے سے نکل جاتے ہیں۔ یہ بھی تو یہی کیس نہیں؟“

”مجھے تو لگتا ہے کہ اس معاملے میں شاربہ بائی کا عمل دخل ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے یوسف کو کوئی مشورہ دیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جو دو بندے آئے، وہ بھی اسی کے بھیجے ہوئے ہوں۔“ میں نے کہا۔

”لیکن اس میں ڈراما کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ لوگ ڈاکٹر سے سیدھے سیدھے کہہ سکتے تھے کہ ہم ڈسپنچر جانا چاہتے ہیں۔“ عمران نے کہا۔

میں اور عمران فوراً ہسپتال کے لیے روانہ ہوئے۔ عمران نے اپنی مہران کار ہسپتال سے کچھ فاصلے پر کھڑی کی۔ میں اندر چلا گیا۔ ڈیوٹی ڈاکٹر تیس بیس سال کا سنجیدہ سا شخص تھا۔ اس نے بتایا کہ ابھی تک مریض کا کچھ پتا نہیں۔ نہ ہی کوئی فون وغیرہ آیا ہے۔ میں نے کہا۔ ”ڈاکٹر صاحب! آپ کو ان کی حالت کا پتا تھا۔ آپ نے انہیں اس طرح جانے کیوں دیا؟“

وہ بولا۔ ”محترم! ہم کسی کوز بروستی روک نہیں سکتے۔ آپ جانتے ہی ہیں، یہاں مریض کے داخل ہوتے ہی کچھ رقم ایڈوائس میں جمع کر لی جاتی ہے۔ اس ایڈوائس کے ہوتے ہوئے ہمارے پاس کوئی جواز نہیں رہ جاتا کہ ہم کسی مریض کو نقل و حرکت سے روکیں۔“

”لیکن ڈاکٹر صاحب! مریض کی جسمانی حالت بھی تو ہوتی ہے۔ آپ جانتے ہیں ابھی ان کے زخم کی اسٹچنگ بھی نہیں ہوئی تھی۔“

”نہیں اسٹچنگ تو ہو چکی ہے۔ یہ دیکھئے یہ سب کچھ لکھا ہے فائل میں۔ اس کے باوجود میں نے انہیں باہر جانے سے منع کیا تھا۔“

تمہیں فون کر لے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں..... میں انتظار کر رہی ہوں۔“

”اوکے..... میں نے کہا۔“

بات ختم ہو گئی تھی لیکن فون بند ہونے کی آواز نہیں آئی۔ میں نے فون کان سے لگائے رکھا۔ شاید وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتی تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس کی آواز ابھری۔ وہ بدلے ہوئے لہجے میں بول رہی تھی۔ ”تابش.....“

”ہاں۔“

”مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کو بہت دکھ دیئے ہیں۔“

”یہ دکھ مجھے ہر سکھ سے زیادہ عزیز ہیں ثروت۔“

”میری ایک بات مان لیں تابش! آپ شادی کر لیں۔ میں نے آپ کے لیے بڑی دعائیں مانگی ہیں۔ مجھے یقین ہے، آپ کو بڑی اچھی لڑکی ملے گی۔ وہ آپ کے ہر دکھ کو سکھ میں بدل دے گی۔ مجھے یقین ہے تابش۔“

”مجھے میرے حال پر رہنے دو ثروت! میں بالکل ٹھیک ہوں اور نصرت کی باتوں پر نہ جایا کرو۔ وہ جو کچھ کہتی ہے، وہ اس کی اپنی سوچ ہوتی ہے۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ وہ جب تم پر کوئی دباؤ ڈالتی ہے تو خود مجھے بھی برا لگتا ہے۔“

وہ روہاسی آواز میں بولی۔ ”آپ بالکل ٹھیک ہیں تو مجھے ایسا کیوں لگتا ہے کہ آپ ٹھیک نہیں ہیں۔ کیوں یہ ادا دل ہر وقت مجھے ملامت کرتا ہے۔ کیوں میں خود کو زنجیروں میں جکڑا محسوس کرتی ہوں۔ پلیز تابش..... پلیز..... مجھ پر رحم کریں۔ مجھے آزاد کر دیں اور میں تب ہی آزاد ہوں گی، جب آپ ٹھیک ہوں گے۔“

میں نے کہا۔ ”اگر اپنے ارد گرد میری موجودگی تمہیں پریشان کرتی ہے تو میں دور چلا جاتا ہوں۔ کوشش کرتا ہوں کہ تمہیں دکھائی نہ دوں۔“

اس نے کچھ نہیں کہا۔ اس کے سسکنے کی مدھم آواز آتی رہی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے فون بند کر دیا۔

میری پریشانی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ ثروت بے چینی سے یوسف کے فون کا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اس سے کہا تھا کہ ابھی تھوڑی دیر میں یوسف سے رابطہ کراتا ہوں۔ لیکن یوسف کہیں نہیں تھا۔ وہ ہسپتال سے غائب ہو چکا تھا۔

وسیم احمد اس صورت حال سے پریشان تھا۔ میں جب فون پر عمران سے بات کر رہا تھا

اسی دوران میں مجھے ہسپتال کے مین دروازے پر یوسف کے دوست وسیم احمد کی صورت دکھائی دی۔ وہ حواس باختہ تھا اور اس کا رنگ پھیکا پڑا ہوا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ سیدھا میری طرف آیا۔ ”کچھ پتا چلا یوسف کا؟“ اس نے چھوٹے ہی پوچھا۔

”یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ اس کے پاس تو تم تھے۔“ میں نے کہا۔

”میں صرف آدھ گھنٹے کے لیے گیا تھا۔ مجھے اپنے بھتیجے کو کالج سے لے کر گھر چھوڑنا تھا۔ واپس آیا تو یوسف نہیں تھا۔ یہ ڈاکٹر صاحب کوئی اور کہانی سنار ہے ہیں۔ یوسف کا فون بھی مسلسل بند جا رہا ہے۔“

”اب تم کہاں سے آرہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”یہاں پاس ہی دو تین اور پرائیویٹ کلینکس بھی ہیں۔ دیکھ کر آیا ہوں کہ شاید وہ وہاں شفٹ ہوا ہو۔ اسٹپنگ کے باوجود اس کا خون رِس رہا تھا اور وہ پاؤں کون محسوس کر رہا تھا۔“

پھر وسیم احمد نے مجھے اشارے سے ایک طرف بلایا۔ ہم کچھ دور کوریڈور میں چلے گئے۔ وہ سرگوشی کے انداز میں بولا۔ ”کہیں یہ وہی کل رات کے پھڈے والا معاملہ تو نہیں۔ جن لوگوں سے یوسف کا جھگڑا ہوا تھا، وہ اسے ڈرا دم کا کریا بہلا پھسلا کر لے گئے ہوں؟“

میں نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اسی دوران میں میرے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ میں نے چونک کر دیکھا لیکن یہ یوسف کا نہیں ثروت کا نمبر تھا۔ کچھ دیر تک تذبذب میں رہنے کے بعد میں نے کال ریسیو کی۔ ”ہیلو۔“

کچھ دیر خاموشی رہی پھر ثروت نے پریشان آواز میں کہا۔ ”کیا بات ہے، یوسف فون کیوں انیڈ نہیں کر رہے؟ پچھلے دو گھنٹے سے کوشش کر رہی ہوں۔“

”وہ دراصل پین محسوس کر رہا تھا۔ ڈاکٹر نے پین کا انجکشن لگایا ہے اور ٹرکولائزر دیا ہے۔ وہ سو گیا ہے۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔

”آپ اس وقت کہاں ہیں؟“

”ہسپتال میں ہوں۔“

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”میں پریشان ہوں۔ کہیں..... آپ لوگ مجھ سے کچھ چھپا تو نہیں رہے۔ آخر..... آپ بتاتے کیوں نہیں کہ کس ہسپتال میں ہیں؟ اس میں چھپانے والی کون سی بات ہے؟“

”چھپانے والی کوئی بات نہیں۔ یوسف کا خیال تھا کہ دو چار گھنٹوں میں اسے گھر چلے ہی جانا ہے پھر تم لوگوں کو تکلیف دینے کا فائدہ۔ ابھی وہ جاگتا ہے تو میں اس سے کہتا ہوں کہ

وہ کہیں کھسک گیا۔ شاید اس نے جان لیا تھا کہ اب یہ معاملہ پولیس تک جانے والا ہے۔ وہ اس پھدے سے بچنا چاہتا تھا۔ یقیناً اسے یہ ڈر بھی رہا ہوگا کہ یوسف کا بھید کھل جائے گا اور پتا چل جائے گا کہ کل رات وہ کہاں تھا۔

میں عمران کے پاس گاڑی میں پہنچا۔ اس نے پوچھا۔ ”تمہارے چہرے پر ہوائیاں کیوں اڑ رہی ہیں؟“

”یار! میں اس سارے معاملے میں ملوث ہو چکا ہوں۔ ثروت کو بتا چکا ہے کہ یوسف کے زخمی ہونے کے بعد اس کے ساتھ میں تھا۔ میں ہی اسے ہسپتال لے کر گیا تھا۔ اب وہ یوسف کے بارے میں ہر بات مجھ سے پوچھ رہی ہے۔“

”تو کوئی بات نہیں جگر! ڈھونڈ لیتے ہیں اسے۔ امید ہے کہ مل جائے گا اور اگر نہ بھی ملا تو تمہارے لیے تو اچھا ہی ہے۔“

”اسی بات سے تو ڈر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”کہیں ثروت کے ذہن میں کوئی الٹی سیدھی بات نہ آجائے۔“



میں اور عمران ہسپتال کے سامنے سے یوسف کی تلاش میں روانہ ہوئے۔ اگلے قریباً چار گھنٹے ہم نے شہر کی سڑکیں ناپتے ہوئے گزارے۔ مختلف ہسپتالوں میں گئے۔ تھانوں وغیرہ میں پتا کرایا۔ قریباً وہ سب جگہیں دیکھیں جہاں یوسف کے پائے جانے کا امکان ہو سکتا تھا۔ وسیم احمد تو کہیں غائب ہو گیا تھا۔ ہم نے یوسف کی ملازمہ حمیدن کے تعاون سے یوسف کے ایک اور دوست ابو بکر کا پتا چلایا اور پھر ابو بکر کے ذریعے ہم نے کئی ایسے ٹھکانے دیکھے جہاں یوسف کی موجودگی کا امکان تھا۔ اس ساری بھاگ دوڑ کے دوران میں ہمیں اپنی طرف سے بھی محتاط رہنا پڑ رہا تھا۔ صرف دو دن پہلے ہمیں لاہور کی سڑکوں پر جاوا کے غنڈوں سے ہمارا بھرپور ٹاکرا ہو چکا تھا۔ وہ لوگ اب بھی آس پاس موجود ہو سکتے تھے۔ بہر حال اس وقت ہم بھی غافل نہیں تھے۔ مہراں گاڑی کے خفیہ خانے میں ٹرپل ٹورانٹل اور ماڈر موجود تھا۔ کافی ایمنیشن بھی تھا۔ ذہنی طور پر بھی ہم پوری طرح تیار تھے۔

حیران کن طور پر یوسف کا کوئی کھوج لگا اور نہ اس کی طرف سے کوئی رابطہ کیا گیا۔ اس دوران میں تین چار بار ثروت اور نصرت کی کالز میرے سیل فون پر آچکی تھیں لیکن میں نے انہیں اٹینڈ نہیں کیا۔ میری یہ خاموشی میری پوزیشن کو مزید خراب کر رہی تھی۔ میرا دھیان باز بار بار شاربہ بانی کی طرف جا رہا تھا۔ وہاں ہمارا جانا خطرے سے خالی تو نہیں تھا مگر اب خطرہ مول لینے بغیر چارہ بھی نہیں تھا۔ شاربہ بانی کی طرف روانہ ہونے سے پہلے میں نے ثروت کو کال کر دینا ضروری سمجھا۔ رابطہ ہوا تو وہ پریشان آواز میں بولی۔ ”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟ کیوں ہماری جان نکال رہے ہیں؟ آپ یوسف سے رابطہ کیوں نہیں کراتے۔“

میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”ثروت! میں تمہیں یوسف کے بارے میں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔ وہ ویسے تو بالکل ٹھیک ہے لیکن ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔“

”کیا ہو گیا ہے؟“ ایک مشرقی بیوی کی حیثیت سے ثروت کے لہجے میں سیکڑوں اندیشے سمٹ آئے۔

”وہ ہسپتال میں نہیں ہے میں کچھ دیر کے لیے کپڑے وغیرہ بدلنے گیا تھا۔ واپس آیا تو وہ جاچکا تھا۔“

”جاچکا تھا؟ آپ خود کہتے ہیں کہ وہ چل پھر نہیں سکتے تھے۔“ ثروت نے قریباً چلا کر کہا۔

”ڈیوٹی ڈاکٹر بتا رہا ہے کہ وہ بندے آئے تھے۔ وہ پہلے یوسف سے باتیں کرتے رہے۔ پھر یوسف ان کے ساتھ وہیل چیئر پر مین دروازے کی طرف چلا گیا۔ اس نے کہا کہ وہ ابھی پانچ منٹ میں بیڈ پر واپس آ رہا ہے لیکن وہ آیا نہیں۔“

”اوگاڈا! میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ آپ یہ تو بتائیں کہ آپ ہیں کہاں؟ کس ہسپتال سے بات کر رہے ہیں؟“

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، ثروت سے فون کسی اور نے لے لیا۔ یہ ایک بھرائی ہوئی سی مردانہ آواز تھی۔ پتا چلا کہ یہ یوسف کے والد فاروقی صاحب ہیں۔ وہ دوسرے کے مریض تھے اور آج کل شدید بیمار تھے۔ انہوں نے ہانپتے ہوئے لہجے میں مجھ سے صورت حال دریافت کی۔ میں نے وہ سب کچھ بتا دیا جو اس سے پہلے ثروت کو بتایا تھا۔ انہوں نے ہسپتال کا نام پوچھا۔ میں نے ہسپتال کا نام بھی بتا دیا۔ وہ بولے۔ ”ہم پندرہ بیس منٹ میں ہسپتال پہنچ رہے ہیں۔“

میں نے انہیں بتایا کہ میں ہسپتال میں نہیں ہوں۔ یوسف کے ایک دوست کے ساتھ ہی اس کی تلاش میں نکلا ہوا ہوں۔ میں نے ان سے کہا کہ ڈیوٹی پر موجود ڈاکٹر انہیں ساری تفصیل بتا دے گا۔

ثروت کے گھر والوں کو ہسپتال کا پتا کر میں نے خود کو قدرے ہلکا محسوس کیا۔ میرا دھیان بار بار شاربہ بائی کی طرف ہی جارہا تھا۔ وہ یوسف کے لاپتا ہونے سے صرف دو ڈھائی گھنٹے پہلے اس سے ملنے ہسپتال آئی تھی۔ بظاہر وہ بیمار داری کے لیے آئی تھی لیکن یہ بات دل کو کچھ گت نہیں تھی۔ شاربہ اور یوسف کے درمیان صرف گاہک اور ناناکا کا رشتہ تھا اور یہ رشتہ بھی فقط دو چار دن پہلے وسیم احمد کے ذریعے ہی استوار ہوا تھا۔ پھر مجھے بار بار وہ پیکل آنکھوں والا شخص بھی یاد آ رہا تھا جو شاربہ بائی کے ساتھ یوسف کی مزاج پرسی کے لیے آیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں یوسف کے لیے غیر معمولی توجہ اور دلچسپی تھی۔ میں نے یہ سب کچھ عمران کے گوش

گزار کیا۔

وہ بولا۔ ”بات کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی۔ شاربہ بائی جیسے لوگ خوش شکل لڑکیوں کو تو غائب کر سکتے ہیں لیکن یوسف فاروقی جیسے چھبیس ستائیس سالہ بندے سے انہیں کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ بظاہر یہ کوئی اغوا اور تادان والا معاملہ بھی نہیں لگ رہا۔ بس ایک ہی بات کی طرف دھیان جاتا ہے۔“

”وہ کیا؟“

”ہو سکتا ہے کہ کل رات شاربہ کی کوٹھی میں چند گھنٹے گزارنے کے بعد یوسف کو معلوم ہو گیا ہو کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ جو لڑکی اس کو دی گئی ہے وہ فلمی ہیروئن نہیں بلکہ اس کی نقل ہے۔ ظاہر ہے کہ یوسف نے دس لاکھ روپیہ نقل کے لیے خرچ نہیں کیا تھا۔ اسی بات پر خریدار اور دکاندار میں جھگڑا ہوا ہو گا۔ دکاندار یعنی شاربہ نے اس خوف سے کہ راز طشت از بام ہو جائے گا اور دوسرے گاہک بھی متاثر ہوں گے۔ خریدار کو غائب کر دیا ہو۔“

”تمہاری بات خارج از امکان نہیں عمران! لیکن پتا نہیں کیوں مجھے ایسا نہیں لگتا۔ ہسپتال پہنچنے کے کچھ ہی دیر بعد یوسف نے فون پر اپنے ہم راز وسیم احمد سے فون پر بات کی تھی۔ اس گفتگو کے دوران میں، میں کچھ فاصلے پر موجود تھا۔ میں بڑے غور سے یوسف کے چہرے کا جائزہ لیتا رہا۔ مجھے بھی شک تھا کہ شاید وہ وسیم سے شاربہ بائی کی دھوکا دہی کے بارے میں کوئی بات کرے لیکن مجھے نہیں لگتا کہ اس نے کوئی ایسی بات کہی ہو۔“

میری اور عمران کی گفتگو کے بعد یہ ضروری محسوس ہوا کہ ہم ایک بار شاربہ بائی سے بات کریں اور اس واقعے کے بارے میں اس کا رد عمل معلوم کریں۔ ایک طریقہ تو یہ تھا کہ ہم سیدھے شاربہ بائی کے کونٹھے پر پہنچ جاتے لیکن پچھلی بار شاربہ بائی کے کونٹھے پر پہنچنا ہمارے لیے ایک لحاظ سے خطرناک ثابت ہوا تھا۔ وہاں جاوا کا کوئی گرگامو موجود تھا اور اس نے ہمیں پہچان لیا تھا۔ وہیں سے لوگ ہمارے پیچھے لگے تھے جس کا نتیجہ ہوٹل لالہ زار کی زوردار لڑائی کی صورت میں نکلا تھا۔

دوسری صورت یہ تھی کہ ہم خود بازار حسن میں جانے کے بجائے بذریعہ فون شاربہ بائی سے رابطہ کریں اور اس معاملے کی ٹوہ لیں۔ عمران کے پاس شاربہ بائی کے بالا خانے کا نمبر موجود تھا۔ وہیں گاڑی میں بیٹھے بیٹھے اس نے کال ملانے کی کوشش کی۔ پہلے دو تین بار تو کسی نے فون اٹھایا ہی نہیں پھر کسی دلال ٹائپ شخص نے کال اٹینڈ کی۔ وہ چھاڑ کھانے والے لہجے میں بول رہا تھا۔ عمران نے اس سے گاہک کی حیثیت سے بات کی اور اسے کہا کہ وہ شاربہ

عمران نے پوچھا۔ ”وہ بندہ کون تھا جو عیادت کے وقت اس کے ساتھ تھا؟“
 ”اس کا نام بشیر احمد ہے۔ وہ بازار ہی کا بندہ ہے۔ اس نے ایک پلازا ٹھیکے پر لیا ہوا ہے۔ میں اس سے بھی ملا ہوں۔ وہ کہتا ہے کہ وہ تو یونہی شاربہ بانی کے ساتھ گاڑی میں بیٹھ گیا تھا۔“

”تمہارا اپنا اندازہ کیا ہے شاربہ بانی کے بارے میں؟“ عمران نے پوچھا۔
 انسپکٹر شوکت بولا۔ ”میں اس عورت کو تھوڑا بہت جانتا ہوں۔ اپنے پیشے میں تو ایک دم ماسٹر ہے۔ بازار میں کافی ساکھ ہے اس کی۔ تھوڑا بہت تعلق فلم والوں سے بھی ہے اس کا۔ میرے اندازے کے مطابق تو یہ اپنے ہاتھ صاف رکھتی ہے۔ کسی پھڈے والے کام میں نہیں پڑتی۔ مجھے اس تھانے میں ڈیڑھ دو سال ہو گئے ہیں۔ بس دو تین بار ہی ایسا ہوا ہے کہ اس کی کوئی لڑکی تھانے آئی ہے۔ اس سے پہلے کا ریکارڈ بھی تقریباً صاف ہی ہے۔“
 انسپکٹر شوکت سے عمران نے پندرہ بیس منٹ گفتگو کی۔ انسپکٹر کی گفتگو تو شاربہ بانی کے حق میں ہی تھی۔ عمران بولا۔ ”یا تو بانی واقعی اس معاملے میں ملوث نہیں یا پھر انسپکٹر نے حرام زدگی کی ہے۔ تھوڑا بہت مال کھالیا ہے بانی سے۔“

میں نے کہا۔ ”یہ فرما رہا ہے کہ شاربہ بانی اپنے ہاتھ صاف رکھتی ہے اور کسی پھڈے والے کام میں نہیں پڑتی لیکن یہاں تو یہ پھڈے والا کام کر رہی ہے۔ جاوے اور سلطان چٹے وغیرہ کی آکے کار بنی ہوئی ہے۔ اصلی ڈبے میں نقلی مال بیچ رہی ہے۔“
 ”ہاں..... یہ بات تو ہے۔“ عمران نے سر ہلایا اور ایک بار پھر بذریعہ فون شاربہ بانی سے رابطے کی کوشش کرنے لگا۔

ایک بار پھر اسی زہریلے دلال سے واسطہ پڑا۔ عمران کی آواز پہچانتے ہی اس نے ریسیور ہٹ دیا۔

میں نے کہا۔ ”کیوں نہ ایک بار بانی جی سے ملنے کا رسک لے ہی لیا جائے۔“
 ”تو ٹھیک ہے جگر! رسک کے لیے تو ہم ہر وقت تیار ہیں۔ رسک لینے کی ہمت اور جرأت ہمارے خاندان میں ٹوپی سے آئی ہے۔“
 ”ٹوپی؟ یہ کون تھا؟“

”یاروہی اپنا پوئلین بونا پارٹ۔ دادا جی کا لنگوٹیا یا رتھا وہ۔ دونوں نے اکٹھے ہی میٹرک کیا تھا پھر پوئلین تو فوج میں چلا گیا، فرانس کو آزاد شہزادہ کرنے کے لیے اور دادا جی نے بادامی باغ میں اسپیر پارٹس کی دکان کھولی لیکن دونوں کی دوستی برقرار رہی۔ جب بھی موقع ملتا تھا،

بائی کولائن پر بلائے۔ اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھا اور پھر دکھے پھیکے لہجے میں بولا کہ وہ دوا کھا کر سو رہی ہیں۔ اس سے پہلے کہ عمران کسی طرح کی ”آرگو میٹ“ کرتا، فون کھناک سے بند کر دیا گیا۔

عمران نے دوبارہ کوشش کی۔ اس مرتبہ بھی تین چار منٹ بعد کال انینڈ ہوئی۔ بولنے والا پھر وہی غصیلا ایجنٹ تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ بدتمیزی سے بولا اور فون بند کر دیا گیا۔

عمران نے دوبارہ کوشش کی۔ اس مرتبہ بھی تین چار منٹ بعد کال انینڈ ہوئی۔ بولنے والا پھر وہی غصیلا ایجنٹ تھا۔ وہ پہلے سے بھی زیادہ بدتمیزی سے بولا اور فون بند کر دیا۔

عمران نے اسے غائبانہ دو تین صلواتیں سنائیں، پھر علاقے کے انسپکٹر سے رابطہ کیا۔ یہ وہاں کا ایس ایچ او بھی تھا۔ عمران کے ساتھ اس کا تعارف راجا والے جھگڑے کے دوران میں ہوا تھا۔ عمران نے شوکت نامی اس انسپکٹر کو فون پر ہی ساری صورت حال بتائی اور اسے کہا کہ وہ شاربہ بانی کے کوشھے پر جائے اور اندازہ لگانے کی کوشش کرے کہ شاربہ بانی کا ہاتھ یوسف کی کشدگی والے معاملے میں ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کہاں تک ہے۔ انسپکٹر شوکت ذہین بندہ لگتا تھا اور خاصا معاملہ فہم بھی تھا۔ اس نے کہا کہ وہ فیصل ٹاؤن سے ایک بندے کو گرفتار کرنے جا رہا تھا لیکن اب یہ کام ملتوی کر کے سیدھا ہیرا منڈی پہنچتا ہے اور ایک ڈیڑھ گھنٹے میں رپورٹ دیتا ہے۔“

ہم اندرون شہر والے گھر واپس آ گئے اور بے قراری سے انسپکٹر کے فون کا انتظار کرنے لگے۔ اس دوران میں ایک بار ثروت کی کال بھی آئی لیکن مجھے سننے کی ہمت نہیں ہوئی۔ میں قصور وار نہیں تھا۔ لیکن پتا نہیں کیوں پھر بھی خود کو قصور وار محسوس کر رہا تھا۔ قریباً ڈیڑھ گھنٹے بعد انسپکٹر شوکت نے عمران کے موبائل پر کال کی۔ عمران نے پسپیکر آن کر دیا تاکہ میں بھی انسپکٹر کے ساتھ ہونے والی گفتگو سن سکوں۔

انسپکٹر نے کہا۔ ”عمران صاحب! شاربہ بانی واقعی دوا کھا کر سوئی ہوئی تھی۔ میں نے اسے مشکل سے جگایا۔ اسے اس بات کا انوسوس ہے کہ اس کی گلبرگ والی کوٹھی کے عین سامنے کچھ لوگوں نے اس کے گاہک پر حملہ کر کے اسے زخمی کیا ہے۔ اسی لیے وہ یوسف فاروقی کی عیادت کے لیے ہسپتال بھی گئی تھی۔ بہر حال وہ تو اس بات سے بالکل انکاری ہے کہ یوسف کے گم ہونے میں اس کا کوئی ہاتھ ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ اپنی مرضی سے ہی تمہیں گیا ہے۔ وہ یہاں اپنے علاج سے مطمئن نہیں تھا، ہو سکتا ہے کہ کسی اور ہسپتال میں داخل ہو گیا ہو۔ اسے امید ہے کہ دو چار گھنٹوں میں اس کی طرف سے کوئی فون وغیرہ آجائے گا۔“

بازارِ حُسن ایک بار پھر جو بن پر تھا۔ جگمگاتی روشنیاں، کھڑکیوں میں لہراتے آنچل۔ سرخی پاؤں سے لتھڑے ہوئے نئے اور سینکڑے ہینڈ چرے، ٹھنکر دوں کی چھنا چھن، پکوانوں کی مہک، دلالوں کی آوازیں، بیچروں کے ٹھٹھے اور ان سب کے اندر مویے کی پاکیزہ خوشبو..... جیسے گندی نالی میں کوئی ہیرا جگمگا رہا ہو۔

بازار کے اندر رش تھا۔ بغلی گلیوں میں تو کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ ہم نے اپنی گاڑی شاربہ بانی کے پلازما بلا خانے سے کچھ فاصلے پر ہی روک دی۔ کہیں پاس کے کوٹھے پر فلم امراؤ جان کا گیت گونج رہا تھا۔ جو بچا تھا وہ لٹانے کے لیے آئے ہیں۔

ابھی ہم گاڑی سے اترنے اور شاربہ بانی کے ٹھکانے کی طرف جانے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ ایک عجیب واقعہ ہوا۔ شاربہ کے پلازما بلا خانے کی طرف سے ایک نوخیز لڑکی تیزی کے ساتھ آئی۔ اس نے خود کو ایک لمبی چادر میں لپیٹ رکھا تھا۔ وہ واضح طور پر خوف زدہ بلکہ حواس باختہ دکھائی دیتی تھی جیسے کوئی پیچھے لگا ہوا ہو لیکن بظاہر کوئی اس کے پیچھے بھی نہیں تھا۔ وہ ایک خوش پوش بیچروے سے ٹکرائی۔ بیچروے نے اپنی پھٹی ہوئی آواز میں کچھ کہا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا، اس کی ہمیں ہرگز توقع نہیں تھی۔ لڑکی کی نگاہ ہماری کار پر پڑی۔ وہ کار کی طرف آئی۔ اس نے عقبی دروازہ کھولا اور غراپ سے اندر بیٹھ گئی۔ نہ صرف بیٹھ گئی بلکہ اس نے خود کو بچھلی نشست پر نیم دراز کر دیا۔ نیم تاریکی میں وہ ہمیں اچھی طرح دیکھ سکتی تھی نہ ہم۔ وہ لڑکاں آواز میں بولی۔ ”پلیز! میری مدد کریں۔ وہ غنڈے میرے پیچھے ہیں..... پلیز۔“

آخری الفاظ کہتے کہتے وہ کچھ اور بھی بچنے ہو گئی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ نشست پر دراز ہو گئی ہے۔ پرفیوم کی خوشبو ساری گاڑی میں بھری گئی تھی۔ ایک کھڑکی سے آنے والی روشنی سیدھی لڑکی کے چہرے اور گردن پر پڑ رہی تھی۔ اس کی عمر بیس سال کے قریب ہوگی۔ نفوش اچھے تھے۔ کانوں میں طلائی جھمکے نظر آ رہے تھے۔ آنکھوں میں خوف جما ہوا تھا۔

”کون لوگ ہیں؟“ عمران نے پوچھا۔

”بازار کے ہی ہیں۔ م..... مجھے زبردستی لے جانا چاہتے ہیں۔“

”کہاں؟“

”اپنے مالک کے پاس۔ بہت بُرا بندہ ہے۔ م..... میں اسے جانتی ہوں۔“

لڑکی کے لب و لہجے اور کسی حد تک حلیے سے بھی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسی بازار کی چیز ہے۔ ایک نوجوان طوائف جو کسی ڈر سے یہاں آچھپی ہے لیکن پھر بھی یہ بازارِ حُسن تھا۔ یہاں ہر طرف گھاتیں لگی ہوئی تھیں اور پوری طرح چوکس رہنے کی ضرورت تھی۔ کیا کہا جاسکتا

وہ جیسر یا لاہور میں ملتے رہتے تھے۔ شاید تمہیں یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ پھولین نے جاپان پر ایٹم بم گرانے کا جو خطرناک فیصلہ کیا تھا، وہ دادا جی کے مشورے سے ہی کیا تھا۔ ”جاپان پر بم پھولین نے نہیں، امریکہ نے گرایا تھا اور اس وقت روز ویلٹ امریکہ کا صدر تھا۔“

”بہی تو وہ تاریخی غلطی ہے جو اب تک تاریخ دان کرتے رہے ہیں۔ میں عنقریب اپنے ”فساد پلس“ پر اس سلسلے میں ایک لمبا چوڑا شوٹا..... م میرا مطلب ہے، پروگرام چھوڑنے والا ہوں۔ اس کو ”ڈی بیٹ“ کرانا کہتے ہیں۔ دیکھنا یہ تاریخ کو بدل دے گا اور یہ کوئی پہلا موقع نہیں جگر! تمہارا یہ خادم اس سے پہلے بھی تاریخ بدل چکا ہے۔“ میں خاموش رہا۔ وہ بولا۔ ”لگتا ہے تم اسے مذاق سمجھ رہے ہو۔ جان من! میں واقعی تاریخ بدل چکا ہوں۔ نصرت نویس کا امتحان دے رہی تھی۔ اس کا تاریخ کا پرچہ تھا۔ اس کی تاریخ کی کتاب اسٹڈی میں پڑی تھی۔ میں نے تاریخ بدل دی اور اس کی جگہ ایف اے کی تاریخ رکھ دی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اس میں سرکھپاتی رہی اور بڑے اچھے نمبروں سے فیل ہو گئی۔“

”چمیل والے اپنے ارد گرد والوں کی مدد اسی طرح کرتے ہیں۔“ میں نے تائید کی اور اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ بولنا شروع ہو گیا تھا اور اب یہی حل تھا سمع خراشی سے بچنے کا۔



اب رات کے نو بجنے والے تھے۔ یہ ایک اور ویک اینڈ کی رات تھی۔ خوشگوار اور بارونق۔ میں اور عمران جیلانی کی لائی ہوئی ایک سوئفٹ میں بیٹھے اور شاربہ بانی کی طرف روانہ ہو گئے۔ ہم پورے انتظام کے ساتھ جا رہے تھے۔ گاڑی کے خفیہ خانے میں ٹرپل نو رائفل اور اس کا وافر ایمونیشن موجود تھا۔ ہم دونوں کے پاس بھرے ہوئے پستل بھی تھے۔ میرے پاس وہی کولٹ پستل تھا جو چند روز پہلے ہم نے سیکرٹری ندیم سے حاصل کیا تھا۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک اور اہم ہتھیار تھا اور اس ہتھیار کو حاصل کرنے کے بعد میرے اعتماد میں اضافہ ہوا تھا۔ یہ وہی چاقو تھا جسے راجا خنجر کا نام دیتا تھا۔ یہ چاقو وہ ندیم سے حاصل کر چکا تھا لیکن اس نے ہمیں ابھی تک اس بارے میں بتایا نہیں تھا۔ وہ اس چاقو کے حوالے سے کچھ رقم کھری کرنا چاہتا تھا۔ ہم نے یہ رقم کھری کر دی تھی۔ عمران نے تین ہزار تو اسے پہلے دیئے تھے۔ مزید چار ہزار بھی دے دیئے تھے۔ ہمارے حوالے کر دیا تھا۔ وہ بالکل دکھری ٹائپ کا بندہ ثابت ہو رہا تھا۔ آج کل وہ اچھرہ کے قریب ایک اور ہوٹل میں رہائش پذیر تھا اور ایشوریا رائے ثانی کا نام لے لے کر آہیں بھر رہا تھا۔

تھا کہ یہ اس لڑکی کی کوئی چال ہی ہو۔ کچھ دیر بعد وہ کپڑے پھاڑ کر شور مچا دے کہ اسے اغوا کیا جا رہا ہے۔ یاد دہانی دے دے کہ وہ ایسا کرنے جا رہی ہے۔“

اچانک کچھ لوگ نظر آئے اور کم از کم اس بات کی تو تصدیق ہو گئی کہ لڑکی کا پیچھا کیا جا رہا ہے۔ یہ تین چار بندے تھے۔ ان کے حلیوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اسی بازار کی کمائی سے پروان چڑھے ہیں۔ وہ ہم سے چالیس پچاس قدم کی دوری پر تھے اور کسی کو ڈھونڈ رہے تھے۔ لڑکی نے بھی انہیں دیکھ لیا اور نشست پر کچھ اور دبک گئی۔ اس نے اپنی ٹانگیں موڑ کر گھٹنے پیٹ سے لگا لیے تھے اور بالکل سکڑ گئی تھی۔ عمران نے گردن موڑ کر دیکھا۔ اتفاقاً گاڑی کا غلاف دونوں نشستوں کے درمیانی خلا میں پڑا تھا۔ عمران نے تیزی سے یہ غلاف لڑکی کے اوپر پھیلا دیا۔ تلاش کرنے والے افراد ادھر ادھر دیکھ رہے تھے۔ دکانوں کے اندر جھانک رہے تھے۔ انہوں نے کچھ دور کھڑی ایک کار کی کھڑکیوں سے آنکھیں لگا کر بھی دیکھا۔ انہیں جیسے یقین تھا کہ لڑکی آس پاس ہی کہیں ہے۔ تب میری نگاہ شاربہ کے بالا خانے کی طرف اٹھی۔ میں نے دیکھا، وہاں بالکونی میں بھی ایک مرد اور دو عورتیں موجود تھیں۔ وہ بھی متلاشی نظروں سے ارد گرد دیکھ رہے تھے۔

لڑکی غلاف کے نیچے سے بولی۔ ”گاڑی چلا دو پلیز! مجھے یہاں سے آگے لے جاؤ۔“

”آگے کہاں لے جائیں؟ رستہ ہی نہیں ہے۔“ عمران نے کہا۔

”تم بس چپکی لیٹی رہو۔“ عمران نے اسے ہدایت کی۔

وہ سہم کر چپ ہو گئی۔ تلاش کرنے والے ہمارے دائیں بائیں گھوم رہے تھے۔ ان میں سے ایک دوڑتا ہوا قریبی گلی میں چلا گیا۔ دو باتیں کرتے ہوئے ہماری گاڑی کی طرف آئے۔ ایک نے بازاری لہجے میں کہا۔ ”زیادہ دور نہیں گئی ہوگی حرامزادی۔ یہیں کہیں گھس کے بیٹھی ہوگی۔“

”پر نظر آئے تو پھر ہے نا۔“ دوسرے نے دانت پیسے۔

ایک نے بلا تکلف ہماری گاڑی کی کھڑکی سے چہرہ لگایا اور آنکھیں سکیڑ کر اندر جھانکنے کی کوشش کی۔

عمران نے کھڑکی کا شیشہ اتار کر فوراً اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔ ”کل گل اے پہلوان!

کیا جھاتیاں مار رہے ہو؟“

”کوئی کڑی تو نہیں دیکھی تم نے؟“ پہلوان نما شخص نے کہا۔

”کڑیاں ہی تو دیکھ رہے ہیں اور یہاں ہے کیا؟ پر تم کس لڑکی کی بات کر رہے ہو؟“

”لال پھولوں والی چادر لی ہوئی ہے اس نے۔ نیلی شوار قمیص ہے۔ ابھی اس سامنے والے پلازے سے اُڑی ہے۔“

”ہاں ہاں..... دیکھی ہے۔“ عمران نے کہا۔

”کہاں؟“

”یہیں پر ہے یار! گاڑی کو غور سے دیکھو۔“ عمران بولا۔

”کیا مطلب؟“

”گاڑی کے نیچے گھسی ہے یار!“ عمران نے سرگوشی کی۔

پہلوان نے پہلے غیر یقینی نظروں سے عمران کو دیکھا پھر جھک کر گاڑی کے نیچے دیکھا۔

مزید تسلی کے لیے گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ وہاں کچھ نہیں تھا۔

عمران نے نشیے انداز میں قہقہہ لگایا۔ پہلوان کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔ اس نے غصیلی نظروں سے عمران کو دیکھا اور بڑبڑاتا ہوا آگے نکل گیا۔

لڑکی پچھلی نشست پر دم بخت پڑی تھی۔

اسی دوران میں سامنے سڑک پر پھنسے ہوئے ایک تانگے کو راستہ مل گیا اور سڑک پر رش

کچھ کم ہو گیا۔ عمران نے کار شارٹ کر دی اور اسے دھیمی رفتار سے آگے بڑھانے لگا۔ گاڑی

انچ انچ سرکتی ہوئی کچھ آگے نکل گئی تو راستہ کچھ کشادہ ہو گیا۔ عمران نے چابک دستی سے

ڈرائیونگ کی اور دو چار منٹ کے اندر گاڑی کو شاربہ بائی والے پلازے سے ڈیڑھ دو فرلانگ دور

لے آیا۔ یہ جگہ بھی بازارِ حسن کا حصہ ہی تھی۔ تاہم یہاں بھیڑ کچھ کم تھی۔ زیادہ تر نچلے درجے کی

طوائفیں تھیں۔ وہ کہیں کہیں دروازوں اور کھڑکیوں میں کھڑی اپنی بوسیدہ چھڑی کے لیے

خریدار ڈھونڈ رہی تھیں۔ یہاں ایک بڑا سا چائے خانہ بھی تھا جہاں کھڑی کی بیٹوں پر مزدور

ٹائپ افراد بیٹھے دی سی آر پرائڈین ٹانچ گانا دیکھ رہے تھے۔ اپنے جسم کھجا رہے تھے اور

سگریٹ پھونک رہے تھے۔

عمران نے گاڑی ایک بغلی سڑک پر موڑی اور دو بند دکانوں کے سامنے کھڑی کر دی۔

یہاں روشنی بھی زیادہ نہیں تھی۔ میں نے نو خیز طوائف کے اوپر سے غلاف ہٹایا اور اس سے کہا

کہ وہ اُٹھ کر بیٹھ جائے، اب خطرہ نہیں ہے۔

اس نے پہلے غلاف میں سے اپنا ڈرا ہوا چہرہ نکالا پھر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد اُٹھ کر

بیٹھ گئی۔ اس کا سینہ دھونکنی کی طرح چل رہا تھا۔ صراحی دار گردن میں نیس دھڑکتی ہوئی محسوس

ہو رہی تھیں۔

تمہارے لیے مصیبت آجائے گی۔“ میں نے کہا۔

”ہاں..... یہ تو ہے۔“ اس نے مری مری آواز میں جواب دیا۔ ”اس کے لیے تو ہر ایک گھڑے کی مچھلی کی طرح ہے۔ بڑے لمبے ہاتھ ہیں اس کے۔“

عمران نے سگریٹ سلگاتے ہوئے کہا۔ ”اس کا کوئی اتا پتا ہے تمہارے پاس؟“
لڑکی نے انکار میں سر ہلایا پھر کچھ دیر تک سوچ کر بولی۔ ”آپ کیا کرو گے؟“
”تم دیکھتی رہو کیا کرتے ہیں۔“ عمران نے کش لے کر کہا۔

”لعل..... لیکن وہ بہت خطرناک ہے۔ آپ لوگوں کے اندازے سے زیادہ..... بڑی باجی..... یا کوئی بھی باجی اس سے دشمنی مول نہیں لے سکتی۔ سارا بازار ڈرتا ہے۔ آچہ تو بس..... اتنا کریں..... کہ مجھے ان گلیوں سے باہر نکال دیں۔ بڑی سڑک پر پہنچ کر میں کوئی ٹیکسی رکشہ لے لوں گی۔“

”پھر کیا کرو گی؟“ عمران نے پوچھا۔

اس کا کا جل پھیل رہا تھا۔ وہ رد ہانسی آواز میں بولی۔ ”اور کچھ نہ ہوا تو..... تو.....“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گئی۔
”تو کیا؟“

”تو کوئی زہریلی چیز کھالوں گی۔ جان چھوٹ جائے گی۔ یا کم از کم کچھ دنوں کے لیے ہسپتال تو پہنچ جاؤں گی۔“ وہ باقاعدہ رو دی۔

عمران نے کہا۔ ”دیکھو تم ہماری پناہ میں آئی ہو۔ تم نے ہم سے مدد مانگی ہے۔ ہم پیچھے ہٹنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ جس کا ساتھ دیتے ہیں، اس کے لیے جان دے دیتے ہیں۔ تم اس بندے کا اتا پتا دو۔ ہم تمہیں یقین دلاتے ہیں، تمہارا کوئی نقصان نہیں ہونے دیں گے۔ اگر کچھ ہوگا تو فائدہ ہی ہوگا۔“

وہ تذبذب میں تھی مگر وہ عمران ہی کیا جو کسی کے تذبذب کو اپنی جادو بیانی سے دور نہ کر دے۔ میں نے بھی اس کا ساتھ دیا۔ دو تین منٹ بعد وہ نیم رضا مند نظر آنے لگی۔ اس دوران میں اس نے اپنا نام نیلم بتایا۔

رات اپنے جو بن پر تھی۔ آسمان شفاف تھا۔ ایک مست ہوا چل رہی تھی۔ یہ دوسرا پہر تھا لیکن ان گلی کوچوں کی رونق سرشام جیسی تھی۔ دور ایک کھڑکی کے ریشمی پردے کے پیچھے بار بار ایک رقاصہ کے لہراتے بازو نظر آتے تھے اور طیلے کی دھندل سی سنائی دیتی تھی۔ رقاصہ ایک جانے پہچانے انڈین گانے پر ”لپ سنگ“ کر رہی تھی۔ موسم ہے عاشقانہ..... ایسے میں اے

عمران نے کہا۔ ”کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ؟“

اس نے پہلی بار غور سے عمران کو اور مجھے دیکھا۔ اس کی کا جل بھری آنکھوں میں شناسائی کے آثار نظر آئے۔ وہ قدرے حیرانی سے بولی۔ ”آپ تو وہی ہیں جو کچھ دن پہلے ہمارے کوٹھے پر آئے تھے۔ آ..... آپ کا نام عمران صاحب ہے نا؟“
عمران نے کہا۔ ”تو تم شاربہ کے پاس ہوتی ہو؟“
”جی ہاں..... شاید آپ نے مجھے پہچانا نہیں۔ میں اس دن آپ کے سامنے بھی آئی تھی۔“

”ہاں..... اب کچھ کچھ لگ تو رہا ہے کہ تمہیں دیکھا تھا۔“ عمران نے بات بتائی۔

”اب کیا معاملہ ہے تمہارے ساتھ؟ تم چھپ کیوں رہی ہو؟“

اس کا چہرہ ایک بار پھر زرد نظر آنے لگا۔ کچھ دیر تذبذب میں رہنے کے بعد وہ بولی۔ ”وہ ایک گاہک ہے ہمارا..... بڑا خبیث بندہ ہے۔ اس نے مجھے بلوایا ہے۔ میں اس کے پاس جا نہیں چاہتی۔“

عمران نے کہا۔ ”تم لوگوں کے گاہک تو ہوتے ہی خبیث ہیں۔ نیک شریف بندے کا اس بازار سے کیا تعلق؟“

”وہ پکا شرابی ہے۔ شراب میں پتا نہیں کیا کیا گولیاں گھول کر پیتا ہے۔ ایک دم جانور ہے۔ میں پہلے دو بار جا چکی ہوں اس کے پاس۔ یہ دیکھیں..... یہ دیکھیں۔“ اس نے اپنی کھلی آستینیں کندھوں تک چڑھا کر دکھائیں۔ کئی جگہ پرانے نیل سے نظر آرہے تھے۔ لڑکی کے چہرے پر نفرت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تو تم نے شاربہ بانی سے کہنا تھا کہ تم جانا نہیں چاہتی ہو۔“

”لیکن وہ مجھے ہی بلارہا ہے اور بڑی باجی (شاربہ) میں اتنی ہمت نہیں کہ اسے انکار کر سکیں۔ شاید کسی میں بھی اتنی ہمت نہیں۔ وہ جینا حرام کر دیتا ہے دوسروں کا۔“ طوائف زادی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”وہ ہے کون؟“ میں نے پوچھا۔

”مم..... مجھے نام کا تو ٹھیک سے پتا نہیں۔ اے بھائی بھائی کہتے ہیں۔ بڑے بڑے کتے پال رکھے ہیں اس نے۔ یہیں صدر کے علاقے میں کئی کنال کی کوٹھی ہے اس کی۔“

”تو تم اس کے ڈر سے بھاگ آئی ہو لیکن آج کی رات تم بچ بھی گئیں تو کل پھر

دل کہیں سے ان کو ڈھونڈ لانا۔

ہماری گاڑی میں بیٹھی نوخیز طوائف نے اپنے چمکیلے گریبان میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹا سا خوبصورت فون انڈیکس نکال لیا۔ اس میں ایک نمبر ڈھونڈ کر اس نے عمران کو دکھایا۔ ”یہ ایک نمبر ہے جی اس کا۔“ وہ بولی۔

عمران نے وہیں بیٹھے بیٹھے اپنے سیل فون پر نمبر پر پریس کیا۔ دوسری طرف سے ایک کرخت آواز ابھری۔ ”کون ہے؟“

عمران نے کہا۔ ”شاربہ جی کے اڈے سے بول رہا ہوں۔ بھائی سے بات کراؤ۔“

”سلطان بھائی سے؟“ دوسری طرف سے پوچھا گیا۔

”ہاں..... ہاں۔“ عمران نے کہا۔

سلطان کے نام پر میرے ساتھ ساتھ عمران بھی قدرے چونکا۔

قریباً ایک منٹ بعد ایک بھاری دبنگ آواز فون کے سپیکر پر ابھری۔ سخت کڑوے لہجے میں پوچھا گیا۔ ”کون ہے؟“

میرے جسم میں سنسناہٹ دوڑ گئی۔ شبے کی کوئی گنجائش نہیں رہی تھی۔ یہ سلطان چنے کی ہی آواز تھی۔ مال روڈ والی کونٹھی میں عمران نے اس کی کوئی اپنی گولی سے سوراخ کر دیا تھا اور ایسا منظر نامہ ترتیب دیا تھا کہ ہم اس کی ”کچھار“ سے بچ کر صاف نکل آئے تھے۔ وہ اب تک سخت بھنایا پھرتا تھا۔

ایک بار پھر اس کی کرخت آواز فون پر ابھری۔ ”بولتا کیوں نہیں..... کون ہے؟“

عمران نے اطمینان سے کہا۔ ”میں تمہارا قریبی رشتے دار ہوں۔ تمہاری والدہ کا خصم..... یعنی تمہارا باپ..... عمران دانش۔“

دوسری طرف چند لمحے سناٹا رہا۔ اس واقعے کے بعد سلطان چٹا بولا تو اس کی آواز میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ ”گلتا ہے عمران تیرا دانہ پانی اب پورا ہو چکا ہے۔ اب تجھے مرنا ہے لیکن یہ میرا وعدہ ہے، تیرے کفن میں لاش نہیں ہوگی۔ بس کچھ ٹکڑے ہوں گے جن کے بارے میں ڈی این اے ٹیسٹ والے بتائیں گے کہ یہ فلاں حرام زادے کے اسپر پارٹس ہیں۔“

”چلو اس کا فیصلہ وقت کر دے گا۔ ابھی تو یہ سب کچھ چلتے ہی رہنا ہے۔ فی الحال میں تم سے ایک اور بات کرنا چاہتا ہوں۔ ایک گزارش کرنی ہے تم سے۔“ عمران نے کہا۔

”میں تمہارے مخمرے پن پر ایک سو ایک بار لعنت بھیجتا ہوں۔ نادر کے قتل کے بعد تم

نے کھلی جنگ چھیڑی ہے۔ اس کا فیصلہ تمہاری موت پر ہونا ہے کتے۔ پرسوں رات تو نے اور تیرے دونوں یاروں نے لالہ زار ہوٹل سے بھاگ کر جان بچائی ہے لیکن تمہیں بھاگنے نہیں دیں گے اور گھسیٹ گھسیٹ کر تمہاری کھال اتاریں گے۔“

”یار! میں نے کہا ہے کہ اس کا فیصلہ وقت آنے پر ہو جائے گا۔ فی الحال تم سے ایک بات کہنی ہے اور میری خواہش ہے کہ تم یہ بات مان جاؤ۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“ سلطان نے زہر کا گھونٹ پی کر کہا۔

”ایک لڑکی ہے نیلم! وہ یہاں میرے پاس بیٹھی ہے۔ بیچاری بہت پریشان ہے اس

وقت۔“

”نیلم..... کون نیلم؟“ سلطان کی آواز لڑکھڑا گئی۔

”یار! وہی نیلم جس کے بازوؤں پر تم نے نیل ڈالے ہوئے ہیں۔ نیلونیل کیا ہوا ہے۔

شاربہ کے کوٹھے پر ہوتی ہے۔“

چند سیکنڈ کی خاموشی کے بعد سلطان پھنکارا۔ ”وہ یہاں کیا کر رہی ہے؟“

”اس بات کو چھوڑو۔ میں جو کہہ رہا ہوں اس پر تھوڑا سا غور کر لو۔“

”کیا کہنا چاہتے ہو؟“

”اس کو معاف کر دو یار! وہ بہت ڈری ہوئی ہے تم سے۔ کسی اور سے گزارہ کر لو۔“

”اچھا تو یہ بات ہے۔ کیا لگتی ہے وہ تمہاری؟“ سلطان چنے کا لہجہ سخت چبھتا ہوا تھا۔

”کچھ لگنا ضروری نہیں ہوتا۔ انسانیت بھی ایک رشتہ ہے۔“ عمران بولا۔

”اچھا تو انسان صاحب! زبان بھی کوئی چیز ہے۔ جب سودا ہو جاتا ہے، پوری رقم گمن

کر وصول کر لی جاتی ہے تو پھر نیچی ہوئی چیز دینی پڑتی ہے۔ شاربہ بائی نے بھی دس راتوں

کے پورے پانچ لاکھ وصول کیے ہوئے ہیں اس حرامزادی کے۔ اسے تو اب آنا ہی پڑے گا۔“

عمران نے بدستور دھیمے لہجے میں کہا۔ ”رقم واپس کر دیتا ہوں تمہیں بلکہ اگر کوئی جرمانہ

شرمانہ بھی ڈالنا چاہو تو ڈال لینا۔“

”تم بیچ میں دلال مت بنو۔ اگر وہ..... کتیا تمہارے پاس ہے تو اس سے بات کراؤ

میری۔“

عمران کا چہرہ متغیر ہوا۔ ماتھے کی رگیں ابھڑ گئیں۔ وہ بدلے ہوئے لہجے میں بولا۔

”سلطانے! ضد نہ کرو۔ یہ لڑکی نہیں جائے گی۔ شاربہ کے پاس اور بھی بہت سا بکاؤ مال ہے۔

کسی اور سے منہ کالا کر لے آج کی رات۔“

عمران نے خود کو پرسکون کرنے کے لیے طویل کش لیا اور دھواں کھڑکی سے ماہر بھینکا۔ میں اور نیلم گم صم اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ نیلم تو باقاعدہ لرز رہی تھی۔ ایک شرابی لڑکھڑاتا اور گنگناتا ہوا ہمارے قریب سے گزر گیا۔

میں نے کہا۔ ”اب کیا کرنا ہے عمران؟“
”کچھ نہیں۔ اس سؤر کے فون کا انتظار کرنا ہے۔“
”کیا مطلب؟“

”ابھی یہ دوبارہ فون کرے گا۔“ عمران نے فون سیٹ کو گھورتے ہوئے کہا۔
واقعی قریباً دو منٹ بعد فون کی بیل ہونے لگی۔ عمران نے سکرین پر نمبر دیکھا اور اس کے ہونٹوں پر زہریلی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”ہیلو“ اس نے کہا۔
دوسری طرف سے آواز اُبھری۔ ”ہیلو! سلطان بول رہا ہوں۔ جو کچھ تم کر رہے ہو، اچھا نہیں کر رہے۔“ سلطان کے لہجے کی اکڑفون ختم ہو چکی تھی۔
”اچھا ہے یا اُتمہارے سامنے ہے۔“

چند سیکنڈ کے توقف کے بعد سلطان نے کہا۔ ”جو رقم میں نے شاربہ بائی کو دی ہے، وہ کل شام تک واپس مل جانی چاہیے۔“
”کل..... تو بینک بند ہے بھائی جان! ہاں پرسوں شام تک مل جائے گی۔ اور اگر نہ ملے گی تو میں اپنی جیب سے دوں گا۔“

”بہت جلد ملاقات ہوگی۔“ سلطان چنے نے معنی خیز لہجے میں کہا اور فون بند کر دیا۔
عمران کا تناؤ ستم ہو چکا تھا۔ اس نے دوکش لے کر سگریٹ باہر پھینکا اور لڑکی سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”لے تیرا کام ہو گیا ہے۔ اب کم از کم یہ بھیڑیا تو تجھے بچہ نہیں مارے گا۔“
لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے روایتی فقرہ بولا۔ ”میں کس منہ سے آپ کا شکر یہ ادا کروں۔“

”اگر کوئی دوسرا منہ نہیں ہے تو اسی سے کر دو۔“ عمران نے کہا۔

”مم..... میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟“ وہ بڑی لجاجت سے بولی۔

عمران نے اسے سرتاپا دیکھا اور کھوپڑی سہلائی۔ پھر ذرا سوچ کر بولا۔ ”اگر تم چاہو تو تھوڑا بہت کر بھی سکتی ہو۔“

وہ پتا نہیں کیا سمجھی۔ پلکیں جھکا کر بولی۔ ”آپ جو کہیں۔“

عمران نے میری طرف دیکھا۔ میں نے نیلم سے پوچھا۔ ”تم کب سے ہوشیار رہ بائی

”تُو..... تُو بات کو بڑھا رہا ہے ہیرو۔“

”بات بڑھ چکی ہے سلطانے! اگر تُو نے ضد نہ چھوڑی تیری آج کی رات ہی نہیں، آنے والی بہت سی راتیں برباد ہو جائیں گی۔ بہت پچھتائے گا تُو۔ تیرا بیڑا غرق کر دوں گا۔“
عمران کا پارا چڑھ چکا تھا۔
”کیا کر لے گا تُو؟“

”یہ پوچھ کیا نہیں کر دوں گا۔ تیرا کلیجہ بھاڑ دوں گا، خون تھوکتا پھرے گا لاہور کی سڑکوں پر۔“ عمران کی آواز میں دل ہلا دینے والی گھن گرج تھی۔ وہ ایک ”بڑے بدمعاش“ سے، بڑے بدمعاش کے لہجے میں بات کر رہا تھا۔ نیلم تھر تھر کا پینے لگی۔ میں بھی سنسنی محسوس کر رہا تھا۔

”ہوش سے بات کر ہیرو۔“ سلطان چنے کی آواز قدرے دھیمی پڑ گئی۔

”ہوش سے بات کر رہا ہوں اور تیرے ہوش بھی ٹھکانے لگا دوں گا۔“ عمران دھاڑا۔
”کسی اور کو پتا ہو یا نہ ہو لیکن مجھے پتا ہے کہ تیری ایک پہلی شادی بھی تھی۔ اس میں سے دو بیٹیاں ہیں تیری۔ ایک شہناز جو یہاں موٹی روڈ کے ایک گھر میں اپنی پھوپھی کے پاس رہتی ہے۔ دوسری عافیہ جو دہلی میں ہے اور وہیں کالج میں پڑھتی ہے۔ یہ جو شہناز ہے نا، اس کے پاس تو میرے بندے بس چار پانچ منٹ کے اندر پہنچ جائیں گے اور وہ جس کو تُو نے دینی بھیجا ہوا ہے، اسے ڈھونڈنے میں بھی مجھے دو تین دن سے زیادہ نہیں لگیں گے۔ اب خود سوچ لے تجھے کیا کرنا ہے۔“

دوسری طرف سناٹا چھا گیا۔ چند سیکنڈ بعد سلطان چنے کی بھرائی ہوئی آواز اُبھری۔
”دیکھ ہیرو! تُو اس لڑائی کو گھر کی عورتوں تک پہنچا رہا ہے۔ یہ کسی کے لیے اچھا نہیں ہوگا۔“
”فی الحال تو یہ تیرے لیے اچھا نہیں ہوگا۔ تُو جو کچھ اس نیلم کے ساتھ کرے گا، وہی کچھ میں شہناز کے ساتھ کروا دوں گا۔ یا پھر عافیہ کے ساتھ کروا دوں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے تجھ سے اور تُو اچھی طرح جانتا ہے، میں جو کہتا ہوں وہ کرتا ہوں۔“

”عمرانے..... عمرانے! زبان سنبھال کر بات کر۔“ سلطان زخمی درندے کی طرح بلبلایا۔

”تُو بھی دماغ سنبھال کر بات کر۔ یہ لڑکی میری پناہ میں آئی ہے اور میں تجھے بتا رہا ہوں کہ میں نے اسے پناہ دی ہے۔“

بھڑکے ہوئے سلطان چنے نے فون بند کر دیا۔

کے پاس؟“

”کوئی ایک سال تو ہو گیا ہے۔“

”رات دن وہیں رہتی ہو؟“

”ہاں جی..... میرا ایک ماموں بھی پانچ چھ سال سے بڑی باجی کے پاس ملازم ہے۔ سارگی بجاتا ہے۔“

میں نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ ”نیلیم! ہم جمعرات کے روز تمہارے پاس کوٹھے پر آئے تھے۔ اس روز ہم سے تھوڑی دیر پہلے دو اور بندے آئے تھے۔ ان میں سے ایک فلم اسٹوڈیو کا بندہ وسیم احمد تھا۔ دوسرا کھڑی ناک اور گورے چٹے رنگ والا یوسف فاروقی تھا۔ ان کے بارے میں کچھ جانتی ہو؟“

وہ بولی۔ ”بس اتنا ہی جی کہ انہوں نے بڑی باجی سے کسی فلمی لڑکی کی بات کی تھی اور ایڈوانس وغیرہ بھی دیا تھا۔“

”تمہیں پتا نہیں کہ وہ فلمی لڑکی کون تھی؟“

”نہیں جی! میں بالکل نہیں جانتی۔ ایسی باتیں بڑی باجی ہم لڑکیوں کو نہیں بتاتی اور اگر سن گن لینے کی کوشش کریں تو سخت غصے ہوتی ہے۔“

”اچھا..... تمہیں پتا ہے کہ کل رات وہ یوسف فاروقی نام کا بندہ ایک جھگڑے میں زخمی ہو گیا تھا؟“

وہ ذرا ہچکچانے کے بعد بولا۔ ”ہاں جی! اتنا تو مجھے پتا ہے۔ گلبرگ میں اس کی گاڑی کا کسی دوسری گاڑی سے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ جس کے بعد جھگڑا ہوا اور وہ زخمی ہو گیا۔“

”تمہیں پتا ہے کہ اب وہ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”نہیں جی! بالکل نہیں۔ بڑی باجی سے یہ پتا چلا تھا کہ وہ ہسپتال میں ہے۔“

وہ اب ہسپتال میں نہیں ہے۔ اسے کسی نے وہاں سے اٹھالیا ہے۔ ہمیں شک ہے کہ اس بارے میں تمہاری بڑی باجی (شاربہ بائی) کچھ نہ کچھ جانتی ہے۔“

”مم..... مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں جی۔“

عمران نے غور سے نیلیم کو دیکھا۔ نیلیم کی کاجل لگی پلکیں بے ساختہ تھرا گئیں۔ عمران نے نرم لہجے میں کہا۔ ”ہم تم پر زور نہیں دیں گے نیلیم! بس اتنا کہیں گے کہ اس سلسلے میں اگر تم ہماری تھوڑی بہت مدد کر سکتی ہو تو کر دو۔ ہمارا یہ وعدہ ہے کہ اس ”مدد“ کی وجہ سے تم پر کوئی زد نہیں پڑے گی۔“

نیلیم کچھ دیر کھوئی کھوئی نظروں سے اپنے پاؤں کو گھورتی رہی۔ اس نے زرق برق چپل پہن رکھی تھی۔ ناخنوں پر شوخ رنگ کی نیل پالش تھی۔ چند سیکنڈ بعد اس نے گہری سانس لی اور بولی۔ ”کوٹھے کے اندر کی بات باہر بتانے پر بڑی باجی سخت ناراض ہوتی ہے۔ پورے بازار میں حقہ پانی پندرہ کر دیتی ہے۔ کچھ لڑکیوں کو تو تھا نہ کچھری بھی بھگتنا پڑا ہے۔ لال..... لیکن..... آج رات آپ نے بڑا احسان کیا ہے مجھ پر۔ مم..... مجھے جو کچھ پتا ہے میں آپ کو بتا دیتی ہوں۔ لیکن..... یہاں مجھے بڑی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔ بھائی کے بندے مجھے ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ وہ یہاں بھی آ سکتے ہیں۔ کہیں اور چل کر بیٹھتے ہیں۔“

عمران نے کہا۔ ”بھائی خبیث کی طرف سے اب تم بالکل تسلی رکھو۔ اس سے تمہاری جان چھوٹ چکی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ اس نے اپنے بندے بھی واپس بلا لیے ہوں گے۔ تم جو کچھ بتانا چاہتی ہو۔ پورے اطمینان سے بتاؤ۔ یہاں تمہارا بال بھی بیکا نہیں ہوگا۔ بالکل ریلیکسڈ ہو جاؤ۔“

عمران کے لب و لہجے نے واقعی نیلیم کی بے وجہ بے چینی دور کر دی۔ میں نے تھرماس سے پانی نکال کر اسے پلایا۔ بعد ازاں نیلیم نے جو کچھ بتایا، اس کا لب لباب یہ تھا۔ یوسف کے زخمی ہونے کی اطلاع شاربہ بائی کو کونٹھی کے ملازموں سے ملی تھی۔ اسے یہ بھی پتا چلا کہ وہ کس ہسپتال میں ہے۔ دن چڑھنے کے بعد دھاری دار شرٹ والا ایک شخص کوٹھے پر آیا تھا۔ اس شخص کو کوٹھے کی لڑکیوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اپنی باتوں میں ایک دو ہندی لفظ بھی بولے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ انڈین ہے۔ وہ شاربہ بائی کی گاڑی میں سوار ہو کر شاربہ بائی کے ساتھ یوسف کی عیادت کے لیے گیا۔ بعد میں جب شاربہ بائی واپس آئی تو مجھ بے چین سی تھی۔ کچھ دیر بعد اتفاقاً اس کی ایک فون کال نیلیم نے سن لی۔ شاربہ اپنے سیل فون پر کسی سے بات کر رہی تھی۔ اس نے یوسف کا ذکر کیا اور کہا کہ وہ شور مچا سکتا ہے۔ بہتر ہے کہ اسے کوئی دوا پلا کر کچھ دیر کے لیے سلا دیا جائے۔ یہ الفاظ نیلیم کے دماغ میں انک کر رہ گئے اور اسے احساس ہوا کہ یوسف نامی اس بندے کے بارے میں ضرور کچھ گڑ بڑ ہے۔ بہر حال اس نے اس بات کا ذکر کسی دوسری لڑکی سے نہیں کیا۔ اپنے ماموں کو بھی نہیں بتایا کیونکہ نشے کی حالت میں کوئی بات اس کے پیٹ میں نہیں رہتی اور وہ بک دیتا ہے۔

اس گاڑی کے اندر بیٹھ کر اپنے لرزتے کانٹے لہجے میں نیلیم نے ہمیں جو بات بتائی، وہ خاصی اہم تھی۔ ہمیں ہمدردی کا صلہ ملا تھا اور ایک بڑا مسئلہ حل ہو گیا تھا۔ شاربہ بائی کے بارے میں ہمارے شکوک درست ثابت ہو رہے تھے۔ اب اس پر اعتماد کے ساتھ ہاتھ ڈالا جا

سکتا تھا۔

عمران نے ایک بار پھر نیلم کو تسلی دیتے ہوئے کہا کہ اس حوالے سے اس پر ذرا سی بھی آنچ نہیں آئے گی۔

وہ بولی۔ ”لیکن میں اب بڑی باجی کے پاس واپس جانا نہیں چاہتی۔ میرا دل چاہ رہا ہے کہ کچھ دنوں کے لیے یہاں سے چلی جاؤں۔ فیصل آباد یا پھر ملتان کی طرف۔“

عمران نے کہا۔ ”تمہاری یہ سوچ مناسب نہیں۔ اس طرح تم خواہ مخواہ خود کو مشکوک بنا لو گی۔ ابھی تم پر کسی طرح کا کوئی الزام نہیں ہے۔ تم سلطان کے بندوں سے ڈر کر بھاگی اور اتفاقاً ہماری گاڑی میں گھس آئیں۔ یہ بات تم صاف صاف شاربہ بائی کو بتا دینا۔ وہ جہانگیرہ عورت ہے، سمجھ جائے گی کہ تم سچ بول رہی ہو۔ باقی سلطان کی طرف سے ہم تمہیں ایک بار پھر تسلی دیتے ہیں۔ وہ اب اپنے ہاتھ تم سے دور رکھے گا۔“

عمران کے سمجھانے بھگانے پر نیلم واپس جانے پر رضامند ہو گئی۔ تاہم اس نے کہا کہ وہ کم از کم آج کی رات بازار سے باہر اپنی ایک سیہلی کے پاس گزارنا چاہتی ہے۔ اس کی سیہلی بھائی دروازے کی طرف رہتی تھی۔

اب رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔ ہم نیلم کو بھائی دروازے چھوڑ آئے۔ عمران نے کسی بھی ایمر جنسی کے لیے اسے اپنا فون نمبر دیا اور اسے ہدایت کی کہ وہ ایک بار شاربہ بائی کو فون کر کے اسے اپنی خیریت سے آگاہ کر دے۔

”ہاں..... اب کیا کرنا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اب بائی جی سے دودو ہاتھ کرتے ہیں۔“

”سوچ لو۔ بڑے زور والی عورت ہے۔“

”زور نکال دیتے ہیں اس کا۔“ وہ اطمینان سے بولا۔ اور..... ایس پی حمزہ صاحب کے نمبر پر یس کرنے لگا۔ اس نے انہیں شاربہ بائی کے بارے میں بتایا اور کہا کہ اس پر ہاتھ ڈالنا ہے۔

”کب؟“ حمزہ صاحب نے پوچھا۔

”ابھی بلکہ اسی وقت جناب! یوسف فاروقی کی زندگی کو خطرہ ہو سکتا ہے۔ ہم اس کام کو لیٹ نہیں کر سکتے۔“

حمزہ صاحب نے غنودہ آواز میں کہا۔ ”دیکھ لو عمران! میزھی عورت ہے۔ ہاتھ پاؤں مارے گی۔ فون شون کرے گی۔“

”ہمارے پاس ثبوت ہیں سر! کچا ہاتھ نہیں ڈال رہے۔ وہ ملوث ہے یوسف کی گمشدگی میں۔“

”کیا ثبوت ہیں؟“

”سوری سر! میں آپ کو بتا نہیں سکتا لیکن یہ یقین دلاتا ہوں کہ وہ گھٹی ہے۔ آپ کو شرمندہ نہیں ہونا پڑے گا۔“

”کتنی نفری ہونی چاہیے۔“ حمزہ صاحب نے پوچھا۔

”ایک انسپکٹر کے ساتھ پانچ چھ بندے بھیج دیں لیکن کچھ ہلکار آس پاس بھی رہیں تاکہ کوئی گڑبڑ ہو تو سنبھال سکیں۔“

تھوڑی دیر میں عمران اور حمزہ صاحب کے درمیان ساری بات طے ہو گئی۔ حمزہ صاحب نے کہا کہ پندرہ منٹ میں پولیس پہنچ رہی ہے۔

عمران نے کہا۔ ”سر! انسپکٹر شوکت سے کہیں کہ چھاپے کے وقت اپنی پاکٹ میں موبائل فون آن کر کے رکھے تاکہ ہمیں اندر کی صورت حال کا پتا چلتا رہے۔ ہم آس پاس ہی موجود ہیں۔“

ہم نے گاڑی واپس موڑی۔ رات کے اس پہر لاہور کا یہ گنجان علاقہ بھی تقریباً سنسان ہی تھا۔ صرف داتا دربار کے گرد تھوڑی بہت رونق نظر آتی تھی۔ ہم قریباً دس منٹ میں واپس وہیں پہنچ گئے جہاں نیلم نامی وہ طوائف ہانپی کا پنی ہوئی ہماری گاڑی میں گھس آئی تھی۔ بازار کی رونق میں بس انیس بیس کا ہی فرق پڑا تھا۔ مختلف کھڑکیوں میں سے موسیقی کی تانیں نکل کر پھیل رہی تھیں۔ بے فکر لوں کی ٹولیاں ادھر ادھر گھوم رہی تھیں۔ سامنے ساتھ ساتھ بنی ہوئی دو پان کی دکانوں پر اچھا خاصا رخ تھا۔ ہم نے گاڑی ایک طرف کھڑی کر دی اور پولیس کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔

اس کام میں زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ پانچ دس منٹ گزرے ہوں گے کہ پولیس موبائل کی نیلی جتی نظر آئی اور سائرن سنائی دیا۔ چار پانچ بھجڑے جو بیچ بازار میں کھڑے اپنی پھٹی ہوئی آواز میں جھگڑا کر رہے تھے، بغلی گلیوں میں تتر بتر ہو گئے۔ پولیس موبائل شاربہ بائی والے پلازا کے عین سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔ اسی دوران میں عمران کے سیل فون پر انسپکٹر شوکت کی کال آ گئی۔ اس نے کہا۔ ”عمران صاحب! ہم ریڈ کرنے جارہے ہیں۔ میں فون آن کر کے اپنی جیسٹ پاکٹ میں ڈال رہا ہوں۔“

”اوکے..... ہم بھی آس پاس ہی ہیں۔“ عمران نے کہا۔

پولیس پلازا نما عمارت میں داخل ہو گئی۔ کچھ دیر بعد عمران کے سیل فون پر اندر کی آوازیں سنائی دیں۔ موسیقی تھی اور گھنگروں کی چھنا چھن تھی۔ تھاقیقین کہ آئے گی یہ راتیں کبھی۔

پھر یہ سارا شور ختم گیا۔ شرابہ بانی اور انسپکٹر وغیرہ کی آوازیں فون پر ابھرنا شروع ہوئیں۔ کچھ فقرے سمجھ میں آرہے تھے، کچھ نہیں۔ تھوڑی دیر بعد شرابہ بانی کا پارا چڑھ گیا۔ حسب توقع وہ غصے سے چلانے لگی۔ ”تمہارے منہ میں پورے ٹائم پر پوری ہڈی ڈالتے ہیں، پھر بھی جین نہیں لینے دیتے ہو۔ یہ کوئی طریقہ ہے۔ کیا چاہتے ہو تم؟ کیا چاہتے ہو؟“

”آپ ذرا اکیلے میں آکر میری بات سن لیں تو آپ کے لیے بہتر ہو گا۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”کیوں اکیلے میں سنوں؟ میں نے کوئی چوری کی ہے..... ڈاکا ڈالا ہے؟ تمہیں جو کہنا ہے یہیں کہو۔“

”تو پھر آپ کو میرے ساتھ تھانے چلنا ہو گا۔ آپ کے خلاف رپورٹ ہوئی ہے۔“

”کہاں ہے رپورٹ کی نقل؟ مجھے بھی تو دکھاؤ۔ کوئی وارنٹ گرفتاری ہے تمہارے پاس..... کوئی تلاشی کا وارنٹ ہے۔“

”سب کچھ دکھائیں گے آپ کو لیکن ابھی آپ کو کچھ دیر کے لیے تھانے جانا ہو گا۔“ انسپکٹر نے کہا۔

ایک کرخت مردانہ آواز ابھری۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ وہی شخص ہے جو چند گھنٹے پہلے عمران سے فون پر بدتمیزی کے ساتھ بات کرتا رہا ہے۔ وہ بولا۔ ”انسپکٹر! یہ ہمارا کاروبار کا ٹائم ہے۔ اگر تمہاری جان زیادہ مصیبت میں آئی ہوئی ہے تو ہم تمہیں اوپر سے فون کر دیتے ہیں۔“

”یہ آرڈر بھی اوپر سے ہی آئے ہیں۔ کافی اوپر سے۔ ابھی بانی جی کو جانا ہی پڑے گا۔“

”یہ کیا تمنا ہے؟ کیا اندھیر مگر ہے؟“ کرخت مردانہ آواز ابھری۔ پھر بہت سی آوازیں سنائی دیں۔ شور پڑ گیا۔ لڑکیوں کے چلانے کی سریلی آوازیں بھی سنائی دیں۔ تب ہم نے دیکھا کہ کچھ اور پولیس والے بھی دوڑتے ہوئے پلازا میں داخل ہو رہے تھے۔ یقیناً یہ وہی ریزرو اہلکار تھے جن کے بارے میں عمران نے حمزہ صاحب سے کہا تھا۔

آوازوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اوپر کچھ مار کٹائی بھی ہوئی ہے۔ پھر آوازیں کچھ مدھم پڑ گئیں۔ غالباً مزید فوری پہنچنے سے صورت حال کچھ سنبھل گئی تھی۔

ارد گرد کے لوگ پوری طرح چونک گئے تھے۔ سب کی توجہ شرابہ بانی والے پلازا کی طرف ہو گئی تھی۔ لوگوں کا خیال غالباً یہ تھا کہ کسی اشتہاری وغیرہ کو پکڑنے کے لیے چھاپا مارا گیا ہے لیکن یہاں صورت حال کچھ اور تھی۔ خود ”کوٹھے والی“ پر آفت آئی تھی۔ عمران گاڑی سے نکل کر پان فردشوں کے پاس جا کھڑا ہوا۔ یہاں لوگ چہ میگوئیوں میں مصروف تھے۔ دلچسپی میری نگاہ پلازا کی ایک بھٹی کھڑکی کی طرف اٹھ گئی۔ کوئی شخص دوسری منزل کی کھڑکی سے نکلا اور پھر چھلانگ لگا کر ساتھ والی چھت پر آ گیا۔ یہاں سے وہ چھبے پکڑ کر نیچے اتر آیا اور گلی میں کود گیا۔ وہ فرار ہو رہا تھا۔ عمران مجھے کہیں نظر نہیں آیا۔ میں گاڑی سے اتر آیا اور اس شخص کے پیچھے لپکا۔ تیس چالیس میٹر آگے جا کر میں نے اسے قیص کے کار سے پکڑ لیا۔ وہ بھاگتے قدموں کی آواز سن کر جان چکا تھا کہ کوئی اس کے پیچھے آ رہا ہے۔ جونہی میں نے اس کا کار پکڑا، وہ چنگھاڑا اور پلٹ کر اندھا دھند اپنا دایاں ہاتھ گھمایا۔ اس کے ہاتھ میں شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل تھی اور بے شک یہ تیز دھار آلے سے زیادہ خطرناک تھی۔ اس نے بوتل کو گردن کی طرف سے پکڑ رکھا تھا۔ میں نے بھرتی سے خود کو بچایا پھر بھی بوتل کا ٹکڑا کنارہ میرے کندھے پر خراش ڈالتا گزر گیا۔ بوتل کا دوسرا دار میں نے جھک کر خالی جانے دیا اور اس کے ساتھ ہی حملہ آور کی کلائی پکڑ لی۔ وہ کچی عمر کا شخص تھا اور خاصا زور آور بھی۔ دس پندرہ سیکنڈ تک ہمارے درمیان زبردست کشمکش ہوئی۔ پھر میں نے اس کا بوتل والا ہاتھ دو تین بار عقب میں پختہ دیوار سے ٹکرایا اور بوتل چٹنا چور کر دی۔ میرا ایک زوردار گھونہ کھا کر وہ پیچھے کی طرف گیا اور ایک دروازے کو توڑتا ہوا ایک کمرے میں جا گرا۔ یہاں بالکل ناکافی لباس میں ایک لڑکی ڈری سبھی کھڑی تھی۔ ایک نوجوان بھی تھا۔ فرش کے قالین پر تاش کے پتے بکھرے ہوئے تھے۔ میرے مد مقابل نے اپنی لمبی قیص کے نیچے سے کچھ نکالنے کی کوشش کی مگر اس سے پہلے ہی میں نے اپنا پستول اس کی پیشانی لے لگا دیا۔ ”خبردار! گولی مار دوں گا۔“ میں نے دونوں لمبے میں کہا۔

وہ اپنی جگہ ساکت لیٹا رہ گیا۔ ہمارے گرد بھی لوگ اکٹھے ہو چکے تھے۔ پھر پولیس والے بھی پہنچ گئے اور انہوں نے اس بندے کو کسٹڈی میں لے لیا۔ نہ صرف کسٹڈی میں لے لیا بلکہ اس سے پہلے اچھی طرح مارا پیٹا بھی۔ اس شخص کی آواز سن کر مجھے اندازہ ہوا کہ یہ وہی غصیلا دلال ہے جو فون پر عمران سے بدتمیزی کرتا رہا ہے۔ پتا چلا کہ اوپر کوٹھے پر باقاعدہ لڑائی ہوئی تھی۔ اس حنیف نامی دلال نے شراب کی ٹوٹی ہوئی بوتل سے ایک پولیس والے کو زخمی بھی کر دیا تھا۔ دو تین مزید افراد کو بھی چوٹیں آئی تھیں۔ اب شرابہ بانی اور حنیف سمیت

قریباً چھ افراد کو تھانے لے جایا جا رہا تھا۔



تھانے پہنچ کر شاربہ بائی کی اکڑفوں کافی حد تک ختم ہو گئی۔ وہ دیکھ چکی تھی کہ معاملہ بگڑ چکا ہے۔ اس نے ایک دو ٹیلی فون بھی کرائے تھے لیکن حمزہ صاحب کی ہدایت پر ایس ایچ او شوکت نے کسی طرح کا دباؤ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا تھا اور اب تو پولیس مقابلے کا کیس بھی بن رہا تھا۔ اس لیے رعایت کا کوئی سوال ہی نہیں تھا۔ حمزہ صاحب نے بھی اپنے طور پر انتظامیہ کے ایک دو عہدیداروں سے بات کر لی تھی۔

تھانے میں شاربہ بائی نے اپنے وکیل کو بلایا لیکن وہ بھی بے بس تھا۔ سرکاری تعطیل تھی۔ شاربہ کو عدالت میں پیش نہیں کیا جاسکتا تھا۔ ویسے بھی اس کی ضمانت ہونے کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ یقیناً اسے ریمانڈ پر پھر حوالات میں ہی بھیجا جانا تھا۔ اس کے غصیلے دلال حنیف کی وجہ سے معاملہ بگڑ گیا تھا۔

اب دن کا اُجالا پھیلنا شروع ہو گیا تھا۔ میں اور عمران تھانے پہنچے تو شاربہ بائی زرد چہرے کے ساتھ ایک کرسی پر بیٹھی نظر آئی۔ شعلہ مزاج حنیف حوالات کے گندے فرش پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر نیلگوں گومتھے تھے اور ناک سے خون رِس رہا تھا۔ اس بد زبان کی یہ درگت دیکھ کر ہمیں گونا گوں تسلی ہوئی۔

ہمیں دیکھ کر شاربہ کے چہرے پر تردد اور کدورت کے آثار نمودار ہوئے۔ یقیناً ہماری یہاں آمد سے پہلے ہی اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ اس کے ساتھ جو کچھ ہو رہا ہے، اس میں عمران کا ہاتھ ہے۔ ہمیں آتے دیکھ کر انسپکٹر شوکت نے عمران کو آنکھ سے اشارہ کیا اور باہر نکل گیا۔ اس کے دو کانٹیل بھی باہر چلے گئے۔ ایک طرح سے اس نے ہمیں شاربہ سے گفتگو کا موقع فراہم کیا تھا۔

عمران اور میں شاربہ کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ وہ بگڑے ہوئے لہجے میں بولی۔
”میں نے تمہارا کیا بگاڑا ہے؟ کیوں میرے اور میری بچیوں کے پیچھے پڑے ہو؟“

عمران نے اطمینان سے کہا۔ ”تم نے ہمارا تو کچھ نہیں بگاڑا کیونکہ ابھی ہم نے تمہیں ہیروئن صاحبہ کا ایڈوائس ہی نہیں دیا تھا۔ اگر ہم تمہیں دو لاکھ روپیہ دے دیتے تو پھر ضرور پھنس جاتے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”تم دو نمبر کام کے اندر دو نمبر کام کر رہی ہو۔ دکھاتی کچھ اور ہو، سودا کچھ اور دیتی ہو۔

جیسا تم نے یوسف کے ساتھ کیا۔“

”پتا نہیں تم کیا بول رہے ہو۔ جو کچھ تم لوگ کر رہے ہو اس کے لیے تم سب کو پچھتانا پڑے گا۔“

”فی الحال تو تمہارے پچھتانے کی باری ہے۔ بہتر ہے کہ جو دھندا تم چلا رہی ہو اس کے بارے میں صاف بتا دو۔“ عمران نے کہا۔

وہ بھنا کر بولی۔ ”تم سب پر اللہ کی مار۔ مجھے تو اب تک یہ سمجھ ہی نہیں آئی کہ مجھ پر الزام کیا ہے؟“

عمران بولا۔ ”تفصیل سے تو تمہیں پولیس والے ہی بتائیں گے۔ ہمیں یہ پتا ہے کہ تم دو نمبر کی اندر دو نمبر کر رہی ہو۔ گاؤں کو چند خاص فلمی پریوں کے چھوٹے دکھاتی ہو۔ ان کے ساتھ رات گزارنے کے لیے بھاری رقم وصول کرتی ہو اور ان کی جگہ ان کی ہم شکل لڑکیوں کو گاؤں کے حوالے کر دیتی ہو۔“

شاربہ کا رنگ بدل گیا۔ وہ لڑکھڑاتی آواز میں بولی۔ ”تم کیا بکواس کر رہے ہو؟ ایسا..... کیسے ہو سکتا ہے؟ لوگ اندھے نہیں ہوتے..... کہ..... انہیں دکھایا کچھ اور جائے، دیا کچھ اور جائے۔“

”تم لوگ ایسا ماحول دیتے ہو کہ نقلی بھی اصلی معلوم ہوتا ہے۔ رہی سہی کسر امپورنڈ شراب اور دیگر نشیلی چیزیں پوری کرتی ہیں۔ پھر بھی اگر کسی کو تمہاری دو نمبر کی پتا چل جائے تو تم لوگ اسے ڈرا دھمکا کر چپ کر دیتے ہو یا پھر ویسے ہی غائب کر دیتے ہو۔ یوسف فاروقی کی طرح۔“

میں جانتا تھا کہ عمران نے جو آخری جملہ کہا ہے۔ وہ دراصل اندھیرے میں تیر چھوڑا ہے۔ اسے ابھی کچھ پتا نہیں تھا کہ یوسف کو کیوں غائب کیا گیا ہے اور اس کا اصل اغوا کار کون ہے۔

”تت..... تم ہوش میں نہیں ہو۔ جو منہ میں آ رہا ہے، بکتے جا رہے ہو۔ میرا کسی ایسی فراڈ بازی سے کوئی تعلق نہیں اور نہ میں یوسف کے بارے میں جانتی ہوں۔“

”تمہاری اس فراڈ بازی کے ہم چشم دید اور کان شنید گواہ ہیں بقلم خود۔“ عمران نے کہا۔ ”تم نے جمعرات کی رات اپنے کوٹھے پر ہم سے ٹاپ کلاس پاکستانی ہیروئن کی بات کی۔ اس کی بکنگ کے لیے دو لاکھ ایڈوائس لیے بلکہ ہمیں بکنگ کی ڈیٹ بھی بتا دی۔ وہ فلمی ہیروئن بھی کٹہرے میں آ کر تمہارے خلاف گواہی دے گی۔ تم نے اس کے نام کا گندہ ترین

استعمال کیا ہے۔“

”یہ سراسر الزام ہے، بہتان ہے۔ میں تم سب لوگوں کے خلاف عدالت میں جاؤں گی۔ تمہیں بتا دوں گی کہ ہم لوگ جب کسی سے ٹکر لیتے ہیں تو کس طرح لیتے ہیں۔“ وہ ایک بار پھر اکڑنے لگی۔ اس کی باجھوں سے پان کی لالی جھانک رہی تھی۔ تراشی ہوئی بھوئیں کمان کی طرح کس گئی تھیں۔

اسی دوران میں میرے سیل فون کی بیل پھر ہونے لگی۔ ایک بار پھر ثروت کا فون تھا۔ اس کی بے چینی سمجھ میں آنے والی بات تھی۔ یوسف کے غائب ہونے سے پہلے میں ہی اس کے آس پاس رہا تھا۔ دوسرا وسم احمد تھا جس کے بارے میں وہ کچھ نہیں جانتی تھی اور نہ اس سے رابطہ کر سکتی تھی۔ اب اس کے سارے سوالوں اور تمام انکوائری کا رخ میری طرف تھا۔ دوسری طرف میں خود ہوا میں لٹکا ہوا تھا۔ مجھے کچھ پتا نہیں تھا کہ یوسف کہاں ہے اور کیسے غائب ہوا ہے؟

میں نے کال ریسیو نہیں کی اور اس وقت کو کو سننے لگا جب رات کے پچھلے پہر سڑک پر ہونے والی لڑائی کے بعد میں زخمی یوسف کو لے کر ہسپتال گیا تھا۔ میری جگہ یہ کام کوئی اور بھی کر سکتا تھا۔ جیلانی، اقبال یا پھر عمران کا کوئی اور ساتھی۔ میرے ہونے سے بہت فرق پڑا تھا۔ ایک بہت بڑا بوجھ آگیا تھا مجھ پر۔

کچھ دیر بعد میرے فون پر نصرت کا میسج موصول ہو گیا۔ اس نے لکھا تھا۔ ”تابش بھائی جان! یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ مجھے یوسف کے گم ہونے کا زیادہ ڈھک نہیں، دکھ اس بات کا ہے کہ باجی، اس کی گمشدگی سے پریشان ہیں۔ وہ ایک ایسے شخص کے لیے فکر مند ہو رہی ہیں جو ان کی زندگی خراب کرنے پر تلا ہوا ہے۔ یہ صورت حال کسی طرح بھی ہمارے حق میں نہیں ہے۔ اس واقعے کے سبب یوسف کے حوالے سے باجی کے رویے میں تبدیلی آئی ہے ورنہ وہ تو اس سے بات تک نہیں کر رہی تھیں۔ دوسرا نقصان یہ ہوا ہے کہ اس معاملے میں آپ کا نام آ رہا ہے۔ ہسپتال میں یوسف کے پاس آپ ہی موجود تھے۔ میری ناقص رائے میں آپ کو چاہیے تھا کہ آپ فوراً یوسف کے گھر والوں کو اطلاع دیتے اور یوسف کی تیمارداری ان کے سپرد کرتے۔ اب یہ مسئلہ بھی ہے کہ آپ فون کا جواب نہیں دے رہے۔ اس وجہ سے فاروقی صاحب کے دل میں شبہ پیدا ہو رہا ہے۔ پلیز! آپ رابطہ کریں۔“

میں نے میسج بھیجا۔ ”نصرت! سلی رکھو، ثروت کو بھی تسلی دو۔ ہم یوسف کا کھوج ہی لگا رہے ہیں۔ اس وقت تھانے میں ہیں۔ ایک عورت سے پوچھ گچھ ہو رہی ہے۔ جو نبی کوئی سرا

ہاتھ آتا ہے، میں تمہیں فون کرتا ہوں۔“

سہ پہر تین۔ بجے کے قریب ایک ہٹی کئی لیڈی سب انسپکٹر اپنی دو تین سپاہیوں کے ساتھ تھانے پہنچ گئی۔ شاربہ بائی ایک علیحدہ کمرے میں موجود تھی۔ لیڈی سب انسپکٹر نے آتے ساتھ ہی اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ یہ سب انسپکٹر ایسے کاموں میں ماہر نظر آتی تھی۔ اس کی ناک چوٹی اور ماتھے پر ایک طرف مہلبھری کا سفید نشان تھا۔ اسے حمزہ صاحب نے خاص طور پر بھیجا تھا۔ ہم دوسرے کمرے میں تھے۔ تاہم ایک بند کھڑکی کے ذریعے اندر کی آوازیں ہم تک صاف پہنچ رہی تھیں۔ انسپکٹر بھی ہمارے ساتھ تھا اور اپنی کرسی پر موجود تھا۔ سب انسپکٹر نے جاتے ساتھ ہی شاربہ سے کہا کہ وہ اپنے کپڑے اتارے۔

شاربہ چلائے لگی۔ سب انسپکٹر کو دھمکیاں دینے لگی۔

سب انسپکٹر نے کہا۔ ”اپنے کوٹھے پر ہر رات درجنوں لڑکیوں کے کپڑے اُتر جاتے ہیں اور انہیں شرابی مردوں کے حوالے کرتی ہو۔ آج تمہارے کپڑے اُتر جائیں گے تو کون سی بڑی بات ہے؟“

شاربہ چلائی۔ ”میں وردیاں اُتر دوں گی تمہاری، جیل میں سراسر دوں گی۔ میں کوئی کرائے کی کوٹھڑی میں دھندا کرنے والی کسی نہیں ہوں، میں شاربہ بائی ہوں۔ بازار کی سب سے بڑی ڈانس ایڈیڈ چلاتی ہوں۔ مٹھلیاں دیتی ہوں تم لوگوں کو۔ رات دن تمہارے منہ میں ہڈیاں ڈالتی ہوں۔ تمیں ہزار اکم ٹیکس ہے میرا۔ تمہارے تو وزیر مشیر اتنا ٹیکس نہیں دیتے اور تم مجھے کپڑے اتارنے کا کہہ رہی ہو؟“

سب انسپکٹر بولی۔ ”ابھی اتارنے کا کہہ رہی ہوں۔ خود نہ اتارو گی تو پھٹ کر اُترے گا۔ کافی مہنگا سوٹ ہے۔“

”کتے کی پنچ۔ دور ہو جا میری نظروں سے۔“ شاربہ چلائی۔

جواب میں چٹاخ کی زوردار آواز اُبھری۔ شاربہ کو تھپڑ پڑا تھا۔ اس کے بعد شاربہ کے چلانے کی صدائیں سنائی دینے لگیں۔ کمرے کے اندر ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔ اندازہ ہوا کہ بازار حسن کی ایک بااثر آغوش کی دھناتی ہو رہی ہے۔

ایک منٹ بعد سب انسپکٹر نے ہانپی ہوئی آواز میں کہا۔ ”ابھی صرف مارا ہے۔ اس کے بعد اُلٹا لٹکاؤں گی اور تب یہ کپڑے شپڑے نہیں ہوں گے تیرے پنڈے پر۔“

شاربہ کی ہائے سنائی دے رہی تھی۔ اس ہائے ہائے میں تکلیف کے ساتھ ساتھ حیرت بھی تھی۔ جیسے اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ اسے اس طرح آڑے ہاتھوں لیا جاسکتا ہے۔ وہ

کراہتی رہی اور ساتھ ساتھ خطرناک نتائج کا ذکر بھی کرتی رہی مگر اب اس کی آواز میں وہ دم خم نہیں تھا۔

سب انسپٹر نے بے خونی سے کہا۔ ”تو جو کچھ کرے گی، وہ بعد کی بات ہے لیکن ابھی یہاں چڑے کے چمتر کے ساتھ تیری جونہ اتروائی ہوگی۔ وہ کسی کی نہیں ہوئی ہوگی۔ بہتر ہے کہ جو کچھ تیرے پیٹ میں ہے، بک دے۔“

”مجھے جو پتا تھا، میں نے بتا دیا ہے۔ میں اس بندے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی۔ میں صرف ہمدردی کی وجہ سے اس کا حال پوچھنے ہسپتال چلی گئی۔“

سب انسپٹر نے اپنی کسی ساتھی سپاہن سے کچھ کہا۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ شاربہ بائی اچانک چلائے لگی۔ ”نہیں..... نہیں..... تم میرے ساتھ ایسا نہیں کر سکتیں۔ میں تمہیں سب کچھ بتا رہی ہوں۔ سب کچھ تو بتا رہی ہوں۔“

سب انسپٹر پھنکاری۔ ”میں نے بھی پی ایچ ڈی کی ہوئی ہے تیری ہیرا منڈی پر۔ تو بڑی پکی ہے۔ جتنی اوپر ہے، اس سے تین گنا زمین کے نیچے ہے۔ میں تجھے باہر نکالوں گی اور ابھی آدھ پون گھنٹے کے اندر نکالوں گی۔“

سب انسپٹر کے خطرناک لب و لہجے اور ماہرانہ گفتگو نے شاربہ بائی کا پتا پانی کر دیا تھا۔ اس نے پینے کے لیے پانی مانگا۔ اگلے پانچ دس منٹ میں وہ بالکل ڈھب پر آ گئی۔

انسپٹر شوکت ہم دونوں کو لے کر کمرے میں داخل ہوا تو شاربہ بائی مطبخ اور خاموش نظر آئی۔ کوٹھے پر اہلکاروں کو خطرناک دھمکیاں دینے والی شاربہ بائی اور اس شاربہ بائی میں زمین آسمان کا فرق تھا۔ وہ ایک کرسی پر بیٹھی تھی۔ ماتھے اور ایک ہاتھ کی پشت پر چوٹ کا نشان نظر آ رہا تھا۔ اس کے چربی دار جسم میں ہلکی سی لرزش محسوس کی جاسکتی تھی۔

ہم تینوں اس کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ تنومند سب انسپٹر ہمارے عقب میں مستعد کھڑی رہی۔ عمران نے سارے سوال انسپٹر شوکت کو سمجھا دیئے تھے۔ انسپٹر نے سب سے پہلا سوال ہی یہ پوچھا۔ ”یہ ہم شکل لڑکیوں والا کام کب سے ہو رہا ہے؟“

”مجھے ٹھیک سے پتا نہیں لیکن ڈیڑھ دو سال تو ہو گئے ہیں۔“ وہ اپنے فربہ ہاتھ کی پشت سے آنسو پونچھ کر بولی۔

”یہ کام کیسے شروع ہوا؟“

”میں قسم کھاتی ہوں، مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔ میرا مقصور صرف اتنا ہے کہ سلطان چنے کا میرے کوٹھے پر آنا جانا تھا۔ ایک دن وہ ایک بڑے بد معاش کو لے کر آیا۔ اس

نے بتایا کہ یہ ڈان جاوا ہے۔ انڈیا کی فلم لائن میں اس کا بڑا اثر رسوخ ہے۔ فلمی ہیروئنوں سے اس کے رابطے ہیں اور وہ ان سے ہر طرح کے کام کرا سکتا ہے۔ اب پاکستان کے فلمی لوگوں سے بھی اس کے تعلقات بڑھ رہے ہیں۔ وہ یہاں کی فلمی لڑکیوں کو انڈیا میں کام دلانے کی بات کرتا ہے اور لڑکیاں اس کے آس پاس رہتی ہیں۔ پھر ایک روز سلطان چنے نے ہی مجھے بتایا کہ پاکستان کی ایک دو ٹاپ کلاس ہیروئنوں سے ہمارے کچے رابطے ہو گئے ہیں۔ ہم ان کے کئی طرح کے کام سنبھال رہے ہیں۔ اس نے مجھے یہ بتا کر حیران کیا کہ اگر میرا کوئی گاہک اچھے پیسے خرچ کر سکے تو وہ ایک مشہور ہیروئن کے ساتھ وقت گزار سکتا ہے۔ شروع میں مجھے یقین نہیں آیا لیکن جب دو تین بار سلطان نے اپنا کہا سچ کر دکھایا تو مجھے یقین کرنا پڑا۔ آپ سب جانتے ہو، میرا تو پیشہ ہی یہی ہے۔ گاہک اور لڑکی کے درمیان رابطہ کرنا۔ اگر لڑکی بکنے پر راضی ہو تو پھر ہمارے پیسے میں سب جائز ہے۔“

”لیکن یہاں تو دو نمبر کام ہو رہا تھا۔ کیا تمہیں پتا نہیں تھا؟“ انسپٹر نے پوچھا۔

”میں اسی طرف آ رہی ہوں۔ چار پانچ گاہک بھگتے کے بعد میرے ملازم حنیف کو شک ہو گیا کہ یہ دو نمبر کام ہو رہا ہے۔ اس کی بات درست تھی۔ ہم نے فیصلہ کیا کہ ہم یہ کام نہیں کریں گے۔ لیکن جلد ہی ہمیں پتا چل گیا کہ اب ہم پیچھے نہیں ہٹ سکتے۔ جاوا ہمیں آسانی سے چھوڑنے والا نہیں تھا۔ اگر ہم زبردستی پیچھے ہٹتے تو نقصان اٹھاتے۔ جاوانے ہمیں بس اتنی گارنٹی دی کہ اگر کبھی کوئی گاہک کسی طرح کا پھنسا ڈالے گا تو سلطان وغیرہ اس سے خود غمیں گے اور مجھ پر یا میری بیٹیوں پر کوئی زبردستی آئے گی۔“

”بس اتنی ہی گارنٹی لے کر تم نے یہ فراڈ بازی جاری رکھی، اچھا خاصا پیسہ بھی کماتی رہیں اور یوسف فاروقی جیسے موٹے مرنے پھانسی رہیں۔“

”میں نے بتایا ہے نا، میں جاوا جیسے بندے سے ٹکر نہیں لے سکتی تھی اور نہ اب لے سکتی ہوں۔“

”ہمیں پورا یقین ہے کہ یوسف کو تمہارے فراڈ کا پتا چل گیا تھا۔ اس کے ساتھ کیا کیا ہے تم نے؟“ انسپٹر نے پوچھا۔

”میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں، مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں۔“ وہ روہانسی ہو کر بولی۔

عمران نے گفتگو میں حصہ لیتے ہوئے کہا۔ ”مجھے لگتا ہے انسپٹر اسے ایک آدھ گھنٹے کے لیے لیڈی پولیس کے حوالے کر ہی دینا چاہیے۔“

”مجھے بھی ایسا ہی لگتا ہے۔“ انسپکٹر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ سب انسپکٹر مستعد انداز میں دو قدم آگے آ گئی۔

شاربہ کارنگ ہلدی ہو گیا۔ ”میرے ساتھ ایسا مت کرو۔ میں اور کچھ نہیں جانتی۔“
 ”لیکن ہم کچھ کچھ جانتے ہیں۔“ عمران نے کہا۔ ”یوسف کو ہسپتال سے کیسے اٹھایا گیا، کہاں رکھا گیا، تمہیں سب معلوم ہے۔ تم پوری نگرانی کر رہی تھیں۔ تمہیں ڈر تھا کہ وہ شور مچائے گا۔ تمہارے ہی کہنے پر اغوا کرنے والوں نے اسے دو پلائی تھی تاکہ وہ بیہوش پڑا رہے۔“

شاربہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر کر رہ گئی۔ عمران کا تیرنشانے پر لگا تھا۔ نیلم سے حاصل کی گئی معلومات یہاں ہمارے کام آ رہی تھیں۔ انسپکٹر شوکت نے کہا۔ ”تم کچھ بتاتی ہو یا ہم کمرے سے نکل جائیں اور سب انسپکٹر سمیرا کو کام کرنے دیں؟“
 وہ ایک دم رونے لگی۔ دنگ عورت تھی مگر حالات کے گھیرے میں آ کر اس کی آن بان سارے پندرسمیت ریزہ ریزہ ہو گئی تھی۔ وہ بکلی۔ ”جاوا بڑا ظالم شخص ہے، اس کے سامنے میری کوئی پیش نہیں چل سکتی۔ وہ جو کہتا ہے، مجھے کرنا پڑتا ہے۔ اپنی اور اپنی بچیوں کی جان کے ڈر سے کرنا پڑتا ہے۔ میں اس کے جال میں پھنس چکی ہوں۔ میں کدھر جاؤں؟ کیا کروں؟ اس کا کارندہ سلطان چٹا ہر وقت موت کے فرشتے کی طرح ہمارے سر پر سوار رہتا ہے۔“

انسپکٹر نے کہا۔ ”تمہارا یہ واویلا ہم بعد میں سن لیں گے۔ پہلے یہ بتاؤ کہ یوسف کے ساتھ کیا کیا تم نے اور کیوں؟“

وہ بولی۔ ”میں قسم کھاتی ہوں۔ مجھے پتا نہیں کہ اندر کی بات کیا ہے۔ بس انڈیا سے جاوا کا آرڈر تھا کہ یوسف کو ہسپتال سے اٹھانا ہے۔ یوسف کو اٹھانے سے پہلے میرے پاس کوٹھے پر ایک بندہ بھیجا گیا تھا۔ وہ انڈین تھا اور جاوا کی طرف سے آیا تھا۔ میں نے اسے پہلی بار دیکھا تھا۔ میں اس کا نام تک نہیں جانتی۔ وہ میرے ساتھ ہسپتال گیا تھا اور اس نے یوسف کو دیکھا۔ جب اس کی تسلی ہو گئی تو سلطان چٹے کے لوگوں نے اگلا قدم اٹھایا اور اسے ہسپتال سے لے گئے۔ وہ اسے وہیل چیئر پر اسٹیشن وین تک لائے اور پھر اسٹیشن وین میں ڈال کر نکل گئے۔“

”وہ آسانی سے کیسے چلا گیا؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ آسانی سے نہیں گیا۔ انہوں نے اس پر پستول تانا ہوا تھا یہ اور بات ہے کہ پستول

ایک کپڑے کے نیچے تھا اور کسی کو نظر نہیں آ رہا تھا۔ انہوں نے یوسف سے کہا تھا کہ اسٹیشن وین میں ایک بندہ ہے جو اس سے دو چار سوال پوچھنا چاہتا ہے اگر اس نے جواب دے دیے تو وہ اس پندرہ منٹ میں اسے چھوڑ دیں گے لیکن یہ غلط تھا، وہ اسے وین میں ڈال کر لے گئے۔ راوی کے پل پر نا کا بندی کی وجہ سے اسے تین چار گھنٹوں کے لیے میری گلبرگ والی کونھی میں رکھا گیا، اس کے بعد آگے لے گئے۔“
 ”آگے کہاں؟“ میں نے پوچھا۔
 ”مجھے ٹھیک سے کچھ پتا نہیں۔“

”چلو جتنا پتا ہے، اتنا ہی بتا دو۔“ میں نے کہا۔

”وہ لوگ اتنا ہی بتاتے ہیں، جتنا ضروری سمجھتے ہیں۔ میری بات کا یقین کرنا، میں تم سے جھوٹ نہیں بول رہی۔ مم..... میں نے ان کی باتوں میں صرف فقیر والا کا نام سنا تھا۔ مجھے تو یہ بھی نہیں پتا کہ ”فقیر والا“ کوئی شہر ہے یا پنڈھنڈ ہے۔ میں نے سلطان سے پوچھا بھی تھا مگر اس نے بات پلٹ دی۔ میں سمجھ گئی کہ وہ کچھ نہیں بتائے گا۔“

”تمہارا خیال ہے کہ وہ لوگ یوسف کو فقیر والا نامی جگہ لے کر گئے ہیں؟“

”مجھے یہی لگتا ہے لیکن اب اگر آپ لوگ چاہو کہ میں سلطان سے کوئی ٹوہ وغیرہ لوں تو ایسا نہیں ہو سکے گا۔ وہ بہت خچرے لوگ ہیں، بہت ہی زیادہ ہوشیار۔ انہیں پتا چل چکا ہوگا کہ پولیس مجھے شک میں لے کر گئی ہے۔ اب وہ کچھ عرصہ تک مجھ سے کوئی تعلق نہیں رکھیں گے۔ ہو سکتا ہے کہ بازار کی کسی اور عورت سے وہی کام لینا شروع کر دیں جو میں کرتی ہوں۔ میں سچ کہتی ہوں، مجھے تو ان کی طرف سے جان کا بھی خطرہ ہے۔“

عمران نے کہا۔ ”تم تسلی رکھو۔ انسپکٹر صاحب تمہاری حفاظت کا پورا انتظام کریں گے۔ بڑے افسر بھی اس کیس میں پوری دلچسپی لے رہے ہیں لیکن شرط یہ ہے کہ تم ہم سے کچھ چھپاؤ مت۔“

وہ ایک بار پھر روہانسی ہو گئی۔ ”میری بات کا یقین کیوں نہیں کرتے ہو..... کیوں نہیں..... مجھے جو پتا تھا، میں نے بتا دیا ہے۔ اب میری جان بھی نکال لو گے تو مجھ سے کچھ نہیں پوچھ سکو گے۔ میرے پاس اب بتانے کو کچھ ہے ہی نہیں۔“

عمران نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اچھا..... چلو انسپکٹر صاحب کو یہی بتا دو کہ جاوا کے پاس کتنی ہیر و منوں کی ہم شکل لڑکیاں ہیں؟“

”مجھے صرف دو کا پتا ہے۔ ایک تو یہی جس کے لیے یوسف نے بات کی تھی اور تم لوگوں

رنگ گورا کرنا کون سا مشکل کام ہے۔

یہ ایک لمبا چوڑا تانا بانا تھا اور اس کی تفصیلات توجہ طلب تھیں۔ یقینی بات تھی کہ انڈیا میں بھی اس طرح کی مہم جوئی ہو رہی تھی۔ عین ممکن تھا کہ وہاں بھی کسی ٹی وی چینل یا فلم کمپنی یا آرٹ اکیڈمی کو اس مقصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہو۔

انسپکٹر شوکت کا اندازہ یہی تھا کہ ہم جو کچھ اس ناکا سے پوچھ سکتے ہیں، وہ پوچھ چکے ہیں۔ تاہم عمران کا خیال تھا کہ ہمیں تھوڑا بہت دلال حنیف کو بھی ٹٹولنا چاہیے۔ ہم لاک آپ میں پہنچے۔ وہ فرش پر اکڑوں بیٹھا تھا۔ یہاں ہونے والی دھنائی کے بعد اس کی تن فرن بھی ختم ہو چکی تھی۔ جس اے ایس آئی بر حنیف نے ٹوٹی ہوئی بوتل سے حملہ کیا تھا، وہ ہسپتال میں تھا۔ الکار پر قاتلانہ حملے کی پاداش میں زیر دفعہ 333، حنیف کو بہ آسانی آٹھ دس سال قید کی سزا ہو سکتی تھی۔ اس وقت وہ بیگلی بلی بنا ہوا تھا۔ عمران نے اس سے کہا۔ ”استاد! جو کچھ ہوا ہے تیری بداخلاقی اور گندی زبان کی وجہ سے ہوا ہے۔ اگر تُو اس وقت میرا فون سن لیتا اور بانی سے میری بات کر دیتا تو شاید نوبت یہاں تک نہ پہنچتی۔“

وہ عمران سے معافی مانگنے لگا۔ وہ مجھے بھی سادہ لباس میں پولیس والا ہی سمجھ رہا تھا۔ اس نے مجھ سے بھی منت سماجت شروع کر دی۔ ہم نے اس سے دس پندرہ منٹ سر کھپایا لیکن اس کے سوا اور کچھ معلوم نہ ہو سکا جو شار بہ ہمیں بتا چکی تھی۔ ایس پی حمزہ صاحب کے کہنے پر رات تک شار بہ کو شخصی ضمانت پر گھر بھیج دیا گیا اور اس کی حفاظت پر گارڈز بھی لگا دیئے گئے۔ حنیف کا جرم سنگین تھا، اس کے خلاف پولیس کی مدعیت میں ہی پرنسپل ڈیٹا دیا گیا۔



اب ہمارے پاس صرف ایک سراغ تھا، فقیر والا..... لیکن یہ کہاں تھا؟ کوئی قصبہ تھا، گاؤں تھا یا کسی علاقے کا نام تھا؟ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس حوالے سے ہمیں سیکرٹری ندیم کچھ اتا پتا دے سکتا تھا مگر صرف دو دن پہلے سیکرٹری ندیم کے حوالے سے ہمیں ایک بُری خبر مل چکی تھی۔ عمران نے اسے جیلانی کے سپرد کیا تھا اور جیلانی نے اسے لاہور ہی میں کسی مکان میں مجبوس رکھا ہوا تھا مگر دو دن پہلے ندیم کو وہاں سے بھاگنے کا ایک نادر موقع مل گیا تھا۔ ایک ساتھ والی بلڈنگ میں آگ لگی تھی جس کی وجہ سے اس مکان میں بھی دھواں بھر گیا جہاں ندیم بند تھا۔ موقع پر دوسرے چوکیدار موجود تھے۔ انہوں نے اس خوف سے کہ کہیں ندیم کی موت نہ ہو جائے، اس کے کمرے کا دروازہ کھولا اور صحن میں لے جانا چاہا مگر اسی دوران میں ندیم کام

نے بھی۔ دوسری وہ نئی ہیر وئن سونو ہے۔“

”یہ لوگ ہم شکل چہرے تلاش کس طرح کرتے ہیں؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

وہ بولی۔ ”ایک پرائیویٹ ٹی وی چینل ہے شاید ”نو کٹی فور“ نام ہے اس کا۔ اس میں ہر ہفتے میں چار دن ایک بڑا کامیڈی شو چلتا ہے۔ اس میں اہم اور مشہور لوگوں کے خاکے اُڑائے جاتے ہیں۔ زیادہ تر فلمی لوگ ہی ہوتے ہیں۔ چینل والے اخبار میں بھی اشتہار دیتے ہیں کہ انہیں اہم شخصیات کے ہم شکل لوگوں کی ضرورت ہے۔ چینل پر بھی اشتہار چلتا ہے کہ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ آپ کی صورت کسی مشہور چہرے (سیلیبرٹی) سے ملتی ہے تو ہم سے رابطہ کریں۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ جاوا وغیرہ کا رابطہ اس چینل سے ہے؟“ انسپکٹر نے پوچھا۔

”میرے خیال میں تو ایسا ہی ہے لیکن اس کے علاوہ بھی ان کا کوئی طریقہ ہو سکتا ہے۔“

شار بہ بانی نے جواب دیا۔

”تمہارا کیا خیال ہے، ہم شکل لڑکیوں سے اور کیا کام لیا جاتا ہے؟“ عمران نے

پوچھا۔

”مجھے ٹھیک سے پتا نہیں..... بس وہ.....“ شار بہ کہتے کہتے انک گئی۔

انسپکٹر شوکت نے اسے پھر رواں کیا اور اسے یقین دلایا کہ اگر وہ تعاون کرے گی تو اس پر کوئی آنچ نہیں آنے دی جائے گی۔ بلکہ اس معاملے میں اس کا نام ہی نہیں آئے گا۔ دوسری صورت میں اس کا رُخ حوالات سے سیدھا لاہور جیل کی طرف ہو جائے گا۔

وہ لرزاں آواز میں بولی۔ ”پچھلے مہینے ان لوگوں نے مشہور بھارتی ایکٹر ایڈیٹور یا رائے کی ایک ہم شکل لڑکی ڈھونڈی تھی۔ دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی۔ بس اس کے بال کچھ گھنگریالے تھے جو انہوں نے سیدھے کرا لیے۔ میرا اندازہ ہے کہ اس لڑکی کو یہ لوگ انڈیا لے جائیں گے یا ہو سکتا ہے کہ لے بھی گئے ہوں۔ وہاں اس سے کئی کام لیے جاسکتے ہیں۔ اسے کسی فلم کے سیٹوں میں اصل ہیر وئن کی جگہ استعمال کیا جاسکتا ہے یا پھر اس طرح کے غلط کام کرائے جا سکتے ہیں جیسے یہاں ہوتے ہیں۔“

میرے تصور میں سوینی نامی وہ لڑکی آگئی جو انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں ہمیں ملی تھی۔ شیخوپورہ کے نواحی ویرانے میں راجا کو اس لڑکی سے ”مستفید“ ہونے کا نادر موقع ملا تھا۔ اس سے پہلے یہ لڑکی سیکرٹری ندیم کی راتوں کو چمکاتی رہی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق وہ کم و بیش نوے فیصد تک معروف فلم اشار سے ملتی تھی۔ اس کا رنگ ابھی کچھ سناٹا تھا لیکن آج کل

ثروت کی خوبصورت آنکھوں میں اندوہ آمیز تھکن تھی۔ بالوں کی دولیس زرد زخاروں پر جھول رہی تھیں۔ ”سوری، میں نے آپ کو ڈسٹرب کیا۔“ وہ بولی اور شولڈر بیگ میز پر رکھ دیا۔

میں نے اسے کرسی دی اور کہا۔ ”سوری تو مجھے کہنا چاہیے۔ میں تم سے رابطہ نہیں کر پارہا تھا۔ دراصل یوسف کے سلسلے میں ہی مصروف تھا۔ یہ دیکھو اب بھی ہم یہ نقشے وغیرہ ہی دیکھ رہے تھے۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی ٹھوس اطلاع ہو تو تم سے رابطہ کروں۔“

”اور اگر دس دن تک ٹھوس اطلاع نہیں ملتی تو آپ رابطہ ہی نہیں کرتے؟“ وہ شکوہ کنناں انداز میں بولی۔

”ایسی بات نہیں ثروت! میں اتنا ہی پریشان ہوں جتنی تم ہو یقین کرو، کل سے ایک لقمہ نہیں کھایا گیا مجھ سے۔ بلکہ یہ عمران بھی اسی طرح بھوکا پیاسا میرے ساتھ پھر رہا ہے۔“

”ہاں ثروت! ہم مسلسل کوشش میں لگے ہوئے ہیں اور کچھ کامیابی بھی ہوئی ہے۔“ عمران نے کہا۔

”کیا کامیابی ہوئی ہے؟“ وہ سر جھکا کر آنسو بہانے لگی۔

عمران نے مجھے اشارہ کیا اور چائے لانے کا بہانہ کرتے ہوئے باہر نکل گیا۔ اس کے پیچھے اقبال بھی کھسک گیا۔ میں نے بے غلوص لہجے میں کہا۔ ”ثروت! صورت حال اچھی نہیں لیکن اتنی بُری بھی نہیں کہ ہم اس طرح رونے لگیں اور ہمت ہار کر بیٹھ جائیں۔“

”آپ..... مجھے سچ بتائیں۔ کیا انہیں اغوا کر لیا گیا ہے؟“

”ہم اسے اغوا تو نہیں کہہ سکتے ثروت! یوں لگتا ہے کہ ان لوگوں کے ساتھ یوسف کا کوئی تنازع تھا۔ وہ اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ شاید اپنی کوئی بات منوانا چاہتے ہیں اس سے۔“

”آپ بات کی شدت کو کم کر رہے ہیں لیکن بات تو وہی ہے نا۔ وہ لوگ یوسف کو لے گئے ہیں لیکن یوسف تو چیرٹی شو میں گئے تھے۔ وہ فورٹریس کی طرف تھا۔ پھر وہ گلبرگ کس لیے آئے۔ جب ایکسیڈنٹ ہوا تو آپ وہاں کیسے پہنچ گئے؟“

ثروت کے لہجے میں الجھن تھی اور شک کی ہلکی سی بو بھی تھی۔ میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ فورٹریس نہیں گیا تھا، وہ تو گلبرگ میں تھا اور کسی کے ساتھ دادعیش دے رہا تھا۔ اگر میں بتاتا بھی تو شاید وہ یقین نہ کرتی اور اسے بھی میری رقابت قرار دیتی۔ میں اس معاملے میں خاموش رہا۔ ایکسیڈنٹ والی جگہ پر پہنچنے کے حوالے سے میں نے اسے بتایا کہ میں اور میرا دوست

دکھا گیا۔ اس نے ایک چوکیدار کے سر پر لوہے کی لٹھ ماری اور گہرے دھوئیں میں پھلانگ لگا دی۔ یوں وہ عقبی دیوار پھاند گیا۔ اس واقعے کے بعد عمران کو وہ مکان مقفل کرنا پڑا تھا۔

اگلے آٹھ دس گھنٹے میں عمران نے سر توڑ کوشش کی کہ کسی طرح سلطان چنے کا کوئی بندہ ہاتھ آجائے اور اس سے ”فقیر والا“ کا اسرار معلوم کیا جائے مگر ناکامی ہوئی۔ شاربہ کا کہا درست نکلا تھا۔ یہ لوگ ایک دم روپوش ہو گئے تھے۔ سلطان چنے کی وہ کونھی بھی خالی پڑی تھی جہاں ہم نے نادریٹی کو شوٹ کیا تھا اور سلطان کے کان میں جھکا ڈالنے کی جگہ بنائی تھی۔ عمران کی نگاہ میں ایک دو اور ٹھکانے بھی تھے۔ اس نے جیلانی، اقبال اور امتیاز وغیرہ کو سرچ کے لیے بھیجا مگر مثبت نتیجہ نہیں نکلا۔

دوسری طرف کبھی ثروت اور کبھی نصرت کا میٹج آرہا تھا۔ وہ جلد از جلد مجھ سے ملنا چاہتی تھیں۔ خاص طور سے ثروت بے چین تھی۔ شام کے بعد میں عمران اور اقبال اندرون شہر یعنی راوی روڈ والے مکان میں سر جوڑ کر بیٹھے اور فقیر والا کا کھوج لگانا شروع کیا۔ ہمیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ یہ قصبہ یا گاؤں کس ضلع یا کس صوبے میں ہے۔ نام سے بھی کچھ ظاہر نہیں ہوتا تھا۔ پنجاب، جنوبی پنجاب اور سندھ میں بھی اس طرح کے نام پائے جاتے تھے۔ عمران نے اپنے ایک تحصیل دار دوست سے رابطہ کیا اور اس کے ذریعے ایک ایسے سرکاری افسر سے بات کی جسے چھوٹے شہروں، قصبات اور دیہات وغیرہ کے بارے میں معلومات حاصل تھیں اور ریکارڈ وغیرہ بھی موجود تھا۔ یہ شخص دو دن کی چھٹی پر تھا اور اس کے بعد ہی تفصیل سے ریکارڈ وغیرہ دیکھ کر کچھ بتا سکتا تھا۔ عمران کے کہنے پر اقبال کہیں سے دو بڑے بڑے نقشے لے آیا۔ یہ پاکستان کے تفصیلی نقشے تھے لیکن ان میں بھی کہیں فقیر والا نظر نہیں آیا۔ ایک جگہ دکھائی دی پر اس کا نام فقیراں پور تھا۔

ہم نقشوں میں مگن تھے جب دروازے پر بیل ہوئی۔ عمران نے کہا۔ ”میری چھٹی حس کہتی ہے کہ یہ نسوانی بیل ہے۔ کہیں شاہین ہی نہ ہو۔ اگر وہ ہوئی تو آج ضرور مجھ سے طلاق لے لے گی۔“

”شادی سے پہلے طلاق کیسے ہو سکتی ہے؟“ اقبال نے کہا۔

”یہ سیل فون کا دور ہے، اس میں سب کچھ ہو سکتا ہے۔“ عمران نے جواب دیا۔

اقبال دروازے پر گیا اور چند سیکنڈ بعد ثروت کو لیے ہوئے اندر داخل ہوا۔ ثروت کا اس طرح آنا میرے لیے تعجب خیز اور پریشان کن تھا۔ اس کے ہاتھ میں چھتری تھی اور تب ہمیں اندازہ ہوا کہ باہر بوند باندی ہو رہی ہے۔

عمران ایک شادی میں شرکت کے بعد آرہے تھے۔

”آخر وہ کون لوگ ہیں؟ کیا چاہتے ہیں؟ کیا انہوں نے کوئی رابطہ کیا ہے؟“ وہ ہاتھوں کی انگلیاں پھیلا کر سوالیہ انداز میں بولی پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ”اور وہ عورت کون ہے جس کے ساتھ آپ تھانے میں موجود تھے؟“

میں نے بات گول کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ یوسف کے ایک دفتری دوست کی جاننے والی ہے۔ اس سے تھوڑی بہت معلومات ملی ہیں۔ پتا چلا ہے کہ وہ لوگ یوسف کو لاہور سے باہر لے گئے ہیں۔ کوئی فقیر والا نام کا قصبہ یا گاؤں ہے۔ اس بات کا ساٹھ ستر فیصد امکان ہے کہ یوسف کو وہاں لے جایا گیا ہو۔ ہم فقیر والا کے بارے میں معلومات حاصل کر رہے ہیں۔ فقیراں پور کے نام سے ایک چھوٹے قصبے کا پتا تو چلا ہے لیکن فقیر والا کا نام کسی نقشے میں نظر نہیں آ رہا۔ دراصل ایسے چھوٹے قصبوں یا دیہات کو اسی وقت ڈھونڈا جاسکتا ہے جب ان کے پاس کے کسی معروف شہر یا قصبے کا پتا ہو۔“

میرے اور ثروت کے درمیان اس موضوع پر آٹھ دس منٹ بات ہوئی، اچانک وہ چونک کر بولی۔ ”میری ایک دوست مرینہ ”پاکستان اسٹڈی“ کی لیکچرار ہے۔ میں نے اس کے پاس ایک نقشہ دیکھا تھا بلکہ پورا اٹلس تھا۔ اردو کے اس اٹلس میں پاکستانی علاقوں کی بڑی تفصیل تھی۔ صوبوں کے نقشے تھے اور پھر صوبوں کے اندر کمشنریوں کے علیحدہ نقشے تھے۔ جیسے کمشنری لاہور، کمشنری گجرات وغیرہ..... چھوٹے چھوٹے ناؤز کے نام بھی لکھے تھے۔ اگر..... اگر واقعی فقیر والا کوئی جگہ ہے تو ان نقشوں میں ضرور ہوگی۔“

”تمہارے پاس اپنی دوست کا فون نمبر ہے؟“ میں نے پوچھا۔

اس نے اثبات میں سر ہلایا اور سیل فون نکال کر اسے کال کرنے لگی۔ فون بند تھا۔ اس نے دو تین بار کوشش کی مگر ناکامی ہوئی۔ اس نے اسی وقت شولڈر بیگ اٹھایا، چھتری پکڑی اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

”کہاں جا رہی ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”مرینہ کی طرف ہمیں وقت ضائع نہیں کرنا چاہیے۔“

”کس میں آئی ہو تم؟“

”ٹیکسی میں۔ ٹیکسی ابھی باہر کھڑی ہے۔“

”نہیں ثروت! اگر تم ابھی جانا چاہتی ہو تو پھر میں گاڑی نکالتا ہوں۔“

اس نے انکار کیا لیکن میں نے اسے قائل کر لیا۔ اسی دوران میں عمران جانے وغیرہ

لے آیا۔ میں نے اقبال سے کہا کہ وہ باہر کھڑے ٹیکسی ڈرائیور کو فارغ کر دے۔ اس دوران میں ہم نے چائے پی اور عمران کو تھوڑی سی تفصیل بتائی۔

دس منٹ بعد ثروت اور میں، عمران کی مہران گاڑی پر موجود تھے اور بازار سے نکل کر بڑی سڑک کی طرف جا رہے تھے۔ میں ڈرائیونگ کر رہا تھا۔ ثروت میرے برابر بیٹھی تھی۔ یہ رات کے دس بجے کا وقت تھا، بارش مسلسل ہو رہی تھی۔ صورت حال کی سنگینی نے ثروت کے اعصاب کو بری طرح جکڑا ہوا تھا۔ مرینہ کے گھربک کا فاصلہ ہم نے تقریباً خاموشی میں ہی طے کیا۔ یہ ساندہ روڈ تھا۔ میں نے گھر کے سامنے گاڑی روک دی۔ ثروت چھتری تان کر اندر چلی گئی۔ اس کی واپسی قریباً آدھ گھنٹے بعد ہوئی۔ ایک کتابچہ سا اس کے ہاتھ میں تھا۔ گاڑی میں گھس کر اس نے چھتری بند کی اور دروازہ بھی بند کر دیا۔ اس کے چہرے پر ہیجان سا تھا۔ وہ گاڑی کی اندرونی بتی جلا کر کتابچے کے صفحے اُلٹنے لگی۔ یہ ایک بغیر جلد کا اٹلس تھا۔ کچھ پُرانا لگتا تھا۔ اس میں واقعی پاکستان کی مختلف کمشنریوں کے تفصیلی نقشے تھے۔

اس نے ایک صفحہ نکالا اور بولی۔ ”یہ دیکھیں..... یہ ہے کمشنری بہاولپور..... یہ ہے ہارون آباد اور یہ اس سے آگے بیس پیچس کلومیٹر..... فقیر والا۔ یہ دراصل فقیر والی ہے۔“ مجھے یاد آیا کہ شاربہ بائی نے بھی اپنی گفتگو میں فقیر والا یا فقیر والی ہی کہا تھا۔ یعنی تلفظ میں تھوڑا سا شک تھا۔

فقیر والا کا لفظ میری نگاہوں میں چمکا اور اس کے ساتھ ہی ایک سنسنی خیز احساس بھی ہوا۔ یہ جگہ انڈین بارڈر کے بالکل قریب تھی۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہی وہ فقیر والی ہے جس کا ذکر شاربہ بائی نے کیا ہے اور جس کا نام چاوا کے ساتھیوں کی گفتگو میں آیا ہے۔

ثروت دھیان سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ ”کیا سوچ رہے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”کچھ نہیں..... اندازہ ہوتا ہے کہ یہ زیادہ بڑا قصبہ نہیں ہے۔ ایسی جگہوں پر کسی باہر کے بندے کا کھوج لگانا زیادہ مشکل نہیں ہوتا..... مگر.....“

”ایک اور بڑی اچھی بات ہوئی ہے۔“ ثروت نے جذباتی انداز میں کہا۔ ”اپنے پیر نے تھانوی صاحب بھی آج کل ہارون آباد میں ہیں۔ وہاں ان کے بہت سے مرید ہیں۔ ان کا ایک دو پولیس افسر بھی ہیں۔ تھانوی صاحب ہماری بہت مدد کر سکتے ہیں۔“

پیر احمد تھانوی وہی نیک خو بزرگ تھے جن کے آستانے پر میں نے پہلی بار نصرت کو دیکھا تھا اور پھر ثروت کو دیکھنے کی سبیل بھی پیدا ہوئی تھی۔ وہ ایک روحانی شخصیت تھے اور

روحانی شعبہ بازوں کی طرح عقیدت مندوں کو اُلٹ نہیں بناتے تھے۔

اب رات کے گیارہ بج چکے تھے۔ بارش جاری تھی۔ کبھی دھیمی اور کبھی تیز ہو جاتی تھی۔ ثروت کے سراپا میں عجیب سی بے چینی پائی جاتی تھی۔ وہ بولی۔ ”تابش! ابو جان (فاروق صاحب) تو بیمار ہیں۔ وہ کہیں آج نہیں سکتے۔ مجھے ہی کچھ کرنا ہوگا۔ میں سوچتی ہوں کیوں نہ میں ابھی ہارون آباد چلی جاؤں۔ احمد تھانوی صاحب کے وہاں ہوتے ہوئے مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“

”کیا مطلب؟ تم اکیلی جاؤ گی اور اس وقت؟“

”تابش! ایسے کاموں میں جتنی دیر ہو، اتنا ہی معاملہ بگڑتا ہے۔ ہم پہلے ہی کافی دیر کر

چکے ہیں۔“

”اگر ایسی بات ہے ثروت تو میں تمہارے ساتھ جاؤں گا لیکن..... ابھی نکلنے کے لیے وقت اچھا نہیں ہے۔ ہم صبح سویرے نکل سکتے ہیں۔ ڈرائیونگ آسان ہوگی اور شاید موسم بھی ٹھیک ہو جائے۔“

”مگر میں تو بس پر جانا چاہتی ہوں۔“

”چلو بس پر ہی چلے جائیں گے مگر صبح نکلنا بہتر رہے گا۔ اس دوران میں، میں ساتھیوں سے بھی مشورہ کر لیتا ہوں۔“

”نہیں تابش! کسی سے مشورہ کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ میں تو چاہتی ہوں کہ میں اکیلی چلی جاؤں۔ وہاں ہارون آباد میں مجھے ہر طرح کی سہولت مل جائے گی۔“ ایک مشرقی بیوی کی تمام تر بے قراری اور خلوص آئینہ فکر مندی ثروت کے لہجے میں پائی جاتی تھی۔ اس کے لہجے کی یہ کیفیت میرے اندر تک ایک طرح کا کرب جگانے لگی۔ وہ کیا کر رہا تھا اس کے ساتھ اور یہ کس طرح ہلکان ہو رہی تھی اس کے لیے۔

”نہیں ثروت!“ میں نے بے ساختہ اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ”میں تمہیں اکیلا نہیں جانے دوں گا لیکن موسم خراب ہوتا جا رہا ہے۔ اس وقت سفر مشکل ہوگا۔ چند گھنٹوں کی بات ہے بلکہ میں ابھی فون پر بس کی ٹائمنگ کا پتا کر لیتا ہوں اور بکنگ بھی کر لیتا ہوں۔ ہمیں ڈائریکٹ ہارون آباد کی بس مل جائے تو بہت اچھا رہے گا۔“

میں نے اسی وقت بس اسٹینڈ پر فون کیا۔ پتا چلا کہ لاہور سے براہ راست ہارون آباد کے لیے بس صبح گیارہ بجے سے پہلے روانہ نہیں ہوگی۔ میں نے دو نشستیں ریزرو کرنے کے لیے کہہ دیا۔

ثروت کل جانے کے لیے نیم رضا مند نظر آنے لگی مگر اس کے اندر بے قراری موجود رہی۔ اس کے پاس احمد تھانوی صاحب کی رہائش گاہ کا فون نمبر موجود تھا لیکن وہ عشا کے کچھ ہی دیر بعد سو جاتے تھے۔ اس وقت انہیں ڈسٹرب کرنا ثروت نے مناسب نہیں سمجھا۔ ہم نے وہیں گاڑی میں چار پانچ منٹ گفتگو کی اور ہمارے درمیان کل دو پہر کا پروگرام تقریباً طے ہو گیا۔ بارش گہم گئی تھی۔ پھر بھی میں چاہتا تھا کہ ثروت کو اس کے گھر تک چھوڑ آؤں مگر اسی دوران میں ایک خالی ٹیکسی آ گئی۔

”ثروت نے کہا۔“ آپ کو بڑا لمبا چکر پڑے گا۔ میں آرام سے ٹیکسی پر چلی جاتی ہوں۔“

میرے روکنے کے باوجود وہ باہر نکل گئی۔ مجھے خدا حافظ کہا اور ٹیکسی پر سوار ہو کر پتلی گئی۔ ٹیکسی قریباً سو میٹر دور گئی ہوگی جب میرے ذہن میں ایک خیال بجلی کی طرح کودا۔ کہیں ثروت نے میرے ساتھ غلط بیانی تو نہیں کی تھی؟ میں نے انجن اسٹارٹ کیا اور گاڑی آگے بڑھادی۔ تھوڑی دیر میں مجھے ٹیکسی کی ”ٹیل لائٹ“ نظر آنے لگی۔ میں محفوظ فاصلے سے ٹیکسی کے پیچھے چلنے لگا۔ کچھ دیر بعد بارش پھر شروع ہو گئی۔ گرج چمک بھی ہونے لگی۔ موسم کے تیور پل پل بدل رہے تھے۔

ایک ایک میرے اندیشے حقیقت کا روپ دھار گئے۔ یتیم خانہ چوک سے سیدھا آگے نکل کر گارڈن ٹاؤن کا رخ کرنے کے بجائے ٹیکسی دائیں طرف بند روڈ کی طرف مڑ گئی۔ اس سڑک پر بسوں کے بہت سے اڈے تھے۔ میں طویل سانس لے کر رہ گیا۔ اس کا مطلب تھا کہ ثروت نے میری بات نہیں مانی اور ابھی اسی وقت تنہا ہارون آباد روانہ ہو رہی تھی۔ یقیناً اس نے سیل فون کے ذریعے اپنے گھر والوں کو اپنی روانگی کی اطلاع پہنچا دی ہوگی۔ بارش زور پکڑتی جا رہی تھی۔ سڑکوں پر پانی جمع ہو رہا تھا۔ ٹیکسی بس اسٹینڈ پر پہنچی۔ میں نے مہران کچھ فاصلے پر روک دی۔ ثروت رنگین چھتری تانے ہوئے ٹیکسی میں سے نکلی اور تیزی سے بس اسٹینڈ کی انتظار گاہ میں داخل ہو گئی۔ اب شبے کی گنجائش نہیں رہی تھی۔ وہ ابھی اور اسی وقت جا رہی تھی۔

میں نے بھی مہران لاک کی اور بارش سے بچنے کے لیے ایک مارکیٹ کے برآمدے میں چلتا ہوا بس اسٹینڈ تک پہنچ گیا۔ کوشش کے باوجود میرے جسم پر بارش کی بوچھاڑیں آتی تھیں اور میں جزوی طور پر بھیگ گیا تھا۔ میں بس اسٹینڈ پر پہنچا تو مجھے بکنگ آفس کے پاس ثروت نظر آئی۔ اس کی پشت میری طرف تھی۔ وہ ٹکٹ لینے کے لیے کھڑکی کے سامنے کھڑی

تھی۔ میں اس کے بالکل پیچھے جا کھڑا ہوا۔ اس نے اپنے شولڈر بیگ میں سے پانچ سوکا نوٹ نکالا اور بنگلہ کلرک سے بولی۔ ”ایک ٹکٹ بہاولنگر کا۔“

میں نے نوٹ اس کے ہاتھ سے اچک لیا اور ہزار کا نوٹ کلرک کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”ایک نہیں دو ٹکٹ۔“

وہ حیرت سے مڑ کر میری طرف دیکھنے لگی۔ بارش کے چھینٹوں سے اس کی چادر بھیک گئی تھی اور بالوں کی نم لٹیس بائیں رخسار سے چپکی ہوئی تھیں۔ مجھے اس کی گہری سیاہ آنکھوں میں تعجب گریز اور اطمینان کے ملے جلے آثار نظر آئے۔ ایک ایسی کیفیت جسے کوئی بھی نام دینا مشکل تھا۔ ٹکٹ لے کر ہم بس میں آ گئے۔ بس درمیانے درجے کی تھی۔ میں نے کہا۔ ”تم کیا سمجھتی تھیں، میں تمہیں اکیلا جانے دوں گا؟“

”شکریہ۔“ اس نے بس اتنا ہی کہا۔

”تم تو کہا کرتی تھیں کہ شکریہ بیگانوں کا ادا کیا جاتا ہے۔“

وہ خاموش رہی۔ چھتری کے باوجود اس کا لباس ایک طرف سے بھیک گیا تھا۔ لان کی قمیص میں سے کندھے کا گلابی پن اور پہلو کے نشیب و فراز نظر آرہے تھے۔ میں نے ہولے سے اس کی اوڑھنی درست کر دی۔ شاید اس نے پھر ”شکریہ“ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن اس بار خاموش رہی۔

بس کی سواریاں تیزی سے پوری ہوئیں اور ڈرائیور نے نشست سنبھال لی۔ میں نے موبائل پر عمران کا نمبر ملایا۔ وہ بولا۔ ”ہیلو تابی! کہاں چلے گئے ہو؟ اتنے رومانی موسم میں نوجوان جوڑے بہک بھی سکتے ہیں۔“

میں نے سنی آن سنی کرتے ہوئے کہا۔ ”عمران! میں بہاولنگر جا رہا ہوں۔ وہاں سے ہارون آباد جاؤں گا۔ ثروت میرے ساتھ ہے۔“

”ہارون آباد؟ وہ کیوں؟“ عمران نے حیران ہو کر پوچھا۔

”تفصیل ابھی نہیں بتا سکتا۔ بعد میں فون کروں گا۔“

”اوے لگڑ بھگڑ! گاڑی کا موبیل آئل بدلنے والا تھا۔ کہیں رستے میں ہی انجن چوک نہ ہو جائے۔“

”نہیں ہوگا چوک یار! وہ ادھر ہی کھڑی ہے۔ بس اسٹینڈ کے پاس۔ دوسری چابی تو ہے نا تمہارے پاس؟ آکر لے جاؤ۔“

”اور تم کس پر جا رہے ہو؟“

”بس پر۔“

”یہ فقیر والا کہیں ہارون آباد کی طرف تو نہیں ہے؟“

”ایسا ہی سمجھ لو۔ باقی باتیں پھر۔“ میں نے کہا اور فون بند کر دیا۔

میرے فون بند کرنے سے ثروت کو اطمینان کا احساس ہوا۔ ثروت کے منع کرنے کے باوجود میں نے پانچ سوکا وہ نوٹ اس کے شولڈر بیگ میں ڈال دیا جو کھڑکی میں اس کے ہاتھ سے لیا تھا۔

میرے ذہن میں سوچ کے گھوڑے دوڑنے لگے۔ حالات مجھے اور عمران کو تنکے کی طرح اڑا رہے تھے۔ چند دن پہلے اسی طرح ڈاکٹر مہناز غائب ہوئی تھی۔ وہ بدھا کی مورتی آرا کوئے والا معاملہ تھا اور وہ ابھی تک وہیں اٹکا ہوا تھا۔ جلالی صاحب زندگی اور موت کی کشمکش میں تھے اور جاوا ایک ذاتی سانحے کا شکار ہو کر ممبئی جا چکا تھا۔ اب اسی سلسلے میں سے یہ یوسف کی گمشدگی والا چکر نکل آیا تھا۔

جلد ہی میرے خیالات کا دھارا پھر ثروت کی طرف مڑ گیا۔ اس کی دلکش شخصیت نے اس عام سی بس کو جیسے جگلا دیا تھا۔ کئی حضرات کن انکھیوں سے دیکھ چکے تھے۔ وہ میرے پہلو میں سکڑی ہوئی سی بیٹھی تھی۔ اس کے بھیگے بدن کی جانی پہچانی لیکن بھولی بھری خوشبو میرے نھتوں سے ٹکرا رہی تھی، مجھے ماضی کی بھول بھلیوں میں پہنچا رہی تھی۔ جب ہم سادوں کی بارش میں بھیگتے تھے۔ ”برساتیوں“ میں چھپتے تھے اور ایک دوسرے کی دھڑکنیں سنتے تھے۔ کتنے ریلے آم تھے ان سادوں کے اور ہونٹوں سے لگنے والی ہر چیز کتنی ریلی تھی۔ ہم سنے بٹتے تھے۔ آنے والے سہانے دنوں کے خواب دیکھتے تھے لیکن اب درمیان میں فاصلے تھے..... بے مہر فاصلے۔

وہ مجھ سے یوسف ہی کی باتیں کرتی رہی۔ ایکسٹینٹ میں کس کا قصور تھا؟ لڑائی کیسے ہوئی؟ یوسف کو کتنا زخم آیا تھا؟ ہسپتال میں اس کی کیفیت کیا تھی؟ وغیرہ وغیرہ۔ آخر وہ الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ”ہر شخص میں خوبیاں خامیاں ہوتی ہیں۔ یوسف میں بھی تھیں لیکن میں نہیں سمجھتی تھی کہ ان کے معاملات کسی سے اتنے بگڑے ہوئے تھے کہ زبردستی ساتھ لے جانے کی نوبت آ گئی۔ یہ کوئی اور معاملہ لگتا ہے۔ اچھا، جب آپ کپڑے وغیرہ بدلنے کے لیے گھر جانے لگے تو انہوں نے آپ سے کیا بات کی تھی؟“

”کوئی خاص نہیں۔“ میں نے ذہن پر زور دے کر کہا۔ ”بس یہی کہ میں کتنے بچے آؤں گا۔ آتے ہوئے میں ایک گلاس پلٹ اور تولیا لے آؤں۔ بس اس طرح کی بات ہوئی

تھی۔ اس وقت وسیم احمد اس کے پاس تھا۔“

”کاش..... اس بندے کا ہی کچھ پتا چل سکتا۔“ وہ بولی۔

بس ہموار سڑک پر رواں تھی۔ پھسلن کی وجہ سے رفتار زیادہ نہیں تھی۔ ڈرائیور نے میوزک آن کر دیا۔ فریدہ خانم کی مدھر آواز بس میں گونجنے لگی۔ وہ عشق جو ہم سے روٹھ گیا، اب اس کا حال بتائیں کیا۔

ثروت خاموشی کے ساتھ کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ باہر دیکھنے کو کچھ نہیں تھا۔ تاریکی تھی اور اس میں درختوں کے بھاگتے سائے تھے۔ وہ بھی شاید صرف اپنے ”اندر“ سے دھیان ہٹانے کے لیے باہر جھانک رہی تھی۔

آواز گونج رہی تھی۔ اک آگ غم تنہائی کی جو سارے بدن میں پھیل گئی۔ جب جسم ہی سارا جلتا ہو تو دامن دل کو بچائیں کیا۔

سینے میں عجیب سا دھواں بھر رہا تھا۔ بے کلی سی تھی۔ ہم کسی تفریحی نور پر نہیں جا رہے تھے۔ یہ سفر بڑی غیر یقینی صورت حال میں ہو رہا تھا۔ کچھ معلوم نہیں تھا کہ وہاں فقیر والی میں کیا حالات پیش آنے والے ہیں۔ ثروت کو احمد تھا نووی صاحب کی طرف سے بڑا آسرا تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ یوسف کا واسطہ کن لوگوں سے پڑا ہے۔ یہ بہت بڑے مگر مچھوں کا بین الاقوامی گروہ تھا۔ پیر احمد تھا نووی بیچارے یہاں کیا کر سکتے تھے۔ نہ ہی یہ کسی انسپکٹر، سب انسپکٹر کے بس کا روگ تھا۔ میں عمران سے رابطہ کرنا چاہ رہا تھا لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ ثروت اسے پسند نہیں کرے گی۔ وہ نہیں چاہتی تھی کہ میں اس سلسلے میں اپنے کسی دوست کو گھسیٹوں۔ صادق آباد کے قریب گاڑی کچھ دیر کے لیے رُکی تو میں ڈرکس وغیرہ لینے کے لیے نیچے اُترا۔ بوندا باندی ہو رہی تھی۔ میں نے چپس، بسکٹس اور جوس وغیرہ لیے۔ اسی دوران میں، میں نے ایک اوٹ میں ہو کر عمران کو فون بھی کیا اور جلدی جلدی اسے صورت حال سے آگاہ کیا۔ میں نے عمران کو بتایا کہ فقیر والی کا قصبہ ہارون آباد سے تھوڑا آگے ہے اور انڈین بارڈر کے قریب ہے۔

انڈین بارڈر والی بات نے عمران کو بھی چونکا دیا۔ وہ بولا۔ ”یہ تو خطرناک بات ہے۔

کہیں ایسا تو نہیں کہ یوسف کو کسی طرح انڈیا اسمگل کیا جا رہا ہو؟“

”میرے ذہن میں بھی یہی بات آتی ہے۔“

”تو پھر کیا کیا جائے؟ میں بھی آؤں۔“ عمران نے کہا۔

”آنا تو چاہیے لیکن ثروت کو پسند نہیں کہ میں اس سلسلے میں کسی کو کال کروں۔ وہ یہی

سمجھ رہی ہے کہ پیر احمد تھا نووی صاحب وہاں موجود ہیں۔ ان کے بااثر مزید بھریں، وہ مسئلہ حل کر ادیں گے۔“

عمران نے کہا۔ ”یا پھر یہ ہے کہ تم پہلے وہاں پہنچو اور صورت حال دیکھو۔ میں اس دوران میں اقبال کو فقیر والی روانہ کر دیتا ہوں۔ وہ تمہارے آس پاس رہے گا۔ اگر تم سمجھو کہ میرے آنے کی ضرورت ہے تو میں بھی پہنچ جاؤں گا۔“

”ہاں..... یہ ٹھیک ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن پھر کوئی تماشہ نہ لگا دینا۔ جب بھی تم اکیلے پرواز کرتے ہو، اپنی چونچ سیدھی کسی رائفل کی نال میں گھسا دیتے ہو۔ شکاری کو بس ٹریگر دبانے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

وہ انڈسٹریل ایریا میں پیش آنے والے واقعے کا اشارہ دے رہا تھا۔

میں نے کہا۔ ”پرندے والی مثال غلط ہے۔ گھوڑے اور گھڑ سوار کی مثال دو۔ وہ کیا کہتے ہیں، گرتے ہیں شہ سوار ہی میدان میں..... اچھا خدا حافظ۔ وہ بس میں میرا انتظار کر رہی ہے۔“

میں نے فون بند کر دیا۔ بس چلنے والی تھی۔ وہ بے چینی سے ادھر ادھر دیکھ رہی تھی۔ اس کا یوں دیکھنا مجھے اچھا لگا۔ ”اتنی دیر؟“ اس نے شکوہ کننا انداز میں کہا۔

”ہاں..... دیر تو واقعی بہت ہو گئی ہے۔“ میں اس کے برابر بیٹھ گیا۔

میں نے پتلون کے ساتھ ذرا کھلے گھیرے کی شرٹ پہن رکھی تھی۔ شرٹ کو پتلون کے اندر نہیں ڈالا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ پتلون کی بیلٹ میں، میں نے کوٹ پسل اڑسا ہوا تھا۔ میں جب بیٹھتا تو شرٹ کے نیچے سے پسل کا ابھار نمایاں ہوتا تھا۔ میری کوشش تھی کہ یہ ابھار ثروت کی نظر میں نہ آئے۔ میرا دوسرا ہتھیار میرا چاقو تھا جو چمڑے کے بینڈ سے میری پنڈلی سے بندھا ہوا تھا۔ میں اور ثروت ساتھ ساتھ بیٹھے تھے۔ پیچھے جانے والی ایک تو مند عورت کو راستہ دینے کے لیے میں ثروت کی طرف سمٹا تو کوٹ پسل کا سخت ابھار ثروت کے پہلو سے مس ہوا۔ اپنے جسم پر پسل کی چھن محسوس ہوئی تو اس نے گڑبڑا کر میری طرف دیکھا۔

”یہ..... کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”کک..... کچھ نہیں۔“ میں نے شرٹ کے نیچے ہاتھ ڈال کر پسل کو بیلٹ کے اندر کھسکا دیا۔ وہ ہنسی نہیں تھی، سمجھ گئی اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ اسی طرح باہر دیکھتے دیکھتے بولی۔ ”تابلش! بہت بدل گئے ہیں آپ، بہت زیادہ۔“

”وقت نے بدلا ہے۔“ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اور..... تم نے بدلا

ہے۔“

”میں نے؟“ وہ بدستور کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔

”ہاں ثروت! وہ رات مجھے کبھی بھولی نہیں جس نے ہمیں ایک دوسرے سے دور کیا۔ وہ اوباش لڑکے..... وہ تمہاری بدنامی..... وہ ہماری بے بسی، وہ تھنیدار اشرف اور ایم پی اے گورایا جیسے لوگوں کی کمینگی اور وہ تمہارے گھر کی بربادی..... وہ سب میرے سینے پر انگاروں کی طرح دھک رہا ہے اور دھکتا رہے گا۔ مجھے اس بد نصیب وقت نے بدلا ہے ثروت جو ہمارا سب کچھ اپنے ساتھ بھا کر لے گیا۔ اب میں وہ تابش نہیں۔ کبھی کبھی تو میرے لیے خود کو پہچانا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔“

”کسی سے انتقام لینے کے لیے اپنی زندگی کو تباہ کر لینا کوئی اچھا طریقہ نہیں تابش۔“

”اس زندگی کے تباہ ہونے سے مجھے کچھ فرق نہیں پڑتا ثروت! میں اب اس سے کافی آگے نکل گیا ہوں۔ خیر چھوڑو ان باتوں کو۔ ہمیں اپنی ساری توجہ اس کام کی طرف رکھنی چاہیے جو ہم کرنے جا رہے ہیں اور یہ کوئی آسان کام نہیں ہوگا۔“

”لیکن..... پھر بھی میں چاہتی ہوں تابش کہ ہم جو کریں، قانون کے اندر رہ کر کریں۔“

”مجھے اس بات سے ڈر لگ رہا ہے کہ آپ نے اپنے پاس ہتھیار رکھا ہوا ہے۔ اس کا لائسنس وغیرہ ہے آپ کے پاس؟“

”لائسنس بھی ہے۔ اس کے علاوہ صرف اپنے بچاؤ کے لیے ہے ثروت! اس کا کوئی غلط استعمال نہیں ہوگا۔“

”اللہ کرے اس کا کوئی استعمال ہی نہ ہو۔ ایک شریف شہری کے خلاف جرم ہوا ہے، اب مقامی پولیس کی ذمہ داری ہے کہ اس کو باز یاب کرائے۔ ہم نے قانون ہاتھ میں نہیں لیا۔“

”ہاں..... ذمہ داری تو پولیس ہی کی ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی اور پھر موضوع بدلنے ہوئے کہا۔ ”ثروت! مجھے ایک بات سچ بتانا..... پلیز۔“

”کس..... کیا؟“

”تمہارے دل میں کوئی شبہ تو نہیں میرے بارے میں؟“

”کس حوالے سے؟“

”یوسف کے حوالے سے۔ ہسپتال میں آخری وقت میں ہی اس کے پاس تھا۔“

اس نے شکوہ کنال نظروں سے مجھے دیکھا اور بولی۔ ”کیا میں آپ کو جانتی نہیں

ہوں؟“

”لیکن تم خود ہی تو کہتی ہو، میں بہت بدل چکا ہوں۔ جب بندہ بدل جاتا ہے تو پھر اس کے بارے میں کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔“

اس نے گہری سانس لی۔ ”اگر ایسی بات ہوتی تو پھر اس وقت میں آپ کے ساتھ نہ ہوتی۔“

”میں تو زبردستی چل پڑا ہوں۔“

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”آپ نے سچ بولنے کو کہا ہے۔ میں سچ ہی کہوں گی۔ مجھے آپ کی طرف سے نہیں لیکن آپ کے دوستوں کی طرف سے بدگمانی ضرور تھی۔ میں ان کو جانتی نہیں۔ نصرت نے بتایا تھا کہ وہ مار دھاڑ کرنے والے لوگ ہیں۔“

”اگر تم ان سے ملو گی تو تمہاری رائے بدل جائے گی ثروت۔“

”میں اس کی ضرورت نہیں سمجھتی تابش اور..... میں ایک بار پھر کہوں گی۔ ہماری میل ملاقات جتنی کم ہوگی، اتنا ہی ہمارے لیے بہتر ہوگا۔ میں اب شادی شدہ ہوں تابش! کسی سے وابستہ ہو چکی ہوں۔ پلیز..... پلیز! آپ میرے لیے خود کو گمانوں میں نہ گھسیٹیں۔“

میرے لیے وہ زندگی کا سب سے خوشگوار دن ہوگا، جب آپ شادی کریں گے۔“

اس نے سر جھکا لیا۔ ریشمی رخساروں پر دو آنسو ریگ گئے۔ ”سوری“ اس نے بس اتنا کہا۔

بہاولنگر سے ہم نے ایک اور بس پکڑی۔ اس بس کی حالت زیادہ اچھی نہیں تھی۔ اڈے سے نکلنے نکلنے بھی بس نے تقریباً ایک گھنٹہ لگایا۔ ایک دو بار عمران کی کال آئی لیکن میں نے ریسیو نہیں کی۔ میں ثروت کے سامنے اس سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔ ایک بار نصرت کی کال بھی آئی لیکن میں نے جواب نہیں دیا۔ ہم آٹھ بجے کے قریب ہارون آباد پہنچ گئے۔ یہ ایک چھوٹا شہر تھا۔ اس کی آبادی ایک لاکھ سے زیادہ نہیں ہوگی۔ مرکزی جامع مسجد کے مینار دور سے ہی نظر آ رہے تھے۔ اس کا شمار بہاولنگر کے اہم شہروں میں ہوتا ہے۔ ہم ایک خوبصورت نہر کا نظارہ اپنی نگاہوں میں سموتے ہوئے منزل پر پہنچ گئے۔

بس اسٹینڈ پر اترتے ہی ہم نے ایک قریبی ریستوران میں ہلکا چھلکا ناشتہ کیا۔ ثروت نے چائے کے ساتھ بسکٹ لیے۔ میں نے ڈبل روٹی کے ساتھ انڈے کا آلیٹ کھایا۔ بارش یہاں بھی ہو رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ پنجاب میں دور دور تک مطلع ابر آلود ہے۔ ناشتے کے فوراً بعد ثروت نے پیر احمد تھانوی صاحب کے نمبر پر کال کی۔ کال ریسیو ہو گئی۔ ثروت نے احمد

تھانوی صاحب کو اپنا نام بتایا۔ انہوں نے فوراً پہچان لیا اور خوش دلی سے بات کی۔ ثروت نے کہا۔ ”حضرت! ایک بہت ضروری کام سے آئی ہوں۔ میرے شوہر یوسف کا معاملہ ہے۔ امید ہے آپ مدد فرمائیں گے۔ میں فون پر نہیں بتا سکتی۔ کچھ دیر بعد آپ کے پاس حاضر ہو جانی ہوں۔ آپ اپنا ایڈریس بتا دیجیے۔“

دوسری طرف سے احمد تھانوی صاحب نے ایڈریس بتانا شروع کیا۔ یہ ایڈریس غالباً ثروت کی سمجھ میں نہیں آیا۔ اس نے کہا۔ ”حضور! میرے ساتھ میرے کزن تائبش ہیں۔ آپ انہیں سمجھا دیجیے۔“ اس نے فون میری طرف بڑھا دیا۔

احمد تھانوی صاحب نے فوراً میری آواز پہچان لی۔ حال چال پوچھا۔ عمران کی خیریت دریافت کی۔ پھر اپنا ایڈریس سمجھایا۔ یہ ہارون آباد کی ایک نئی رہائشی کالونی کا ایڈریس تھا۔ میں نے کوٹھی کا نمبر نوٹ کر لیا۔ ثروت کو تھوڑا سا تعجب ہوا کہ تھانوی صاحب مجھے بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔

ناشتے کا بل میں نے زبردستی ادا کیا۔ ایک ٹیکسی پکڑ کر ہم مطلوبہ کالونی کی طرف روانہ ہوئے۔ چھوٹے شہروں میں فاصلے زیادہ نہیں ہوتے۔ ہم جلد ہی منزل پر پہنچ گئے۔ کوٹھی بھی جلد ہی نظر آ گئی۔ میں نے ٹیکسی رُکوائی ہی تھی جب ایک منظر دیکھ کر مری طرح چونک گیا۔ کوٹھی کے بڑے سے سیاہ گیٹ کے سامنے ایک قطار میں موٹر سائیکلیں اور کچھ گاڑیاں کھڑی نظر آ رہی تھیں۔ یہ تھانوی صاحب کے مریدین کی گاڑیاں تھیں۔ ان گاڑیوں کے قریب ایک سیاہ کرولا کارز کی اور اس میں سے ایک خوبصورت لڑکی ذرا لڑکھاتی ہوئی سی اُتری۔ ایک شخص نے اسے بڑھ کر سہارا دیا۔ لڑکی نے سن گلاسز لگا رکھے تھے۔ لباس بھی اچھی تراش کا تھا۔ اس کی ٹانگ میں نقص تھا اور چہرے پر بیماری کی جھلک۔ دور سے دیکھ کر بالکل یہی لگا کہ وہ معروف انڈین اداکارہ کرشمہ کپور ہے۔ وہ دو افراد کا سہارا لیتی ہوئی گیٹ میں داخل ہو گئی۔ میں ساکت و جامد بیٹھا رہا۔

”کیا ہوا تائبش؟“ پچھلی نشست سے ثروت نے پوچھا۔

”کک..... کچھ نہیں لیکن ہم ابھی اندر نہیں جاسکتے۔“

”کیوں؟“

”یہ بعد میں بتاتا ہوں۔“ میں نے کہا پھر ڈرائیور کو ہدایت کی کہ وہ ٹیکسی واپس موڑ لے۔

ثروت خاموش ہو گئی۔ وہ سمجھ گئی تھی کہ کوئی گڑبڑ ہے۔ میری نگاہ میں وہ مناظر گھوم رہے

تھے۔ جب مال روڈ والی کوٹھی میں ہم نے سلطان چٹے کو آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ عمران نے دراز قد نادرٹی کی کوٹھ کر دیا تھا۔ اس لڑائی کے دوران میں سلطان چٹے نے عمران پر گویا چلائی تھی مگر عمران کی بے مثال ”کک“ نے کام کیا اور سلطان کی چلائی ہوئی گویا اس کی ساتھی نیڈ عرف کرشمہ کپور کی برہنہ ٹانگ میں لگی تھی۔

آج وہی کرشمہ کپور اپنی زخمی ٹانگ اور بیمار چہرے کے ساتھ یہاں احمد تھانوی صاحب کے آستانے پر دکھائی دی تھی۔ غالباً وہ ایک مریض کی حیثیت سے یہاں پہنچی تھی۔ لاہور سے دور اس سرحدی علاقے میں اس کا پایا جانا بھی اپنی جگہ معنی خیز تھا۔

پیر احمد تھانوی صاحب کی قیام گاہ سے تھوڑے ہی فاصلے پر پلبرک ہمیں ایک ہوٹل کا بورڈ نظر آیا۔ اچھا ہوٹل لگتا تھا۔ ہم نے ٹیکسی ہوٹل کے عین سامنے رُکوائی اور اندر داخل ہو گئے۔ بارش ایک بار پھر زور پکڑ رہی تھی۔ گاہے بگاہے ہوا بھی چلنے لگتی تھی۔ ایک ہی چھتری تلے سٹے کر ہم ہوٹل کے ڈائننگ ہال میں داخل ہو گئے۔

میں نے ثروت کو بتایا کہ یہاں کچھ گڑبڑ ہے۔ مجھے کچھ ایسے بندے نظر آئے ہیں جو مجھے جانتے ہیں اور میرے مخالفین میں سے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد ہی ہم حضرت صاحب کے پاس جا سکیں گے۔ غنیمت تھا کہ ثروت نے مجھ سے مخالفین کی تفصیل نہیں پوچھی۔ اگر میں اسے یہ بتاتا کہ یہ انڈین ڈان جاوا کے لوگ ہیں اور درحقیقت یہی ہیں جنہوں نے یوسف کو اغوا کیا ہے تو یقیناً ثروت کے رہے سبے اوسان بھی خطا ہو جاتے۔

ہم برستے موسم میں چائے پیتے رہے اور انتظار کرتے رہے۔ میں نے ہوٹل کی دوسری منزل پر جا کر دیکھا۔ وہاں سے تقریباً ڈیڑھ فرلانگ کے فاصلے پر احمد تھانوی صاحب کی قیام گاہ نظر آتی تھی۔ سیاہ گیٹ کے باہر سیاہ کرولا اب بھی موجود تھی۔ اوپر کی منزل سے ہی میں نے عمران کو فون بھی کیا اور مختصر اُصورت حال سے آگاہ کیا۔ عمران نے بتایا کہ اقبال اور امتیاز فقیر والی کے لیے روانہ ہو چکے ہیں۔

اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے میں، میں نے تین چار بار بالائی منزل پر جا کر دیکھا۔ کرولا وہیں نظر آئی۔ ثروت بے چین ہو رہی تھی۔ اس کے خیال میں بہت تاخیر ہو چکی تھی، اب وہ اور تاخیر نہیں چاہتی تھی۔ اس کے ذہن میں یہ سوال بار بار اُبھرتا تھا کہ اگر کچھ لوگ یوسف کو زبردستی فقیر والی لے کر آئے ہیں تو کیوں؟ اور یہی لائیخل سوال میرے اور عمران کے ذہنوں میں بھی موجود تھا۔ اگر یہ کوئی تاوان وغیرہ کا چکر ہوتا تو اب تک ثروت یا فاروقی صاحب سے رابطہ کیا چاچکا ہوتا مگر ایسی بھی کوئی بات نہیں ہوئی تھی۔ پھر جاوا جیسے امیر کبیر بد معاش کو یوسف

میں ان کی باتیں سنتا رہا پھر ہم اُنھ کو دوسری منزل پر آ گئے۔ ہم نے یہاں لابی میں ہی کھانا کھایا اور چائے پی۔ دیوار گیر کھڑکیوں سے باہر زم بھم جاری تھی۔ اسی دوران میں نصرت کا بھی فون آ گیا۔ صورت حال جو بھی تھی، نصرت اس بات پر اندر سے بہت خوش تھی کہ میں اور ثروت ساتھ ہیں اور اگلے ایک دو دن ساتھ ہی رہیں گے۔ ہوٹل کی لابی میں ٹی وی موجود تھا۔ میں ٹی وی دیکھنے لگا۔ ثروت آرام کرنے کے لیے کمرے میں چلی گئی۔ میں نے اسے تاکید کی کہ وہ دروازہ اندر سے بند رکھے۔ وہیں صوفے پر لیٹے لیٹے مجھے نیند آ گئی۔

دوبارہ آنکھ کھلی تو گہرا اندھیرا چھا چکا تھا۔ کھڑکیوں سے باہر بجلی چمک رہی تھی اور بارش بھی جاری تھی۔ ہوٹل کی بجلی چلی گئی تھی۔ مختلف جگہوں پر موم بتیاں روشن تھیں۔ میں نے لیٹے لیٹے گھڑی دیکھی رات کے ساڑھے نو بج چکے تھے۔ گھڑی سے پھسل کر میری نظر سامنے گئی اور میں سکتہ زدہ لیٹا رہ گیا۔ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر وہی انڈین اداکارہ کرشمہ کپوری، ہم شکل لڑکی نیو موجود تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک اسٹک تھی اور وہ رُک رُک کر قدم اٹھا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک تو مند فحش تھا۔ اس شخص کو آج دوپہر بھی میں نے دیکھا تھا۔ نیو نے اپنا نصف سے زائد چہرہ نقاب میں چھپایا ہوا تھا۔ وہ دونوں ٹیرس کی طرف چلے گئے۔ شاید وہاں کھڑے ہو کر بارش کا نظارہ کرنا چاہتے تھے۔

شکر کا مقام تھا کہ ان میں سے کسی کی نظر مجھ پر نہیں پڑی تھی۔ یہ بات عیاں تھی کہ یہ لوگ بھی شب ب سری کے لیے اسی ہوٹل میں آ گئے ہیں۔ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا کہ میں لابی چھوڑ دوں اور کمرے میں چلا جاؤں لیکن وہاں ثروت تھی اور میں ہرگز نہیں چاہتا تھا کہ کمرے میں اس کا حصہ دار بنوں۔ ابھی میں اسی شش و پنج میں تھا کہ مجھے ثروت اپنی طرف آتی دکھائی دی۔ وہ ذرا پریشان تھی۔ میں اُنھ کو بیٹھ گیا۔ ”کیا بات ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ ڈرے ہوئے انداز میں بولی۔ ”میرے ساتھ کمرے میں آئیں۔ وہاں کچھ ہے۔“ ”کیا ہے؟“

”آئیں نا۔“ اس نے تیز سرگوشی کی۔ میں خود بھی لابی میں مزید رُکنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے ساتھ چلتا ہوا کمرے میں آ گیا۔ یہاں بھی شمع روشن تھی۔ میں نے دروازہ بھیڑ دیا۔ ”مجھے آواز آرہی ہے۔۔۔۔۔ کھرچ کھرچ کی۔۔۔۔۔ اس الماری کے پیچھے سے۔“ اس نے اٹھ اٹھائی۔

میں کان لگا کر سنتا رہا۔ کچھ دیر بعد مجھے بھی آواز آئی۔ کوئی جیسے لکڑی کو اپنے دانتوں

سے تادان لینے کیا ضرورت تھی؟ مجھے رہ رہ کر وہ منظر یاد آتا تھا جب شاربہ بانی کے ساتھ موٹی سفید آنکھوں والا شخص پوسف کی عیادت کے لیے آیا تھا۔ وہ یوسف کو عجیب نظروں سے دیکھتا رہا تھا۔ جیسے کسی شاندار نسل کے گھوڑے یا کسی اور پالتو جانور کو دیکھا جاتا ہے۔ پسند کیا جاتا ہے۔

دن کے تقریباً بارہ بجے تھے جب کرولا احمد تھانوی صاحب کی قیام گاہ سے اوجھل ہوئی۔ ثروت نے فوراً فون کیا لیکن اب وہاں ایک اور مصیبت منتظر تھی۔ احمد تھانوی صاحب کے مرید خاص فرید نے بتایا۔ ”حضرت صاحب تو چلے گئے ہیں۔“ ”کہاں؟“ ”ثروت نے گہرا کر پوچھا۔“ ”شہر سے باہر گئے ہیں کسی کام سے۔“ ”کب تک آئیں گے؟“

”اب تو کل ہی آنا ہوگا۔ نو بجے کے قریب۔“ سیل فون کے پیکر سے آواز اُبھری۔ ”اوگاؤ۔“ ثروت شپٹا گئی۔ ”ان کا سیل نمبر ہے؟“ ”بی بی! آپ کو پتا ہوگا، حضرت موبائل وغیرہ نہیں رکھتے۔“ ثروت نے فون بند کیا اور ہاتھوں میں سر تھام لیا۔ اب ہمیں کل تک انتظار کرنا تھا۔ اس گرجے سے موسم میں ٹھکانے کی ضرورت تھی۔ ہم نے مشورہ کیا اور ہوٹل میں ہی ایک کمرہ لے لیا۔ میں نے ثروت سے کہا۔ ”کمرہ استعمال کرنا۔ میں لابی میں وقت گزار لوں گا۔“ ”آپ۔۔۔۔۔ دو کمرے لے لیں۔“ ”اس کی ضرورت نہیں۔“ میں نے کہا۔

ہمارے عقب میں ایک میز پر تین نوجوان اونچی آواز میں گفتگو کر رہے تھے اور ساتھ ساتھ پودینے کی چٹنی لگا کر گرم پکڑے کھا رہے تھے ایک نے کہا۔ ”یار! میں نے اسے کار میں چڑھتے دیکھا ہے۔ صرف پندرہ بیس فٹ کے فاصلے سے۔ یہ وہی تھی۔۔۔۔۔ کرشمہ کپور۔ اس کے ساتھ کوئی فلم ڈائریکٹر قسم کا بندہ تھا۔“

دوسرا بولا۔ ”یہ بات ماننے والی نہیں۔ اتنی بڑی بھارتی فلم اشار اور ہمارے اس چھوٹے سے شہر میں۔ یہاں اس نے گھاس چرے آنا تھا۔“ تیسرا بولا۔ ”یار! شکلوں سے شکلیں ملتی ہیں۔ ہو سکتا ہے وہ فلم اشار سے ملتی جلتی ہو یا پھر۔۔۔۔۔“ وہ کہتے کہتے رُک گیا اور ذرا توقف سے بولا۔ ”ویسے اس طرح بھی ہوتا ہے کہ یہ لوگ کسی جگہ چوری چھپے شوٹنگ کے لیے آ جاتے ہیں۔“

سے کاٹ رہا تھا اور بچوں سے کھرچ رہا تھا۔ غالب امکان یہ تھا کہ یہ کوئی چوہا ہے۔ ثروت نے ہراساں آواز میں کہا۔ ”میں یہاں نہیں رہوں گی۔ کوئی دوسرا کمر خالی ہے تو ٹھیک ہے ورنہ ہم لابی میں رات گزار لیں گے۔“ وہ باہر نکلنے کے لیے دروازے کی طرف بڑھی اس کا نسوانی خوف اس پر حاوی ہو رہا تھا۔

”نہیں ثروت!“ میں نے اسے روکا۔ ”ہم باہر نہیں جاسکتے۔ وہی دوپہر والے لوگ اب یہاں ہوٹل میں آگئے ہیں۔“ میں نے ثروت کو تفصیل بتائی۔ وہ اور پریشان ہو گئی۔ باہر کا خوف اندر کے خوف سے کہیں زیادہ سنگین تھا۔ میں نے ثروت کو صوفے پر بٹھایا اور خود الماری کے پیچھے تاک جھانک شروع کی۔ سیل فون کی نارنج سے احتیاط کے ساتھ ہر طرف دیکھا۔ وہاں کچھ نظر نہیں آیا لیکن اسی دوران میں پھر کھرچنے کی سی آوازیں آنے لگیں۔ جیسے کسی ٹیلی شے سے لکڑی وغیرہ کو کریدا جا رہا ہو۔ دفعتاً مجھے اندازہ ہوا کہ یہ آواز کمرے کے اندر سے نہیں، باہر سے آرہی ہے۔ شاید کوئی دیوار کے ساتھ موجود تھا۔ میں کھڑکی کے پاس پہنچا۔ اس کی چٹنی بغیر آواز پیدا کیے اتاری اور تیزی سے پٹ کھول کر باہر جھانکا۔ کوئی حرکت سی محسوس ہوئی جیسے کوئی شے پر چھائیں تیزی سے دائیں طرف اوجھل ہو گئی ہو۔

”کچھ نظر نہیں آیا؟“ ثروت نے پوچھا۔

”نہیں..... کچھ بھی نہیں..... مجھے تو لگتا ہے کوئی بلی وغیرہ ہوگی۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ کچھ دیر ہم موم بتی کی روشنی میں بیٹھے رہے۔ ثروت بولی۔ ”میں ادھر بیڈ پر نہیں لیٹوں گی۔ آپ نے لیٹنا ہے تو لیٹ جائیں۔ میں یہاں صوفے پر ٹھیک ہوں۔“

”لیکن کھانا؟“

”مجھے تو بالکل بھی بھوک نہیں، آپ نے کھانا ہے تو یہیں منگوا لیں۔“

”نہیں..... بھوک تو مجھے بھی نہیں۔“ میں نے کہا اور بستر پر دراز ہو گیا۔ وہ صوفے پر لیٹ گئی۔ آواز دوبارہ نہیں آئی لیکن مجھے یقین تھا کہ ثروت کے کان اسی طرف لگے ہوئے ہیں۔ بارش کی مدھم آواز سنائی دے رہی تھی۔ ثروت کو کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس ہوٹل میں ہمارے ساتھ کون لوگ موجود ہیں۔ یہ سفاک مجرم اور خطرناک قاتل تھے۔ یوسف کی گمشدگی سے بھی ان کا تعلق مسلمہ تھا۔ رات آہستہ آہستہ آگے کو سرک رہی تھی۔ میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اس بند کمرے میں اپنی اور ثروت کی موجودگی کو بڑی شدت سے محسوس کرنے لگا۔ دل چاہا کہ اس سے کوئی بات کروں۔ اس سے کہوں۔ ”ثروت! تم اتنے عرصے سے شادی شدہ ہو کر بھی شادی شدہ نہیں ہو۔ تمہارے شوہر نے سارے اختیارات رکھنے کے باوجود ابھی تک

تمہیں چھوٹا نہیں۔ کیا یہ قدرت کی طرف سے کوئی اشارہ ہے؟ کوئی کرشماتی رعایت ہے؟“ میں کہنا چاہتا تھا لیکن کہہ نہیں سکا۔ بس آنکھیں بند کیے سوچتا رہا۔ دفعتاً مجھے لگا کہ ثروت صوفے سے اٹھی ہے۔ وہ تیزی سے آئی اور میرے بازو کے ساتھ چمٹ سی گئی۔ ”تابش! وہاں کوئی ہے۔ میں نے کھڑکی میں سایہ دیکھا ہے۔ وہ اندر جھانک رہا تھا۔“ وہ دہشت زدہ آواز میں بولی۔ ”میں نے صاف دیکھا ہے تابش۔“

میں نے پھونک مار کر شمع بجھا دی اور چٹلون کی بیلٹ سے بھرا ہوا کولٹ پسل نکال لیا۔ میں اور ثروت وہاں پر ساکت و جامد بیٹھے رہے اور کھڑکی کی طرف دیکھتے رہے۔ نہ جانے کیوں مجھے بھی محسوس ہو رہا تھا کہ کوئی آس پاس ہے لیکن کھڑکی میں مجھے کچھ دکھائی نہیں دیا۔ ثروت اسی طرح میرے ساتھ چپکی بیٹھی تھی۔ اس نے مضبوطی سے میرا بازو پکڑ رکھا تھا۔ اس کے گھٹنے نرم بالوں کی مہک میرے حواس میں سرایت کر رہی تھی۔

پانچ دس منٹ اسی طرح گزر گئے۔ کھڑکی کے آس پاس کوئی حرکت نظر نہیں آئی۔ دھیرے دھیرے میرے بازو پر ثروت کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی، تاہم وہ اسی طرح میرے ساتھ لگی بیٹھی رہی۔ غیر یقینی حالات اسے مجھ سے دور ہونے نہیں دے رہے تھے۔ اس کا سر میرے کندھے سے لگا ہوا تھا۔ کچھ دیر بعد مجھے لگا کہ شاید وہ اٹکھنے لگی ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ جاگ رہی تھی اور اس کا ثبوت مجھے اس نمی کی صورت میں ملا۔ نمی میں نے اپنے کندھے پر محسوس کی۔ یہ ثروت کی آنکھ کا پانی تھا۔ یہ ”میری“ ثروت کی آنکھ کا پانی تھا۔ وہ بڑی خاموشی سے رو رہی تھی۔ باہر ہونے والی بے آواز بارش کی طرح۔

میں نے کولٹ پسل کو بائیں ہاتھ میں لیا اور دائیں ہاتھ سے ثروت کو اپنے ساتھ لگا لیا۔ ”ثروت!“ میں نے پُر خلوص لہجے میں کہا۔

وہ سکھنے لگی۔ مجھے لگا کہ چار پانچ برس کی جدائی کے بعد وہ آج پہلی بار مجھ سے ملی ہے۔ اپنا ڈکھ مجھے بتا رہی ہے۔



میں نے اسے بہت کم روتے دیکھا تھا لیکن آج وہ رو رہی تھی۔ ٹوٹ کر رو رہی تھی۔ یہ ”بے آواز رونا“ تھا تاہم اس کی شدت میں باسانی محسوس کر سکتا تھا۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر مجھے لگا کہ اس وقت خاموشی ہی سب سے بڑا اظہار ہے۔ اس نے بھی تو خاموشی کو ہی زبان بنایا ہوا تھا۔ اور یہ خاموشی واقعی فصیح و بلیغ زبان بن گئی تھی۔ ایک ایک زخم دکھا رہی تھی۔ ایک ایک ڈکھ بیان کر رہی تھی۔ کب پھڑے؟ کیا کیا گزری؟ کیسے امیدوں اور آسوں نے دامن

پکڑے رکھا، پھر کب زہر کے گھونٹ بھرنے پڑے، کب ہاتھوں پر مہندی رچی، کب شہنائی بجی اور کیونکر صبح و شام راہ دیکھنے والی آنکھوں کو ہمیشہ کے لیے پابند کرنا پڑا۔

اس کے خاموش آنسو ایک ایک بات بیان کر رہے تھے اور میں سن رہا تھا۔ وہ جیسے کہہ رہی تھی۔ ”آپ پر تو مجھے بڑا مان تھا تابش! میں سمجھتی تھی کہ آپ مجھے چھوڑ نہیں سکتے، دل میں یہ آس پلتی تھی کہ آپ مجھے کہیں چھپنے نہیں دیں گے۔ آپ مجھے ڈھونڈ لیں گے، شاید چھپی ہی اس لیے تھی کہ آپ مجھے تلاش کر لیں، ہر رکاوٹ عبور کر کے مجھ تک پہنچ جائیں۔ بڑا بھروسہ تھا آپ کی محبت پر۔ لوگ ایک دوسرے سے ملنے کے لیے دن گنتے ہیں۔ ہم نے تو پل گئے تھے، لمحے شمار کیے تھے تابش! ایک دوسرے کے بغیر جینے کا کوئی تصور ہی نہیں تھا ہمارے ہاں..... پھر کیوں ہو گیا ایسا؟ اتنی آسانی سے آپ دستبردار ہو گئے مجھ سے۔ مجھے غیروں کو سوچ دیا.....“

وہ سسکتی رہی اور خاموشی کی زبان بولتی رہی۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”ثرثوت! تمہیں تھوڑا بہت تو پتا چل ہی چکا ہے کہ میرے ساتھ کیا گزری۔ وہ ایسے واقعات تھے جن پر میرا کوئی بس نہیں تھا۔ میں کہیں سے کہیں پہنچ گیا۔ بھانڈیل اسٹیٹ ارد گرد کی دنیا سے بالکل کٹی ہوئی جگہ تھی۔ اگر نہ بھی ہوتی تو شاید میں اس جگہ سے نکل نہ سکتا۔ میں اپنے ہوش و حواس میں ہی نہیں تھا۔ نصرت نے تمہیں تھوڑا بہت بتایا تو ہوگا۔“

وہ خاموش رہی، بس اشک بہاتی رہی۔

میں نے سلسلہ کلام جوڑتے ہوئے کہا۔ ”امی کھڑکی سے نیچے گری تھیں اور شاید گرتے ہی ختم ہو گئی تھیں۔ میں انہیں دیکھنے کے لیے اندھا دھند سیڑھیوں کی طرف بھاگا اور پھر مجھے کچھ ہوش نہیں رہا۔ میں سیڑھیوں سے گرا تھا اور میرے سر پر بڑی سخت چوٹ آئی تھی۔ ثرثوت! اس چوٹ نے مجھے اگلے تقریباً دو ڈھائی سال تک اپنے ارد گرد سے بالکل بیگانہ رکھا۔ مجھے پتا ہی نہیں تھا، میں کون ہوں، کہاں ہوں۔ کچھ انجان لوگ میری دیکھ بھال کرتے تھے لیکن وہ انجان لوگ بتاتے ہیں کہ اس حالت میں بھی میں تمہارا نام پکارتا تھا۔ راتوں کو اٹھ کر جنگل کی طرف بھاگتا تھا۔ تم تک پہنچنا چاہتا تھا۔ وہ لوگ مجھے پکڑ کر لاتے۔ مجھے حفاظت اور نگرانی میں رکھتے لیکن موقع ملے ہی میں پھر نکل جاتا تھا۔ پھر ایک وقت ایسا آیا جب میری یادداشت بحال ہو گئی۔ میری بے قراریاں کچھ اور بڑھ گئیں۔ یہ غم مجھے دن رات ذبح کرنے لگا کہ ڈھائی تین سال پہلے میں تمہیں کس حال میں چھوڑ کر آیا تھا۔ میں وہاں سے کیسے اور

کیونکر نکل پایا، یہ ایک طویل داستان ہے ثرثوت! پاکستان پہنچتے ہی میں نے پوری شدت سے تمہاری تلاش شروع کر دی۔ میں جانتا تھا کہ تم نے جرمنی میں میرا بہت انتظار کیا ہوگا، میری بہت راہ دیکھی ہوگی۔ میں جانا چاہتا تھا کہ تم کہاں اور کس حال میں ہو اور پھر ایک روز احمد قحانوی صاحب کے گھر پر مجھے نصرت نظر آئی۔ اس کے بعد کے واقعات تم جانتی ہی ہو۔“ نہایت بوجھل دل کے ساتھ میں خاموش ہو گیا۔

ہم کئی منٹ تک اسی طرح گم صم بیٹھے رہے۔ اب اس نے میرا بازو چھوڑ دیا تھا اور ذرا پیچھے ہٹ گئی تھی، تاہم اس کا ہاتھ ابھی تک میرے ہاتھ میں تھا۔ ڈرا سہا ہوا سر دلس۔

وہ گلوگیر آواز میں بولی۔ ”تابش! جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ شاید یہ ہمارا مقدر تھا اور آدمی مقدر سے تو نہیں لڑ سکتا نا۔ اب..... میری زندگی یوسف سے جڑی ہوئی ہے۔ اب..... وہی میرے لیے سب کچھ ہیں۔ میں ایک بیوی کے ناتے اپنا ہر فرض نبھانا چاہتی ہوں تابش! میں ان کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر سکتی ہوں۔ اگر..... خدا خواستہ کسی نے انہیں تادان کے لیے اغوا کیا ہے تو میں اپنا سب کچھ..... سب کچھ بیچ کر انہیں بچانا چاہوں گی۔ میں نے.....“ وہ فقرہ مکمل نہ کر سکی اور پھر سسکنے لگی۔

میں نے تسلی بخش انداز میں اس کا ہاتھ دبایا۔ ”تم حوصلہ رکھو ثرثوت! یوسف ملے گا اور ضرور ملے گا۔ ہم اسے ڈھونڈنے کے لیے ہر حد تک جائیں گے۔“

وہ اشک بار لہجے میں بولی۔ ”ان کی کسی سے دشمنی نہیں۔ لین دین کے معاملے میں بھی وہ بالکل فیئر ہیں۔ چھوٹی موٹی خامیاں کس بندے میں نہیں ہوتیں۔ کچھ عرصہ پہلے تک ان میں بھی تمہیں مگر اب انہوں نے بہت حد تک ان پر قابو پالیا ہے۔ بہت بدل گئے ہیں وہ..... جرمن بیوی سے بھی ان کا تعلق تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ اس نے ان سے ”ڈائی وورس“ مانگی تھی۔ وہ ڈائی وورس کے پیپر تیار کروا رہے تھے۔ کبھی کبھی تو مجھے یہ شک بھی ہوتا ہے کہ کہیں یہ وہی ڈائی وورس والا معاملہ نہ ہو۔ میرا مطلب ہے.....“

”نہیں ثرثوت! یہ کوئی مقامی چکر ہے۔“

”مقامی کیا ہو سکتا ہے تابش! وہ بالکل صاف سیدھی زندگی گزار رہے تھے۔ ان کی کوئی مصروفیت ہم سے ڈھکی چھپی نہیں تھی۔ صبح دفتر جانا اور شام کے فوراً بعد واپس آ جانا۔ اس کے بعد اگر کوئی تفریح ہوتی بھی تھی تو ہمارے ساتھ ہی ہوتی تھی۔ پچھلے کچھ ہفتوں سے ہمارے درمیان تھوڑی سی ناراضگی چل رہی تھی۔ میں ان کے ساتھ کہیں آ جانیں رہی تھی۔ میں نہیں جانتی تھی تو وہ بھی نہیں جانتے تھے۔“

اشارہ کیا۔ پھر تیزی سے چٹخی گرائی۔ پٹ کھولا۔ کھڑکی کے عین نیچے کوئی موجود تھا۔ وہ گھٹنوں اور ہاتھوں کے بل بیٹھا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ پچھلی بار کی طرح تڑپ کر نگاہ سے اوجھل ہو جاتا، میں نے پھرتی سے اس کی توانا گردن دبوچ لی۔ پٹل صوفے پر گرا کر میں نے اس کا منہ بھی دبوچ لیا تھا۔ ایک ہی زوردار جھٹکے سے میں نے اسے کھینچ کر کمرے میں کر لیا اور ٹانگ کی مدد سے کھڑکی کے پٹ بند کر دیئے۔ ثروت کی گھٹی گھٹی آواز سنائی دی۔ یقیناً وہ سخت خوف زدہ تھی۔ مد مقابل میں خاصی طاقت تھی، وہ خود کو چھڑانے کی اندھا دھند کوشش کر رہا تھا۔ اس کے جسم پر ایک میلی کچلی شلوار کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ گلے میں منکوں کا ہار سا تھا۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ کسی طرح شور مچا سکے لیکن اس کے ہونٹوں پر میں نے بڑی مضبوطی سے ہتھیلی جمار کھی تھی۔ میرے کہنے پر ثروت نے میرے سیل فون کی نارنج روشنی کی اور اس کو نو وارہ کے چہرے پر فوکس کیا۔ وہ بیس بانئیں برس کا ہٹا کٹا سائیں نما لڑکا تھا۔ سر منڈا ہوا تھا اور منہ سے رال بہہ رہی تھی۔

میں نے سرسراتے لہجے میں کہا۔ ”شور مچاؤ گے تو اسی طرح تمہارا سانس روک کر تمہیں مار ڈالوں گا۔ چپ رہو گے تو کچھ نہیں کہوں گا۔“

اسے اندازہ ہو چکا تھا کہ وہ میری مزاحمت نہیں کر سکتا۔ پھر بھی حتی نتیجے تک پہنچتے پہنچتے اس نے دو تین منٹ لگا دیئے۔ اس کی مزاحمت ختم ہوئی تو میں نے اس کے منہ سے ہاتھ ہٹا دیا۔ میرے ہاتھ میں پستول تھا جسے دیکھ کر وہ خوف زدہ ہو رہا تھا۔ ثروت بھی ایک گوشے میں کھپائی ہوئی حیرت سے اس میلے کچیلے ملنگ نما لڑکے کو دیکھ رہی تھی۔

اس نے عجیب انداز میں اپنی بڑی بڑی آنکھیں کھولیں اور ہمیں ڈرانے والے انداز میں بولا۔ ”چلے جاؤ یہاں سے..... واپس چلے جاؤ..... نہیں تو بڑا پچھتاؤ گے..... تمہارے پیچھے کالے سائے ہیں۔ وہ تمہیں مار دیں گے۔ وہ تمہیں کھا جائیں گے۔ تمہاری قبریں بھی نہیں بنیں گی۔ لاش ہی نہ ہو تو قبر کیسے بنتی ہے۔“

”کون ہو تم؟“ میں نے سخت لہجے میں پوچھا۔ وہ منہ سے رال بہاتے ہوئے بولا۔ ”میں جن زاد ہوں۔ میں اوپر ہوا میں اڑتا ہوں۔ وہاں سے سب کچھ دیکھتا ہوں۔ مجھے سب نظر آتا ہے۔ تم دونوں غلط جگہ آ گئے ہو۔ یہاں کالے سائے تمہیں گھیریں گے۔ تمہاری قبریں بھی نہیں بنیں گی۔“

ثروت نے ہلکائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں نے تمہیں کہیں دیکھا ہے۔ شاید احمد صاحب (پیر احمد تھانوی) کی کوٹھی پر.....“

میں اسے کیسے بتاتا کہ وہ خوش فہموں میں مبتلا ہے۔ ٹین ایجر جرمن بیوی کے بعد یوسف نے ”تفریق“ کے کچھ اور راستے ڈھونڈ لیے تھے۔ وہ منہ مانگی قیمت دے کر اپنی راتیں رنگین کر رہا تھا اور اس کی یہ گمشدگی بھی انہیں ”مصرفیات“ کا شاخسانہ ہے۔

میں نے بس اتنا کہا۔ ”ثروت! میرے حوالے سے اپنے دل میں کوئی شک نہ رکھنا۔ نصرت جو کچھ کہا کرتی ہے وہ صرف اس کے اپنے خیالات ہیں۔ میں اسے کئی بار سختی سے منع بھی کر چکا ہوں لیکن تم جانتی ہو کہ وہ بچپن سے ضدی ہے۔“ میری آواز ڈکھ سے بوجھل ہو رہی تھی۔

”میں جانتی ہوں۔“ وہ منمنائی۔

میں نے کہا۔ ”ثروت! میں سچے دل سے کہتا ہوں، اگر تم مجھے مل جاتیں تو میں خود کو دنیا کا خوش قسمت ترین انسان سمجھتا۔ لیکن اگر تم میری قسمت میں نہیں ہو تو پھر بھی میں اپنے رب کی مرضی پر راضی ہوں۔ کسی کو خاموشی سے چاہتے رہنا کوئی گناہ نہیں۔ لوگ اسے گناہ کہتے ہیں تو کہتے رہیں۔ میں یہ ”گناہ“ اب بھی کر رہا ہوں اور زندگی کی آخری سانس تک کرتا رہوں گا۔ میں جب..... مر جاؤں گا ثروت..... تو مجھے..... غور سے دیکھنا..... میرے ہونٹوں پر غور سے دیکھنا..... تمہیں وہاں اپنا نام لکھا ہوا ملے گا۔ وہ کسی کو نظر آئے یا نہ آئے لیکن اگر تم نے دیکھا تو تمہیں ضرور نظر آئے گا۔ میں سچی محبت کے اس لفظ کو قبر میں بھی اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔“

جذبات کے سبب میرا گلارہ زندہ گیا۔ اس ڈر سے کہ کہیں آنکھیں نم نہ ہو جائیں، میں خاموش ہو گیا۔

اس نے کوئی رد عمل ظاہر نہیں کیا، بس ساکت بیٹھی رہی۔ اچانک میں ٹھٹھک گیا..... مجھے کھڑکی سے باہر پھر کوئی حرکت محسوس ہوئی تھی۔ ثروت نے سر جھکا رکھا تھا اس لیے وہ اس حرکت کو دیکھ نہیں پائی۔ میں نے ہولے سے اپنا ہاتھ ثروت کے ہاتھ سے الگ کیا۔ کولٹ پٹل کو اپنے بانئیں ہاتھ سے دائیں میں منتقل کیا اور جسم کو حرکت دی۔ ثروت بُری طرح چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ اس نے ایک بار پھر میرا بازو جکڑ لیا۔ میں نے بہ آہستگی بازو چھڑایا اور اندھیرے میں جھک کر چلتا ہوا کھڑکی کی طرف بڑھا۔

پچھلی دفعہ میں نے کھڑکی کی چٹخی اس طرح لگائی تھی کہ وہ آسانی سے کھل سکے۔ میں نے چٹخی پر ہاتھ رکھا۔ باہر یقیناً کوئی موجود تھا۔ میں نے ایک بار پھر ثروت کو خاموش رہنے کا

وہ ثروت کی سنی اُن سنی کرتے ہوئے بولا۔ ”سارا بکھیرا تیرا ہے۔ پہلے پکڑی بھی ٹو جائے گی۔ جیسے وڈے پیر صاحب پکڑے گئے۔ وہ تو شاید واپس آ جائیں گے پر تو نہیں آ سکے گی۔ سات کنوؤں کا پانی پیا ہے انہوں نے۔ تو نے تو ایک کا بھی نہیں پیا۔

”بڑے پیر صاحب کون ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”وہی جن کے پاس تم کل اپنی لوڑ (ضرورت) کا پیالا لے کر گئے تھے۔ نہیں..... نہیں لوڑ کا دیگیا۔ نہیں نہیں لوڑ کی دیگ..... بہت وڈی دیگ..... اس دیگ کو کوئی نہیں بھر سکتا۔ شاید وڈے پیر صاحب بھی نہیں۔“

اس سائیں نماز کے کی باتوں سے پتا چل رہا تھا کہ شاید اس کا تعلق کسی طور پیر احمد تھانوی صاحب سے ہے۔ لیکن میں نے اسے کبھی تھانوی صاحب کے آستانے پر نہیں دیکھا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کا تعلق یہاں ہارون آباد سے ہی ہو اور وہ ایک آدھ بار لاہور گیا ہو جہاں ثروت نے اسے دیکھا ہو۔

وہ عجیب اُلجھی ہوئی سی باتیں کر رہا تھا۔ ہم کچھ پوچھتے، وہ جواب کچھ دیتا۔ پھر اس نے ایک دم رٹا ڈال دیا کہ وہ دودھ جلیبیاں کھانا چاہتا ہے اور اگر ہم نے اسے دودھ جلیبیاں نہیں کھلائیں تو وہ کھڑکی سے نیچے چھلانگ لگا دے گا اور اس کی دونوں ٹانگیں ٹوٹ جائیں گی۔

ہم نے اسے بمشکل سنبھالا۔ ثروت نے اپنے شولڈر بیگ میں سے چاکلیٹ نکال کر اسے دی۔ کافی بڑی چاکلیٹ تھی، وہ ایک ہی بار منہ میں ڈال کر ہڑپ کر گیا۔ میں یہ جاننے کی کوشش کر رہا تھا کہ وہ کسی طرح کی اداکاری تو نہیں کر رہا۔ بظاہر اس کے آثار نہیں تھے یا پھر وہ بہت اچھا اداکار تھا۔ پہلی بات ہی درست لگتی تھی۔ تھوڑی دیر بعد اس نے اعلان کیا کہ اسے پیشاب آ گیا ہے اور اتنے زور سے جتنے زور سے چناب میں پانی آتا ہے۔ میں نے اسے کمرے کے انچ باتھ روم کا راستہ دکھایا لیکن اس نے صاف انکار کر دیا۔ اس نے کہا کہ وہ بند جگہ پر پیشاب نہیں کر سکتا اور اس کے لیے فی الوقت کھلی جگہ یہ کراہی تھی۔

جب مجھے لگا کہ وہ سچ سچ یہاں پیشاب کر دے گا تو میں اسے کھڑکی میں سے گزار کر باہر لے آیا۔ یہاں کافی کشادہ بالکونی تھی۔ میں نے کہا۔ ”یہاں کر لو پیشاب۔“

وہ نیم آمادہ نظر آیا۔ لیکن پھر ایک دم اس نے مجھے دھکا دیا اور نیچے جانے والی سیڑھیوں کی طرف دوڑ لگا دی۔ میں نے اس کے پیچھے لپک کر اسے دوبارہ دبوچنا چاہا مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ یقیناً ہوٹل میں شور شرابا ہو جاتا اور یہاں آج رات کچھ ایسے لوگ ہمارے ساتھ مقیم تھے جن کے سامنے میں ہرگز آنا نہیں چاہتا تھا۔

دو بھائیوں کا ہونا چھٹیوں کی جانب مائل نہیں ہو گیا۔

میں وہیں کمرے میں آگیا۔ کڑی کڑی لڑائی طرح لڑنے سے بعد کڑی کڑی سے ہنسی طرف رخ کر پڑا۔ اسی ترنگی گھیر رہی تھیں جو کئی گھنٹے پہلے ہنر سے کھینچی گئی تھیں۔ انہیں کھینچنے والا یہ سائیں لڑکائی تھا۔ کمرے کمرے کی آوازوں، لڑائی، ہنم گھیر رہی کی سی تھی۔ شہادت نے سہمائی ہو کر رہ گئی تھی۔ ہم اس دل جلانے والی سائیں کی آمد پر تیرہ من گئے۔ اس نے جو باتیں کہی تھیں، ان میں سے کچھ تو ایسی باتیں تھیں جو ہمیں سوچنے پر مجبور کر رہی تھیں۔ اس نے کالی پر چھانچوں کا ذکر کیا تھا۔ وہ سب شک و شبہ سے آزاد ہو کر سوچ رہی تھیں۔ ہو سکتا ہے کہ اس سوائے میں سائیں کا شکائے کیا ہو مگر وہاں سے ہی جتنی اہم تو فحاشی صاحب کے بارے میں بھی دیکھ کر تو ایسی باتیں کر رہا تھا، وہ کہہ رہا تھا کہ ہمارے یہ صاحب بکرا سے ملے ہیں۔ ہاں نہیں کہہ سکتے، بات سے اس کا کیا مطلب تھا۔ یہ صاحب واقعی اپنی رہائش پر سوچ رہے نہیں تھے۔ اوستہ سوئے پر چڑھ گئی۔ میں اس کے قریب کڑی چڑچڑایا۔ سائیں کی آمد سے پہلے میرے دل اس کے درمیان جھگڑا تھا۔ کھٹکھٹا رہی تھی، اس کے خراشے ابھی تک اس کے پیروں پر موجود تھے۔ انہیں سرخ اور خورم تھیں۔ ہر حال اب ہمارے منہاں سے کا دھارا دوسری طرف مڑ چکا تھا۔ اس بات کا پتا نہیں چکائی بلکہ شکا تھا کہ اہم تو فحاشی صاحب کہہ رہی ہیں کہ کب تک وہیں چلیں گے۔

سائیں کی باتوں سے یہ شک ابھی سو رہا تھا کہ شاید اس نے ہمیں گلے دیا ہے اور اہم تو فحاشی صاحب کی قیام گاہ کے آس پاس دیکھا ہے اور اس سے ہمارے پیچھے نکل کر یہاں پہنچ گئی ہیں۔ پہنچ گیا ہے۔ ہم نے سٹے کی کوئی نو پک کے بعد پہلے فون پر اہم تو فحاشی صاحب سے رابطہ کر رہی گے۔ اس کے بعد ہی ان کی طرف جانے کے لیے لگے گے۔

بارش شاید آسمانی تھی مگر بکے پانی پر سوار ہو رہے تھے۔ رات آخری پر شہادت سوئے پر ہم راز دار ہو گئے تھے۔ مجھے بھی دیکھ کر کے لیے دنگ آگئی۔ جسمانی اور اخلاقی شکاوت اگلی رات ہی تھی کہ میں سو گیا۔ جب جاگ توں پڑا تو یہ تھا۔ یہ اپنی لڑائی اور اپنی دلی تھا۔ رات کو وہاں میں سائیں کو دھکوتی میں لے کر گیا تو میری قیاس گئی ہو گئی تھی۔ میں نے اسے کہی پر پھینکا دیا تھا۔ اب میں نے دیکھا کہ شہادت سے جو کچھ اسٹری کر رہی تھی۔ اسٹری اس نے میرے سے شکوتی تھی۔ اسے ہوں اپنی قیاس اسٹری کرتے دیکھ کر ایک عجیب سا اضطراب محسوس میں جا رہا ہو گیا۔ ہم سب کچھ غور سے اس باتوں۔ عید کا موقع تھا۔ یہ سب باتوں کے مگر عید میں پارٹی تھی۔ خانہ میں کے بہت سے لڑکے لڑکیاں بھی ملے تھے۔ خوب بکے سوار سے ہوئے تھے۔

چھت پر ٹہلتے ہوئے میں نے ثروت سے کہا تھا۔ ”کبھی کبھی بڑا دل چاہتا ہے کہ تم میرے کپڑے استری کرو۔ میرے سامنے انہیں استری کر کے ہینگر پر لٹکاؤ۔“
وہ بولی۔ ”شادی کے بعد..... شادی سے پہلے ہرگز نہیں۔“

میں نے تملائے ہوئے انداز میں کہا۔ ”یہ کیا بات ہوئی۔ ہر کام شادی کے بعد..... ہر کام شادی کے بعد۔ بھی یہ چھوٹے چھوٹے بے ضرر کام تو شادی سے پہلے ہو ہی سکتے ہیں اور لوگ کرتے بھی ہیں یار۔“

”آپ کے جو چھوٹے چھوٹے کام ہیں نا، وہ میں اچھی طرح جانتی ہوں۔“ وہ خوشی سے بولی۔

”اچھا استری کرنے سے تو تمہاری شرم و حیا پر کوئی آفت نہیں آجائے گی۔ یہ تو بالکل ہی چھوٹا سا کام ہے لیکن اس سے مجھے جو خوشی ہوگی وہ بہت بڑی ہوگی۔“

”اس بڑی خوشی کو شادی کے بعد کے لیے سنبھال کر رکھ لیں نا..... اب دن ہی کتنے رہ گئے ہیں۔“

”یعنی تم استری نہیں کرو گی؟“

”بالکل نہیں۔“ وہ ادا سے بولی۔

”میں ابھی نہ کرواؤں تو میرا نام نہیں۔“ میں نے کہا۔ وہاں پاس ہی چھوٹی ممانی کا شولڈر بیگ پڑا تھا۔ میں نے بیگ میں سے ہلکے سرخ شیڈ والی لپک اسٹک نکالی۔ اسے انگلی پر لگایا اور قیص پر سینے کی طرف ہونٹوں کا نشان سا بنا دیا۔ پھر ایک مدھم سا نشان کندھے کی طرف بھی بنا دیا۔ ”اس کو کہتے ہیں بلیک میلنگ۔“ میں نے وضاحت کی تھی۔ ”اب میں اسی قیص کے ساتھ سب میں گھوموں پھروں گا۔ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ ان میں سے اکثر جان جائیں گے کہ یہ نشان کیسے ہیں اور ان کا شجرہ نسب کیا ہے۔ اب اندازہ لگا لو کہ تمہارے بارے میں کیا کیا سوچا جائے گا۔ لو میں جارہا ہوں۔“ میں نے کہا۔

ثروت نے جلدی سے میرا بازو پکڑ لیا تھا۔ اس کا ردائی کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ثروت نے چھت پر ہی مجھے ایک کزن کی قیص لا کر دی تھی جو میں نے پہنی تھی۔ اس نے میری قیص کے داغ دھوئے تھے اور پھر اسے استری بھی کیا تھا۔

آج اسے اپنی قیص پر استری پھیرتے دیکھ کر وہ سارا خوبصورت منظر تصور کے پردے پر ابھرا آیا۔

”ناشتے میں کیا منگوائیں؟“ میں نے پوچھا۔

”جو آپ کا جی چاہے۔ مجھے تو زیادہ بھوک نہیں ہے۔“ وہ بولی۔
”بھوک کیوں نہیں؟ رات کو بھی کچھ نہیں کھایا تھا۔ اپنے لیے نہیں تو یوسف کے لیے کچھ لھاؤ۔ جسم میں طاقت ہوگی تو اس کے لیے کچھ کر سکیں گے نا۔“

میں نے بذریعہ انٹرکام کمرے کے اندر ہی ناشتہ منگوا یا۔ ڈبل روٹی، جیم، انڈے، دودھ اور چائے سبھی کچھ شامل تھا۔ گاہے بگاہے میں دروازے کی جھری میں سے باہر لابی کا جائزہ بھی لے لیتا تھا۔ ابھی تک کرشمہ کپور ثانی یا اس کے کسی ساتھی کی شکل نظر نہیں آئی تھی۔ میرے اندازے کے مطابق کرشمہ کپور ایک کمرے میں تھی۔ اس کے دو یا تین ساتھی دوسرے کمرے میں تھے۔ نیچے ان کی سیاہ کروڑا گاڑی بھی کھڑی تھی۔ اس پر بہاؤ پور کی نمبر پلیٹ لگی ہوئی تھی۔

ناشتے کے بعد ساڑھے نو بجے کے قریب ثروت نے اپنے سیل فون سے احمد تھانوی صاحب کی قیام گاہ پر فون کیا۔ فرید نامی ملازم خاص سے ہی بات ہوئی۔ اس نے بتایا۔ ”پیر صاحب ابھی واپس نہیں آئے۔ شاید ان کی واپسی میں کچھ دیر ہو جائے گی۔“

”کیا مطلب آپ کا؟“ ثروت پریشان ہو کر بولی۔ ”ہم ان کے لیے لاہور سے آئے ہیں۔ یہاں ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔ دوپہر تک ہمیں کمرہ چھوڑنا ہے۔“

فرید نے روکھے لہجے میں کہا۔ ”اس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ حضرت صاحب بھی بندہ بشر ہیں..... کوئی کام پڑ سکتا ہے بندے کو۔“

”تو پھر کیا کریں جی..... اب کتنے بجے تک فون کریں؟“
”کتنے بجے کا تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ آپ شام کو دوبارہ ٹرائی کر لو..... خدا حافظ۔“

اس کے ساتھ ہی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

گفتگو کے دوران میں ثروت نے سیل فون کا اسپیکر آن رکھا تھا۔ مجھے فرید احمد کی آواز میں پریشانی اور عجلت صاف محسوس ہوئی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ وہ خود بھی تھانوی صاحب کی واپسی میں تاخیر کے حوالے سے پریشان ہے۔

رات والے سائیں لڑکے کی رمزیہ گفتگو ایک بار پھر ہمارے کانوں میں گونجنے لگی۔ اس نے تھانوی صاحب کو دوڑے پیر کہا تھا اور ان کے حوالے سے کچھ ابھی ہوئی باتیں کہی تھیں۔

رات والے واقعے کے بعد وہ تنگ دھڑنگ دوبارہ نظر نہیں آیا تھا۔

ثروت پریشان لہجے میں بولی۔ ”جہاں تک میں جانتی ہوں حضرت صاحب کہیں بھی ہوں، کتنے بھی مصروف ہوں، اپنے مریضوں کو دیکھنے کے لیے وقت پر پہنچ جاتے ہیں۔ اگر وہ

آج نہیں آئے تو کوئی خاص وجہ ہوگی۔ آپ کا کیا خیال ہے؟“
”میں تم سے اتفاق کرتا ہوں ثروت۔“

وہ گم صم ہو گئی۔ اسے تھانوی صاحب سے بڑی امید تھی۔ وہ سمجھتی تھی کہ وہ یہاں یوسف کا کھوج لگانے میں ہماری خاطر خواہ مدد کریں گے اور مقامی پولیس بھی ہر طرح ہمارے ساتھ تعاون کرے گی۔ مگر یہاں یہ ماجرا ہوا تھا کہ حضرت صاحب خود ہی کہیں اُلجھے ہوئے تھے۔ ہمیں یہاں ہارون آباد آئے اب چوبیس گھنٹے سے اوپر ہو چکے تھے لیکن ابھی تک حضرت صاحب سے ملاقات ہی نہیں ہو سکی تھی۔

میں نے ایک بار پھر دروازے کی جھری میں سے دیکھا اور چونک گیا۔ مجھے کرشمہ کپور اور اس کا ایک ساتھی لابی میں نظر آئے۔ کرشمہ کپور حسب سابق لمبی چادر میں تھی اور اس چادر میں سے اس کی آنکھیں اور تھوڑی سی پیشانی ہی نظر آتی تھی۔ غالباً اپنی آنکھوں کو کرشمہ کپور کی آنکھوں سے ملانے کے لیے وہ نیلے لینس لگاتی تھی۔ یا اسے لگائے جاتے تھے۔ مجموعی طور پر وہ کچھ لاغر اور پڑمردہ نظر آتی تھی۔ اس کے ساتھی نے اسے کوئی دولا کر دی، ساتھ میں پانی کا گلاس تھا۔ کرشمہ کپور نے گولیاں منہ میں رکھ کر پانی پی۔ میں نے جلدی سے کھڑکی میں جا کر نیچے سڑک کی طرف دیکھا۔ گندی رنگت والا ایک چوڑا چکلا شخص سیاہ کر دلا کو کپڑے سے صاف کر رہا تھا۔ اندازہ ہوا کہ یہ لوگ یہاں سے رخصت ہونے والے ہیں۔ میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ ان لوگوں کا پیچھا کرنے اور ان کا ٹھکانا جاننے کا یہ اچھا موقع تھا۔ درحقیقت میں رات کو ہی فیصلہ کر چکا تھا کہ اگر کل یہ لوگ روانہ ہوں تو میں ان کے پیچھے جاؤں گا۔
میں نے یہ بات ثروت سے کہی تو وہ ایک دم پریشان نظر آنے لگی اور بولی۔ ”تو میں یہاں اکیلی رہوں گی۔“

وہ بھول رہی تھی کہ وہ یہاں اکیلی ہی آنا چاہ رہی تھی۔ بہر حال، اس کی یہ پریشانی مجھے اچھی لگی۔ میں نے کہا۔ ”مجھے نہیں لگتا کہ یہ لوگ زیادہ دور جائیں گے۔ زیادہ سے زیادہ فقیر والی تک جائیں گے۔ میری واپسی ڈیڑھ دو گھنٹے میں ہو جائے گی۔ ویسے بھی میں موبائل پر تم سے رابطہ رکھوں گا۔“

لیکن یہ لوگ ہیں کون؟“ وہ جزبہ ہو کر بولی۔

میں نے اس موقع پر مناسب سمجھا کہ ثروت کو تھوڑا بہت بتا دوں۔ ورنہ وہ سمجھتی کہ میں یوسف والا معاملہ بیچ میں ہی چھوڑ کر اپنے کسی کام میں لگ گیا ہوں۔ میں نے کہا۔ ”ثروت! مجھے شک ہو رہا ہے کہ میں نے ان میں سے ایک بندے کو ہسپتال میں یوسف کے ارد گرد

دیکھا تھا۔ وہی چوڑی ناک والا سانولا سا شخص۔ اب وہ یہاں بھی موجود ہے۔ مجھے ذرا اس بارے میں اپنا شک دور کر لینے دو۔“ میں نے بات بنائی تھی۔

”تو پھر..... مجھے بھی ساتھ لے جائیں۔ میں اکیلی یہاں کیا کروں گی؟“
”نہیں ثروت! یہ مناسب نہیں۔ تم یہاں آرام سے بیٹھو۔ ٹی وی دیکھو اور دروازہ بند رکھو۔ میں نے کہا ہے ناکہ میں فون پر رابطہ رکھتا ہوں۔“
میں ثروت کو بمشکل راضی کر سکا۔ غالباً اس کے ذہن میں رات والے واقعات تھے جب ننگ دھڑنگ سائیں ہمارے کمرے کے گرد منڈلاتا رہا تھا۔

نیتو عرف کرشمہ کپور نے اب سن گلاسز لگا لیے تھے۔ وہ شاید کمرے میں کوئی چیز بھول گئی تھی۔ اپنی جگہ سے اٹھی اور اسٹک کے سہارے چلتی ہوئی کمرے میں چلی گئی۔ چوڑی ناک والے شخص کا رخ دوسری جانب تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانا۔ میں کمرے سے نکلا اور اس کی نظر بچاتا ہوا سیزرھیاں اُتر گیا۔ میں نے پی کیپ پہن رکھی تھی۔ دھوپ کی عینک بھی لگائی تھی۔ مجھے اُمید تھی کہ اگر ان تینوں افراد میں سے کسی نے مجھے دیکھا بھی ہے تو آسانی سے نہیں پہچان سکے گا۔ ہوٹل سے کچھ فاصلے پر دو تین ٹیکسیاں کھڑی تھیں۔ میں نے ایک اچھی حالت کی مہران ٹیکسی منتخب کی۔ اس کا ڈرائیور ایک بالکل ڈبلا پتلا شخص تھا۔ پیشانی سے کافی سارے بال اڑے ہوئے تھے۔ وہ بڑے انہماک سے کیلے کھا رہا تھا اور عیسیٰ خیلوی کے گانے سن رہا تھا۔ میں ٹیکسی میں عقبی سیٹ پر جا بیٹھا۔ ”کہاں جانا ہے صاحب جی؟“ وہ شیریں لہجے میں بولا۔

”فقیر والی۔ کتنے پیسے لو گے؟“

”آپ خوشی سے جو دے دیں گے جی۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ اگر تم نے مجھ پر چھوڑ دیا ہے تو پھر تمہیں ناراض نہیں کروں گا لیکن ابھی تھوڑی دیر کرنا ہے۔ ہوٹل سے میرے کچھ ساتھی بھی آرہے ہیں۔“
”ہمارے ساتھ بیٹھیں گے۔“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”نہیں وہ پیچھے جو کالی کر دلا کھڑی ہے، اس میں جائیں گے۔ ہمیں ان کے ساتھ ہی جانا ہے۔“

ڈرائیور نے مطمئن انداز میں سر ہلایا۔ اس نے مجھے کیلوں کی پیشکش کی۔ میں نے شکریے کے ساتھ انکار کر دیا۔ اس نے نیپ ریکارڈر کی آواز تھوڑی سی اونچی کر دی تاکہ میں بھی پوری طرح موسیقی سے فیضیاب ہو سکوں۔ عیسیٰ خیلوی کی آواز ٹیکسی میں گونجنے لگی۔ پنے

کبھی کسی دوسری گاڑی کو بھی ٹیکسی اور کرولا کے درمیان آنے دیا۔

میرا خیال تھا کہ کرولا فقیر والی کی طرف جائے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ وہ فقیر والی سے کافی پہلے ہی بائیں طرف ایک کچے کچے راستے پر مڑ گئی۔ یہ تارکول کے بجائے اینٹوں کی سڑک تھی اور کہیں کہیں سے ناہموار بھی تھی۔ اب ہمیں کرولا سے اپنا فاصلہ مزید بڑھانا پڑا۔ ہم نے کرولا کو دیکھنے کے بجائے اس دھول پر نظر رکھی جو کرولا کے ٹائروں سے اُڑ رہی تھی۔ یہ سفر پندرہ بیس منٹ کے بعد ایک گاؤں پر جا کر ختم ہوا۔ یہ خالص دیہی علاقہ تھا۔ گاؤں ذرا نشیب میں تھا۔ دور سے مسجد کے سفید مینار نظر آ رہے تھے اور ان سے کچھ فاصلے پر کسی حویلی کے برج تھے۔ یہ کافی بڑی حویلی تھی۔ شاید انگریزوں کے دور میں بنی تھی۔ میں نے ٹیکسی گاڑی سے تھوڑے فاصلے پر درختوں کی اوٹ میں رکوا دی۔ ڈرائیور یا سر سے کہا کہ وہ انجن کا کوئی تار وغیرہ اُتار دے اور بونٹ کھلا رکھے۔ اگر کوئی پوچھے بھی تو اسے بتائے کہ گاڑی خراب ہے اور سواری گاؤں میں گئی ہے۔

اس کو سب کچھ سمجھا کر میں جوی کے اونچے کھیتوں میں پگڈنڈی پر چلتا ہوا گاؤں کی طرف بڑھا۔ اب میں نے پی کیپ اُتار لی تھی اور عینک بھی جیب میں ڈال لی تھی۔ کوٹ بسل کو جیب سے نکال کر میں نے پتلون کی بلیٹ میں اڑس لیا اور اسے چھپانے کے لیے شرٹ پتلون سے باہر نکال لی۔ اسی دوران میں ثروت کا فون آ گیا۔

”ہیلو..... کہاں ہیں آپ؟“ اس نے فکر مند لہجے میں پوچھا۔

”جہاں بھی ہوں بالکل خیریت سے ہوں۔“ میں نے ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔

”پلیز اپنا خیال رکھیں۔“

”خیال ہی تو اپنے بس میں نہیں ہے۔“

”اچھا کب تک آجائیں گے؟“

”ابھی تو جا رہا ہوں بھئی۔ ڈونٹ دری۔ دوپہر کا کھانا کھٹے کھائیں گے۔“

گفتگو ختم ہو گئی۔ میں جلد ہی گاؤں کی بیرونی حدود میں پہنچ گیا۔ یہاں سے حویلی کی ایک سائیڈ کی جھلک نظر آتی تھی۔ کچے اور نیم کچے مکانوں کے درمیان وہ کسی چٹان کی طرح کھڑی تھی۔ اس کی بیرونی دیواریں ٹانگ چندی اینٹوں کی تھیں اور کافی موٹی تھیں۔ ایک طرف پرچون کی دکان نظر آ رہی تھی۔ لکھا تھا۔ ”لطیف دی ہٹی.....“

میں لطیف دی ہٹی یعنی لطیف کی دکان پر چلا گیا۔ کاؤنٹر کے پیچھے اندر کی طرف لکڑی کا ایک سٹول رکھا تھا۔ میں تھکے ہوئے انداز میں بیٹھ گیا اور دکاندار سے کہا۔ ”بھائی صاحب!

نال چانتی تارے نال کو ماہیا..... توں پھل موہیے دا، میں تیری خوشبو ماہیا۔

میں نے مزکرہ دیکھا۔ مجھے لگا جیسے ہوٹل کے کمرے کی کھڑکی میں سے ثروت مجھے دیکھ رہی ہے اور میرے لیے دعا گو ہے۔

حسب توقع چار پانچ منٹ بعد چادر میں لپیٹی ہوئی کرشمہ کپور واکنگ اسٹک کے سہارے چلتی ہوئی گاڑی کی اگلی نشست پر آ بیٹھی۔ چوڑی ناک والے نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھال لی۔ باقی دونوں افراد پچھلی نشست پر بیٹھ گئے۔ گاڑی روانہ ہوئی تو میرے اشارے پر ڈرائیور نے ٹیکسی بھی آگے بڑھا دی۔

جلد ہی ہم اندرونی سڑکوں سے نکل کر ہائی وے پر پہنچ گئے۔ میں نے ذرا بد لے ہوئے لہجے میں ڈرائیور سے کہا۔ ”تمہارا نام؟“

”محمد یاسر جی۔“

”تو یا سربات یہ ہے کہ میرا تعلق سی آئی ڈی سے ہے۔ سمجھتے ہونا خفیہ پولیس؟“

”جی ہاں.....“ وہ ایک دم چونک کر بولا۔

”گھبرانے کی بات نہیں۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ ”تمہیں پورا کرایہ ملے گا۔ بلکہ انعام بھی دوں گا۔ ہمیں اس گاڑی کا پیچھا کرنا ہے اور پوری احتیاط کرنی ہے کہ انہیں شک نہ ہو۔“

”ٹھنڈ..... ٹھیک ہے جی۔ یہ کوئی مجرم وغیرہ ہیں؟“ اس نے غور سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

”مجرم تو نہیں..... ابھی ملزم ہیں۔“

”تھتھیار وغیرہ بھی ہو گا ان کے پاس؟“ وہ ڈرے ہوئے لہجے میں بولا۔

”ہو بھی سکتا ہے۔ اسی لیے کہتا ہوں کہ ہمیں احتیاط سے چلنا ہے۔“

اس نے تھوک نگل کر اثبات میں سر ہلایا اور ٹیپ ریکارڈر کی ناب گھما کر عیسیٰ خیلوی کا گلابا دیا۔

”اے چلتا رہنے دو۔ ہم پولیس والے اتنے کچے مسلمان نہیں ہوتے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔

اگلے آدھ گھنٹے تک ہم نے احتیاط سے کالی کرولا کا تعاقب جاری رکھا۔ ہائی ویز پر گاڑیاں اکثر گھنٹوں تک ایک دوسرے کے پیچھے چلتی رہتی ہیں۔ یعنی اس طرح سے چلنا ایک معمول کی بات ہوتی ہے۔ پھر بھی ہم نے احتیاط کی۔ کرولا سے اپنا فاصلہ برقرار رکھا اور کبھی

ٹھنڈا پلا دو۔ کوئی کوک شوک۔“

اس نے کسی مقامی فیکٹری کی بنی ہوئی ”سوڈا واٹر“ نکالی اور بولا ”میرے پاس تو یہی ہے جی۔“

”چلو جی..... یہی چلے گی۔“ میں نے فراخ دلی سے کہا۔

”کہاں سے آئے ہیں؟“ لطیف نے پوچھا۔ وہ تیس پینتیس برس کا بھلا مانس سا مخضر تھا۔ اس نے لٹھے کی سفید شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ دکان میں ایک طرف گولیوں، ٹافیوں والے ڈبوں کے اوپر تہ کی ہوئی ”جانماز“ بھی رکھی تھی۔ وہ میرے لباس کو ذرا حیرت سے دیکھ رہا تھا۔

میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔ ”ہارون آباد سے آیا ہوں۔ وہاں ہمارے ایک پیر و مرشد ہیں احمد تھانوی صاحب، ان کے نیاز حاصل کرنے تھے لیکن وہ کہیں گئے ہوئے ہیں۔ کل ان سے مل کر لاہور واپس چلا جاؤں گا۔ اب تھوڑا سا وقت تھا میں نے سوچا ادھر کا چکر لگا لوں۔“

”ادھر کیسے؟“ لطیف نے پوچھا۔

”فقیر والی میں ہمارے ایک دوست ہیں اکبر مہر صاحب! انہوں نے بتایا تھا کہ یہاں بارڈر کے ساتھ ساتھ رقبے کافی سستے مل جاتے ہیں۔ فارم وغیرہ بنانے کے لیے اچھی جگہ ہے۔ میں نے سوچا چلو تھوڑا سا سروے کر آؤں۔ ٹیکسی پر آیا۔ وہ ادھر کھیتوں کے پاس خراب ہو گئی ہے۔ ڈرائیور ٹھیک کر رہا ہے۔“

لطیف کے چہرے پر عجیب سی چمک نمودار ہو چکی تھی۔ اس نے دکان کے پچھلے حصے سے ایک گدڑی والی کرسی نکالی اور تپاک سے بولا۔ ”آپ سٹول پر نہیں ادھر کرسی پر بیٹھیں جی! آپ تو ہمارے اپنے ہیں۔ بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ اس نے ایک بار پھر مجھ سے مصافحہ کیا۔

”میں سمجھا نہیں۔“ میں نے کہا۔

”آپ ہمارے پیر بھائی ہیں۔ ہم بڑے پُرانے عقیدت مند ہیں حضرت صاحب کے۔“ وہ پُر جوش انداز میں بولا۔

اس کے ساتھ ہی اس نے اپنے آٹھ دس سالہ بیٹے کو پکارا۔ وہ بھاگتا ہوا آیا۔ لطیف بولا۔ ”اپنے چاچا کو سلام کرو۔“ لڑکے نے فوراً ماتھے پر ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔ وہ مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”لوجی اب بتاؤ کیا کھانا پیو گے؟ کیا سیوا کریں آپ کی؟“

میں منع کرتا رہا لیکن اس نے دودھ پتی منگوائی اور دکان کے اندر سے ہی بہت سے بسکٹ نکال کر میرے سامنے رکھ دیے۔ وہ بچھا جا رہا تھا۔

کہنے لگا۔ ”لگتا ہے آپ پہلی بار ادھر آئے ہیں؟“

”آیا تو پہلی بار ہوں لیکن آپ کو کیسے پتا چلا؟“

”آپ کے کپڑوں سے۔“ اس نے کہا۔

اسی دوران میں ایک جواں سال لڑکا تمباکو لینے لطیف کی دکان پر آیا۔ اس نے بھی بڑے تعجب سے میرے کپڑوں کو دیکھا جیسے میں نے پتلون قمیص نہیں پہنی، گھاگرا چولی یا کوئی اور زنانہ لباس پہن رکھا ہے۔

لڑکے کے جانے کے بعد میں نے لطیف سے پوچھا۔ ”کیا یہاں پینٹ قمیص پہننا منع ہے؟“

”ایسا ہی سمجھ لیں جی۔ چودھری انور کو چنگا نہیں لگتا۔ وہ کہتا ہے اپنا پینڈ و لباس پہنو۔ پینڈ و کھاؤ، پینڈ و پیو، پینڈ و طریقے سے رہو۔ یہ سوڈا واٹر بھی میں نے ڈرتے ڈرتے رکھا ہوا ہے۔ وہ تو ان چیزوں سے بھی منع کرتا ہے۔ بہت غصے والا ہے۔ اس کی مرضی کے خلاف علاقے میں کوئی نہیں چل سکتا۔“

ایک گلی میں حویلی کی ایک دیوار کی جھلک نظر آرہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”یہ حویلی کس کی ہے لطیف صاحب؟“

وہ بولا۔ ”چودھری انور کی۔ یہ دراصل تین بھائی ہیں۔ چودھری انور بڑا ہے۔ اس سے چھوٹا چودھری اصغر ہے اور پھر نکا چودھری امجد۔ تینوں بڑے ڈھاڈے ہیں لیکن چودھری انور کچھ زیادہ ہی کوڑا (کڑوا) ہے جو اس نے کہہ دیا بس کہہ دیا۔ باقی دونوں بھائی بھی اس کی پوری حمایت کرتے ہیں اور پھر سارے علاقے کو اس پر عمل کرنا پڑتا ہے۔“

”چودھری انور، ویسے کیسا بندہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت چنگا..... اور بہت بُرا۔“ لطیف دھیمی آواز میں بولا۔

”یہ کیا بات ہوئی۔ چنگا بھی اور بُرا بھی؟“

لطیف نے کہا۔ ”جو لوگ اس کے کہنے کے مطابق چلتے ہیں ان کے لیے بہت چنگا ہے، دوسروں کے لیے بہت بُرا..... بلکہ بہت ہی بُرا۔ کھڑے کھڑے بندے کی جان نکال لیتا ہے۔“

اسی دوران میں سولہ سترہ سال کا ایک لڑکا سائیکل پر کھاد کی دو بوریاں رکھے دکان کے

سامنے سے گزرا۔ اس نے پینٹ قیص پہن رکھی تھی۔ کپڑوں کی طرح لڑکے کا اپنا حلیہ بھی خستہ تھا۔ میں نے لطیف سے کہا۔ ”آپ تو کہتے ہیں کہ یہاں شہری لباس کوئی نہیں پہنتا۔“
 لطیف میرا اشارہ سمجھ کر بولا۔ ”یہ نوکر ہے حویلی کا۔ اس کی بات اور ہے۔“
 ”کیا مطلب؟ جو چیز عام لوگوں کے لیے منع ہے وہ اپنے نوکروں کے لیے جائز ہے۔“

”ہاں..... یہی تو چکر ہے۔ یہ لباس نوکر پہن سکتے ہیں جن کو ہر وقت حویلی والوں کی جھڑکیاں کھانی پڑتی ہیں۔ عام لوگ نہیں پہن سکتے۔ اب یہ منڈا جو یہاں سے گزرا ہے، پڑھا لکھا ہے۔ شاید بہاد پور کا رہنے والا ہے۔ بس چودھریوں کے ہتھے چڑھ گیا ہے۔ یہاں بھینسوں اور گاؤں کو گوبر اٹھا رہا ہے، کتوں کا راتب بنا رہا ہے اور اس طرح کے دو بے کام کر رہا ہے۔ اچھی تنخواہ بھی ملتی ہے لیکن ذلیل بھی راج کے ہوتا ہے۔ نوکری چھوڑنا چاہے تو آسانی سے چھوڑ بھی نہیں سکتا اور یہاں یہ کوئی ایک ہی شہری منڈا نہیں ہے، چھوٹی بڑی عمر کے چودہ پندرہ نوکر، نوکرانیاں حویلی میں ایسے ہی ہیں۔ یہ شہری ہیں اور یہاں ذلیل ہو رہے ہیں بلکہ.....“ کریانہ فروش لطیف کہتے کہتے چپ ہو گیا۔
 ”آپ کچھ کہنے لگے تھے؟“ میں نے کہا۔

وہ ذرا توقف سے بولا۔ ”آپ پیر بھائی نکل آئے ہیں، اس لیے آپ کو بتا رہا ہوں ورنہ یہ باتیں کرنے والی نہیں ہیں۔ چودھری انور کی تین بیویاں ہیں۔ پچی گاؤں کی ہے، باقی دو شہری ہیں۔ ایک ویاہ تو چودھری نے پچھلے سال ہی کیا ہے۔ لاہور شہر کی کوئی کڑی ہے۔ چنگی بھلی پڑھی لکھی ہوئی۔ بس پھنس گئی ہے کسی طرح۔ چودھری کی اصل بیوی تو پہلے والی واجدہ بی بی ہی ہے۔ باقی دونوں تو بس رکھیلیں ہی ہیں۔ چودھری ان دونوں کو کوئی بچہ وغیرہ بھی نہیں ہونے دیتا۔ درمیان والی کو تو شاید دو چار مہینے میں طلاق ہو جائے۔ چودھری کا دل شاید بھر گیا ہے اس سے۔ مار کٹائی بھی کرنے لگا ہے اس کے ساتھ.....“

اگلے ایک گھنٹے میں میرے اور لطیف کے درمیان تفصیلی گفتگو ہوئی۔ وہ مجھے دکان کے پیچھے اپنے گھر میں لے گیا۔ کھانا کھلایا۔ کھانے کے دوران میں بھی ہم بے تکلفی سے باتیں کرتے رہے۔ ہم ایک دوسرے کو اپنائیت سے آپ کے بجائے تم کہہ رہے تھے۔ مجھے اس سرحدی گاؤں اور گاؤں کی حویلی کے بارے میں جو کچھ معلوم ہوا، وہ اس طرح تھا۔ حویلی کو پہلی حویلی کہا جاتا تھا حالانکہ اس کا رنگ پیلا نہیں تھا۔ غالباً کسی زمانے میں اس کو پیلا رنگ کیا گیا تھا جس کی وجہ سے نام پہلی حویلی پڑ گیا تھا۔ چودھری انور اور اس کے دونوں بھائیوں کی

دہشت پورے علاقے میں تھی۔ وہ ہر طرح کے ناجائز و غیر قانونی کاموں میں ملوث تھے لیکن کوئی ان کی طرف آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا تھا۔ بُرے کاموں کے لیے تینوں بھائیوں کا اتفاق مثالی تھا۔ غیر قانونی شراب سے لے کر طوائف بازی اور اسمگلنگ تک ہر کام وہ کرتے تھے۔ انہوں نے اچھی نسل کی بڑی تیز رفتار گھوڑیاں پال رکھی تھیں۔ ان گھوڑیوں پر سوار چودھریوں کے ہر کارے پورے علاقے پر نظر رکھتے تھے۔ لطیف کے بقول کبھی کبھار سکھ حضرات بھی چودھریوں سے ملنے کے لیے گاؤں میں آتے تھے۔

میرے اور لطیف کے درمیان ”پیر بھائی“ ہونے کی وجہ سے اعتماد اور یقین کی زبردست فضا پیدا ہو گئی تھی۔ وہ احمد تھانوی صاحب کا نام لے لے کر جیتا تھا اور میں نے بھی احمد تھانوی صاحب سے اپنی زبردست محبت اور عقیدت ظاہر کر دی تھی۔ میں نے لطیف سے کھل کر بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے جب اسے بتایا کہ میرا تعلق اسپیشل پولیس سے ہے اور میں ایک بندے کی تلاش میں یہاں آیا ہوں تو وہ پریشان نظر آنے لگا۔

میں نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ ”لطیف بھائی! فکر مند ہونے کی ذرا سی بھی ضرورت نہیں۔ ہمارے درمیان روحانی بھائی چارے کا رشتہ ہے اور یہ بالکل ایسے ہی رہے گا۔ اللہ نے چاہا تو میری طرف سے تمہیں کاٹنا چھینے کی تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ حضرت صاحب تمہیں میری طرف سے ہر طرح کی ضمانت دے سکتے ہیں۔“

میری ان باتوں نے لطیف کی پریشانی کافی حد تک کم کر دی۔ وہ مجھ سے اس شخص کے بارے میں سوال جواب کرنے لگا جسے میں ڈھونڈنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے یوسف فاروقی کا حلیہ بتایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ کب سے اوجھل ہے۔

لطیف نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تابلش بھائی! اگر تمہیں ٹوہ لگی ہے کہ تمہارا بندہ ان لوگوں کے پاس ہے تو یہ ٹوہ ٹھیک ہو سکتی ہے۔ یہ لوگ اس طرح کے سارے کام کرتے ہیں۔ اسمگلنگ کا مال تو بارڈر کے آ پار جاتا ہی رہتا ہے، کبھی کبھی یہ بندوں کو بھی بھیج دیتے ہیں۔ ابھی دو ڈھائی مہینے پہلے اس طرح کا ایک واقعہ ہوا ہے۔ ایک سکھ لڑکی انڈیا سے بھاگ کر نکانہ صاحب آ گئی تھی۔ وہ یہاں اپنی پسند کے سکھ لڑکے سے شادی کرنا چاہتی تھی مگر اس کا بھائی اس کے پیچھے آیا اور پھر اسے پکڑ کر یہاں ہمارے پنڈ لے آیا۔ سنا ہے کہ یہیں سے وہ لڑکی واپس انڈیا پہنچا دی گئی تھی۔“

میں نے کہا۔ ”جس بندے کے پیچھے میں یہاں آیا ہوں، اس کے بارے میں بھی کچھ اس طرح کا شک ہو رہا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ لوگ اسے انڈیا پہنچانا چاہتے ہوں۔“

ہماری نگاہیں ایک دوسرے کو ہی ڈھونڈا کرتی تھیں اور ثروت تو کہا کرتی تھی کہ وہ ایسی تقریبات میں جاتی ہی میرے لیے ہے۔ ورنہ اس کی ”تہنائی پسندی“ بہت سی تقریبات سے دامن بچا جاتی۔

ثروت نے مجھے بتایا کہ سائیں لڑکا کوئی دو گھنٹے پہلے نظر آیا تھا، اس کے بعد دکھائی نہیں دیا۔

میں نے ثروت کو تسلی دی اور اسے سرحدی گاؤں اور پہلی حویلی کے حوالے سے اپنی ساری کارگزاری سنائی۔ میں نے اسے سکھ لڑکی والا واقعہ نہیں سنایا ورنہ وہ مزید پریشان ہو جاتی۔ ہاں..... یہ ضرور کہا کہ یوسف اس گاؤں میں یا پہلی حویلی میں موجود ہو سکتا ہے۔

”میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔“ وہ ماتھا پکڑ کر بولی۔ ”ان لوگوں کی یوسف سے کیا دشمنی ہو سکتی ہے اور اگر..... خدا نخواستہ یہ لوگ انہیں بارڈر پار لے جانا چاہتے ہیں تو کیوں؟“

”یہ سوال واقعی پریشان کرتا ہے۔“ میں نے تائید کی۔

وہ بولی۔ ”حضرت صاحب سے بھی ابھی کوئی رابطہ نہیں ہو سکا۔ تین بار فون کر چکی ہوں۔ ہر بار یہی بتایا گیا ہے کہ حضرت صاحب ابھی واپس نہیں آئے۔ میرا خیال ہے کہ اب تو وہ لوگ میرا فون بھی نہیں سنیں گے۔“

یہ بھی ایک تعجب خیز سوال تھا کہ حضرت صاحب کہاں ہیں؟ ذہن میں پھر سائیں کی رات والی باتیں گونجنے لگیں۔ اس نے حضرت صاحب کے حوالے سے کچھ خدشات کا اظہار کیا تھا۔ کیا وہ جانتا تھا کہ حضرت صاحب کسی مشکل میں ہیں یا پھر یہ کوئی روحانی کیفیت تھی، الہام قسم کی شے تھی۔

میں نے کہا۔ ”ثروت! مجھے ایک دیہاتی لباس چاہیے اور دو تین دن کی مہلت چاہیے۔ مجھے پوری اُمید ہے کہ میں یوسف والا مسئلہ حل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ کم از کم کوئی ٹھوس سراغ ضرور ڈھونڈ لوں گا۔“

”دیہاتی لباس؟ وہ کس لیے؟“

”اس کی بھی ضرورت ہے۔ تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“ پھر میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ”ثروت! میرا ایک مشورہ ہے، اگر تم مانو تو.....“

”کہیں۔“ وہ لمبی پلکیں جھکا کر بولی۔

”تم لاہور واپس چلی جاؤ۔ میں تمہیں بس پر بٹھا دیتا ہوں۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا تمہارے لیے۔ مجھے صرف تین چار دن کی مہلت دو۔ میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ کوئی نہ کوئی

اسی دوران میں میرے سیل فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ ثروت تھی۔ میں نے کال انینڈ کی۔ وہ پریشان آواز میں بولی۔ ”تابش! آپ کہاں ہیں؟ اتنی دیر کیوں لگا دی ہے؟“

”بس اب واپس روانہ ہو رہا ہوں۔ تم خیریت سے ہونا؟“

”ہاں خیریت سے ہوں لیکن وہ سائیں لڑکا پھر نظر آیا ہے۔ بالکونی میں گھوم رہا تھا۔ کھڑکی سے چہرہ لگا کر دیکھ رہا تھا۔ مجھے ڈر لگتا ہے اس سے۔“

”ثروت! وہ بالکل بے ضرر ہے۔ کچھ نہیں کہے گا اور نہ ہی اندر آئے گا۔ میں بس تھوڑی دیر میں تم تک پہنچ رہا ہوں۔“

ثروت کو تسلی دے کر میں نے فون بند کر دیا۔

لطیف سوالیہ نظروں سے میری طرف دیکھ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”یہ کزن ہے میری۔ یوسف فاروقی کی بیوی ہے۔ اس کی تلاش میں ہی میرے ساتھ یہاں آئی ہے۔ ہم ہارون آباد کے ایک ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔“ میں نے اسے تفصیل بتائی اور یہ بھی بتایا کہ میری یہ کزن بھی حضرت صاحب کی بہت عقیدت مند ہے۔

اسی اثناء میں پردے کے پیچھے سے لطیف کی بیوی کی آواز سنائی دی۔ وہ لطیف کو ”عثمان کے ابا“ کہہ کر بلارہی تھی۔ وہ اپنی آواز سے سنجیدہ طبیعت عورت لگتی تھی۔

میں نے بھی لطیف سے اجازت چاہی۔ لطیف مجھے اس بات کی آفر کر چکا تھا کہ مجھے یوسف کے حوالے سے کسی طرح کی مدد کی ضرورت ہو تو وہ حاضر ہے۔

جاتے وقت لطیف نے مجھ سے کہا۔ ”اگر تمہیں دوبارہ یہاں آنے کی ضرورت پڑے تو بہتر ہے کہ دیہاتی لباس میں آؤ اور خود کو دیہاتی ہی ظاہر کرو۔ ورنہ کوئی مصیبت کھڑی ہو سکتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اگر ضرورت پڑی تو ایسا ہی کروں گا۔“

میں واپس ٹیکسی ڈرائیور یاسر کے پاس پہنچا۔ وہ بڑی بے چینی سے میرا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے بتایا کہ ایک گھوڑی سوار آیا تھا۔ وہ پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ یاسر نے وہی کچھ بتایا جو میں نے سمجھا دیا تھا۔ ہم فوراً ٹیکسی میں بیٹھے اور واپس روانہ ہو گئے۔ اس گاؤں کی فضا میں عجیب سا خطرہ محسوس ہوتا تھا۔

ہوٹل کے کمرے میں ثروت بے قراری سے میرا انتظار کر رہی تھی۔ مجھے اس کی یہ بے قراری اچھی لگی۔ ثروت کی اس کیفیت نے مجھے گزرے دنوں کی یاد دلادی۔ جب اسی طرح وہ میرے فون کا یا میری آمد کا انتظار کیا کرتی تھی۔ شادی بیاہ اور دیگر تقریبات کے موقع پر بھی

بہتری کی صورت نکلے گی۔“

اس نے پلکیں اٹھا کر مجھے دیکھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد دوبارہ پلکیں جھکا لیں اور بولی۔ ”پلیز تابتاش! مجھے اس کے لیے مجبور نہ کریں۔ میں نے خود سے عہد کیا ہوا ہے۔ یوسف کے بغیر واپس نہیں جاؤں گی۔“

”اگر وہ یہاں موجود ہی نہ ہوا تو پھر؟“

”تو پھر ہم وہاں جائیں گے جہاں ان کے ہونے کی امید ہوگی۔“

”تم..... جان بوجھ کر خود کو خطروں میں ڈالنا چاہ رہی ہو۔“

”آپ..... کے ہوتے ہوئے میں کوئی خطرہ محسوس نہیں کرتی اور پرسوں آپ خود ہی تو کہہ رہے تھے کہ ہمارا ایمان ہونا چاہیے جو رات قبر میں آتی ہے، وہ باہر نہیں آسکتی۔“

”اگر میں تمہاری بات حضرت صاحب سے کرادوں اور وہ بھی تمہیں یہ مشورہ دیں کہ تم واپس چلی جاؤ..... تو پھر؟“

وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ”میں ان سے بھی التجا کروں گی کہ وہ ایک بیوی کے طور پر مجھے اپنا فرض پورا کرنے دیں۔“

میں نے کوشش کی لیکن وہ ٹس سے مس نہیں ہوئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ وہ ابھی اس لیے بھی ہارون آباد میں رہنا چاہتی ہے کہ اسے ایک آدھ دن میں حضرت صاحب سے ملاقات کی توقع ہے۔

میں ہوٹل میں علیحدہ کمرہ لینا چاہ رہا تھا مگر وہ اس پر بھی راضی نہیں تھی۔ عجیب صورت حال تھی۔ چند روز پہلے تک وہ میرے ساتھ کسی علیحدہ کمرے میں رہنے کا تصور تک بھی نہ کر سکتی ہوگی مگر اب اس کی مجبوری تھی۔ اس کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ ہوٹل والوں کے نزدیک بھی ہم میاں بیوی ہی تھے۔ کھانے کے بعد بھی ہم میں تادیر گفتگو جاری رہی۔ احمد تھانوی صاحب کے بارے میں ابھی تک کوئی خیر نہیں تھی۔ ثروت اب خود وہاں فون کرنا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی جگہ میں نے فون کیا۔ ملازم خاص فرید احمد نے بتایا کہ حضرت صاحب ضروری کام سے لاہور گئے ہوئے ہیں۔ ابھی ایک دو روز تک نہیں آئیں گے۔ یہ صورت حال اس صورت حال سے مختلف تھی جو فون پر ثروت کو بتائی جاتی رہی تھی۔ مطلب تھا کہ وہاں کچھ گڑبڑ ضرور ہے۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جب میں ٹیکسی پر واپس آیا تھا تو میں نے حضرت صاحب کی قیام گاہ کے سامنے کافی گاڑیاں کھڑی دیکھی تھیں۔ یقیناً یہ وہی لوگ تھے جو ان سے ملاقات کے لیے آئے تھے اور اب مایوسی کا شکار تھے۔

ثروت کا اصرار تھا کہ اب میں اسے اکیلا ہوٹل میں چھوڑ کر کہیں نہیں جاؤں۔ وہ سمجھ چکی تھی کہ اب میں دوبارہ لطیف کے گاؤں جانا چاہتا ہوں اور ایک دو روز وہاں رہنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ وہ زور دینے لگی کہ میں اسے بھی ساتھ لے کر جاؤں۔ ہماری طویل بحث کا حتمی نتیجہ یہ نکلا کہ ثروت بھی میرے ساتھ گاؤں جائے گی۔ ہم دونوں ایک فیملی کی طرح ہوں گے اس لیے ہم پر کسی طرح کا شک کیے جانے کا امکان کم سے کم ہوگا۔

ثروت سے ایک گھنٹے کی رخصت لے کر میں بازار گیا اور وہاں سے دو جوڑے کپڑوں کے خرید لایا۔ ایک مردانہ دوسرا زنانہ۔ زنانہ جوڑے کے ساتھ دیہاتی طرز کی ایک چادر بھی تھی۔ میں نے ایک گالی بھی خرید لی جو دیہاتی ٹائپ کے کپڑوں کے ساتھ میچ کرتی تھی۔ مجھے قریباً دو گھنٹے لگ گئے۔ ایک خوشگوار شام دھیرے دھیرے اپنے سارے پھیلا رہی تھی۔ ثروت ایک بار پھر بے چینی سے میری منتظر تھی۔ میں نے سلاسلایا جوڑا ثروت کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”پہن کر دیکھ لو۔ مجھے لگتا ہے پورا آئے گا۔“

میرا یقینی انداز دیکھ کر اس کے چہرے پر حیا کا رنگ سا لہرا گیا۔ بہر حال وہ ہاتھ روم میں چلی گئی۔ میرا اندازہ درست تھا۔ شلوار کی لمبائی میں معمولی سا فرق نکلا، باقی سب ٹھیک تھا۔ میں اپنی رنگ دار شلوار قمیص دکان پر ہی ٹرائی کر چکا تھا۔

اسی دوران میں لاہور سے عمران کا فون آ گیا۔ میں نے باہر لابی میں جا کر اس سے بات کی اور ساری صورت حال سے آگاہ کیا۔ اس نے ساری بات سننے کے بعد کہا۔ ”کہیں زیادہ بُری جگہ سینگ نہ پھنسا لینا۔ مجھے لگتا ہے کہ میں بھی فوری طور پر تمہاری مدد کو نہ آسکوں گا۔“

”کیوں..... کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“

”یار! میں امید سے ہوں۔“

”مبارک ہو۔ شاہین نے بُرا تو نہیں منایا؟“

”یار! پوری بات تو سن لیا کرو۔ مجھے لگتا ہے کہ گمشدہ ڈاکٹر مہناز کا کچھ کھوج کھرا ملنے والا ہے۔ اس کے ساتھی ڈاکٹر رسام کی ایک فون کال پکڑی گئی ہے۔ اس وقت میں اور راجا لاہور سے باہر جا رہے ہیں، براستہ موٹروے۔“

میں نے کہا۔ ”موبائل فون کا آپیکر تو آن نہیں ہے؟“

”نہیں۔“ عمران نے جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ”یار! اس راجا کو اپنے ساتھ زیادہ نہ جمیرو۔ یہ بڑا ٹیڑھا بندہ ہے۔ کوئی

پریشانی پیدا نہ کر دے۔“

عمران نے کہا۔ ”گھبراؤ نہ جگر! مانس مانس..... پلس ہو جاتا ہے۔ اس وقت اسے ساتھ رکھنا مجبوری ہے۔ باقی جیلانی اور اقبال فقیر والی پہنچ چکے ہیں۔ تم کسی بھی وقت ان سے رابطہ کر کے مدد کے لیے بلا سکتے ہو۔“

”ٹھیک ہے۔ اگر ضرورت پڑی تو کال کر لوں گا لیکن تم نے بتایا نہیں کہ ڈاکٹر مہناز کا کیا کھوج ملا ہے؟“

”ابھی نہیں۔ پہلے مجھے کسی نتیجے پر پہنچ لینے دو۔“ عمران نے کہا۔ وہ جلدی میں نظر آتا تھا، اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

ثروت کے ساتھ ایک کمرے میں رات گزارنے کا تصور بڑا عجیب اور محال تھا۔ یقیناً وہ بھی اس صورت حال کو بڑی شدت سے محسوس کر رہی تھی۔ ایک عورت ہونے کے ناطے اس کے لیے یہ سب کچھ کہیں زیادہ مشکل تھا۔ میں رات گیارہ، بارہ بجے تک باہر لابی میں بیٹھا رہا اور ٹی وی دیکھتا رہا۔ پھر اندر چلا گیا۔ وہ آج بھی بیڈ پر لیٹنے کو تیار نہیں تھی۔ میں بیڈ پر چلا گیا، وہ چادر اوڑھ کر صوفے پر دراز ہو گئی۔ ہم ایک دوسرے کی قربت اور دوری کو بڑی شدت سے محسوس کرتے رہے۔ نہ جانے رات کے کس پہر مجھے نیند آگئی۔



اگلے روز دوپہر کے وقت میں ایک بار پھر گاؤں میں لطیف کرپانہ فروش کی دکان کے سامنے کھڑا تھا۔ اس مرتبہ میرے ساتھ چادر میں لپیٹی لپٹائی ثروت بھی تھی۔ ہم دونوں دیہاتی حلیے میں تھے۔ لطیف کے مہمان کی حیثیت سے میں نے کچھ پھل بھی ایک شاپر میں ڈالے ہوئے تھے۔ لطیف مجھے دیکھ کر حیران ہوا۔ اسے یہ توقع تو تھی کہ میں دوبارہ آؤں گا لیکن یہ نہیں تھی کہ اتنی جلدی آؤں گا اور میرے ساتھ ”زنانہ ساتھ“ بھی ہوگا۔

اس نے خوشی اور فکر مندی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ہمیں خوش آمدید کہا۔ وہ ثروت کو تو گھر کے اندر لے گیا، ہم دونوں باہر دکان پر ہی بیٹھ گئے۔ لطیف نے میرے حلیے پر اطمینان کا اظہار کیا اور بولا۔ ”میں ملنے جلنے والوں سے یہی کہوں گا کہ تم پیہر بھائی ہو اور مجھ سے ملنے کسی دوسرے پنڈے آئے ہو۔ کس پنڈے کا نام لوں؟“

”میانوالی کہہ دینا۔ یہ میانوالی شہر نہیں..... پسورد کی طرف ایک گاؤں کا نام ہے۔“

”ٹھیک ہے..... اور ساتھ میں کون ہے؟“

”تمہیں بتایا ہے کہ کزن ہے لیکن مجبوری ہے، بیوی کہہ دینا۔“

”رات تو یہیں رہو گے نا؟“ لطیف نے پوچھا۔ لہجہ ایسا ہی تھا جیسے میرا جواب نفی میں سننا چاہتا ہو۔

میں نے کہا۔ ”ہاں..... ایک یا دو رات تو رہنا پڑے گا۔ میں جانتا ہوں لطیف..... تمہیں تکلیف دے رہا ہوں لیکن تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میری وجہ سے کوئی آج نہیں آئے گی تم پر۔ بالکل بے فکر رہو۔“

وہ کچھ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔ یقیناً اس کے ذہن میں اندیشے موجود تھے۔ لیکن میرا پُر اعتماد لہجہ اسے حوصلہ بھی دے رہا تھا۔ پھر میں نے اپنا تعلق خفیہ پولیس سے بتایا تھا۔ یہ چیز بھی اس کے لیے تسلی بخش تھی۔ وہ جیسے تیسے میری میزبانی پر آمادہ ہو گیا۔

گاؤں کے ماحول میں واقعی ایک عجیب طرح کی خاموشی اور ہراس کی کیفیت پائی جاتی تھی۔ پہلی حویلی اور حویلی والوں کا خوف جیسے کسی جنس کی طرح عام مہنگوگوں میں موجود تھا۔ حویلی کے کسی مکان کی کچھڑ آلود جیپ دکان کے سامنے سے گزری تو لطیف نے کھڑے ہو کر سلام کیا۔ ایک دو راہگیروں نے بھی رُک کر ہاتھ ماتھے پر رکھا۔ جیپ میں درمیانی عمر کا ایک بازو چودھری بیٹھا تھا۔ اس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال ہوگی۔ معلوم ہوا کہ یہ چودھری انور کا سب سے چھوٹا بھائی چودھری امجد ہے۔

ہم دکان میں بیٹھے گپ شپ کرتے رہے۔ اکا دکا گاہک بھی آتے رہے۔ لطیف نے اپنی بیوی کو ہمارے بارے میں ساری حقیقت بتا دی تھی۔ یعنی وہ جانتی تھی کہ ثروت میری بیوی نہیں بلکہ رشتے دار ہے اور ہم اس کے شوہر کی تلاش میں نکلے ہوئے ہیں۔ لطیف نے بتایا کہ اس کی بیوی تھوڑی سی پریشان ہے لیکن وہ جلد ہی اسے نارمل کر لے گا۔

اسی دوران میں پیچھے گھر کے اندر سے رونے کی مدھم آواز سنائی دی۔ لطیف چونک گیا۔ پھر اپنی دھوتی سنبھالتا ہوا دکان کے اندر سے ہی اپنے گھر میں چلا گیا۔ اس کی واپسی پندرہ بیس منٹ بعد ہی ہوئی۔ اس نے تھوڑا سا چونا اور ہلدی وغیرہ لی اور پھر گھر کے اندر چلا گیا۔ اس نے بتایا کہ کسی کو چوٹ لگی ہے۔ اس دوران میں لطیف کا آٹھ دس سالہ بیٹا عثمان دکان پر بیٹھا رہا۔

دس منٹ بعد جب وہ واپس آیا تو میں نے تفصیل پوچھی۔ عثمان کو گھر میں بھیجنے کے بعد لطیف نے بتایا۔ ”حویلی کی ایک نوکرانی رشیداں ہے۔ بچ وقت کی نمازی عورت ہے۔ بیچاری روتی جا رہی ہے۔ چودھری انور نے اسے ٹھڈے مارے ہیں۔ بیچاری کی پسلیاں بل گئی ہیں۔ اس طرح کے واقعات یہاں ہوتے ہی رہتے ہیں۔ بہت سوں کا تو پتا ہی نہیں چلتا۔ یہ

میری گھر والی کی سہیلی ہے، اس لیے دکھڑا سنانے آگئی ہے۔“
”ہوا کیا ہے؟“

”کچھ ہونا ضروری نہیں ہوتا بھائی تابش! یہاں کسی ویلے کسی کی بھی شامت آسکتا ہے۔ بہر حال اس میں تو تھوڑا بہت قصور بھی ہے رشیداں کا۔“
”کیسا قصور؟“ میں نے پوچھا۔

”چودھری انور نے شہری نوکرانیاں بھی رکھی ہوئی ہیں۔ کوئی جھاڑو پھیرتی ہے، کوڑا کپڑے دھوتی ہے یا پسینے میں نہاتی ہے اور روٹیاں پکاتی ہے۔ باورچی خانے میں کام کرنا والی ایک نوکرانی کا نام روبی ہے۔ ملتان شہر کی رہنے والی ہے۔ چودھری انور کا سب سے چھوٹا پترست اٹھ سال کا ہے۔ بلال نام ہے اس کا۔ کبھی کبھی روبی اسے کوئی شہری کھانا پکادیتی تھی۔ اب اسے عادت پڑ گئی ہے۔ اسی بات پر چودھری انور کو غصہ آیا ہے۔“
”شہری کھانا؟ یہ کیا بات ہوئی؟“

”بھائی تابش! وہی کھانے جو شہر کے ہوٹلوں شوٹلوں میں بنتے ہیں۔ مجھے تو ان کے نام بھی چنگی طرح نہیں آتے۔ وہ کیا کہتے ہیں چائیز کھانے..... شاشک..... سوپ اور بلیک پیپر فیر۔ چودھری کو اس بات پر بھی روبی پر غصہ تھا۔ پرسوں بلال نے کسی کھانے کی ضد کی۔ اس کے لیے جو سامان چاہیے تھا، وہ ختم ہو چکا تھا۔ ہارون آباد سے ہی مل سکتا تھا اور تمہیں پتا ہی ہے، پرسوں کتنی بارش ہو رہی تھی۔ لاڈلے پتر نے رٹا ڈال دیا۔ اسی بات سے تپ کر چودھری انور نے روبی کو بُری طرح مار لگا دی۔ اس کا بچہ ہونے والا تھا۔ پیٹ پٹھنڈا لگنے سے اس کی حالت خراب ہو گئی۔ چودھری انور نے اسے فوراً ہارون آباد کے ہسپتال بھیج دیا۔ ساتھ میں روبی کا بندہ بھی گیا۔ بڑی مشکل سے وچاری کی جان بچی ہے۔“

”افسوس ناک بات ہے۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن اس میں رشیداں کے ساتھ کیوں زیادتی ہوئی ہے؟“

”رشیداں دراصل روبی کے ساتھ ہی باورچی خانے میں کام کرتی تھی۔ جب روبی نے ایک دو بار چوری چوری بلال کو شہری کھانے پکا کر دیئے تو رشیداں نے بھی چودھری یا چودھرائن کو نہیں بتایا۔ چودھری کو اسی بات کا غصہ تھا۔ روبی کو مارتے ہوئے اس نے دو چار رشیداں کو بھی لگا دیں اور ساتھ ہی اسے نوکری سے بھی نکال دیا۔ ایک مہینے کی تنخواہ اس کے منہ پر ماری اور حویلی سے بھگا دیا۔“

لطیف نے ہر آنے جانے والے سے میرا تعارف اپنے پیر بھائی کے طور پر ہی کرایا اور

بتایا کہ میں ایک دو روز کے لیے یہاں مہمان ہوں۔ رات کا کھانا میں نے اور لطیف نے گھر کی بیٹھک میں کھایا۔ مرغی پکی تھی۔ یہاں آنے کے بعد ثروت سے ایک بار بھی میری ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ میں نے اس سے بھی کہہ رکھا تھا کہ وہ لطیف کی بیوی سے حویلی اور حویلی والوں کے بارے میں معلومات حاصل کرے۔ بہر حال ہمیں ابھی تک اپنی معلومات کے تبادلے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اس آدھے گاؤں میں بجلی موجود تھی اور آدھے گاؤں میں نہیں۔ لطیف کا گھر بھی بجلی سے محروم حصے میں آتا تھا۔ سرشام لالٹینیں روشن ہو گئیں۔ میں نے لطیف سے کہا تو اس نے بیٹھک میں میری اور ثروت کی ملاقات کا موقع فراہم کر دیا۔ کچھ دیر بعد کچے کمرے میں لالٹین کی داستانی روشنی میں ثروت اور میں آمنے سامنے تھے۔ وہ رنگین پایوں والے نواڑی پٹنگ پر بیٹھ گئی۔ میں نے مونڈھا سنبھال لیا۔ دیہاتی لباس اس کے جسم پر خوب جچا تھا۔ اس نے بال بھی سچ میں سے مانگ نکال کر دیہاتی انداز میں بنائے تھے۔ لطیف نے اپنی بیوی رضیہ کو ہمارے بارے میں کچھ زیادہ نہیں بتایا تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ میاں بیوی میں سلوک تو ہے مگر مزاج میں بہت زیادہ ہم آہنگی نہیں ہے۔ ثروت نے کہا۔ ”توبہ یا اللہ..... آپ نے دیکھا اس بیچاری عورت کو کتنی بیدردی سے مارا گیا تھا۔ یہ میرے ہاتھ جتنے بڑے نیل پڑے ہوئے تھے اس کی پسلیوں پر۔“

”بس یہ اسی ٹائپ کے لوگ ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”اصل قصور اس روبی نام کی ملازمہ کا تھا اور ساتھ میں کبختی اس بیچاری کی بھی آگئی اور اب پتا چلا ہے کہ کیا ہو رہا ہے وہاں، حویلی میں؟“ ثروت نے کہا۔

”کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے دریافت کیا۔

”وہ بچہ بلال دو دن سے بھوکا ہے۔ ضد کر رہا ہے۔ اب یہ لوگ ڈھونڈ رہے ہیں کوئی اور ملازمہ جو اس کے لیے اس کی مرضی کی چیز پکا سکے۔ یہاں گاؤں میں تو سب دیسی عورتیں ہیں۔“ ثروت کی خوبصورت آنکھوں میں چمک پیدا ہوئی۔ وہ دھیمی آواز میں بولی۔ ”میرے دل میں تو ایک اور بات آرہی ہے۔ میں کیوں نا عارضی ملازمہ بن کر چلی جاؤں وہاں؟“

”خدا کا نام لو۔“ میں نے تنبیہی انداز میں کہا۔ ”وہ اچھے لوگ نہیں ہیں۔“

”لیکن رشیداں یہ بھی نہ بتا رہی تھی کہ چودھری انور کی پہلی بیوی وڈی چودھرائن کا بڑا ”ہولڈ“ ہے حویلی میں۔ حویلی کے اندر وہ کوئی ایسی ویسی بات نہیں ہونے دیتی۔ ایسے کاموں کے لیے چودھریوں نے ”ڈیرا“ رکھا ہوا ہے اور باہر کی عورتیں آتی ہیں۔ وہ یہ بھی بتا رہی تھی کہ چودھری انور کی دو جوان بیٹیاں ہیں۔ چھوٹے چودھری اصغر کی ایک بیٹی کی عمر بھی پندرہ

سولہ سال ہے۔“

”جو کچھ بھی ہے ثروت! یہ خطرناک کام ہوگا۔“

”مگر آپ خود ہی تو کہہ رہے تھے کہ حویلی کے اندر کا حال جاننا ضروری ہے۔“

”اس کے لیے میں ہوں نا۔ تم دیکھنا ایک دودن میں سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

”خطرہ تو آپ کے لیے بھی ہوگا۔ تو پھر کیوں نہ میں خطرہ مول لوں کیونکہ میری ذمہ داری زیادہ ہے۔“

”میری ذمہ داری بھی زیادہ ہے کیونکہ! بسف جب لاپتا ہوا تو میں ہی اس کے آس پاس تھا اور کچھ لوگوں کے نزدیک میں بھی مشتبہ ہوں۔“ میں نے کہا۔

وہ چونک کر مجھے دیکھنے لگی۔ وہ سمجھ گئی کہ میرا اشارہ یوسف کے والد فاروقی صاحب کی طرف ہے جنہوں نے یوسف کے لاپتا ہونے کے بعد فون پر مجھ سے خشک لہجے میں بات کی تھی اور اس وقت کسی حد تک ثروت کا لب و لہجہ بھی بیگانوں جیسا تھا۔

”اگر کسی بات سے آپ کی دل آزاری ہوئی ہے تو میں معافی چاہتی ہوں۔“ وہ افسردگی سے بولی اور اس کی جھیل آنکھوں میں پانی کی چمک لالین کی روشنی میں نمایاں ہو گئی۔

”نہیں ثروت! شرمندہ تو میں ہوں۔ میں نے یوسف کے لاپتا ہونے کے بعد کئی گھنٹے تک تم سے رابطہ نہیں کیا اور تم سب کو سخت پریشانی میں مبتلا رکھا۔“

ثروت کچھ نہیں بولی۔ بس پلکیں جھپک جھپک کر اپنے آنسو چھپانے کی کوشش کرتی رہی۔ میں نے موضوع بدلتے ہوئے پوچھا۔ ”اچھا..... احمد تھانوی صاحب سے رابطہ ہو سکا؟“

”نہیں..... ابھی شام سے پہلے فون کیا تھا۔ اب وہاں سے کوئی فون ہی نہیں اٹھا رہا۔ کوئی مسئلہ ضرور ہے وہاں۔“

”میں نے بھی دوپہر کے وقت کال کی تھی۔ نیل جا رہی تھی۔ کوئی ریسپونس نہیں کر رہا تھا۔“ وہ بولی۔ ”یہ لطیف صاحب بھی تو حضرت صاحب کے بہت عقیدت مند ہیں۔ ان سے پوچھنا تھا اس بارے میں۔“

”میں نے پوچھا تھا۔ وہ آخری بار پچھلے جمعے کو ہارون آباد گیا تھا۔ حضرت صاحب سے اپنے بچے عثمان کو دم کرایا تھا اس نے۔ حضرت صاحب اسی روز لاہور سے ہارون آباد پہنچے تھے۔ اس کے بعد سے لطیف کو کچھ پتا نہیں۔“

”میں نے پوچھا تھا۔ وہ آخری بار پچھلے جمعے کو ہارون آباد گیا تھا۔ حضرت صاحب سے اپنے بچے عثمان کو دم کرایا تھا اس نے۔ حضرت صاحب اسی روز لاہور سے ہارون آباد پہنچے تھے۔ اس کے بعد سے لطیف کو کچھ پتا نہیں۔“

”میں نے پوچھا تھا۔ وہ آخری بار پچھلے جمعے کو ہارون آباد گیا تھا۔ حضرت صاحب سے اپنے بچے عثمان کو دم کرایا تھا اس نے۔ حضرت صاحب اسی روز لاہور سے ہارون آباد پہنچے تھے۔ اس کے بعد سے لطیف کو کچھ پتا نہیں۔“

”میں نے پوچھا تھا۔ وہ آخری بار پچھلے جمعے کو ہارون آباد گیا تھا۔ حضرت صاحب سے اپنے بچے عثمان کو دم کرایا تھا اس نے۔ حضرت صاحب اسی روز لاہور سے ہارون آباد پہنچے تھے۔ اس کے بعد سے لطیف کو کچھ پتا نہیں۔“

”میں نے پوچھا تھا۔ وہ آخری بار پچھلے جمعے کو ہارون آباد گیا تھا۔ حضرت صاحب سے اپنے بچے عثمان کو دم کرایا تھا اس نے۔ حضرت صاحب اسی روز لاہور سے ہارون آباد پہنچے تھے۔ اس کے بعد سے لطیف کو کچھ پتا نہیں۔“

کو بڑی محبت سے چاچی کہہ رہا تھا اور اس کی ٹانگوں سے لپٹ رہا تھا۔ ثروت اس کے ساتھ باہر چلی گئی تو لطیف دوبارہ بیٹھک میں آ گیا۔ وہ گرم گرم جلیبیاں اور دودھ لے کر آیا تھا۔ دودھ دو بڑے پیالوں میں تھا۔ جلیبیاں ایک تھالی میں رکھی تھیں۔ ”لوجی پنڈ کی خاص سوغات کھاؤ۔“ وہ چار پانی پر آلتی پالتی مار کر بولا۔

ہم دودھ جلیبیاں کھانے لگے۔ خالص دودھ اور کڑکڑاتی جلیبیاں۔ ساتھ میں بیٹری والے ریڈیو پر پنجابی گانے۔ کہیں دور سے ڈیزل والے انجن کی مخصوص کوکو اور صحن میں بکریوں کی میاہٹ۔ سماں بندھ گیا۔ مجھے ہارون آباد کے ہوٹل والا ملنگ لڑکا یاد آ گیا۔ اس نے بھی تو ہم سے دودھ جلیبیوں کی فرمائش کی تھی۔

میں نے کہا۔ ”لطیف بھائی! کوئی ایسا بندہ ملنا چاہیے جو ہمیں پہلی حویلی کے اندر کے حالات کے بارے میں کچھ بتا سکے۔“

”یہی تو وہی مصیبت ہے تابش بھائی! چودھری کے ڈر سے کوئی زبان نہیں کھولتا۔ بلکہ ایسے لگتا ہے کہ ہم سب لوگوں نے آنکھیں ہی بند کر رکھی ہیں کہ جو ہونا ہے ہوتا رہے۔ ہمیں کیا لینا دینا۔ سب جانتے ہیں کہ حویلی میں کالے دھندے ہوتے ہیں لیکن حویلی کے سامنے سے سب کان لپیٹ کر گزر جاتے ہیں۔“

لطیف نے ذرا توقف کیا پھر پُرسوج لہجے میں بولا۔ ”ویسے تابش بھائی! ایک کام ہو سکتا ہے۔ پر اس میں تھوڑا سا ڈر بھی آتا ہے۔“

”تم بتاؤ تو سہی۔“

”ثروت بی بی یہ شہری ٹائپ کے کھانے تو پکا لیتی ہوگی۔“

”ہاں پکا تو لیتی ہے۔“ میں نے ٹھنڈی سانس لی۔

”اس ویلے حویلی میں ایک ایسی ملازمہ کی سخت لوڑ ہے۔ چودھری کا لاڈلا پتر بلال کچھ کھانا نہیں رہا۔ بڑا ضدی ہے۔ سخت دخت ڈالا ہوا ہے اس نے.....“

”نہیں لطیف۔“ میں نے لطیف کی بات کاٹی۔ ”جو تم سوچ رہے ہو وہ نہیں ہو سکتا۔ یہ تو جان بوجھ کر مصیبت کو دعوت دینے والی بات ہے کہ ہم ثروت کو حویلی بھیج دیں۔“

لطیف خاموش ہو گیا۔ پھر ڈھیلی آواز میں بولا۔ ”ہاں..... بات تو ڈروالی ہی ہے لیکن..... پھر اور کیا طریقہ ہو سکتا ہے۔“

”میں نے کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا۔“ اچھا..... تم بتا رہے ہو کہ چودھری انور وغیرہ نے خاص نسل کی گھوڑیاں پال رکھی ہیں۔ شکاری کتے وغیرہ بھی ہیں۔“

پر عاشق نہیں ہوئی۔ اب ڈاکٹر بیچارے دن رات یہ کھوج لگانے کی کوشش کر رہے ہیں کہ موصوف کی جان آخر جسم کے کس حصے میں اٹکی ہوئی ہے۔ سنا ہے کہ پرسوں انہوں نے اپنے ہاتھوں کی انگلیوں کو کچھ حرکت بھی دی ہے۔ شاید ہارمونیم پر کوئی پُرانا گانا گانے کی کوشش فرمائی ہے۔“

”اچھا بتاؤ۔ راجا کہاں ہے؟“

”ادھر میرے ساتھ ہی ہے۔“

”اس کی فوری ضرورت پڑ گئی ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم تو مجھے بھی اجتناب فرمانے کے لیے کہہ رہے تھے۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔

میں نے مختصر الفاظ میں عمران کو ساری صورت حال بتائی اور اس سرحدی گاؤں روہی وال کا مکمل ایڈریس بھی اسے سمجھا دیا۔

عمران نے پُرسوج لہجے میں پوچھا۔ ”وہاں نیو (کرشمہ کپور) کے ساتھ کوئی جانا پہچانا بندہ تو نظر نہیں آیا؟“ میں نے اس کا جواب نفی میں دیا۔ وہ بولا۔ ”لیکن اس کا امکان تو ہے نا جگر! ہو سکتا ہے کہ حویلی کے اندر سلطان یا جاوے کا کوئی ایسا بندہ ہو جو راجا کو پہچانتا ہو۔“

”میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا لیکن کرشمہ کپور کے علاوہ یہاں سارے نئے چہرے ہی نظر آئے ہیں۔“

وہ بولا۔ ”ویسے تو راجا کا حلیہ بھی آج کل کافی بدلا ہوا ہے۔ لمبے بال کٹوا دیئے ہیں اس نے..... بلکہ اس نے کیا میں نے ہی کٹوائے تھے۔ جوئیں پڑی ہوئی تھیں۔ چھوٹی چھوٹی داڑھی مونچھ بھی رکھی ہوئی ہے۔ آسانی سے پہچانا تو نہیں جائے گا۔“

”تو پھر اللہ کا نام لے کر بھیج دوا سے۔“

عمران نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”موڈی بندہ ہے۔ انکار بھی کر سکتا ہے لیکن میں کوشش کرتا ہوں کہ یہ کل کسی وقت تم تک پہنچ جائے۔ تمہارے پاس اس کا سیل نمبر ہے نا؟“

میں نے اثبات میں جواب دیا اور عمران سے کہا کہ وہ راجا کو ساری صورت حال سمجھا دے۔

کچھ مزید گفتگو کے بعد ہم نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

میں راجا کو یہاں بلانے اور کسی طرح حویلی کے اندر پہنچانے کا پروگرام بنارہا تھا لیکن اگلے روز جو کچھ ہوا وہ میری پلاننگ سے بہت ہٹ کر تھا۔

رات کو میں اور لطیف دیر تک جاگتے رہے۔ ویرانے کی طرف گیدڑوں کی آوازیں آتی

”ہاں..... یہ تو ہے۔“

میں نے کہا۔ ”میرے پاس ایک ایسا بندہ ہے جو جانوروں کو سدھانے میں ایک دم ماسٹر ہے۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ وہ یہاں آجائے اور چودھری انور سنے مل کر اپنی خدمت پیش کرے۔ ہو سکتا ہے کہ وہ اسے جانوروں کی سدھائی کے لیے عارضی طور پر حویلی میں رکھ لیں؟“

اس بارے میں میرے اور لطیف کے درمیان کچھ دیر تک مزید بات ہوئی۔ لطیف نے بتایا۔ ”کچھ ہفتے پہلے چھوٹے چودھری امجد نے کہیں سے چار پانچ بڑے بلڈاگ کتے منگوائے تھے۔ ان میں سے دو کتوں نے ایک ملازم کی تین چار سالہ بچی پر حملہ کر کے اسے سخت زخمی کر دیا۔ بعد میں وہ بچی بیچاری ہارون آباد ہسپتال میں فوت ہو گئی۔ امجد نے ان دونوں کتوں کو گولی مار دی تھی۔“

”اس کا مطلب ہے کہ گھوڑوں اور کتوں وغیرہ کی سدھائی کرنے والے کے لیے حویلی میں موقع بن سکتا ہے۔“

لطیف نے میرے خیال کی تائید کی۔

میں عمران سے رابطہ کرنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ خود اسی کا فون آ گیا۔ میں نے کہا۔ ”سیانے لوگ کہہ گئے ہیں، شیطان کے بارے میں سوچو تو وہ حاضر ہو جاتا ہے۔“

وہ بولا۔ ”لگتا ہے کہ آج کل شیاطین تمہیں بہت تنگ کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے بھی، ماحول ہی ایسا ہے۔ جس کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے ترستے تھے۔ وہ رات دن تمہارے ساتھ ہے۔ ایک رومانی ایڈونچر کا ساما حول بنا ہوا ہے۔“

”تمہاری آدھی بات درست ہے۔“ میں نے نحیف لہجے میں کہا۔ ”رومانی ایڈونچر کا نہیں، صرف ایڈونچر کا ماحول ہے۔ تم بتاؤ ڈاکٹر مہناز ہاتھ آئی یا نہیں؟“

”ہم اسی سلسلے میں یہاں گجرانوالہ میں ہیں۔ ایک مکان کی نگرانی ہو رہی ہے۔ اس کے دروازے پر تالا لگا ہے لیکن امید ہے کہ اگلے چوبیس گھنٹوں میں یہ تالا ضرور کھلے گا اور ہم ڈاکٹر رسام یا مہناز میں سے کسی ایک کی صورت شریف دیکھ سکیں گے۔“

”جلالی صاحب کی کیا پوزیشن ہے؟“

”یار! وہ کوئی ون ڈے کے کھلاڑی نہیں جو آسانی سے اپنی وکٹ باؤلر کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ماشاء اللہ بریڈ مین اور حنیف محمد وغیرہ کی طرح لمبی آنکڑ کھیلنے والے ہیں۔ کوئے میں ہیں۔ لیکن ابھی تک وکٹ پر ڈٹے ہوئے ہیں۔ مہناز جیسی لڑکی یونہی تو ان کے بڑھاپے

تھیں اور کبھی کبھی ٹریکٹر کی گونج سنائی دیتی تھی۔ گا ہے بگا ہے دیہاتی چوکیدار کی صدایوں پرانی صدا، جاگدے رہو، بھی کانوں میں پڑ جاتی تھی۔ ہم ڈھائی بجے کے قریب سوئے۔ میں یہاں بھی سخت چٹائی پر سونا پسند کرتا تھا اور میری اس عادت پر لطیف کو حیرت بھی تھی۔

صبح جاگا تو دس بج چکے تھے۔ دھوپ گاؤں کے کچے درو دیوار اور سنہری کھیتوں پر چمک رہی تھی۔ لطیف اپنی ہٹی پر جا چکا تھا۔ اس کی بیوی صحن میں بکریوں کو نہلا رہی تھی۔ مجھے جاگتے دیکھ کر چھوٹے عثمان نے اپنے والد کو اطلاع دی۔ چند ہی سیکنڈ بعد وہ میرے پاس آ گیا۔

وہ کچھ پریشان سا تھا۔ ”خیریت ہے لطیف؟“ میں نے پوچھا۔
 ”ہے بھی اور نہیں بھی۔“

میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ ذرا توقف سے بولا۔ ”سویرے آٹھ بجے کے قریب میری گھر والی نے بتایا کہ ثروت اپنے بستر پر نہیں ہے۔ ہم نے یہاں وہاں دیکھا پر وہ نظر نہیں آئی۔ میری گھر والی نے کہا کہ کل وہ دیر تک ہمسائی برکتے سے باتیں کرتی رہی ہے۔ برکتے ہمارے پنڈ کی دانی ہے اور تھوڑا بہت دوا دارو بھی کرتی ہے۔ گھر والی نے کہا وہ کہیں اس کے ساتھ نہ گئی ہو۔ ہم نے برکتے کے گھر سے پتا کیا۔ اس کے بندے نور دین نے بتایا کہ برکتے بھی گھر میں نہیں ہے۔ ہمیں تھوڑی سی تسلی ہوئی۔ میں تم کو جگانا چاہتا تھا، پھر سوچا کہ کوئی اچھی خبر مل جائے تو جگاتا ہوں۔ اتنے میں برکتے اور ثروت دونوں واپس آ گئیں۔ ثروت نے بتایا ہے کہ وہ حویلی میں گئی تھی۔ اس نے چودھرائن سے بات کی ہے اور اسے حویلی میں کچھ دنوں کے لیے کھانا پکانے کا کام مل گیا ہے۔ وہ اسی وقت اپنی کچھ چیزیں لے کر واپس حویلی چلی گئی۔“

میرے جسم میں سرد لہری دوڑ گئی۔ میں نے رات ثروت کو منع بھی کیا تھا لیکن وہ وہی کر رہی تھی جو اس کی مرضی تھی۔ کسی وقت تو یوں لگتا تھا کہ اس کے نزدیک میری کوئی اہمیت ہی نہیں ہے۔ جو کچھ ہے یوسف ہے اور اس کی بازیابی ہے۔ میں دل موس کر رہ گیا۔
 لطیف نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”تابش بھائی! اتنا گھبرانے کی گل بھی نہیں ہے۔ وہ سیانی لگتی ہے۔ اس نے جو کیا ہے، دیکھ بھال کر ہی کیا ہوگا۔ ویسے بھی حویلی کے اندر زیادہ عمل دخل وڈی چودھرائن کا ہے۔ وہ گھر کے مردوں پر سخت نظر رکھتی ہے۔“

وہ سارا دن میں نے عجب بے قراری کے عالم میں گزاری۔ ایک دو بار موہا بل پر ثروت سے رابطے کی کوشش بھی کی لیکن موہا بل بند تھا۔ یہ بھی ڈکھ کی بات تھی کہ اس نے کال یا منیج کے ذریعے بھی مجھے مطلع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ شام سے کچھ دیر پہلے راجا بھی گاؤں پہنچ

گیا۔ میں نے فون پر اسے لطیف دی ہٹی کا پتا بتا دیا لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وہ ہٹی یعنی دکان پر نہیں آئے بلکہ سیدھا گاؤں کی چوپال میں چلا جائے، وہیں پر اسے سویلی کا کوئی نہ کوئی بندہ بھی مل جائے گا۔ میں نے اسے یہ بھی سمجھایا تھا کہ اگر اس نے لطیف کی دکان پر آنا ہو تو عام گا ہک کے طور پر آئے اور مجھ سے کسی صورت اپنی جان پیچان ظاہر نہ کرے راجا، ثروت کو نہیں جانتا تھا اور نہ وہ راجا کو جانتی تھی۔ لہذا میں نے راجا کو بتانا ضروری نہیں سمجھا کہ اس سے پہلے ہماری طرف سے کوئی اور بھی حویلی کے اندر پہنچ چکا ہے۔

میں اور لطیف نے راجا کو تانگے سے اترتے اور گاؤں میں داخل ہوتے دیکھا۔ اس نے بھی دور سے مجھے دیکھ لیا تھا۔ میری ہدایت کے مطابق وہ مکمل دیہاتی لباس یعنی دھوتی کرتے میں تھا۔ اس کی آنکھ اب ٹھیک ہو چکی تھی۔ وائل کے کڑھائی دار کرتے میں سے اس کا مضبوط کسرتی جسم اپنی جھلک دکھا رہا تھا۔ اس کے بازو کا زخم بھی غالباً اب بہتر تھا۔ چند دن پہلے تک اس کے گندے بال کندھوں تک پہنچتے تھے، اب وہ چھوٹے ہو چکے تھے۔ اس نے چھوٹی چھوٹی داڑھی بھی رکھی ہوئی تھی۔ حلیہ کافی تبدیل نظر آتا تھا۔

وہ رات میں نے بے چینی میں ہی گزاری۔ رہ رہ کر ثروت کا خیال ذہن میں آ رہا تھا۔ وہ پہلی حویلی میں تھی اور یہ وہ جگہ تھی جس کے بارے میں مقامی لوگ بالکل اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ اگر ان لوگوں کو کسی طرح کا شبہ ہو جاتا تو ثروت سخت مصیبت میں گرفتار ہو سکتی تھی۔ مجھے ثروت کی من مانی پر بھی افسوس تھا۔ اس نے مجھے بے خبر رکھ کر یہ قدم اٹھایا تھا۔ شاید اسے پتا تھا کہ میں اسے کبھی بھی ایسا نہیں کرنے دوں گا۔ دوسری طرف میں راجا کے بارے میں بھی فکر مند تھا۔ ابھی تک کچھ خبر نہیں تھی کہ اسے اپنے مقصد میں کامیابی ہوئی ہے یا نہیں اور اگر ہوئی ہے تو کس حد تک؟

علی الصبح میں نے لطیف کو گاؤں کی چوپال کی طرف روانہ کیا تاکہ وہ کوئی سن گن لے۔ لطیف کی واپسی ایک گھنٹے بعد ہوئی۔ اس نے کہا۔ ”لگتا ہے کہ تمہارا یہ ساتھی کافی ہوشیار ہے۔ اس نے کل شام کو ہی چودھری انور سے بات کر لی تھی۔ اسے حویلی میں تو نہیں رکھا گیا پر ڈیرے پر جگہ مل گئی ہے۔ ڈیرا گاؤں کی پچھلی طرف کھیتوں میں ہے۔ رات کو راجا ڈیرے پر ہی سویا ہے۔ آج وہ چودھری انور کو اپنی کاریگری دکھائے گا۔ لگتا ہے کہ وہ کام حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گا۔“

”ثروت کے بارے میں کوئی خبر؟“

”نہیں..... اس کے بارے میں تو کوئی پتا نہیں۔ حویلی کی دیواریں اتنی اچی ہیں کہ ان

کے اندر کے معاملوں کو جاننا بڑا مشکل ہوتا ہے تابش بھائی!“
 ”دائی برکتے سے بات ہوئی تمہاری؟“

”ہاں..... وہ کہتی ہے کہ کل سویرے دؤی چودھرائن، ثروت کو بادرجی خانے میں لے کر گئی تھی۔ اس نے ثروت سے کوئی کھانا پکوا یا۔ چھوٹے کو وہ پسند آ گیا۔ چودھرائن نے اسے عارضی طور پر ایک ہفتے کے لیے بادرجی خانے کا کام دیا ہے۔“
 ”لطیف بھائی! وہاں کوئی پریشانی تو نہیں ہوگی اس کے لیے؟“ میں نے فکر مندی سے پوچھا۔

وہ بولا۔ ”مجھے اندر کے حال کا کچھ کچھ پتا ہے۔ اگر تو وہ سیدھا سیدھا کام کرتی رہے گی تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔ مسئلہ تب ہی ہوگا جب اس سے کوئی اُلٹا پلٹا کام ہو جائے گا لیکن وہ مجھے سمجھ دار لگتی ہے۔ اس نے جاتے ساتھ ہی چودھرائن کو بتا دیا ہے کہ وہ خود تو پکی دیہاتن ہے، پر اس کی ایک شہری سہیلی ہے جس سے اس نے شہری کھانے پکانے سیکھے ہیں۔“
 ”ہاں..... سمجھدار تو بہت ہے لیکن اگر وہ کسی وجہ سے خود کو سنبھال نہ سکی تو؟ مثلاً اسے حویلی میں اچانک اس کا شوہر نظر آ گیا۔ وہ کسی مصیبت میں گرفتار ہوا تو وہ کیا کرے گی؟ عورت ذات ہے کوئی بھی جذباتی حرکت کر سکتی ہے۔“
 ”اسے کرنی تو نہیں چاہیے۔“

”ایک تو اس نے کی ہے نا۔ ہمیں بتائے بغیر خود ہی حویلی میں چلی گئی ہے۔“ میں نے بچھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”لگتا ہے میاں بیوی میں بڑی محبت ہے۔ کوئی بچہ وچہ بھی ہے ان کا؟“

”نہیں۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

وہ غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ ”یہ ثروت تمہاری چچا زاد ہے؟“

”نہیں..... خالہ زاد۔“

”جب تم اس کے بارے میں گل بات کرتے ہو تابش بھائی تو تمہاری آواز میں عجیب سی اُداسی آ جاتی ہے۔ میری بات کا بُرا نہ منانا۔ کیا اس کے علاوہ بھی تم دونوں کا کوئی رشتہ رہا ہے؟“

میرے اندر عجیب سی جھنجھلاہٹ پیدا ہوئی۔ دل چاہا کہ اس ذاتی پوچھ گچھ کے جواب میں لطیف کو جھاڑ دوں لیکن پھر خود پر ضبط کیا۔ وہ میری بے لوث میزبانی میں مصروف تھا اور مجھے ”پیر بھائی“ سمجھ کر خود کو خطرے میں ڈال رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”نہیں..... ایسی کوئی بات

نہیں لطیف بھائی! یوسف کی گمشدگی نے ہمیں بہت پریشان کیا ہے۔ ایک بیمار بہن اور بوڑھے سر کے سوا ثروت کا آگے پیچھے کوئی نہیں۔ جو کچھ کرنا ہے، مجھے ہی کرنا ہے۔ اسے سنبھالنا بھی ہے اور تلاش میں اس کی مدد بھی کرنی ہے۔“
 ”فرض کیا تابش بھائی! یوسف یہاں حویلی میں ہی مل جاتا ہے تو آپ کیا کریں گے؟“

”جو کچھ بھی کروں گا لیکن ایک بات ذہن میں رکھو لطیف بھائی! میں پھر تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ میری وجہ سے تم پر یا تمہارے گروالوں پر کوئی آنچ نہیں آئے گی۔ یہ میرا وعدہ ہے تم سے۔“

وہ ابھی ہوئی نظروں سے میری طرف دیکھنے لگا۔ اسی دوران میں پردے کے پیچھے سے اس کی بیوی نے آواز دی اور وہ اپنے بچے عثمان کو گلدی پر بٹھا کر گھر کے اندر چلا گیا۔ آٹھ دس سالہ عثمان اپنی عمر سے زیادہ عقلمند تھا۔ بڑی چابک دستی سے دکان داری کر لیتا تھا۔ اس کی ایک چھوٹی بہن بھی تھی جو شاید کسی چاچی، تائی کے ہاں گئی ہوئی تھی۔

ثروت نے یوں اچانک حویلی میں جا کر مجھے عجیب ہیمان میں مبتلا کر دیا تھا۔ میں نے رات کا زیادہ تر حصہ جاگ کر گزارا۔ صبح ناشتے کو بھی دل نہیں چاہا۔ لطیف اصرار کرتا رہا مگر میں نے دانت کے درد کا بہانہ بنایا۔ مجھے افسوس ہو رہا تھا۔ کچھ اور نہیں تو وہ کہیں چھپ کر چھوٹا سامیج ہی کر دیتی۔ بتا دیتی کہ خیریت سے ہے۔ میں آنکھیں بند کیے چٹائی پر نیم دراز تھا جب چوڑیوں کی ہلکی سی کھنک سنائی دی۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ پہلو میں کھڑی تھی۔ دیہاتی لباس میں گاؤں کی کوئی دو شیزہ نظر آتی تھی۔

”السلام علیکم۔“ اس نے کہا۔

”وعلیکم السلام۔“ میں نے مختصر جواب دیا۔

”بھائی لطیف بتا رہے ہیں کہ آپ نے ابھی ناشتہ بھی نہیں کیا۔“

”بس دل نہیں چاہا۔“

”آپ ناراض ہیں مجھ سے۔“

”میرا کوئی حق نہیں ناراض ہونے کا۔ ناراض تو تمہیں ہونا چاہیے کہ میں زبردستی

تمہارے ساتھ چلا آیا ہوں۔ تمہارے معاملے میں مداخلت کر رہا ہوں۔“

”آپ کو غصہ ہے کہ میں آپ کو بتائے بغیر کیوں گئی۔ اگر میں بتاتی تو آپ کبھی جانے نہ دیتے۔ اور میں نہ جانی تو یقین کریں بہت کچھ ہماری نظروں سے اوجھل رہتا۔“ وہ دبے

دبے جوش سے بولی۔

”کیا اوجھل رہتا؟“

”میں بتاتی ہوں سب کچھ۔ پہلے آپ ناشتہ کریں۔ میں دومنٹ میں آئی۔“

وہ میرے روکتے روکتے باہر نکل گئی۔ کچھ ہی دیر بعد وہ انڈا پراٹھا لے آئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ پراٹھا اس نے خود بنایا ہے۔ اس کے ہاتھ کا پراٹھا میں ہزاروں پراٹھوں میں سے پہچان سکتا ہوں۔ ایسی زبردست گولائی ہوتی تھی جیسے پرکار استعمال کی گئی ہو۔ لطیف کی بیوی رضیہ شاید تھکی ہوئی تھی یا پھر کسی دوسرے کام میں مصروف ہوگی۔

”تم بھی کھاؤ۔“ میں نے کہا۔

”نہیں..... میں کھا کے آئی ہوں۔ وہاں بھی پراٹھے اور انڈے ہی بنے ہیں۔ ساتھ میں مکئی کی میٹھی روٹی تھی اور سو جی کا حلوہ تھا۔ کافی ڈٹ کر ناشتہ کرتے ہیں یہ لوگ۔ چھوٹے بلال کو میں دلایا بنا کر دے آئی ہوں، وہ پراٹھا وغیرہ نہیں کھاتا۔“ اس نے ذرا توقف کیا اور بولی۔ ”ابھی دوپہر کے کھانے میں کافی ٹائم ہے۔ میں نے بڑی چودھرائں سے کہا۔ میں ایک چکر گھر کا لگا آؤں۔ سردرد کی دوا وہاں رکھی ہے، وہ لے آؤں۔“

”تمہیں کم از کم وہاں سے فون تو کر دینا چاہیے تھا۔ ایک میسج ہی بھیج دیتیں تو اتنی پریشانی نہ ہوتی۔“

”سوری تابش! دراصل میں فون لے کر ہی نہیں گئی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ فون کی وجہ سے کوئی مسئلہ نہ ہو جائے۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”کیا دیکھا تم نے وہاں؟“

اس نے اٹھ کر دروازہ بھینڑا۔ لرزاں آواز میں بولی۔ ”آپ کو پتا ہے حضرت تھانوی صاحب کہاں ہیں؟“

”کہاں ہیں؟“

”حویلی میں۔ میں نے خود دیکھا ہے انہیں۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکے۔ وہ ایک کمرے میں ہیں اور کوئی وظیفہ وغیرہ کر رہے ہیں بلکہ ان سے زبردستی کرایا جا رہا ہے۔“

”زبردستی؟“

”ہاں..... کوئی لمبا وظیفہ ہے شاید دو تین دن کا۔ پتا چلا ہے کہ حضرت صاحب یہ وظیفہ ہر چاند کی بائیسویں اور تیسویں رات کو کرتے ہیں۔ کوئی خاص پڑھائی ہے جس کے لیے یہ دن وقف ہیں۔ کہتے ہیں کہ اس پڑھائی کا خاص اثر ہے۔ پرانی ضدی بیماری کے لیے یہ

وظیفہ بہت مفید سمجھا جاتا ہے۔ میں نے کل خود دیکھا ہے، حضرت صاحب نے اپنے سامنے مٹی کا کورا پیالا رکھا ہوا ہے۔ اس میں پانی ہے۔ اس پر کچھ پڑھ رہے ہیں۔ بعد میں یہ پانی بوتل میں ڈال کر مریض کو دے دیا جائے گا۔“

”اور مریض کون ہے؟“

”وہی لڑکی جس کی ٹانگ کی چوٹ بگڑی ہوئی ہے۔ ہر وقت بخار میں رہتی ہے۔“

”تو وہ لڑکی ابھی یہیں ہے۔“

”ہاں تابش! وہ یہیں رہ رہی ہے۔ میں نے کل اسے پاس سے دیکھا ہے۔ اس کی شکل کچھ کچھ انڈین ایکسٹریس سے ملتی ہے۔ اس نے آنکھوں پر نیلے لینس بھی لگا رکھے ہیں۔“

”تو تمہارا کیا خیال ہے کہ حضرت صاحب جو پانی دم کر رہے ہیں وہ اس لڑکی کے لیے ہے؟“

”جی ہاں..... یہی پتا چلا ہے۔ حیرانی اور دکھ کی بات یہ ہے کہ حضرت صاحب سے یہ سب کچھ زبردستی کرایا جا رہا ہے۔ یوں سمجھیں کہ انہیں ڈرا دھمکا کر یہاں لایا گیا ہے۔ اور ان سے زبردستی وظیفہ پڑھوایا جا رہا ہے۔ ان لوگوں کی عقل پر رونا آتا ہے۔ دم درد کا کام بھی بزورِ بازو کروا رہے ہیں۔“

”بات کچھ سمجھ میں نہیں آرہی۔“

”میں نے سارا پتا کیا ہے۔“ وہ دثوق سے بولی۔ ”انڈین ایکسٹریس کی شکل والی اس لڑکی کا نام نیتو ہے۔ کچھ عرصے پہلے اس کی ٹانگ میں کہیں گولی لگ گئی تھی جس سے ہڈی کو نقصان پہنچا تھا۔ یہ یہاں چودھری انور اور امجد وغیرہ کی خاص مہمان ہے۔ لاہور میں اس کی ٹانگ کے دوا پریشن ہوئے تھے لیکن چوٹ بگڑ گئی ہے۔ انفیکشن ہے جس کی وجہ سے بخار بھی ہو جاتا ہے۔ کسی نے انہیں حضرت صاحب کا بتایا اور یہ کہا کہ ان کا خاص وظیفہ ہڈی کے بگڑے ہوئے زخموں کے لیے بہت مفید سمجھا جاتا ہے لیکن یہ بھی پتا چلا کہ یہ وظیفہ حضرت صاحب مہینے کی صرف خاص تاریخوں میں کرتے ہیں اور علاج کرانے والے بہت پہلے سے اس وظیفے کے لیے اپنے نام لکھوا لیتے ہیں۔ بہر حال یہ لڑکی اپنے ساتھیوں کے ساتھ تین چار دن پہلے یہاں سے ہارون آباد پہنچی ہے۔ ان لوگوں کے پاس چودھری انور کا ایک رقعہ بھی تھا جس میں چودھری انور نے کہا تھا کہ مریضہ ان کی خاص الخاص مہمان ہے اور جس طرح بھی ہو سکے اس کا کام پہلے کر دیا جائے۔“

ثروت نے ذرا توقف کیا اور بولی۔ ”آپ کو پتا ہی ہے۔ حضرت صاحب وظیفہ یا دوا

دارو کے حوالے سے کسی کی سفارش یا مداخلت برداشت نہیں کرتے۔ انہوں نے لڑکی اور اس کے ساتھیوں کو بتایا کہ وہ یہ وظیفہ مہینے میں صرف ایک بار ایک فرد کے لیے کرتے ہیں اور اس سے پہلے تین چار نام لکھے ہوئے ہیں۔ اس لیے وہ معذرت چاہتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ ڈاکٹری علاج جاری رکھا جائے، وہ ویسے اللہ کا کلام پڑھ کر پھونک دیتے ہیں، دعا بھی کرتے ہیں، ان شاء اللہ شفا ہوگی۔ لیکن اگر وہ لوگ ضروری وظیفہ کروانا چاہتے ہیں تو پھر کچھ انتظار کر لیں۔ بس یہ معاملہ بحث اور تلخ کلامی میں بدل گیا۔ یہاں گاؤں سے ایک دوفون چودھری انور کے بھی گئے۔ حضرت صاحب اپنی اصولی بات پر قائم رہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان سے زبردستی کی گئی کچھ بندوں نے انہیں اسلحہ دکھا کر جیپ میں بٹھایا اور یہاں لے آئے۔“

میں حیرت سے سن رہا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس طرح کا کام اس طریقے سے بھی ہو سکتا ہے۔ کسی سے گن پوائنٹ پر دعائے خیر کرائی جاسکتی ہے۔ اس سے پہلی حویلی کے چودھریوں کی عقل سمجھ کا اندازہ ہوتا تھا۔

ثروت نے کہا۔ ”ویسے تو حضرت صاحب کو خوب عزت دی جا رہی ہے۔ نوکر چاکر کمرے کے پاس سے دبے پاؤں گزرتے ہیں۔ ان کے لیے اچھے سے اچھا کھانا پکوا یا جا رہا ہے لیکن وہ وظیفہ مکمل کرنے سے پہلے یہاں سے ہل بھی نہیں سکتے۔ میرا اندازہ ہے کہ آج شام یا کل صبح تک انہیں جیپ پر بٹھا کر احترام کے ساتھ ہارون آباد واپس چھوڑ آئیں گے۔“

”اور کوئی خاص بات نظر آئی وہاں؟“

وہ سوچتے ہوئے بولی۔ ”مجھے لگتا ہے کہ اس زخمی لڑکی کی طرح ایک دو اور لڑکیاں بھی ہیں وہاں۔ ان کی حیثیت بھی وہاں مہمان کی سی ہے۔ لیکن میں ابھی تک انہیں دیکھ نہیں سکی۔ دراصل یہ کافی بڑی حویلی ہے۔ دو منزلیں ہیں۔ حویلی کے کچھ حصوں کی طرف ملازم جا ہی نہیں سکتے۔“

میں نے ثروت کو اس بارے میں تھوڑا بہت بتانا ضروری سمجھا۔ میں نے کہا۔ ”ثروت! یہ ایک بڑا فلمی قسم کا چکر چلا ہوا ہے یہاں۔ تمہیں پتا ہے آج کل ٹی وی وغیرہ پر بھی ہم شکل لوگوں سے پرفارمنس کرانے کا ٹرینڈ ہے۔ کھلاڑیوں، سیاست دانوں اور اداکاروں سے ملتی جلتی شکلوں والے لوگ ڈھونڈے جاتے ہیں اور وہ مزاحیہ پروگراموں میں شرکت کرتے ہیں۔ ہمسایہ ملک انڈیا میں بھی یہ سلسلہ عرصے سے چل رہا ہے۔“

ثروت نے اثبات میں جواب دیا۔

میں نے کہا۔ ”ایک دو پرائیویٹ چینل ایسے بھی ہیں جو خاص طور سے ایسے پروگراموں

پرفیکس کرتے ہیں۔ ان میں سے ہی ایک چینل کے کچھ اہلکاروں کے ذریعے یہ دہرا گیم کھیلا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ نام نہاد آرٹ اکیڈمیاں بھی اس میں ملوث ہیں۔ پھر انہیں شارٹ لسٹ کیا جاتا ہے۔ پھر ان میں سے مزید چناؤ ہوتا ہے۔ اس عمل میں بعض اوقات کوئی حیرت انگیز مشابہت والا چہرہ بھی مل جاتا ہے۔ اس چہرے کو یہ لوگ اپنے مطلب کے لیے خاص طریقوں سے استعمال کرتے ہیں۔ یہ نیوٹرو نامی لڑکی جو تم نے حویلی میں دیکھی ہے، وہ بھی ان منتخب چہروں میں سے ایک ہے۔ مجھے شک ہے کہ ایک اور انڈین ایکٹریس سے مشابہت رکھنے والی کم از کم ایک اور لڑکی ضرور یہاں موجود ہوگی۔ اس کا نام سوینی ہے۔“

ثروت حیرت سے یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ روشن ماتھے پر اُچھن کی پرچھائیاں تھیں۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتی، آٹھ دس سالہ عثمان اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں چائے کے دو کپ تھے۔ ہم چائے پینے لگے۔ عثمان ہمارے ارد گرد ہی موجود رہا۔ لہذا ہم دوبارہ بات شروع نہ کر سکے۔ جب میں چائے میں چینی ہلا رہا تھا، ثروت بغور میرے ہاتھوں کو دیکھ رہی تھی۔ ذرا جھجکتے ہوئے بولی۔ ”ایک بات پوچھوں آپ سے؟“

”پوچھو۔“

”یہ آپ کے ہاتھ پاؤں اتنے بدلے ہوئے سے کیوں ہیں؟ میرا مطلب ہے..... ان کی رنگت، ان کی جلد؟ بلکہ..... آپ..... سارے کے سارے بدلے ہوئے ہیں۔“

”تم بھی تو بدلی ہوئی ہو۔“ میں نے چائے کو گھورتے ہوئے کہا۔

”میں کسی اور حوالے سے بات کر رہی ہوں۔ لگتا ہے کہ پچھلے عرصے سے بہت سخت زندگی گزار رہے ہیں آپ؟“

”تمہیں پتا ہی ہے، یہ دو چار برسوں کی بات نہیں۔ سکول کے زمانے سے شروع ہونے والا جنون ہے، وہی مارشل آرٹ۔“

”لیکن آپ میں تو اور کئی تہذیبیں آئی ہیں۔ نصرت بتاتی تھی کہ آپ خود کو جان بوجھ کر تکلیف میں ڈالے رکھتے ہیں۔ زخم ہو تو اس کا علاج نہیں کرتے، درد ہو تو اس کی دوا نہیں کھاتے۔ بے وجہ سردی گرمی اور بھوک برداشت کرتے ہیں۔ یہاں بھی میں دیکھ رہی ہوں کہ آپ نرم بستر چھوڑ کر چٹائی پر سو رہے ہیں۔ آپ کو کھانے پینے کی کوئی پروا نہیں۔“

”بھئی کھاتی تو رہا ہوں اور تم سے زیادہ کھا رہا ہوں۔ اور چٹائی پر سونا مارشل آرٹ کے کھلاڑیوں کے لیے..... بلکہ سب کھلاڑیوں کے لیے اچھا ہوتا ہے۔ کمر میں درد نہیں ہوتا۔“

وہ سر ہلا کر بولی۔ ”آپ بہت کچھ چھپا رہے ہیں۔ لگتا ہے آپ کو عادت پڑ گئی ہے، خود

کو تکلیف دینے کی اور تکلیف دے کر خوش ہونے کی۔“

”تمہارے لیے یہ بات اطمینان کا باعث نہیں کہ میں خوش ہوں۔“

وہ لا جواب سی ہو گئی۔ اسی دوران میں عثمان باہر جا چکا تھا۔ میں دوبارہ اصل موضوع پر آ گیا۔ میں نے اسے وضاحت سے بتایا کہ کچھ جرائم پیشہ لوگ مشہور اداکاروں کی ہم شکل لڑکیاں ڈھونڈ رہے ہیں اور ان میں سے بہترین کا انتخاب کرنے میں مصروف ہیں۔ میری پوری بات سننے کے بعد وہ پُر تفکر انداز میں بولی۔

”تابش! اگر آپ اور آپ کے دوستوں نے چھان بین کی ہے تو ٹھیک ہی کی ہوگی لیکن..... یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ پھر ان لڑکیوں کو اس دور دراز گاؤں میں کیوں لایا گیا ہے؟“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”ثروت! یہ انسانی اسمگلنگ کا معاملہ لگتا ہے۔ مجھے شک ہو رہا ہے کہ ان لوگوں کو اس سرحدی گاؤں سے کسی طرح بارڈر پار پہنچا دیا جائے گا۔“

ایک دم ثروت کے چہرے پر نظر آنے والی حیرت میں خوف کا عنصر بھی شامل ہو گیا۔ وہ بولی۔ ”تابش! تو پھر یوسف کیوں یہاں ہیں؟ ان کا اس معاملے سے کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ کیا یہ لوگ..... انہیں بھی بارڈر پار پہنچانا چاہتے ہیں؟“

ایک دم میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ ثروت کے الفاظ پوری شدت سے میرے کانوں میں گونجنے لگے اور مجھے لگا کہ جس سوال کا جواب مجھے اور عمران کو پچھلے کئی دن سے نہیں مل رہا تھا، شاید آج مل گیا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ اتفاقاً یوسف فاروقی کی شکل بھی کسی مشہور چہرے سے مل گئی ہو۔ جب یوسف نے پاکستانی فلمی ہیروئن کی ”نقل“ کے ساتھ رات گزاری تھی، اسے جاوا کے کئی لوگوں نے دیکھا تھا۔ ہو سکتا تھا کہ ان پر انکشاف ہوا ہو کہ یوسف خود بھی ایک کام کی چیز ہے۔

”کیا سوچ رہے ہیں؟“ ثروت کی آواز نے مجھے خیالوں سے چونکایا۔

”کچھ نہیں، یونہی ایک خیال ذہن میں آیا ہے۔“ میں نے کہا اور ایک بار پھر سوچ میں گم ہو گیا۔ جہاں تک میری معلومات تھیں، یوسف کی شکل کسی پاکستانی یا بھارتی فلمی اداکار سے تو ہرگز نہیں ملتی تھی۔ ممکن تھا کہ کسی اور شعبے کی سیلیبریٹی سے اس کی مشابہت ہو۔

پھر مجھے یاد آیا کہ جب یوسف زنجی ہو کر ہسپتال میں تھا تو شاربہ بانی ایک خاص بندے کو عیادت کے بہانے اپنے ساتھ لائی تھی۔ وہ بندہ صرف یوسف کا ملاحظہ کرنے کے لیے آیا

تھا۔ یہ ملاحظہ اسی خاص مشابہت کے حوالے سے ہو سکتا تھا۔ مجھے لگا کہ واقعات کی کڑیاں آپس میں مل رہی ہیں۔

میں نے کہا۔ ”ثروت! نہ جانے کیوں میرا یہ یقین پکا ہوتا جا رہا ہے کہ یوسف کو بھی اسی حویلی میں لایا گیا ہے اور ہو سکتا ہے کہ.....“ میں کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

وہ اپنی خوبصورت ذہین آنکھوں سے مجھے دیکھتی جا رہی تھی، میری بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔ ”کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ یوسف کو بھی یہاں سے سرحد پار پہنچانے کی کوشش کی جائے گی۔“

”ہاں ثروت! ایسا ہو بھی سکتا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”تم کوشش کرو کہ اگلے چند گھنٹوں میں یوسف کے بارے میں کچھ پتا چل سکے۔ اگر کنفرم ہو جائے کہ وہ واقعی حویلی میں ہے تو پھر ہم ہر طرح کی کارروائی کر سکتے ہیں۔ پولیس اور دوسرے اداروں کی مدد بھی لی جاسکتی ہے۔“

ثروت نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور بے چین نظر آنے لگی۔ احمد تھانوی صاحب کے حوالے سے اسے جو ڈھارس تھی، وہ تو تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ وہ بولی۔ ”ٹھیک ہے تابش! میں واپس جاتی ہوں۔ جونہی کسی بات کا پتا چلا، میں آپ سے رابطہ کروں گی۔“

”کیسے؟“

”میں خود چکر لگا لوں گی۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”ثروت! بہت احتیاط سے۔ کسی طرح کارسک نہیں لینا۔“

اس نے کچھ نہیں کہا لیکن اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی لاطعلقی نظر آئی۔ یہ لاطعلقی میری فکر مندی سے تھی۔ وہ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی تھی۔ زیادہ مری جاؤں گی۔

اس نے صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا اور باہر نکل گئی۔ ثروت و صبح کے میری دھڑکنیں زیر و زبر ہونے لگیں۔ میں نے ثروت کو راجا کے بارے میں اور حویلی میں اس کی آمد کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ لطیف کی بیوی رضیہ کو بھی راجا کے بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔

لطیف دکان کا سودا لینے کسی قریبی قصبہ تک گیا ہوا تھا۔ اس کا بیٹا عثمان، باپ کی جگہ دکان پر بیٹھا تھا۔ دوپہر کو مجھے چنے کھا کر گزارہ کرنا پڑا۔ پتا چلا کہ لطیف کی بیوی کی طبیعت

”یہ تمہاری خوش فہمی ہے کہ وہ لڑکیاں ہیں۔ شادیاں وقت پر ہو گئی ہوتیں تو تمہارے جتنے بچے ہوتے ان کے۔“

”بس تم جل جل کر کباب ہوتے رہنا۔ جب ایسی باتیں کرتے ہو تو شاہین کے سگے بھائی لگتے ہو۔“

”اچھا..... یہ فون بند کر کے کیوں بیٹھے ہو؟“

”تمہیں بتایا تو ہے یار! ان لڑکیوں نے جینا دو بھر کیا ہوا ہے۔ ان کی دیکھا دیکھی شو بڑ کی کچھ اور لڑکیوں کو بھی میرے اندر سرخاب کے پر نظر آنے لگے ہیں۔ یار! سچ بتاؤ مجھ میں ہے کوئی ایسی بات؟ عام سا بندہ ہوں۔ اب اگر اللہ نے خوبصورتی یا ذہانت دی ہے تو اس میں میرا کیا دوش ہے۔“

”تم تو پیدا انٹی نر دوش ہو۔“ میں نے تائید کی۔

”یقین کر دو تابی! میں تو کئی بار اللہ سے دعا مانگتا ہوں کہ وہ مجھے بالکل عام سا شخص بنا دے..... جیسے تم ہو، جیسے یہ اپنا شیخ (جیلانی) ہے۔“

”اچھا..... تم نے کوئی کام کی بات کرنی ہے یا میں فون بند کر دوں؟“

”ار..... رررر..... نہیں..... یہ غضب نہ کرنا۔ پھر پتا نہیں کال مل سکے یا نہیں۔ میں تمہیں کچھ بتانا چاہ رہا تھا۔ انسپکٹر شوکت کو میں نے مسلسل پیچھے لگایا ہوا ہے شارہ بانی کے..... اور حنیف کے۔ حنیف نے تھوڑا بہت اور بتایا ہے یوسف کے بارے میں۔“

”کیا؟“ میرا تجسس ابھر آیا۔

”حنیف کا کہنا ہے کہ اتفاق سے یوسف کی ایک بد قسمتی اس کے لیے مشکل کی وجہ بن گئی ہے ورنہ اس کے لیے کوئی مسئلہ ہی نہیں ہونا تھا۔ اس نے شارہ بانی کو دس لاکھ روپے دیئے تھے اور اس کے بدلے گلبرگ والی کوٹھی میں ”مزیدار“ رات گزاری تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنے گھر چلے جانا تھا اور نقلی ہیروئن نے اپنے گھر۔ قصہ ختم..... مگر ہوا یوں کہ گلبرگ والی کوٹھی میں جاوا کے ایک دو بندوں نے یوسف کو دیکھا اور حیران رہ گئے۔ یوسف کی شکل انڈیا کے کسی مشہور بندے سے مل رہی تھی اور کافی زیادہ مل رہی تھی۔ اب پتا نہیں وہ کوئی اداکار تھا، کھلاڑی تھا یا پھر سیاست دان یا سیاست دان کا بیٹا وغیرہ۔ جاوا کے لوگ اس کے لیے لپٹا گئے اور اس کے ساتھ وہ سب کچھ ہوا جو ہمارے سامنے ہے۔“

میں نے کہا۔ ”جو بات تم کہہ رہے ہو، وہ آج صبح میرے ذہن میں بھی آئی ہے۔ میں نے تمہیں بتایا ہی ہے، انڈین اداکارہ کرشمہ کپور سے مشابہت رکھنے والی لڑکی نیتو بھی یہاں

ٹھیک نہیں۔ سہ پہر کے وقت مجھے دور سے راجا آتا دکھائی دیا۔ اس کی دھوتی ہوا میں پھڑ پھڑ رہی تھی۔ وہ عام سے انداز میں دکان پر آ کر کھڑا ہو گیا اور سگریٹ کا پیکٹ خریدا۔ وہ شاید مجھ سے کوئی بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن لطیف کے بجائے اس کا بیٹا دکان پر بیٹھا تھا۔ پھر اسی دوران میں حویلی کا ایک عمر رسیدہ ملازم بھی دکان کے اندر آ کر بیٹھ گیا اور عثمان سے گپ شپ کرنے لگا۔ راجا کو کوئی بھی بات کیے بغیر واپس حویلی جانا پڑا۔

جس وقت وہ حویلی والی گلی میں داخل ہو رہا تھا، وہاں سے ایک جیپ نکلتی نظر آئی۔ یہ حویلی ہی کی کچھڑا آلود جیپ تھی۔ جیپ دکان کے سامنے سے گزری تو میں چونک گیا۔ اس میں مجھے احمد تھانوی صاحب کی جھلک نظر آئی۔ اندازہ ہوا کہ ان کا کام ختم ہو چکا ہے اور انہیں واپس ہارون آباد پہنچایا جا رہا ہے۔ وہ بہت خاموش بلکہ رنجیدہ نظر آرہے تھے۔

میں موجودہ صورت حال پر عمران سے مشورہ کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اسے کئی فون کیے لیکن اس کا فون بند جا رہا تھا۔ وہ پتا نہیں کس جگر میں پڑا ہوا تھا۔ لطیف کی واپسی شام کے فوراً بعد ہی ہو گئی۔ وہ اپنی سائیکل پر بہت سارے سامان لاد کر لایا تھا۔ اس نے دو پہر کے کھانے کا پوچھا۔ میں نے بتایا کہ بھوک ہی نہیں تھی۔ تھوڑے سے چنے پھاٹک لیے ہیں۔ وہ سمجھ گیا کہ دو پہر کو کھانا پکایا ہی نہیں گیا۔ اس نے پُر تکلف کھانا پکویا۔ چھوٹا گوشت، چاول اور حلوہ وغیرہ تھا۔ کھانا کھانے کے بعد ہم حسب معمول بیٹھک میں آ بیٹھے۔ لائین کی روشنی میں ریڈیو سنتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ آج تیز ہوا چل رہی تھی۔ مطلع بھی اُبر آلود تھا۔ شام سے پہلے دانی برکتے چلی حویلی سے ہو کر آئی تھی۔ اس نے بتایا تھا کہ ثروت وہاں خوش ہے۔ ایک ملازمہ آمنہ کے ساتھ مل کر اس نے باورچی خانے کا سارا کام سنبھالا ہوا ہے۔ لڑکا بلال بھی اس سے راضی ہے۔ وڈی چودھرائن نے ثروت کو پیشکش کی تھی کہ اگر وہ چاہے تو اسے یہاں مستقل بھی رکھا جاسکتا ہے۔

لطیف کو احمد تھانوی صاحب کی گاؤں میں آمد اور رخصتی کے بارے میں کچھ علم نہیں تھا۔ میں نے بھی اسے بتانا مناسب نہیں سمجھا۔ اسی دوران میں عمران کا فون آ گیا۔ یہ کال اس نے اپنے نمبر سے نہیں کی تھی۔ میں نے کہا۔ ”کہاں غائب ہو، گدھے کے سینگوں کی طرح۔ میں نے کوئی دس بار فون کیا ہے تمہارا نمبر ہی بند ہے۔“

وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولا۔ ”بس یار تنگ آ گیا ہوں ان دونوں لڑکیوں سے۔“

”کون لڑکیاں؟“

”ارے یہی نرگس اور ریما۔ بس جان کھا لیتی ہیں یہ۔“

اس گاؤں میں موجود ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک آدھ اور لڑکی بھی یہاں ہو۔ آثار سے لگ رہا ہے کہ ان لوگوں کو سرحد پار پہنچایا جائے گا۔“

عمران بولا۔ ”سب سے پہلے تو تم یہ کنفرم کرو کہ یوسف یہاں حویلی میں ہے یا نہیں۔ اگر وہ موجود ہے تو پھر ہمیں فوری طور پر کوئی قدم اٹھانا چاہیے۔“

”قدم تو اب بھی اٹھایا جاسکتا ہے۔“ میں نے کہا۔

”لیکن اگر یوسف اندر موجود ہے تو پھر ہمیں احتیاط سے کام لینا پڑے گا۔ یہ نہ ہو کہ پولیس گھیراؤ لے یا ہلا بولے اور وہ لوگ اندر والوں کو نقصان پہنچادیں۔“

”میں نے ثروت سے کہا تو ہے کہ وہ جلد از جلد یوسف کی ٹوہ لگائے۔“

ہماری گفتگو کے دوران میں ہی لطیف کسی کام سے اُٹھ کر گھر کے اندر چلا گیا تھا۔ اچانک مجھے لگا کہ وہ بیوی سے کسی بات پر بول رہا ہے۔ جھگڑے کی سی صورت حال تھی۔ پھر یہ آواز مزید واضح ہو گئی۔ میں نے عمران سے بات مختصر کر کے فون بند کیا اور آوازوں پر کان لگا دیئے۔ تجسس سے مجبور ہو کر میں بیٹھک سے اُٹھا اور آوازوں کی سمت بڑھا۔ یہ ایک بند کمرے میں سے آرہی تھیں۔ کمرے سے باہر برآمدے میں چھوٹا عثمان مجھ روانی لگائے سو رہا تھا۔ میں نے دروازے سے کان لگائے۔ آوازیں وضاحت سے سنائی دینے لگیں۔ لطیف لڑزائی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”تم نے بہت بُرا کیا رضیہ! تم پر لعنت ہو، اللہ کی مار ہو تم پر۔ تمہیں ذرا خیال نہ آیا۔ وہ پیر بھائی ہے، مہمان ہے ہمارا۔ اودہ خدایا! اس عورت نے مجھے کہیں کانہیں چھوڑا۔ اودہ خدایا.....“

رضیہ تنک کر بولی۔ ”رونے کے بجائے شکر کر خدا کا۔ میں نے تجھے بچالیا ہے۔ تیرا کیا خیال ہے، یہ بات چودھریوں سے ڈھکی چھپی دینی تھی۔ وہ اُنٹی چڑیوں کے پر گنتے ہیں۔ ایک آدھ دن میں تیرا سارا پول کھل جاتا تھا۔ پھر انہوں نے ننگا کر کے اُلٹا لٹکا دینا تھا تجھے اور ساتھ میں مجھے بھی۔ تیرے دماغ میں پتا نہیں کیا بھرا ہوا ہے۔ تجھے اتنی سمجھ نہیں آتی۔ ہم نے اس پاٹھ میں رہنا ہے۔ یہاں جینا اور مرنا ہے۔ چھوٹے چھوٹے بچے ہیں ہمارے۔“

”پرتو نے ان کا بھی سوچا ہے؟ اب ان کے ساتھ کیا ہوگا؟“

”وہ اپنے کیے کی سزا بھگتیں گے۔ ان سے کس حکیم نے کہا تھا کہ وہ یہاں آئیں اور بھیس بدل کر جاسوسیاں کریں۔ میں تجھے لکھ کر دے دیتی ہوں، اس کی یہ بات بھی جھوٹی ہے کہ وہ پولیس والا ہے۔ پولیس والا ہوتا تو اب تک کئی پولیس والے یہاں پہنچ چکے ہوتے۔“

”تجھے اُلو بننا رہا ہے۔“

”اودہ خدایا۔“ لطیف پھر کراہا۔

رضیہ نے کہا۔ ”اب کیے کرائے پر پانی نہ پھیرنا۔ میں نے یہی کہا ہے وڈی چودھرائن سے کہ مجھے لطیف نے بھیجا ہے۔ سمجھ رہے ہوں بات؟“

ابھی اس کا فقرہ پورا نہیں ہوا تھا کہ دروازے پر زور دار دستک ہوئی۔ میری رگوں میں لہونے اُچھلا مارا۔ لگتا تھا کہ حویلی سے لوگ پہنچ گئے ہیں۔ میں نے تیزی سے سوچا۔ کمرے میں واپس آیا۔ لکڑی کی ایک ڈولی کے نیچے میں نے کولٹ پسل چھپا رکھا تھا۔ میں نے پسل نکالا اور اس دروازے کی طرف بڑھا جو گھر اور دکان کو ملاتا تھا۔ دروازے میں سے گزر کر میں تاریک دکان میں داخل ہوا۔ گاجر کے مربے کا ایک مرتبان میرا گھٹنا لگنے سے کچے فرش پر گرا اور ٹوٹ گیا۔ میں جانتا تھا کہ لطیف دکان کو اندر کی طرف سے بس ایک تالا لگاتا ہے۔ میں نے تاریکی میں ٹٹول کر تالے کا سراغ لگایا۔ گلی میں گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ دروازے پر دستک دینے والے اب اندر آ گئے تھے۔ ان کی بلند غصیلی آوازیں میرے کانوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں نے پسل کی نال تالے کے اوپر رکھ کر فار کیا۔ اندھیرے میں دھماکے سے شعلہ چمکا۔ میرے دوسرے فار سے تالا ٹوٹ گیا۔ میں نے لکڑی کے اٹھ نوٹ چوڑے دروازے کی لکڑی کھولی مگر اس سے پہلے کہ میں دکان سے باہر قدم رکھتا، اندر آنے والے میرے سر پر پہنچ گئے۔ میری طرف دو رائفلوں کی نالیں اٹھی ہوئی تھیں۔ ایک بڑی نارج کا روشن دائرہ سیدھا میرے چہرے پر پڑ رہا تھا۔ ”خبردار اودے! بھون کر رکھ دیں گے۔“ ایک کرخت آواز تاریکی میں گونجی۔ اسی دوران میں باہر کی طرف سے دکان کا دروازہ بھی ایک جھٹکے سے کھل گیا۔ کئی افراد اس طرف بھی موجود تھے اور ان میں سے یقیناً کچھ مسلح بھی تھے۔ مزاحمت کرنے کو میں اب بھی کر سکتا تھا۔ میرے اندر ایک عجیب سی ترنگ تھی۔ مرنے اور مار دینے کا وہی جذبہ تھا جس کے بیچ عمران نے میرے اندر بور کھے تھے اور جس کی آبیاری بھانڈیل اسٹیٹ میں جسکی کی کڑی تربیت نے کی تھی۔ لیکن پھر مجھے ثروت کا خیال آیا۔ ثروت اونچی دیواروں والی اس حویلی میں موجود تھی جہاں سے یہ لوگ دندناتے ہوئے آئے تھے۔ اگر اس مزاحمت کے دوران میں مجھے کچھ ہو جاتا تو وہ کم از کم آج کی رات کے لیے تو اس حویلی میں تنہا رہ جاتی۔ نہیں میں اسے تنہا نہیں چھوڑ سکتا۔ میرے دل سے آواز آئی۔ میں نے اپنا پسل جھکا لیا۔

”اس کو پھینک کر پیچھے ہٹو۔“ اندھیرے میں سے ایک گرج دار آواز نے کہا۔

میں نے پسل پھینک دیا۔ ایک شخص نے چمکدار میٹوں والی لالھی گھما کر میرے کندھے

پر ماری۔ دو افراد نے مجھے عقب سے جکڑ لیا۔ میری گردن اور سر پر پستول کے دتے سے سخت چوٹیں لگائیں۔ میں چاول اور دالوں کی ادھ کھلی بوریوں پر گرا۔ یہی وقت تھا جب میں نے صفائی سے اپنا سیل فون وال کی ایک بوری میں گھسا دیا۔ انہوں نے ایک بڑے رومال سے میرے ہاتھ پشت پر کس کر باندھ دیئے۔ اس دوران میں وہ گالیوں کی بارش بھی کرتے رہے۔ اب میرے ارد گرد لالٹینوں کی روشنی تھی۔ میں نے دیکھا لطیف دور ایک کونے میں خاموش کھڑا تھا۔ وہ مجھ سے نظر نہیں ملا پارہا تھا۔ میں نے بھی اسے امتحان میں ڈالنا مناسب نہیں سمجھا اور اس کی طرف سے رُخ پھیر لیا۔ چودھری کے کارندوں نے اچھی طرح میری تلاشی لی اور پھر گھسٹ کر کھڑا کر دیا۔

اور اب میں اونچی دیواروں والی پہلی حویلی کے اندر تھا۔ یہ انگریزوں کے دور کی بنی ہوئی پختہ عمارت تھی۔ ارد گرد کے کچے مکانون سے بالکل میل نہیں کھاتی تھی۔ دیواریں موٹی اور چھتیں اونچی تھیں۔ محرابی دروں میں پُرانی لکڑی کے مضبوط دروازے لگے ہوئے تھے۔ ان میں آہنی کیلیں قطار اندر قطار دور ہی سے دکھائی دیتی تھیں۔ حویلی گاؤں کے اس حصے میں تھی جہاں بجلی موجود تھی۔ مجھے وسیع وعریض بیٹھک نما جگہ پر پہنچایا گیا۔ بیٹھک کی آرائش خالص دیہاتی طرز کی تھی۔ بیٹھنے کے لیے صوفوں کی جگہ رنگین پاپوں والے پانگ تھے۔ ان پر کڑھائی دار گاؤں تکیے رکھے ہوئے تھے۔ گھنی مونچھوں اور متمنائے چہروں والے دو تین افراد یہاں موجود تھے اور شاندار قسم کے حقے گڑگڑا رہے تھے میں نے فیص پتلون والے ایک دبلے پتلے نوجوان کو دیکھا جو ایک حقے کی چلم درست کرنے میں مصروف تھا۔ مجھے لطیف نے بتایا تھا کہ یہاں نچلے درجے کے سارے کام شہر سے آئے ہوئے ملازم کرتے ہیں۔ اب اس کا ثبوت بھی مل رہا تھا۔ لیکن سوچنے کی بات تھی کہ کیا چودھری انور ازواجی رشتے کو بھی نچلے درجے کا کام سمجھتا تھا جو اس نے دوشہری بیویاں رکھ چھوڑی تھیں۔ اس نے انہیں اولاد سے بھی محروم رکھا ہوا تھا۔ جلد ہی مجھے پتا چل گیا کہ میرے سامنے رنگین پلنگ پر بڑے ٹھاٹ سے بیٹھا ہوا پینتیس چالیس سالہ شخص چودھری انور ہی ہے۔ چہرے کے رنگ کے مقابلے میں اس کے ہونٹ قدرے سیاہ تھے۔ یہ اس کی سگریٹ نوشی اور شراب نوشی کی علتوں کی نشاندہی کرتے تھے۔ چودھری انور کی دہشت قرب و جوار کے حاضرین پر مسلّم تھی۔ اس کے عقب میں ایک خطرناک صورت شخص کندھے سے پستول لٹکائے چوکس کھڑا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ ایک طرف لکڑی کی ڈھائی تین فٹ اونچی میز کے اوپر ایک دیہاتی نوجوان مرغا بنا ہوا تھا۔ قطرہ قطرہ پسینہ اس کے چہرے سے میز پر ٹپک رہا تھا۔ پتا نہیں بیچارے کو کس جرم کی سزا دی

گئی تھی۔ اگر وہ وہاں سے گر جاتا تو سخت چوٹ آتی۔

مجھے بھی کسی ملزم کی طرح چودھری کے سامنے پیش کیا گیا۔ میرے ہاتھ ابھی تک صافہ نما رومال میں بندھے ہوئے تھے۔ چہرے پر ایک دو چوٹیں بھی آئی تھیں جن کی میٹھی میٹھی جلن میرے جسم میں تپش جگا رہی تھی۔

اسی دوران میں ایک طرف سے چھوٹا چودھری امجد برآمد ہوا۔ اس نے ثروت کا بازو کندھے کے قریب سے پکڑ رکھا تھا۔ چہرے پر کڑھکی تھی۔ وہ ثروت کو کھینچ کر لایا اور چودھری انور کے قریب کھڑا کر دیا۔ ثروت کی آنکھیں رونے سے سرخ تھیں اور اس نے سر جھکا رکھا تھا۔ میرے تن بدن میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ تاہم ان چنگاریوں کی جلن میں عجب طرح کی لذت بھی تھی۔ آج ایک طویل..... طویل عرصے بعد میں اور ثروت اکٹھے ایک مشکل کا شکار تھے اور آج میں وہ پہلے والا تابش نہیں تھا۔ میرے اندر اور باہر بہت کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ میرے سینے میں ایک پُر جوش دل دھڑک رہا تھا۔ وہ دل جو اپنی ہمت کو آزمانا چاہتا تھا۔ اور میری محبوب ترین ہستی میرے رُوبرو تھی۔ وہ جس کے سپنے میں نے دن رات آنکھوں میں سجائے تھے، جس کے لیے تکلیف سہنا اور جان دینا میرے لیے سعادت کی سی حیثیت رکھتا تھا۔ ثروت کے لیے یوں تو ہمیشہ ہی سے سب کچھ فدا تھا لیکن اب ناقابل عبور فاصلوں نے شاید ان جذبول میں مزید شدت پیدا کر دی تھی۔ نہ جانے کیوں ان لمحوں میں یہ حویلی اور اس حویلی کے لوگ مجھے حقیر محسوس ہوئے۔ ان کی تمام تر خونخواری کے باوجود مجھے لگا کہ میں ان کو چیر کر گزر سکتا ہوں۔ ہاں..... اگر ثروت میرے ساتھ تھی۔ اس کا ہاتھ میرے ہاتھ میں تھا۔ تو پھر کوئی مصیبت، مصیبت نہیں تھی۔ کوئی دیوار، دیوار نہیں تھی۔ بھانڈیل اسٹیٹ کی سخت ترین آزمائش سے گزرنے کے بعد اور جارج گورا جیسے خطرناک ترین فائٹر سے ٹکرانے کے بعد میرے اندر ایک خاص طرح کا اعتماد پیدا ہو چکا تھا۔ بے شک پہلی حویلی کے یہ چودھری بہت سفاک تھے لیکن یہ میرے لیے پہلا موقع نہیں تھا کہ میں ایسے لوگوں کے رُوبرو تھا۔ جارج گورا کی ہزیمت کے مناظر میرے اندر ایک اضافی توانائی پیدا کرتے رہتے تھے اور اس کی شکست میرے جسم پر ایک تمنّے کی طرح لگی ہوئی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ تمنّہ میرے سینے پر نہیں تھا، کہیں اور تھا۔ یہ تمنّہ ایک چرمی کور کے ذریعے میری ران سے بندھا ہوا تھا۔ یہ وہی نادر چاقو تھا جس نے جارج کا پیٹ پھاڑا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے لطیف کی دکان میں میری جو سخت تلاشی ہوئی، اس میں یہ چاقو محفوظ رہا تھا۔

چودھری انور نے حقے گڑگڑا کر مونچھوں کے اوپر سے گاڑھا سفید دھواں چھوڑا اور مجھے

گھورتے ہوئے بولا۔ ”اوئے بد بخت! کہاں سے آیا ہے تُو..... کس باغ کی مولیٰ ہے؟“
میں خاموش کھڑا رہا۔

چودھری بولا۔ ”سنا ہے کہ تُو خود کو پلس والا بتاتا ہے اور کسی کو چھڑانے شردانے کے لیے یہاں آیا ہے۔ کس بیوی کھچ کھچ لے آئی ہے یہاں؟“
ثروت نے گھٹی گھٹی آواز میں کہا۔ ”ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔“

”اوئے! یہ تو ہمیں بھی پتا ہے رات کی رانی کہ قصور تیرا ہی ہے۔ تیرا بندہ کسی طوائف کے ساتھ بھاگ گیا ہے۔ کسی ہوٹل شوٹل میں دل پشوری کر رہا ہو گا اور تُو اپنے اس یار کے ساتھ آگئی ہے اسے ڈھونڈنے کے واسطے۔“ چودھری انور نے کہا۔ پھر اپنے عقب میں کھڑے شخص سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اوئے! کیا کہتے ہیں مولادادا! انے کتے تے ہرناں دے شکاری۔“

مولاداد سمیت دو تین افراد نے فرمائشی تہتہ لگایا۔

اسی دوران میں ایک طرف سے نیتو عرف کرشمہ کپور لنگڑاتی ہوئی برآمد ہوئی۔ اس نے بڑے تعجب سے میری طرف دیکھا پھر اس کے چہرے کا رنگ بدل گیا۔
چودھری انور بھی کچھ ٹھک گیا۔ کرشمہ کپور سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تم اس کو جانتی ہو بی بی؟“

”اس کو نہیں جانوں گی تو اور کس کو جانوں گی۔“ وہ زہریلے انداز میں بولی۔ ”یہ اور اس کا ساتھی ہی تو تھا جنہوں نے میری زندگی حرام کی ہے۔ ان پر چلائی ہوئی گولی ہی لگی تھی مجھے۔ نادر کو مارنے والے اور اس کی لاش کی ویڈیو فلم بنانے والے بھی یہی ہیں۔ مم..... مجھے تو لگتا ہے چودھری جی کہ اس کا ساتھی بھی یہیں کہیں گاؤں میں ہی ہو گا۔“

چودھری انور اور چودھری امجد کے چہرے متغیر ہو گئے۔ لگتا تھا کہ وہ نادر کے بارے میں تھوڑا بہت جانتے ہیں۔ ماحول میں عجب سی سنسنی پھیل گئی۔ میں نے دیکھا، ثروت کا چہرہ زرد تر ہو گیا ہے، وہ خشک ہونٹوں پر زبان پھیر رہی تھی۔

چودھری انور نے حقے کا طویل کش لے کر کہا۔ ”نادر وہی ہے ناجوڈانگ (لاٹھی) کی طرح لمبا سا تھا۔“

”جی چودھری جی۔“ کرشمہ کپور نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”وہ بڑا بہادر بندہ تھا جی۔ سلطان صاحب کے سپینے پر اپنا خون گراتا تھا۔ اس کی موت کا سلطان صاحب کو بڑا دکھ ہوا۔ انہوں نے ان دونوں کو بڑا ڈھونڈا ہے لاہور شہر میں۔ یہ ایک دم کہیں غائب ہو گئے تھے۔“

اب دیکھیں یہ ملا بھی ہے تو کہاں۔ آپ کسی طرح لاہور میں سلطان صاحب کو خبر پہنچائیں۔ ان کا دل باغ باغ ہو جائے گا اس اطلاع سے۔“ کرشمہ کپور کی آواز خوشی سے لرز رہی تھی۔
کرخت چہرے والے مولاداد نے آگے بڑھ کر میرا گریبان پکڑ لیا اور زور زور سے جھٹکے دیتا ہوا بولا۔ ”اوئے بتا، کہاں ہے وہ تیرا حرامی یار! کس ماں کی گود میں چھپا ہوا ہے۔ اسی پنڈ میں ہے یا کہیں اور ہے؟“

اس کے ساتھ ہی اس نے میرے پیٹ میں گھسنے کی زوردار ضرب لگائی۔ میں اس ضرب کے لیے تیار نہیں تھا۔ شدید چوٹ لگی اور میں گھٹنوں کے بل گر گیا۔ دو افراد مجھ پر پل پڑے۔ مجھے گھونے اور لاتیں رسید کی گئیں۔ تکلیف ہو رہی تھی لیکن مزہ بھی آرہا تھا۔ مزہ اور تکلیف میرے لیے اکثر اسی طرح گن مل جاتے تھے۔

ثروت چلائی۔ ”خدا کے لیے۔ خدا کے لیے ان کو نہ ماریں۔“

چودھری انور کے اشارے پر مجھے چھوڑ دیا گیا۔ میری قمیص اور بنیان دونوں پھٹ گئی تھیں۔ میں اپنے قدموں پر کھڑا ہو گیا۔ چودھری انور نے وحشی نظروں سے ثروت کو گھورا۔
”اس سوہنی کڑی کو بڑا دکھ ہوا ہے۔“

چھوٹے چودھری امجد نے ثروت کے بال مٹھی میں جکڑے اور گرج کر بولا۔ ”سچ بتا..... یہ کیا لگتا ہے تیرا اور کس لیے اس کے ساتھ بھاگی پھر رہی ہے؟“

”مم..... میری کسی سے دشمنی نہیں۔ میں بس اپنے میاں کو ڈھونڈ رہی ہوں۔ اُف..... مجھے چھوڑ دو۔“ ثروت کراہی۔ اس کی گردن مڑی ہوئی تھی اور تکلیف کے سبب چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔

”چھوڑ دو اسے۔“ میں گرجا۔ ”اپنے ہاتھ دور رکھو اس سے۔ نہیں تو پچھتاؤ گے..... میں..... قبرستان بنادوں گا اس حویلی کو۔“

چھوٹے چودھری امجد نے اپنی گرفت ذرا نرم کر دی۔ ثروت کے چہرے پر تکلیف کے آثار کم ہو گئے۔ بڑے چودھری انور نے بڑی تیز نظروں سے مجھے دیکھا۔ ان نظروں میں زہر تھا اور آگ تھی۔ وہ سر ہلا کر بولا۔ ”واہ بھی واہ..... بڑا پیار ہے مر جا صاحبان میں۔ ایک دو بچے کے اندر جندڑی ہے بھی ان کی۔ پیار واقعی بڑی چنگی چیز ہے۔ کئی کام اس کی وجہ سے سوکھے (آسان) بھی ہو جاتے ہیں۔ کیوں بھی مولادادا؟“ اس نے معنی خیز نظروں سے ہتھول بردار مولاداد کی طرف دیکھا۔

وہ اپنی خضاب لگی مونچھوں کو تاؤ دے کر بولا۔ ”آہو جی! آپ بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔“

کیا ہے اور ایک بار نہیں، کئی بار کیا ہے۔ ایک چیونٹی تک نہ مارنے والا تابش اب جان لینا اور دینا سیکھ چکا ہے۔ دینا نے اسے سکھا دیا ہے۔

یہاں ایک دروازے اور روشن دان کے سوا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ایک میلا سا بلب کوٹھڑی میں روشنی بکھیر رہا تھا۔ میرے ہاتھ ابھی تک پشت پر بندھے ہوئے تھے۔ ثروت نے ہاتھ کھول دیئے اور میری کلائیوں کو سہلایا۔ اس کی آنکھوں سے مسلسل آنسو گور رہے تھے۔

وہ بولی۔ ”یہ سب میری وجہ سے ہوا ہے۔ میری طرف سے آپ کو ہمیشہ دکھ ہی ملے ہیں۔“ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

وہ تعجب سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے اس کے کان کے قریب سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”ہمیں بڑی احتیاط سے بات کرنی ہوگی۔ مجھے شک ہے کہ یہ لوگ ہماری باتیں سننے کی کوشش کریں گے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں اسی لیے اکٹھے بند بھی کیا گیا ہو۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا اور دو آنسو اس کے شفاف رخساروں پر لڑھک گئے۔ میں نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔ ”تمہیں کوئی چوٹ وغیرہ تو نہیں آئی؟“

”نہیں..... لیکن آپ کو تو آئی ہیں۔ کپڑے بھی پھٹ گئے ہیں۔“

میں نے کوٹھڑی کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ لکڑی کے دروازے میں ایک معمولی سی درز موجود تھی مگر اس درز سے کوٹھڑی کے بس ایک مختصر گوشے کو ہی دیکھا جاسکتا تھا۔ کوئی روشندان میں سے ہمیں دیکھنے کی کوشش کرتا تو ہمیں پتا چل سکتا تھا۔ لکڑی کی ایک خالی الماری، پلاسٹک کے ایک وائر کولر اور دو تین جھوٹے برتنوں کے سوا یہاں اور کچھ نہیں تھا۔ مجھے لگا کہ شاید ہم سے پہلے وہی معتوب لڑکا یہاں بند تھا جو باہر بیٹھک میں نظر آیا تھا۔

اگلے ڈیڑھ دو گھنٹے میں ہم نے دو طرح کی گفتگو کی۔ جو باتیں عام تھیں وہ نارمل لہجے میں کہیں لیکن خاص بات سرگوشیوں کی صورت میں کہی۔ سرگوشیاں کرتے ہوئے مجھے اپنے اونٹ ثروت کے کان کے پاس لانے پڑتے تھے اور ایسا ہی ثروت بھی کرتی تھی۔ نہایت غلین صورت حال کے باوجود اس کی یہ قربت مجھے بھرا رہی تھی۔ اس کی سانسوں کا لمس میرے چہرے اور پورے جسم میں ایک سنسنہٹ جگاتا تھا۔ پتا نہیں کیا بات تھی۔ مجھے ان پریشان کن حالات کی ذرہ بھر پروا نہیں تھی۔ پریشانی کی جگہ دل و دماغ میں عجیب سی ترنگ تھی۔ کچھ کر دکھانے کا عزم تھا۔

اچانک کچھ مدد آمیز سنائی دینے لگیں۔ یوں لگا جیسے ایک مرد اور عورت کھسر پھسر کر رہے ہیں۔ پھر مرد کا ہلکا سا تہقہ سنائی دیا۔ میرے جسم میں چیونٹیاں سی ریگ گئیں۔ مجھے لگا

چودھری انور نے کہا۔ ”ویسے بھی تم کافی دنوں بعد جیل سے آئے ہو۔ میرا خیال ہے کہ تھوڑی دیر کے لیے اس صاحبان کو تمہارے حوالے کر دیتے ہیں۔ یہ مر جا (مرزا) جب اس کا تماشہ دیکھے گا تو خود ہی فر فر ولنا شروع کر دے گا۔ جو پوچھیں گے وہ تو بتائے گا ہی، جو نہیں پوچھیں گے وہ بھی بتائے گا۔“

چھوٹے چودھری امجد نے ایک بار پھر ثروت کے بالوں کو جھکا دیا۔ میرے ہاتھوں کو بہت مضبوطی سے نہیں بانہا گیا تھا۔ مجھے لگا کہ اگر میں کوشش کروں تو اپنے ہاتھوں کو کپڑے کی گرفت سے نکال سکتا ہوں۔ یہی وقت تھا جب ایک موٹی تازی باز عورت اندر آئی۔ اس کا بھاری چہرہ سیب کی طرح سرخ تھا۔ وہ چمکیلے لاپے کرتے میں تھی۔ جسم پر گہنے بھی نظر آتے تھے۔ میں پہلی نظر میں پہچان گیا کہ وہ وڈی چودھرائن ہے۔ اس نے چودھری امجد سے کہا۔ ”وے امجدے! چھوڑ دے اس لسی مینی (کنزور بکری) کو۔ کہیں اس کی گردن کا کڑا کا ہی نہ نکل جائے۔“

امجد نے ایک بار پھر گرفت ذرا نرم کر دی۔ عورت، چودھری انور کے پاس پلنگ پر جا بیٹھی۔ اس کے ماتھے پر سلوٹیں تھیں۔ اس نے چودھری کے کان میں ایک دو باتیں کیں۔ چودھری پہلے تذبذب میں رہا پھر اس نے اثبات میں سر ہلایا اور نیم رضا مند نظر آنے لگا۔

کچھ دیر بعد چودھری اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ پہلے اس نے سر غائبے لڑکے کی بقایا سزا معاف کی اور اسے دو چار گالیاں دے کر بیٹھک سے باہر بھیج دیا۔ پھر چھوٹے چودھری امجد سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”ایک ضروری کام پڑ گیا ہے۔ ابھی جا رہا ہوں۔ تم گڈی باہر نکلو دو۔ اور ان دونوں کو بند کر دو۔ صبح دیکھیں گے کیا کرنا ہے ان کا۔“

میرے سر پر دو چار مزید دو ہتھ مارے گئے اور دھکیل کر ایک چھوٹے کمرے میں بند کر دیا گیا۔ کمرہ بھی کیا بس بیٹھک کے عقب میں ایک کوٹھڑی سی تھی۔ حیرت یہ ہوئی کہ ثروت کو بھی میرے ساتھ ہی کوٹھڑی میں دھکیل دیا گیا۔ مجھے کوٹھڑی میں بند کرتے وقت مجھ سے میرے موبائل فون کے بارے میں پوچھ گچھ کی گئی۔ میں نے انہیں بتایا کہ موبائل میرے پاس تھا لیکن اب نہیں ہے۔ شاید کہیں گر گیا ہے۔

کوٹھڑی کا دروازہ بند ہوا تو وہ چٹائی پر بیٹھ گئی اور سسکیوں سے رونے لگی۔ میں لڑکپن سے اس کا راز شناس تھا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ کیوں رو رہی ہے۔ اس کی سسکیوں میں چھپی ہوئی آواز میں سن سکتا تھا۔ وہ مجھ سے پوچھ رہی تھی۔ کیا واقعی میں قاتل بن چکا ہوں؟ کیا واقعی میں نے اپنے کئی دوست کے ساتھ مل کر کسی شخص کو قتل کیا ہے؟ میں اسے کیسے بتاتا کہ میں نے ایسا

کہ یہ اپنے راجا کا قبضہ ہے۔ مرد، عورت کی آوازیں کبھی ذرا بلند ہو جاتیں، کبھی بالکل دھیمی پڑ جاتیں۔ حویلی میں کہیں پکڑے تلے جا رہے تھے اور بین والی مچھلی تیار ہو رہی تھی۔ اس کی خوشبو ہم تک بھی پہنچ رہی تھی۔ کسی وقت وڈی چودھرائن کی تحکمانہ آواز بھی ہمیں سنائی دیتی۔ وہ کسی نوکرانی کو ڈانٹتی یا کوئی ہدایت جاری کرتی تھی۔ گاہے بگا ہے کسی کمرے سے برتن نکلنے کی آواز آتی یا پھر ایک چھوٹا بچہ ضدی انداز میں رونے لگتا۔ یہ چھوٹے چودھریوں میں سے کسی کا بچہ ہو سکتا تھا یا پھر ممکن تھا کہ کسی نوکرانی کا ہو۔

میرے ذہن میں شک پیدا ہو چکا تھا کہ راجا اب ڈیرے پر نہیں بلکہ کہیں ہمارے قریب ہی موجود ہے۔ میں نے اس پرانی طرز کی کوٹھڑی کی دیوار کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ اس کی اونچائی سترہ اٹھارہ فٹ سے کم نہیں تھی۔ روشندان چھت سے ڈیڑھ دو فٹ نیچے تھا۔ لکڑی کی الماری میں خانے سے بنے ہوئے تھے۔ یہ خانے میزھی کا کام دے سکتے تھے۔ اگر میں الماری کے اوپر پہنچ جاتا تو روشندان تک رسائی ہو سکتی تھی۔ میں نے سرگوشیوں میں ثروت کو اپنے ارادے کے بارے میں بتایا۔ وہ میری ہدایت پر بے چوں و چرا عمل کر رہی تھی۔ میں نے اسے کہا کہ وہ الماری کو ذرا تھام کر کھے اور ڈگمگانے سے بچائے۔ اس نے ایسا ہی کیا۔ میں الماری کے خانوں میں پاؤں رکھتا۔ اوپر پہنچ گیا لیکن اب بھی روشن دان دو ڈھائی فٹ اوپر تھا۔ میں نے اشارہ کیا اور ثروت نے، انٹرکولر مجھے تھما دیا۔ میں نے انٹرکولر پر پاؤں رکھے اور روشن دان سے ساتھ والے کمرے میں جھانکنے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ عام ساز کا کمرہ تھا۔ میں کمرے کا قریباً نصف حصہ دیکھ سکتا تھا۔ یہاں بھی بلب کی بدھم روشنی موجود تھی۔ مجھے ایک شخص کی پشت نظر آئی۔ میں نے ایک سیکنڈ میں پہچان لیا۔ وہ راجا تھا۔ اس کے سامنے ایک پلیٹ تھی۔ وہ بڑی رغبت سے گرم گرم پکڑے کھا رہا تھا۔ پاس ہی شیشے کا گلاس تھا جس میں دھسکی چمک رہی تھی۔ انڈین شراب کا آؤھا بھی پاس ہی پڑا تھا۔ راجا سے چار پانچ فٹ کے فاصلے پر ایک مشہور انڈین فلم اشار ایشوریا رائے موجود تھی۔ وہ اسی نوے فیصد سے زائد مشابہت رکھتی تھی۔ اب تو اس نے اپنے بال بھی ایشوریا رائے ہی کے انداز میں سیدھے کرا لیے تھے۔ اس نے انڈین اسٹائل کی کام دار سبز ساڑھی پہن رکھی تھی۔ سوئیٹ عرف ایشوریا کو میں نے آخری بار شکستہ حال جیپ میں دیکھا تھا۔ وہ لاہور کے مصافحات میں ایک ویران جگہ تھی۔ میں اور راجا ”ایشوریا“ کو جیپ میں بند کر کے لاہور چلے گئے تھے۔

آج کئی ہفتوں بعد وہ پہلی حویلی کے اس آرام دہ کمرے میں موجود تھی۔ وہ ایک نوازی پلنگ پر گاؤنچے کے سہارے نیم دراز تھی اور ٹرانز سنسر ریڈیو سے چھیڑ چھاڑ کر رہی تھی۔ دونوں

دھیمی آواز میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ زیادہ تر الفاظ میرے کانوں تک بھی پہنچ رہے تھے۔ سوئیٹ عرف ایشوریا نے ادا سے کہا۔ ”راجا! تو ایک نمبر کا فراڈیاب ہے۔ اپنے پکے سے پکے دوست کو دھوکا دے سکتا ہے۔ اب وہ کیا سوچے گا تیرے بارے میں؟“

راجا نے غالباً آنکھ مار کر کہا۔ ”سوہنو! اتے مکھوں! تہاڈے جیسی ٹیٹ چھوری کے لیے تو راجا اپنے اصلی پیو کے تمباکو میں زہر ملا سکتا ہے۔ عمو کی تو کوئی گل ہی نہیں ہے۔“

اس کے ساتھ ہی اس نے بڑے کمینے پن سے ایشوریا کے پاؤں کے انگوٹھے پر ہلکی سی دندی کاٹی۔

اس نے ”سی“ کر کے پاؤں سمیٹا اور بولی۔ ”ویسے تو نے سب کچھ بتا دیا چودھری انور صاحب کو؟“

”اوہو نہیں میری سوہنی! میں نے، کچھ نہیں بتایا اور نہ کسی کو دھوکا دیا ہے میں نے۔ دھوکا تو اس عورت رضیہ نے اور لطیف دکاندار نے دیا ہے۔ تابی ان کے گھر میں تھا۔ انہوں نے چودھرائن کے سامنے سارا پول کھول دیا تابی کا اور اس کڑی ثروت کا۔ جب پول ہی کھل گیا تھا تو پھر میں کیوں خود کو خواہ مخواہ خطرے میں ڈالتا۔ میں اس ویلے ڈیرے پر تھا۔ میں چاہتا تو یہاں سے بھاگ بھی سکتا تھا۔ لیکن یہ چودھری انور مجھے اپنے ٹائپ کا بندہ لگا ہے۔ اسے قدر بھی ہے کارگر بندے کی۔ اپنی ساری گھوڑیاں میرے سپرد کرنا چاہتا ہے اور تین بلڈاگ بھی۔ میں نے چودھری کو سب کچھ بتا دیا اور ویسے ذرا سوچ رانی! میں نے چنگا ہی کیا نا؟ میں بھی یہاں تھا اور تو بھی یہاں تھی۔ آج نہیں تو کل ہماری ملاقات ہو ہی جاتی تھی اور تو نے فنا فٹ بتا دینا تھا چودھری کو یہ تابی اور راجا ایک ہی باغ کی مولیاں ہیں۔“

وہ ادا سے مسکرائی اور بولی۔ ”ہو سکتا ہے کہ میں نہ ہی بتاتی۔ پردہ رکھ لیتی تمہارا۔“

”بس تیری انہی باتوں پر تو کلیجا نکلتا ہے میرا۔“ وہ اپنا سینہ مسل کر بولا۔

”ویسے ایک نمبر کا مطلبی حرصی ہے تو۔ اب اپنے اس یار عمو کو پکڑو اے گا؟“

”یہ سارا تیرے خسن کا لشکارا ہے میری دلبر جانی!“ اس نے ایک بار پھر ایشوریا کا گورا ہٹا پاؤں پکڑنے کی کوشش کی۔ وہ ایک دم شوخ انداز میں سٹ گئی۔

راجا ذرا سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔ ”ویسے میری رانی! یہ یاری دوستی، یہ بھائی چارہ، یہ سب بول بچن ہے۔ کوئی کسی کا یار نہیں۔ یہاں سب کو اپنی اپنی پڑی ہے۔ اب دیکھو نا اس عمو کو ہی۔ اس کو پتا بھی تھا کہ حویلی میں کوئی نہ کوئی ایسا ہوگا جو مجھے پہچان لے گا پر اس نے بھیج دیا مجھے یہاں کٹ کھانے کے لیے اور مرنے کے لیے۔ یہاں کوئی کسی کا نہیں۔“

ایشوریا ناز سے پاؤں کو حرکت دینے لگی۔ راجا نے ایک پیگ مزید چڑھایا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایشوریا کا نازک بازو پکڑ کر اسے بھی اٹھایا پھر اس کے دونوں ہاتھ پکڑ کر ہنجالی انداز میں ڈانس کی کوشش کرنے لگا۔ اس کے بھونڈے پن پر ایشوریا پہلے ہنسی رہی پھر وہ منجھے ہوئے انداز میں ٹھکے لگانے لگی۔ کبھی وہ دونوں کمرے کے اس حصے میں چلے جاتے جو میری نظروں سے اوجھل تھا، کبھی میرے سامنے آ جاتے۔ میں بالکل بے حرکت تھا۔ یہ خدشہ بھی میرے ذہن میں موجود تھا کہ کہیں ان میں سے کوئی اوپر روشن دان میں جھانک نہ لے۔ ثروت نے نیچے الماری تھام رکھی تھی۔

ناچتے ناچتے راجا نے فلمی انداز میں خود کو جھکایا اور سبک بدن ایشوریا کو اپنے دائیں کندھے پر بٹھالیا۔ ریڈیو پر بول گونج رہے تھے۔ اکھیاں ملانے نہیں۔ رونے گل پاندے نہیں۔ انیاں دے کول نہیں، بہناں چاہی دا۔ (یہ آنکھیں ملاتے ہیں، آنسو دیتے ہیں ان کے پاس آنا ہی نہیں چاہیے) راجا اسی انداز میں ناچنے کی بھونڈی کوشش کر رہا تھا۔ کچھ بھی تھا، سوئی عرف ایشوریا کا وزن تھا۔ ایک جگہ راجا کے قدم لڑکھڑائے۔ ایشوریا کو سنبھالتے سنبھالتے وہ خود بھی پلنگ پر گرا۔ اس نے ایشوریا کو اپنی بانہوں میں لے لیا اور اس کے حسین چہرے کو اپنی شرابی سانسوں سے لتھڑنے لگا۔ وہ ہنس رہی تھی اور راجا کو آگے بڑھنے سے روک رہی تھی۔ پھر وہ ہانپی ہوئی سانسوں کے ساتھ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ نقل تھی لیکن کئی زاویوں سے حیران کن حد تک اصل نظر آتی تھی۔ غالباً کڑی محنت سے اس کے جسم کو بھی فلمی "اسمارٹنیس" دے دی گئی تھی اور یہ محنت اس کے جسم پر ہی نہیں، اس کے طور اطوار اور ناز و انداز پر بھی کی گئی تھی۔ آواز کے فرق سے قطع نظر وہ کئی اعتبار سے ایشوریا رائے ہی دکھائی دیتی تھی۔

راجا اس کے قریب ہوتا جا رہا تھا۔ لیکن صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ اس کے ہاتھ آنے والا نہیں، کم از کم آج تو نہیں اسی دوران میں ایشوریا کی مشکل آسان ہو گئی۔ دروازے پر اٹک ہوئی۔ کسی نے راجا کو باہر بلا لیا۔ کچھ دیر بعد میں بھی نیچے اتر آیا۔

راجا کے بارے میں میری رائے کبھی بھی اچھی نہیں تھی۔ بھانڈیل اسٹیٹ میں جشن کی ات جب عمران نے مجھے اپنی طویل روداد سنائی تھی، اس میں بھی مجھے راجا کا کردار زیادہ بھایا نہیں تھا۔ اب بھی مجھے چند ہفتے پہلے کا وہ واقعہ بھولا نہیں تھا جب انڈسٹریل امیریا کی کونٹری میں اچانک مجھے زخمی حالت میں چھوڑ کر بڑے روکھے پن سے نکل گیا تھا۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی لوشن کامیاب نہیں ہوئی اور اسے واپس آنا پڑ گیا تھا۔ عمران کے ساتھ بھی راجا کا رویہ مخلص

اس نے پھر شراب کا طویل گھونٹ بھرا اور جب دھوتی کے پلو سے اپنے ہونٹ صاف کرنے کی کوشش کی تو اپنی ٹانگ کو دور تک نکا کر لیا۔

اس کا نشہ پختہ ہو رہا تھا۔ اس نے اپنا کرسی نما رنگین مونڈھا کھسکا کر ایشوریا کے قریب کر لیا۔ وہ اس کا ارادہ بھانپ کر سیدی ہو کر بیٹھ گئی۔ سینے پر سبز ساری کا پلو درست کرتے ہوئے بولی۔ "دیکھ راجے! وہاں جنگل میں جو ہو گیا سو ہو گیا۔ یہ چودھری انور کی حویلی ہے۔ یہاں خود کو ذرا سنبھال کر رکھ۔"

"اوئے ہیرے! تیرے سامنے کون کا فر کا پتر خود کو سنبھال کر رکھ سکتا ہے۔ سچ کہتا ہوں، جس دن سے تُو دکھری ہوئی ہے نا، رات دن تیرے بارے میں ہی سوچتا رہتا ہوں۔ ایسی ایسی باتیں سوچتا ہوں کہ تجھے پتا چل جائے نا....."

"تو جوتی اتار لوں تجھ پر۔" ایشوریا نے شوٹی سے فقرہ مکمل کیا۔

"جوتی کی بات نہ کر میرے ساتھ۔ گولی بندوق کی بات کر۔ ماری ہے تو گولی مار۔ سیدی میرے سینے میں۔ اپنی تھاں سے ذرا سا بھی ہل جاؤں تو تھوک دینا میرے مرے منہ پر۔" راجا کے لہجے میں لڑکھڑاہٹ اور نیشا پلن تھا۔

"یہ تو ساری باتیں ہیں۔ چھوٹا چودھری امجد کہتا ہے کہ کچھ کر کے دکھاؤ تو پھر ہے نا۔" "کر کے بھی دکھاؤں گا، میری بادشاہ زادی بس ایک آدھ دن میں کڑا کا نکال دوں گا اس کا۔"

سوئی عرف ایشوریا جب ہمیں پچھلی بار ملی تھی تو اس کا اردو لہجہ اتنا اچھا نہیں تھا۔ اس میں پنجابی یا شاید لاہوری جھلک نمایاں تھی، لیکن اب وہ بہتر اردو بول رہی تھی۔ غالباً اس سلسلے میں اس پر محنت کی جا رہی تھی۔ وہ بولی۔ "پر تیری ایک بات میری سمجھ میں نہیں آ رہی راجے! ہو سکتا ہے کہ کل یا پرسوں تک سلطان چٹا بھی یہاں پہنچ جائے۔ اور تُو بھاگا ہوا ہے اس کی کونٹری سے..... بلکہ تُو نے اس تابش کو بھی وہاں سے بھگایا ہوا ہے۔"

"او ہیرے! یہ ساری گل بات ہو گئی ہے چودھری انور سے۔ چودھری انور نے وعدہ کیا ہے کہ سلطان چٹے سے میری صلح کرادے گا اور ویسے بھی میں نے کون سا ایسا وڈا نقصان کیا تھا سلطان صاحب کا۔ بس معمولی سی بات تھی۔ یہاں تو وڈے وڈے زمینداروں اور چودھریوں پر بکری چوری کے مقدمے بن جاتے ہیں۔"

اس دوران میں ایشوریا رائے مسلسل ریڈیو کی ناب گھما رہی تھی۔ ایک اسٹیشن پر ایک پنجابی گا نا لگ گیا۔ اکرم راہی گا رہا تھا۔ سونیاں توں دور دور رہنا چاہی دا.....

و لیے اس کے آس پاس رہتے ہیں۔ یہ ان سے ہر طرح کے کام لیتا ہے۔ تجھے اس کا کچھ اور روپ نظر آتا ہوگا، پر اس کا روپ کچھ اور ہے۔ اب دیکھ، یہی معاملہ دیکھ۔ سالانہ خود نہیں آیا اور ہمیں گھسا دیا ہے۔ اس کا لے بھونڈوں کے چھتے میں۔ بڑے خطرناک لوگ ہیں یہ۔ بندے کو کبھی کی طرح مارتے ہیں۔“

”تو تم نے ان کو بتا دیا سب کچھ؟“

”میں نے نہیں بتایا، تمہارے اس یار لطیف اور اس کی زبانی نے بتایا ہے۔ سارا پول کھول کے رکھ دیا ان کمینوں نے اور تجھے بھی سب پتا ہے، اتنا بھولا نہ بن۔ میں نے سوچا، جو ہونا تھا ہو چکا۔ اب کیوں نہ اپنی سائیڈ بچاؤں۔ اور میں نے چنگا ہی کیا نا۔ نہیں تو شناخت تو میری بھی ہو جانی تھی۔ بال چھوٹے کرانے اور داڑھی مونچھ سے بندے کا تھو بڑا تو نہیں بدل جاتا۔ مجھے پتا تھا کہ یہاں بھی جاوے گا کوئی نہ کوئی بندہ ضرور ہوگا۔ اسے میرے تھو بڑے پر شک ضرور پڑے گا اور یہی ہوا۔ وہ جھمک چھلوا ایٹور یارائے بھی یہاں ہے۔ اس نے حویلی میں گھستے ہی مجھے پہچان لیا۔ بالکل جیسے اس دوسری کڑی نیتو نے تجھے پہچانا ہے۔“

”مجھے تو لگتا ہے کہ تم ہر جگہ ”اپنا“ کھیل شروع کر دیتے ہو راجا۔“

وہ بولا۔ ”یہاں سب اپنی اپنی کھیڈ ہی کھیڈتے ہیں بھولے بادشاہ! دیکھ میں اتنی دیر جیل میں سڑتا رہا۔ اس عمو نے پلٹ کر مجھے نہیں دیکھا۔ یہ تو ایسا کتے کا ختم ہے کہ کہیں مجھے دیکھ بھی لیتا تو نظر بچا کر نکل جاتا۔ وہ تو اتفاق سے میری تمہاری ملاقات ہو گئی اور عمو کو بھی مجھ سے ملنا پڑا۔ لیکن پھر بھی وہ اپنے ہی حساب میں رہا۔ بول..... ہا یا نہیں؟ مجھے ہوٹل میں اکیلا چھوڑ کر خود تم دونوں چلے گئے اس بابے جلالی کے پاس۔ مجھ سے چچا چھڑانا چاہتے تھے۔ وہ تو میں نے اس گندے انڈے ندیم کو پکڑا اور عمو پلٹ کر میری طرف آیا۔ میں سچ بتاتا ہوں تجھے یہاں ہر کوئی اپنی کھیڈ ہی کھیڈتا ہے۔“

میں مجھے دل کے ساتھ راجا کو دیکھتا رہا۔ وہ بولا۔ ”دیکھ تابی! میں اس کڑی کے سامنے یہ ساری گل بات کرنا نہیں چاہتا تھا پر مجبوری ہے۔ تُو نے عمو کے ساتھ مل کر نادر ٹی ٹی کے ساتھ جو کچھ کیا ہے، تجھے پتا ہے نا..... بول پتا ہے نا۔“

میں خاموش رہا۔ وہ بولا۔ ”کل کسی وقت سلطان چٹاناک سے زہر ملا دھواں چھوڑتا ہوا یہاں پہنچ جائے گا۔ نادر ٹی ٹی کے بدلے وہ پھاڑ ڈالے گا تجھے۔ اور تیرے ساتھ ”زنانہ ساتھ“ بھی ہے۔ یہ چودھری انور بھی کوئی چھوٹی موٹی بلا نہیں ہے۔ شہری کڑیوں کی تو بہت زیادہ ”بے عزتی“ خراب کرتا ہے یہ۔ اس ساری تباہی سے بچنے کا بس ایک ہی طریقہ ہے۔

دوست والا نہیں تھا۔ اب یہاں بالکل اور طرح کی صورت حال سامنے آرہی تھی۔ سو بیٹی عرف ایٹور یا نامی اس لڑکی کا کاٹنا کافی دنوں سے راجا کے دل میں چبھا ہوا تھا۔ یہاں وہ اسے پھر نظر آگئی تھی اور وہ اپنی تمام تر گندی بھوک کے ساتھ اس پر قربان ہوا جا رہا تھا۔

”یہ کون لوگ تھے؟“ ثروت نے سرگوشی میں مجھ سے پوچھا۔

”ایک تو کتوں اور گھوڑوں کا بدمعاش ٹریز ہے۔ دوسری مشہور انڈین ایکٹریس ایٹور یارائے۔“

”یعنی ایٹور یارائے کی کوئی ہم شکل؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”دونوں قص کر رہے تھے۔“

”کیا آپ جانوروں کے اس ٹریز کو جانتے ہیں۔“

”تھوڑا بہت..... سمجھو بس معمولی شناسائی ہے۔“ میں نے بات گول کی۔

”مم..... مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے تابی!“

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا، دروازے پر آہٹیں ہوئیں۔ پھر دروازہ کھلا۔ پہلے و سکی کا بچہ اندر آیا پھر راجا۔ ایک رائفل بردار نے راجا کے عقب میں کوٹھڑی کا دروازہ بند کر دیا۔

ثروت سہم کر ایک کونے میں سمٹ گئی۔ راجا کو چڑھی ہوئی تھی۔ اس کی لال لال آنکھوں میں مجھے سوراخ بال نظر آیا۔ اس نے پہلے ذریدہ نظروں سے ثروت کو گھورا پھر میرے قریب چٹائی پر پھسکڑا مار کر بیٹھ گیا کہنے لگا۔ ”تم مجھے یہاں دیکھ کر حیران ہونے لگے ہو اور میں تمہیں دیکھ کر۔ پر میں زیادہ حیران بھی نہیں ہو رہا کیونکہ مجھے پتا ہے کہ تم یہاں کیوں اور کیسے پہنچے ہو؟“

”کیا کہنا چاہ رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”ایک بڑا نیک اور چنگا مشورہ دینے آیا ہوں تجھے۔“ اس نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

وہ بولا۔ ”دیکھ..... میں تجھے اپنے دل کی گل بتاتا ہوں۔ عمو سے میری بڑی یاری رہی ہے۔ میں نے بڑا کچھ کیا ہے اس کے لیے۔ اپنی جان کی بھی پروا نہیں کی۔ پر یہ اوپر سے اور ہے اندر سے کچھ اور۔ تُو اس کا پکایا رہے نا مگر تجھے بھی اس کے بارے میں کچھ زیادہ پتا نہیں ہے۔ اس کا پورا ایک جھٹا ہے۔ کیا کہتے ہیں اس کو انگریزی میں ”گینگ“ اس کے لوگ ہر

ہم ہے۔“

”تیرا کیا اندازہ ہے، اس ویلے وہ کہاں ہوگا؟“

”میں نجوی نہیں ہوں۔“

”پر میں نجوی ہوں۔“ وہ ایک دم پھنکارا۔ ”اور میں تجھے بتا رہا ہوں تابی! اگر تُو نے ان لوگوں کو عمران کا کھوج نہ دیا نا تو یہ کڑا کے نکال دیں گے تیرے اور تیری اس معشوق کے۔ تیرے پاس سوچنے کے لیے بس سویر تک کا ویلا ہے۔“

میراجی چاہا کہ راجا پر جھپٹ پڑوں اور کم از کم اس کی گردن کا کڑا کا تو ضرور نکال دوں۔ بعد میں جو کچھ بھی ہو، دیکھا جائے گا لیکن پھر خود پر ضبط کرنا پڑا۔ میرے ساتھ ثروت تھی اور مجھے اپنے سے پہلے اس کے بارے میں سوچنا تھا۔

لگتا تھا کہ باہر گرج چمک کے ساتھ بارش شروع ہو چکی ہے۔ گیلی مٹی کی خوشبو نتھنوں تک پہنچ رہی تھی اور اس کے ساتھ کسی وقت بادلوں کی گرج بھی سنائی دیتی تھی۔ مچھلی، پکڑوں اور روسٹ چکن کی خوشبو ساری حویلی میں پھیلی ہوئی تھی۔ رات کے قریب آدس بج چکے تھے۔ راجا اپنی جگہ سے اُٹھتے ہوئے بولا۔ ”تابی باؤ! یہ ویلا بڑا قیمتی ہے تیرے لیے۔ پھر بچھتانے کا موقع بھی نہیں ملے گا۔ میں دو تین گھنٹے بعد پھر آؤں گا۔ تب تک کچھ ہو رہا ہے اور اپنی اس ”زنانی“ سے بھی مشورہ کر لے جس نے خود اپنی گردن پھنسنائی ہے اس شکنجے میں۔ زیادہ مصیبت تو اس کی گوری چڑی پر ہی آئی ہے نا۔“

میں راجا کو کیسے بتاتا۔ ثروت کی طرف کوئی آنکھ اٹھا کر نہیں دیکھ سکتا۔ کسی کو اتنی جرأت نہیں تھی کہ وہ ثروت کو غلط نیت سے چھوٹا بھی۔ اس سے پہلے ایک قیامت برپا ہونا تھی۔ ایک ایسا طوفان اُٹھنا تھا جس کے بارے میں اس حویلی کے چودھری سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ کچھ ایسا یقین تھا میرے اندر..... ایسا والہانہ بھروسہ جس نے مجھے پہاڑ کی طرح بلند اور مضبوط کر دیا تھا۔ میری خواہش تھی، بس میرے ہاتھ میں ثروت کا ہاتھ ہو۔ پھر جس جس آفت نے میرا راستہ روکنا ہے، وہ میرے سامنے آجائے اور میں اس کے پرچے اڑا دوں۔

میں راجا سے یوسف فاروقی کے بارے میں کچھ سن گن لینا چاہتا تھا مگر آخر میں اس نے ایسی بد زبانی کی تھی کہ میں نے اس سے بات کرنا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ الکل کی بدبو سمیت باہر نکل گیا اور کوٹھڑی کا دروازہ پھر سے مقفل ہو گیا۔ باڑے کی طرف سے کتوں کا شور سنائی دے رہا تھا۔ میں نے چوبی دروازے کی باریک مہین درز سے آنکھ لگا کر باہر جھانکنے کی کوشش کی۔ کافی دیر بعد ایک شہری لباس والی لڑکی نظر آئی۔ وہ اپنے ہاتھوں میں فروٹ سے

عمو کا خیال چھوڑ دے۔ اپنے بارے میں سوچ۔“

”کیا سوچوں؟“ میں نے اس کی سرخ آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا، باہر سے کسی عورت کے زور زور سے بولنے کی آوازیں آنے لگیں۔ دراصل یہ دو عورتیں تھیں جو آپس میں بُری طرح جھگڑ رہی تھیں۔ بول چال سے دونوں پڑھی لکھی لگتی تھیں، وہ ایک دوسرے کو کوس رہی تھیں۔

راجا نے کہا۔ ”یہ دونوں شہری زنانیاں ہیں چودھری انور صاحب کی۔ ایک تو بالکل نئی آئی ہے۔ سوئیں ہیں۔ لڑیں گی نہیں تو اور کیا کریں گی۔“

پھر ایک دم ایک عورت چلانے لگی۔ ساتھ ہی چودھری انور کی گرج دار آواز بھی سنائی دی۔ پتا چلا کہ وہ ایک بیوی کو پیٹ رہا ہے۔ یقیناً یہ بُرائی بیوی تھی۔ وہ اسے گالیاں بھی دے رہا تھا۔ اس کی قہرناک آواز اُبھری۔ ”کتے کی بچی، طلاق مانگتی ہے۔ لے لے طلاق..... کل کی لیتی آج ہی لے لے..... ابھی لے لے۔ پر پہلے وہ بیچ لاکھ روپیہ دے دے جو تیرے بھکے ننگے پیو نے اپنی بیماری پر لگایا ہے۔“

عورت نے جواب میں کچھ کہا۔ چودھری نے اسے مزید مارا۔ پھر شاید وڈی چودھرائن یعنی پہلی بیوی نے اس کی جان بچائی۔ ثروت بھی خوف زدہ سی یہ سب کچھ سن رہی تھی۔ راجا مسکرایا۔ ”ایسے کنڈم تماشے ان حویلوں میں روز ہی ہوتے ہیں۔ چھڈ ان کو۔ تُو اپنے بارے میں سوچ۔“

”پوچھ تو رہا ہوں کہ کیا سوچوں؟“

”سچ بتا..... موبائل کہاں ہے تیرا؟“

”میں نے چودھری کے بندوں کو بتایا ہے، مجھے کچھ پتا نہیں۔ یہاں حویلی آتے ہوئے راستے میں ہی کہیں گرا ہے۔“

”یہ لوگ سب ڈھونڈ کر آئے ہیں۔ چپا چپا دیکھا ہے۔“

”کسی نے اٹھا لیا ہوگا۔“

”اور اس کڑی کا کہاں ہے؟“ راجا کا اشارہ ثروت کی طرف تھا۔

”یہ لائی ہی نہیں تھی۔“ میں نے کہا۔

راجا نے اپنی چھوٹی چھوٹی بدبودار داڑھی کھجائی۔ ”اچھا..... یہ عموفون کیوں نہیں اٹھا رہا؟“

”کل میں خود بھی کرتا رہا ہوں۔ بہت دفعہ کوشش کی۔ اس نے نہیں اٹھایا۔ پتا نہیں کیا

بھری ہوئی ٹرے اٹھائے گزری۔ دو تین منٹ بعد دو اور آدمی گزرے۔ ان میں سے ایک کو دیکھ کر میں بُری طرح چونکا۔ یہ یوسف فاروقی تھا۔ اس کی ٹانگ کا زخم اب غالباً ٹھیک تھا۔ معمولی لنگڑا ہٹ کے سوا اسے کوئی مسئلہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ تاہم اس کا چہرہ زرد اور مرجھایا ہوا سا نظر آ رہا تھا۔ وہ بس ایک یا دو سینڈ کے لیے میری نظروں کے سامنے رہا پھر آگے نکل گیا۔ اب یہ بات کفرم ہو گئی تھی کہ وہ جس کی تلاش میں ہم مارے مارے پھر رہے ہیں، یہیں پر موجود ہے۔ میں نے فی الحال ثروت کو پوسٹ کے بارے میں بتانا مناسب نہیں سمجھا، وہ جذباتی ہو سکتی تھی۔ باہر موسم مسلسل اُبر آلود تھا۔ کسی وقت گرج چمک بھی ہونے لگتی تھی۔ میں اور ثروت دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے رہے۔ ثروت اب بالکل گم صم تھی۔ انجانے اندیشے اس کے چہرے پر گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ مجھے لگا کہ اس کے کانوں میں شاید وہی سائیکل کے کہے الفاظ گونج رہے ہیں۔ اس نے کالی پر چھائیوں کا ذکر کیا تھا اور ان سنگین ترین حالات کا ذکر کیا تھا جن کا اختتام کسی قبرستان میں ہو سکتا تھا۔ تو کیا کوئی مرنے والا تھا؟ کون مرنے والا تھا اور کس طرح؟

ہمارے ارد گرد نقل و حرکت کی آوازیں اب معوم ہوتی جا رہی تھیں، کھانا کھالیا گیا تھا۔ برتن سیٹے جا چکے تھے، حقے بھی گڑ گڑائے جا چکے تھے۔ اب حویلی کے کین شاید سونے کی تیاری میں تھے۔ مسلسل روتے ہوئے بچے کی ریں ریں بھی اب ختم ہو چکی تھی۔ کسی کمرے میں بجتا ہوا ریڈیو خاموش ہو گیا۔ ارد گرد کی لائٹس گل ہو گئیں۔ پارہ بج چکے تھے۔ راجا نے کہا تھا کہ وہ پھر آئے گا لیکن وہ نہیں آیا۔ شاید اس نے زیادہ پی لی تھی۔ پھر یقیناً مرغن کھانے کی خماری بھی ہوگی۔ ہو سکتا تھا کہ وہ کہیں پڑا سو رہا ہو اور اب سورج طلوع ہونے سے پہلے آنکھ نہ کھولے۔

مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ چودھری انور وغیرہ سوئی عرف الیٹوریا کے ذریعے راجا کو اپنے ہاتھ میں رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ وہ عمران کو پھنسانے میں ان کی مدد کرے۔ چودھریوں کو تو عمران سے کوئی دشمنی نہیں تھی، یقیناً وہ سلطان چنے کی خواہش کے احترام میں یہ سب کچھ کر رہے تھے۔

ڈیڑھ دو بجے تک حویلی میں مکمل سکوت ہو گیا۔ بس کسی قریبی کمرے سے کسی کے کراہنے کی مدھم آواز آتی رہی، یہ یقیناً کرشمہ پور ہی تھی۔ غالباً درد کے سبب اسے نیند نہیں آ رہی تھی۔ وہ کسی وقت اُٹھ کر ٹہلنے بھی لگتی تھی۔ اس کے ٹہلنے کا ثبوت ”واکنگ اسٹک“ کی ہلکی ٹھک ٹھک تھی۔

گھڑی کی سوئیاں آگے کو سرکتی رہیں۔ وہ رات کے دو ڈھائی بجے کا عمل تھا۔ اب حویلی میں مکمل سکوت تھا۔ اس سکوت کو بس کسی وقت رکھوالی کے کتوں کی مدھم آواز ہی توڑتی تھی۔ ”آئندہ کیا ہوتا ہے؟“ ہم دونوں کے ذہنوں میں بس یہی ایک سوال گڑا ہوا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کیا کسی طرح عمران کو خبر ہو سکے گی کہ یہاں ہمارے ساتھ کیا ہوا ہے اور راجا نے کس کمینگی سے اپنی وفاداریاں بدلی ہیں؟ میرے ذہن میں بار بار اس سیل فون کا خیال بھی آ رہا تھا جو میں لطیف کی دکان کے اندر دل کی بوری میں گھسا آیا تھا۔ اتفاقاً فون آن نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ دو چار دن تک ویسے ہی بوری میں پڑا رہتا مگر یہ بھی ممکن تھا کہ وہ کل لطیف کی نظر میں آ جاتا اور وہ اسے آن کر کے عمران یا پھر اقبال وغیرہ سے رابطہ کر پاتا۔ مگر جس طرح کے حالات ہو گئے تھے یا اس کی بیوی نے کر دیئے تھے، یہ امکان نہیں تھا کہ لطیف کسی طرح کا رسک لے گا۔ ہو سکتا تھا کہ وہ فون ویسے ہی کسی جوہڑ میں پھینک دیتا۔

اچانک دروازے پر مدھم آہٹ سنائی دی۔ کسی نے ہولے سے قفل کھولا اور دروازے کا ایک پٹ وا کیا۔ مجھے راجا کی صورت نظر آئی۔ اس نے فوراً ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میرے دل میں اُمید کی کرن جاگی۔ راجا کا رویہ بدلا ہوا نظر آتا تھا۔ اس نے سر کے اشارے سے مجھے اور ثروت کو باہر آنے کا کہا۔

میں چند سینڈ کے لیے تذبذب میں رہا۔ یہ اس کی کوئی چال تو نہیں تھی؟ جب اس نے دوبارہ سر کو حرکت دی تو میں اُٹھ کھڑا ہوا اور اپنے ساتھ ثروت کو بھی اٹھالیا۔ ثروت کے جسم میں ہلکی سی لرزش تھی۔ ”آ جاؤ“ راجا نے سرسراتی سرگوشی کی۔

میں نے گرگابی پہنی۔ ثروت کے پاؤں میں پہلے ہی چپل موجود تھی۔ ہم راجا کے پیچھے کوٹھڑی سے باہر آ گئے۔ راجا کے ہاتھ میں ایک دیسی ساخت کا پستول نظر آ رہا تھا۔ وہ ہمیں اپنے ساتھ بڑی احتیاط سے چلاتا ہوا ایک برآمدے میں پہنچا۔ یہاں بلب روشن تھا۔ ایک قریبی کمرے کے ادھ کھلے دروازے سے خراٹوں کی مدھم آواز آرہی تھی۔ راجا نے میرے کان میں سرگوشی کی۔ ”یہ وڈی چودھرائن سورہی ہے۔ آرام سے گزرتا ہوگا۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ ہم دبے پاؤں دروازے کے سامنے سے گزرے۔ برآمدے میں روشن بلب کی کچھ روشنی اندر کمرے میں بھی پہنچ رہی تھی۔ نجم شمیم چودھرائی پھیل کر پلنگ پر سو رہی تھی۔ یہ کافی بڑا چینیٹی پلنگ تھا مگر چودھرائی کے نیچے مختصر محسوس ہوتا تھا۔ پلنگ کے ساتھ ہی چینیٹی طرز کی سائیز نیبل بھی تھی۔ اس پر دو انگوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ یقیناً یہ چودھرائن کی ہوں گی۔ چودھرائن کے جسم پر طلائی کڑوں کے سوا کوئی اور گہنا بھی نظر نہیں آ

رہا تھا۔ ظاہر ہے کہ سونے سے پہلے اس نے یہ گہنے اتار دیئے ہوں گے۔
راجا ایک لمحے کے لیے ٹھنکا۔ پھر ہمیں خاموش رہنے کا اشارہ کرتے ہوئے دبے پاؤں
کمرے میں پہنچا۔ اس نے دونوں انگوٹھیاں اٹھائیں۔ بڑی احتیاط سے سائیز نیبل کی اوپر
والی دراز کھولی۔ اس میں چودھراؤ کے بھاری جھمکے اور وزنی کینٹھا موجود تھا۔ راجا نے بڑی
چابک دستی سے یہ ساری چیزیں ایک رومال میں ڈالیں اور بلی کی چال چلتا ہوا باہر آ گیا۔
یقیناً وہ مضبوط اعصاب کا مالک شخص تھا اور اس کا لالچ بھی اس کے اعصاب ہی کی طرح ٹکڑا
تھا۔

ہم ایک بار پھر راجا کے پیچھے چلتے ہوئے بیرونی دروازے کی طرف بڑھے۔ میں نے
اپنا ازار بند بہت کس کر نہیں باندھا تھا۔ بوقت ضرورت ایک سیکنڈ کے اندر میں اپنا شاندار چاقو
اپنے ہاتھ میں کر سکتا تھا۔ اندرونی عمارت سے باہر نکلنے کے لیے ہمیں ایک اور کمرے کے
اندر سے دبے پاؤں گزرنا پڑا۔ میں ٹھنک گیا۔ یہاں پختہ فرش پر نیتو عرف کرشمہ کپور بے
سدھ پڑی تھی۔ وہ اونڈھی تھی اور ایک ٹانگ عجیب انداز میں مڑی ہوئی تھی۔ ”کیا ہوا ہے؟“
میں نے راجا کے کان میں سرگوشی کی۔

”بے ہوش ہو گئی ہے۔ خانہ خراب جاگ رہی تھی۔ اس نے مجھے تاڑ لیا۔ میرے پیچھے
آئی۔ میں نے پھڑ لیا۔ رولا ڈالنا (شور مچانا) چاہتی تھی، میں نے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ بڑی
ڈھیٹ ہڈی نکلی۔ آخر تک تھ پیر چلاتی رہی۔“

میں نے جھک کر غور سے کرشمہ کپور کو دیکھا۔ وہ بیہوش نہیں تھی۔ مرچکی تھی۔ اس کی
آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ مرچکی ہے۔ میں نے اس کی حلام گردن پر ہاتھ رکھا۔ نبض کہیں نہیں
تھی۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر راجا کی طرف دیکھا۔ وہ سمجھ گیا کہ میں کیا کہنا چاہتا
ہوں۔ بہر حال ثروت کے سامنے ہم نے کسی طرح کا تبصرہ مناسب نہیں سمجھا۔ اس کا پہلے ہی
بڑا حال تھا۔ وہ بیچاری تو یہ سمجھ کر لاہور سے چلی تھی کہ سیدھی احمد تھانوی صاحب کے پاس پہنچے
گی اور انہیں اپنا دکھڑا سناے گی۔ وہ اس کو تسلی دے کر سب کچھ سنبھال لیں گے اور پولیس
میں موجودان کے مرید ایک آدھ روز میں یوسف کو ڈھونڈ نکالیں گے۔ مگر یہاں جو کچھ ہو رہا
تھا، وہ ثروت کے سان گمان میں بھی نہیں تھا۔

ہم راجا کے پیچھے چلتے ہوئے اندرونی دروازے سے نکلے اور حویلی کے احاطے میں آ
گئے۔ کرشمہ کپور کی اچانک موت نے میری دھڑکنیں زیر و زبر کر دی تھیں۔ مجھے یہ سمجھنے میں
دشواری نہیں ہوئی کہ زیادہ دیر تک دم گھٹا رہنے کی وجہ سے نیتو عرف کرشمہ کی موت ہوئی ہے۔

وہ سو فیصد مرچکی تھی۔ شاید یہ زبردستی ”دعائے خیر“ کرانے کا نتیجہ تھا۔ ہم احاطے سے
گزرے۔ بیرونی پھانک کے پاس ”مالٹے“ کے پودوں میں ایک چوکیدار رسیوں سے بندھا
پڑا تھا۔ اس کے منہ میں ایک کپڑا بڑے اچھے طریقے سے ٹھونس دیا گیا تھا۔ وہ حرکت کر سکتا تھا
نہ آواز نکال سکتا تھا۔ اس کے سر سے خون کا کچھ رساؤ بھی نظر آ رہا تھا۔ لگتا تھا کہ ہمیں کوٹھڑی
سے نکالنے سے پہلے راجا نے خاصا ”ہوم ورک“ کیا ہے۔ اسی سنگین ہوم ورک میں کرشمہ کپور
کی جان بھی گئی تھی۔ راجا کے حوالے سے میں ابھی تک متذبذب میں تھا، اس بندے کی کچھ
سمجھ نہیں آ رہی تھی۔

جونہی ہم پھانک سے باہر نکلے، رکھوالی کے دو کتے جارحانہ انداز میں ہماری طرف
لپکے۔ یہ بھاری تھو بڑوں والے بلڈاگ تھے۔ ثروت کراہ کر میرے بازو سے لپٹ گئی۔ تب
میں نے دیکھا کہ راجا گھٹنے زمین پر ٹیک کر بیٹھ گیا۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ بار بار زمین پر
مارے اور منہ سے سچ سچ کی آوازیں نکالیں۔ حیرت انگیز طور پر کتوں کا اشتعال کم ہو گیا۔ شاید
وہ راجا سے مانوس ہو چکے تھے۔ دونوں کتے بے قراری سے اس کے گرد چکرانے لگے۔ اس
کی ٹانگوں میں اپنے منہ گھسانے لگے۔ راجا تیز سرگوشی میں بولا۔ ”تابی! اس سامنے والی
گاڑی میں بیٹھو۔ چابی اندر ہی ہے لیکن تم نے انجن اشارٹ نہیں کرنا۔“

میں نے راجا کی ہدایت پر عمل کیا اور ثروت کو لے کر چند میٹر دور کھڑی جیپ میں بیٹھ
گیا۔ یہ کھلی چھت کی جیپ تھی۔ اس میں سے کچی مچھلی کی بو آرہی تھی۔ غالباً شام کو حویلی میں
جو مچھلی پکائی گئی تھی، وہ اسی جیپ میں آئی تھی۔ جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھنے کے بعد میں
سمجھ گیا کہ راجا نے انجن اشارٹ نہ کرنے کا کیوں کہا ہے۔ جیپ ایک کچی ڈھلوان پر کھڑی
تھی۔ یہ ڈھلوان ساٹھ ستر میٹر آگے تک چلی گئی تھی۔

کتوں کو رام کرنے کے بعد راجا بھاگتا ہوا جیپ کی طرف آیا۔ اس نے جیپ کو ذرا سا
دھکا لگایا تو وہ ڈھلوان پر آگئی اور لڑھکتا شروع ہو گئی۔ راجا بھی کود کر میرے ساتھ آ بیٹھا۔
ثروت پچھلی نشست پر تھی۔ جیپ ڈھلوان پر لڑھکتی چلی گئی۔ ڈھلوان ختم ہونے کے بعد بھی وہ
کافی دور تک اپنے ہمارے میں آگے بڑھتی گئی۔

پھر میں نے انجن اشارٹ کیا اور ہیڈ لائٹس جلائے بغیر آگے بڑھنے لگا۔ ”کیسا میٹ
کام ہوا ہے؟“ وہ جوش سے بولا۔ ”دیکھو ایک گولی نہیں چلی اور ہم حویلی سے باہر ہیں۔“
”لیکن کرشمہ کپور تو گئی نا۔“ میں نے ہولے سے کہا۔

”بس اس کی آئی ہوئی تھی۔ میں نے اس کا منہ دبانے کے سوا اور کچھ نہیں کیا اور وہ بھی

اور پھر وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا۔ سب سے پہلے ثروت کو ہی اس کا علم ہوا۔ وہ لرزاں آواز میں بولی۔ ”دیکھیں کوئی آرہا ہے۔“

میں نے غور کیا۔ حویلی کی طرف سے کسی گاڑی کی دوا چھلتی کودتی روشنیاں ہماری طرف بڑھ رہی تھیں، دیکھتے ہی دیکھتے ان میں پانچ چھ روشنیاں مزید شامل ہو گئیں۔ وہ لوگ آگاہ ہو چکے تھے۔ اسی دوران میں راجا نے جیب کے نشستوں کی نیچے سے ایک شاندار ایل ایم جی ڈھونڈ نکالی تھی۔ شاید اسے پہلے سے اس گن کا علم تھا۔ وہ یہ لوڈنگن میری طرف پھینکتے ہوئے بولا۔ ”یہ لو۔ ضرورت پڑے تو گولی چلاؤ۔ میرا خیال ہے کہ میں دو تین منٹ میں اسے چاکر کر لوں گا۔“ اس کا اشارہ انجن کی طرف تھا۔

اس نے نارچ اپنے منہ میں ڈال لی اور تن دہی سے انجن پر جھک گیا۔ حویلی سے نکلنے والی روشنیاں تین حصوں میں تقسیم ہو گئیں اور ہچکولے کھاتی ہوئی مختلف اطراف میں بڑھیں۔ دور روشنیاں سیدھا ہماری طرف آئیں۔ میں نے وحشت زدہ ثروت کو گاڑی کی اوٹ میں بٹھا دیا اور خود اس کے پہلو میں پوزیشن لے لی۔

ہماری طرف آنے والی ایک لوڈر نما گاڑی تھی۔ میں نے دور ہی سے دیکھ لیا۔ اس پر سات آٹھ افراد موجود تھے۔ وہ سب کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے ساتھ ساتھ دو تین یو گیر کتے شور مچاتے آرہے تھے۔ ہماری خراب گاڑی کو دیکھنے کے بعد انہوں نے لوڈر کچھ فاصلے پر ہی درختوں کے درمیان روک لیا۔ میں نے ایک ہوائی فائر کیا تاکہ وہ سمجھ جائیں کہ ہمارے پاس ہتھیار موجود ہیں۔

اس ہوائی فائر کے جواب میں چند سیکنڈ بعد ہم پر سیدھا فائر ہوا۔ یہ فائر جیب کی آہنی باڈی میں کہیں لگا۔ اس کے بعد دو طرفہ گولیاں چلنے لگیں۔ قریباً ایک منٹ بعد میں نے ایک کامیاب نشانہ لگایا اور لوڈر کا اگلا فائر برست کر دیا۔ ثروت کے لیے یہ چویشن بالکل اُن دیکھی اور وحشت ناک تھی۔ اس کا سانس جیسے سینے میں اٹکا ہوا تھا۔ سر گھٹنوں میں دے کر اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں اور گاڑی کے پیسے کے پیچھے بالکل سمٹ سنا گئی تھی۔

دوسری طرف سے دو تین رائفلوں کا فائر آرہا تھا لیکن یہ سنگل فائر تھا۔ اندازہ ہوتا تھا کہ ان لوگوں کے پاس کوئی آٹو میٹک رائفل نہیں ہے۔ فائرنگ شروع ہوئے دو منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ راجا نے نعرہ لگایا۔ ”ہو گئی“ اس کے ساتھ ہی وہ جھک کر آگے بڑھا اور ڈائریکٹ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ جیب اشارت ہو گئی۔ غالباً راجا نے اسے ڈائریکٹ کر دیا تھا۔ اس نے ہمیں جیب پر بلا لیا۔ میں نے چھوٹے چھوٹے دو تین برست فائر کیے۔ ایک بو گیر کتا

اس لیے دبایا تھا کہ وہ بس تڑپتی ہی جا رہی تھی۔“ میں نے کہا۔ ”وہاں حویلی میں تو تو نے عمران کے بارے میں بڑی کڑوی باتیں کہیں۔“

”وہ اس لیے کہ کوٹھڑی کے آسے پاسے چودھری کے بندے موجود تھے۔ وہ اندر کی آوازیں سن سکتے تھے۔ پر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں نے عمو کے بارے میں جھوٹی باتیں کہیں۔ میں نے جو کہا وہ تقریباً سچ ہی تھا۔ وہ کمینہ ایسا ہی ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی تو سچ مچ بڑا زہر چڑھتا ہے اس پر..... لیکن کچھ بھی ہے، جیسا بھی ہے، خبیث اپنا یا تو ہے۔“

”چالی کہاں سے ملی تھے کوٹھڑی کی؟“

”اوئے..... خود اس شہدے چودھری نے دی تھی۔“ راجا نے مڑ کر حویلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ حویلی اندھیرے میں گم ہوئی جا رہی تھی۔

”مڑ مڑ کر کیا دیکھ رہے ہو۔ وہ الیٹور یا رائے کی شکل والی تو یاد نہیں آرہی؟“

”اوئے..... زن مرید نہیں ہوں میں۔ وہ سؤردی بچی چنگی تو لگتی ہے پراتنی بھی نہیں کہ اس کے لیے اس کمینے عمو سے دغا کر جاؤں۔“

اچانک گاڑی کو دو تین جھٹکے لگے اور وہ رُک گئی۔ ”بیزا غرق..... یہ کیا ہوا؟“ راجا نے کہا۔

”کہیں تیل تو ختم نہیں ہو گیا؟“

”نہیں یا ر! تیل تو چنگا بھلا ہے۔“ اس نے میٹر کی طرف اشارہ کیا۔

”پھر کیا موت پڑ گئی ہے اس کو؟“

”یہ جس طرح جھٹکے کھا کر رُک رہا ہے، مجھے لگتا ہے کوئی چور سوچ ہے اس کے اندر..... انجن کے اندر جو تیل ہوتا ہے، وہ ختم ہو جاتا ہے تو گمڈی رُک جاتی ہے۔“

مجھے لگا راجا ٹھیک ہی کہہ رہا ہے۔ اس نے ڈیش بورڈ میں سے ایک نارچ نکالی اور جیب کا بوٹ کھول کر چیک کرنے لگا۔ وہ ان کاموں میں ماہر لگتا تھا۔ انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی سے فرار ہوتے وقت اس نے جیب کو جس طرح خراب اور پھر ٹھیک کرنے کا ڈراما کیا تھا، وہ مجھے اچھی طرح یاد تھا، لیکن یہاں تو سچ مچ کوئی خرابی پیدا ہو گئی تھی۔ یہ بڑی مخدوش صورت حال تھی۔ پہلی حویلی میں کسی بھی لمحے ہمارا بھانڈا پھوٹ سکتا تھا اور موت کے ہر کارے ہمارے پیچھے دوڑ لگا سکتے تھے۔ ہم تینوں بار بار حویلی کی جانب دیکھ رہے تھے۔ دور تارکی میں بس اس کی دو بیرونی روشنیاں ہی دکھائی پڑتی تھیں۔

کربناک آواز میں چلا کر ناموش ہو گیا۔ حملہ آور تتر بتر ہو کر جھاڑیوں میں جا چھپے تھے۔ شاید انہیں ہماری طرف سے ایسی شدید مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ ایل ایم جی نے ان کے ہوش اڑا دیئے تھے۔ میں نے ثروت کے کان میں تیز سرگوشی کی۔ ”سریںچے رکھو اور بھجلی سیٹ پر لیٹ جاؤ۔ اٹھنے کی کوشش نہ کرنا، چاہے کچھ بھی ہو جائے۔“

اس نے لرزتی آواز میں ”اچھا جی“ کہا اور میری ہدایت پر عمل کیا۔ اس دوران میں راجا نے اپنے دیسی ساختہ پستول سے تین چار فائر کیے اور میں نے بھی دو گولیاں چلائیں۔ تب میں بھی جھک کر گاڑی میں بیٹھا اور نشست پر نیم دراز سا ہو گیا۔ راجا نے ایک جھٹکے سے جیب آگے بڑھادی۔ راجا کی حرکات و سکنات میں بلا کی پھرتی تھی۔ وہ اپنے اعصاب پر بھی غیر معمولی کنٹرول رکھتا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ اس قسم کے حالات میں وہ بہترین ساتھی ثابت ہو سکتا ہے۔ جیب کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح حرکت میں آئی۔ راستہ اونچا نیچا تھا۔ پچاس ساٹھ فٹ آگے جا کر وہ بڑی طرح اُچھلی۔ سامنے ڈیش بورڈ پر رکھی ہوئی کوئی شے اُچھل کر باہر گر گئی۔ یہ وہ رومال تھا جس میں راجا نے دُئی چودھرائن کے قیمتی گہنے باندھے تھے۔

راجا نے بریک لگا دیئے۔

”کیا کرتے ہو؟“ میں چلا یا اور راجا کا بازو تھام لیا۔

”یار! ایک سیکنڈ۔“ وہ بولا۔

”خدا کا خوف کر راجا۔“ میں نے کہا۔

”اوئے کچھ نہیں ہوتا۔“ اس نے کہا اور بازو چھڑا کر گہنوں کی طرف بڑھا جو ایک ڈھلوان پر لڑھک کر آٹھ دس فٹ نیچے چلے گئے تھے۔

”راجا۔“ میں نے پھر پکارا۔

مگر اس کی آنکھوں میں لالچ کی پٹی بندھی ہوئی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ وہ ایک سیکنڈ میں واپس ڈرائیونگ سیٹ پر آجائے گا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ یہ ایک سیکنڈ کا فاصلہ کبھی طے نہیں ہوگا۔ جونہی اس نے جھک کر رومال اٹھایا۔ فائر ہوا اور گولی راجا کے عین سینے میں لگی۔ وہ لڑکھڑا کر پہلو کے بل گرا۔

میں نے لوڈر کی طرف اندھا دھند ایک برسٹ چلایا اور راجا کی طرف بڑھنا چاہا لیکن اسی وقت ایک اور فائر ہوا۔ گولی راجا کی گردن کو چیرتی ہوئی نکل گئی۔ لوڈر کی ہیڈ لائٹس میں مجھے یہ سب کچھ واضح دکھائی دیا۔ میں نے بے تاب ہو کر نیچے اترنا چاہا مگر ثروت نے بڑی

مضبوطی سے میرا بازو تھام لیا۔ ”نہیں تابش“ وہ چلائی۔ اس کے لہجے میں بے پناہ خوف تھا۔ وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ میں کھسک کر ڈرائیونگ سیٹ پر آیا۔ نیچے جھکے جھکے میں نے کلچ دبا کر گیسز لگایا اور جیب آگے بڑھادی۔ دو تین گولیاں پھر جیب سے نکرائیں مگر؟ میں کوئی نقصان پہنچانے میں ناکام رہیں۔ لوڈر کا ٹائر چونکہ برسٹ تھا اس لیے وہ ہمارے پیچھے نہیں آ سکتا تھا۔ میں اس کھلی چھت والی جیب کو دوڑاتا چلا گیا۔ میں نے اب جیب کی ہیڈ لائٹس آن کر لی تھیں۔ وہ تھوہر اور جنتر کی جھاڑیوں کے درمیان اونچے نیچے راستوں پر بھاگتی چلی جا رہی تھی۔ ثروت، نشست پھلانگ کر میرے پہلو میں آگئی تھی۔ راجا کے ساتھ جو کچھ ہوا، وہ اتنا آنا فانا اور غیر متوقع تھا کہ میں سکتہ زدہ سا رہ گیا تھا۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ اب ہمارے درمیان نہیں ہے۔ اس میں شک کی گنجائش بہت کم تھی کہ وہ مر چکا ہے۔ پہلی گولی سینے میں بائیں طرف لگی تھی۔ دوسری یقیناً اس کی شہ رگ چیر کر نکل گئی تھی اور یہی شخص چند گھنٹے پہلے اکرم راہی کا گاناسن رہا تھا اور سو بیٹی عرف ایشوریا کو کندھے پر بٹھا کر ناچ رہا تھا۔ ثروت مسلسل سسک رہی تھی لیکن اس نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی۔ میں بھی راجا کا تصور ذہن سے نکالنے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔

ہمیں ٹھیک سے پتا نہیں تھا کہ ہمارا رخ کس طرف ہے۔ ہم بس حویلی اور حویلی والوں سے دور نکلنے کی کوشش کر رہے تھے۔ بارش نہیں ہو رہی تھی مگر گرج چمک جاری تھی۔ کسی وقت آسمانی بجلی کا جھماکا ہوتا تو قرب و جوار روشن ہو جاتے۔ اس کے بعد پھر گہری تاریکی پھیل جاتی۔ اس تاریکی میں کبھی کبھی دور کہیں جگنو سے چمکتے نظر آتے تھے۔ یقیناً یہ وہ لوگ تھے جو موت کے ہرکارے بن کر ہمارے پیچھے آرہے تھے۔ ہارون آباد کے ہوٹل میں سائیں لڑکے نے کہا تھا۔ تمہارے گرد موت کی پرچھائیاں ہیں اور اس نے قبروں والی منخوس بات بھی کی تھی۔ اس کے فقرے میری سماعت میں ایک مسلسل گونج بن کر رہ گئے تھے۔ میں موت سے ڈرتا نہیں تھا لیکن اس وقت مجھے موت کے بارے میں سوچنا بالکل اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ کیونکہ میں اکیلا نہیں تھا، میرے ساتھ ثروت بھی تھی۔



”فی الحال تو بس چلتے جانا ہے۔ اللہ کرے کہیں کوئی آبادی نظر آجائے۔“

دائیں طرف چپکنے والی روشنیاں ہمارے قریب آتی جا رہی تھیں۔ ثروت نے بھی اس تبدیلی کو محسوس کر لیا تھا اور یقیناً یہ تبدیلی اسے مزید ہراساں کر رہی تھی۔ ایک بگدا چانک جیپ پھسلی اور اس کا اگلا ٹائر کھڑے میں چلا گیا۔ ثروت لڑھک کر اسٹیرنگ ڈنیل کے اوپر مری۔ میرے گھٹنوں پر بھی ہلکی چوٹ آئی۔ اگلے دو تین منٹ میں، میں نے جیپ کو اس جگہ سے نکالنے کی کافی کوشش کی مگر کامیابی نہیں ہوئی بلکہ یوں لگا کہ اس کا پیہر زیادہ اندر دھنس گیا ہے۔ دائیں طرف چپکنے والی روشنیاں مزید قریب آ گئی تھیں۔ مجھے اندازہ ہو رہا تھا کہ گاڑیوں کے علاوہ کچھ گھڑسوار بھی ہمارے پیچھے ہیں۔ لطیف نے بتایا تھا کہ یہ لوگ تیز رفتار گھوڑیاں پالتے ہیں اور پورے علاقے میں دندناتے ہیں۔ اب جیپ جھوڑنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ میں نے ایمونیشن والا تھیلا اٹھایا نارچ لی اور ایل ایم جی کندھے سے لٹکالی۔ ثروت کا ہاتھ تمام کر میں کیکر کے درختوں اور جنتر کی جھاڑیوں میں دوڑتا چلا گیا۔

بارش کی بوندیں پتوں سے چھن چھن کر ہمیں بھگور رہی تھیں۔ زمین گوربتلی تھی پھر بھی کہیں کہیں کافی پھسلن موجود تھی۔ مجھے گاہے بگاہے ایک یا دو سیکنڈ کے لیے نارچ بھی روشن کرنا پڑ رہی تھی۔ ثروت بری طرح ہانپ رہی تھی۔ اس نے جیسے سب کچھ میرے اوپر جھوڑ دیا تھا۔ اپنا ہاتھ میرے حوالے کر دیا تھا اور میرے ساتھ کھینچی چلی جا رہی تھی۔

ایک جگہ مجھے لگا کہ وہ بے دم ہو کر گر جائے گی۔ میں نے اسے بٹھا دیا اور خود بھی ایک تاور کیکر سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ثروت کی سانسیں سینے میں نہیں سمار رہی تھیں۔ میری سانس کی لے بھی تیز تھی۔ اس دوران میں، میں نے گن سے نیا میگزین انیج کر لیا۔ ثروت روہانسی آواز میں بولی۔ ”پلیز تابش! آپ کسی پر گولی نہ چلائیں۔ یہ غلط ہوگا۔“

”وہ ہمیں گولی ماردیں تو یہ صحیح ہوگا؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم..... خود کو ان کے حوالے کر دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ بعد میں کوئی بہتر صورت

نکل آئے۔“ وہ ہانپی ہوئی سانسوں کے درمیان بولی۔

”یہ خطرناک قاتل ہیں ثروت! رحم کرنا نہیں جانتے۔ ہم ان کے ساتھ رعایت نہیں کر سکتے کیونکہ یہ بھی ہمارے ساتھ رعایت نہیں کریں گے۔“

ہوا کا ایک جھونکا آیا۔ کسی گاڑی کے ڈیزل انجن کی آواز صاف سنائی دی۔ یقیناً تعاقب کرنے والی گاڑیاں نزدیک پہنچ چکی تھیں۔

”اٹھو ثروت!“ میں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا۔

دس بیس منٹ بعد بوندیں پڑنے لگیں۔ یہ ایک عجیب سفر تھا۔ انجانے راستے..... انجانا رخ اور عقب میں موت کے فرستادے۔ ایسے ہی کچھ سفر میں نے پہلے بھی تو کیے تھے۔ ایسی ہی بارش راتوں میں ایسے ہی پرخطر ویرانوں میں، میں پہلے بھی تو دیوانہ وار بھاگا تھا۔ کوئی تڑپ تھی جو میری سانسوں کو ٹوٹنے نہیں دیا کرتی تھی۔ کوئی لگن تھی جو مجھے بے دم ہو کر گرنے نہیں دیتی تھی۔ وہ بھانڈیل اسٹیٹ کے بے آباد جنگل تھے، وہ ایسی ہی جان لیوا راتیں تھیں۔ میں کسی تک پہنچنے کے لیے بھاگا کرتا تھا۔ کسی کو پانے کے لیے اپنے پاؤں کو بولہبان کیا کرتا تھا۔ اور جس کے لیے میں ایسا کیا کرتا تھا آج وہ میرے پہلو میں تھی۔ اس کے بال کھل کر ہوا میں اڑ رہے تھے۔ اس کے بدن کی مہک میری رگ جاں میں اتر رہی تھی۔ یہ رات نہایت زہریلی تھی اور نہایت رکمیں تھی۔ جان لیوا بھی تھی اور دل گداز بھی، یہ زندگی تھی اور موت بھی۔ میرے سینے میں ایک ایسا طوفان تھا جو ہر رکاوٹ کو بہا کر لے جاسکتا تھا۔

اور پھر بارش تیز ہو گئی۔ میں نے اپنے پہلو میں رکھی ہوئی ایل ایم جی کو نشست کے نیچے گھسا دیا۔ نشست کے نیچے کیونوں کا ایک تھیلا بھی تھا جس میں ایل ایم جی کا ایک فالتو میگزین اور سو کے قریب راؤنڈ موجود تھے۔ یہ سارا انتظام یقیناً راجا نے ہی کیا تھا۔

ثروت منمنائی۔ ”تابش! آپ نے مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا۔“

”کیسا وعدہ؟“

”کوئی غیر قانونی کام نہ کرنے کا۔“ وہ بولی پھر ذرا توقف سے کہنے لگی۔ ”کیا ہم کسی

پولیس اسٹیشن تک نہیں پہنچ سکتے؟“

”پولیس اسٹیشن تو کیا یہاں کوئی آبادی بھی نظر نہیں آ رہی۔“

”ہم کدھر جائیں گے؟“ اس کی آواز واضح طور پر کپکپا رہی تھی۔

میرے اندازے کے مطابق کم از کم تین افراد اور ایک گھوڑی ایل ایم جی کی مہلک فائرنگ کا شکار ہوئے۔ لیکن وہ تعداد میں زیادہ تھے۔ قریب آتے جا رہے تھے۔ اچانک ایک سیاہ پر چھائیں دائیں طرف سے مجھ پر جھپٹی۔ یہ لاپچہ گرتے والا ایک قوی ہیکل شخص تھا۔ میں دھکا لگنے سے دور جا گرا۔ ایل ایم جی ایک درخت سے ٹکرائی اور اس کا نم دستہ میرے ہاتھ سے پھسل گیا۔ میں نہتا ہو گیا۔ ثروت کے چلانے کی آواز میرے کانوں میں پڑی۔ کم از کم چار پانچ افراد مجھ پر پل پڑے۔ وہ اس مرحلے میں مجھے جان سے مارنا چاہتے تو مار سکتے تھے لیکن وہ مجھے زندہ پکڑنا چاہتے تھے۔ وہ رائفلوں کے کندھوں اور لائیووں سے مجھے مارنے لگے۔ وہ وحشی ہو رہے تھے لیکن ایک بات سے وہ بے خبر تھے۔ میں مکمل طور پر نہتا نہیں تھا میری ٹانگ کے ساتھ وہ بے مثال چاقو بندھا ہوا تھا جس نے بھانڈیل اسٹیٹ میز جارج جیسے درندے کو چیرا تھا اور اس کے علاوہ بھی کئی توانا گردنوں کا خون چانا تھا۔

میں نے نیچے گرے گرے وہ چاقو اپنی ران سے جدا کیا۔ اس کا دستہ میرے ہاتھ میں آیا تو رگوں میں سیال آگ دھک اٹھی۔ وہ ساری بے پناہ نفرتیں دل و دماغ میں تازہ ہو گئیں جنہوں نے میری ہنستی بستی زندگی کو برباد کیا تھا۔ آج سیٹھ سراج میرے سامنے نہیں تھا، واجی نہیں تھا، ایم پی اے گورایا اور تھانیدار اشرف بھی نہیں تھا، لیکن ان کے ہمزاد تو تھے۔ یہ سب اسی قبیل کے لوگ تھے۔ اسی لازوال سفاکی کے علمبردار تھے۔ میں نے پہلا وار ایک شخص کی گنبد نما توند پر کیا اور اسے افقی رخ پر چیر کر رکھ دیا۔ نیچے جھکے جھکے دوسرا وار ایک رائفل بردار کی ناف پر کیا۔ چاقو چربی دار جلد کاٹ کر دستے تک اندر گھسا اور مضروب کی کر بناک آواز میری سماعت سے ٹکرائی۔ میں نے زور لگا کر چاقو کھینچا۔ گرم خون میرے ہاتھ پر گرا۔ ایک کلباڑی کا قاتل وار بچاتے ہوئے میں نے کلباڑی بردار کی گردن پر کاری زخم لگایا۔ وہ زیادہ تھے۔ مسلح تھے لیکن خود پر اچانک ٹوٹنے والی قیامت نے انہیں سکتہ زدہ کر دیا۔ ایک گولی چلی لیکن مجھے ایک دیوانہ سا بھروسہ تھا کہ آج کوئی گولی مجھے چھو نہیں سکے گی۔ اگلے ڈیڑھ دو منٹ میں اس جگہ ایک خون ریز ”سعرکہ“ ہوا۔ میرے مقابل پانچ افراد آئے تھے۔ ان میں سے دو تو پہلے ہلے میں ہی شدید زخمی ہو گئے تھے۔ باقی تین بھی میری وحشت کے آگے ٹھہر نہیں سکے۔ میرے قاتل چاقو نے انہیں ادھیڑ کر رکھ دیا۔ میں دیوانہ وار چلا رہا تھا۔ ان کو زخم زخم کر رہا تھا۔ آخری ایک شخص دہشت زدہ ہو کر بھاگ کھڑا ہوا۔ میں نے اس کا پیچھا کیا لیکن وہ اوجھل ہو گیا۔ میں واپس پلٹا۔ ایک زخمی تڑپ رہا تھا اور کسی ہتھیار تک پہنچنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے اس کے سینے پر چڑھ کر اس پر متعدد وار کیے اور اسے ٹھنڈا کر دیا۔

ہم پھر روانہ ہو گئے۔ کبھی بھاگ رہے تھے، کبھی تیز چل رہے تھے۔ اچانک ثروت پلائی اور لڑکھڑا کر گر گئی۔ میں نے اسے بمشکل اٹھایا۔ اس کا پاؤں بڑی طرح مڑ گیا تھا۔ میں نے نیچے بیٹھ کر اس کے منحنے کو ہاتھوں سے دبایا، وہ کراہنے لگی۔ اس کی چپل اتر کر دور چلی گئی تھی۔ میں نے چپل اٹھا کر اسے دی۔

چند سیکنڈ بعد اس نے کہا کہ وہ چل سکتی ہے۔ ہم پھر آگے بڑھنے لگے لیکن اب رفتار بہت کم تھی۔ پہلے تو چوٹ گرم تھی اس لیے وہ کوشش کر کے چلتی رہی۔ آٹھ دس منٹ بعد اس کی ہمت بالکل جواب دے گئی۔ ”تابش! آہ مجھ سے نہیں چلا جاتا۔“ وہ لڑکھڑا کر کیچڑ میں بیٹھ گئی۔

بارش کی بو چھاڑیں ہمیں شرابور کر رہی تھیں۔ روشنیاں اب بالکل قریب آگئی تھیں۔ شاید ان لوگوں نے ہماری گاڑی دیکھ لی تھی اور زمین پر پاؤں کے نشان بھی دیکھ لیے تھے۔ کچھ دور ایک کچے نیلے (تھے) پردرختوں کا گھنا جھنڈ تھا۔ ہم وہاں تک پہنچ جاتے تو نسبتاً محفوظ ہو جاتے لیکن اب اس کے لیے وقت بہت کم تھا۔ میں نے نارچ کی روشنی میں دیکھا۔ ثروت کا پاؤں سوچ کر کپکا ہو گیا تھا۔ اسے میرے اندازے سے زیادہ چوٹ آئی تھی۔ یہ بھی ممکن تھا کہ فریکچر ہو چکا ہو۔

یہ بے بسی کا عروج تھا۔ میں نے جھک کر ثروت کو گود میں اٹھالیا۔ اس نے اپنے بازو میرے گلے میں حماں کر دیئے تھے۔ ایل ایم جی اور ایمونیشن کا وزن بھی مجھ پر تھا مگر میں آگے بڑھنے کی بے پناہ ہمت رکھتا تھا۔ دو تین منٹ مزید گزرے۔ پھر عقب سے ایک فائر ہوا اور گولی میرے کندھے کو بوسہ دیتی گزر گئی۔ اس کے ساتھ ہی کڑک دار آواز آئی۔ ”رُک جاؤ۔“

اب رُکنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔ وہ گھڑی آگئی تھی جس کا خدشہ تھا۔ میں نے ثروت کو دو تارو جڑواں درختوں کی اوٹ میں بٹھایا اور خود ساتھ والے درخت کی آڑ لے کر ایل ایم جی سنبھال لی۔

اگلے دو تین منٹ اس ویرانے میں تہلکہ خیز تھے۔ میں کوئی بہت اچھا نشانے باز نہیں تھا۔ رائفل چلانا بھی میں نے عمران سے بھانڈیل اسٹیٹ میں ہی سیکھا تھا لیکن اس وقت میرے رگ و پے میں جو برق دوڑ رہی تھی، اس نے مجھے میری اصل صلاحیتوں سے کہیں اوپر ابھار دیا تھا۔ بھیکے ہوئے جنگل میں دھماکے ہوئے، شعلے چمکے اور پگھلا ہوا سیسہ ہدف کی تلاش میں ہر طرف مہلک پرواز کرنے لگا۔

گاڑی اب بالکل نزدیک آگئی تھی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ اس گاڑی کے سوار پہلی گاڑی کو نہیں دیکھ سکے اور نہ ان تین چار بد معاشوں کو جنہیں میرے چاقو نے لاشوں میں تبدیل کیا تھا۔ وہ ٹیلے کے بالکل نزدیک پہنچ کر رُک گئے۔ شاید انہیں محسوس ہوا تھا کہ یہ ٹیلا کسی کے چھپنے کے لیے مناسب جگہ ہے۔ وہ یہاں نظر ڈالنا چاہتے تھے، پھر میں نے دیکھا کہ وہ اوپر آ رہے ہیں۔ اب میرے پاس دو راستے تھے۔ ایل ایم جی کا منہ کھول دیتا، مارتا اور مر جاتا یا پھر وہاں موجود ڈھینگریوں یعنی خشک ٹہنیوں کو پناہ کے لیے استعمال کرتا۔ یہ ڈھینگریاں ایک انبار کی صورت میں ایک طرف پڑی تھیں۔ میں نے یہی طریقہ مناسب سمجھا۔ میں یہ ڈھینگریاں گھسیٹ کر جھوپڑے میں لایا اور خود کو ثروت سمیت ان کے پیچھے کیمرے لالچ کر لیا۔ بس ایک کوشش تھی جو کامیاب ہو سکتی تھی اور ناکام بھی۔ ثروت کے لیے یہ سارا نظارہ ناقابلِ دید تھا۔ اس کا سارا وجود کانپ رہا تھا اور اس نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔ میں نے بھی دیوار سے ٹیک لگالی اور سیاہ رنگ کی ایل ایم جی بالکل تیار حالت میں گود میں رکھ لی۔ آنے والے پہلے ٹیلے کے گرد چکراتے رہے پھر اوپر آ گئے۔ دو ٹارچوں کے روشن دائرے آس پاس چکرارہے تھے۔ وہ لوگ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ ان باتوں میں گالیوں کی بہتات تھی۔ کوئی ڈھلوان پر پھسلا اور اس نے کچھڑ کو ماں بہن کی گالی دی۔ دوسرا بولا۔ ”منہ بند رکھ۔ وہ تیرے ماں پیرا دھر ہوں گے بھی تو تیری آواز سن کر کسی طرف نکل بھاگیں گے۔“

یہ سنسنی اعصاب کو ریزہ ریزہ کر رہی تھی۔ یہ صورتِ حال سولی پر لٹکنے کے مترادف تھی۔ ہم ساکت و جامد بیٹھے رہے۔ میں نے انگلی ٹریگر پر رکھ لی۔ وہ اندر آئے۔ انہوں نے ٹارچ کا دائرہ چاروں طرف گھمایا۔ یہ روشنی چند سینکڑوں کے لیے اس جھاڑ جھنکاڑ پر رُکی جس کے عقب میں ہم تھے۔ میں سمجھا کہ ہمیں دیکھ لیا گیا ہے۔ میں نے ٹریگر پر رکھی انگلی کو حرکت دینا چاہی لیکن ایک لمحے کے لیے رُک گیا۔ یہی لمحہ..... یہی ایک لمحہ ہمیں خوفناک تصادم سے بچا گیا۔ روشن دائرہ آگے بڑھ گیا، ادھر ادھر گردش کرنے لگا۔ وہ ہم سے صرف سات آٹھ فٹ کی دوری پر تھے پھر وہ باہر نکل گئے۔ گہری تاریکی چھا گئی۔



نیم خشک رات دھیرے دھیرے سرک رہی تھی، ہم فوری ٹکراؤ سے توجہ گئے تھے لیکن لطمہ پوری طرح دور نہیں ہوا تھا۔ وہ لوگ ارد گرد ہی موجود تھے۔ انہوں نے دوسری گاڑی اموڈ لی تھی اور اپنے ساتھیوں کی لاشیں بھی دیکھ لی تھیں۔ مجھے گاہے بگاہے دور کیکر اور ٹاہلی

لیکن ابھی بلا ٹی نہیں تھی۔ ایک اور گاڑی کی روشنیاں تیزی سے قریب آرہی تھیں۔ ”ثروت اٹھو.....“ میں نے ثروت کو تھاما۔

وہ بے حرکت بیٹھی رہی۔ میرے ذہن میں یہ خوفناک خیال آیا کہ کہیں اسے گولی تو نہیں لگ گئی۔ لیکن ایسا نہیں تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی مگر اس کے پاؤں پر بالکل وزن نہیں آ رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ سسکیاں نکلیں۔ میں نے ایل ایم جی پھر اپنے کندھے سے لٹکائی۔ چاقو دوبارہ چمڑے کے تسمے میں اڑسا اور اسے گود میں اٹھا لیا۔ وہ کراہ رہی تھی۔ اس نے سہارے کے لیے اپنی بانہیں میرے گلے میں ڈال دیں اور اپنا سر نیم جان انداز میں میرے سینے سے ٹکا دیا۔ میں لڑکھڑاتا ہوا آگے بڑھا۔ رُخ ٹیلے کی طرف تھا۔ گاڑی کی آمد سے پہلے پہلے میں اس ٹیلے (تھے) تک پہنچنا چاہتا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ انڈسٹریل ایریا میں چند ہفتے پہلے زخمی ہونے والی ٹانگ سے مسلسل ٹیسس اٹھ رہی تھیں۔ شدید تھکن بھی کام دکھا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ نچلا دھڑ بالکل سن ہو گیا ہے۔ ہمت جواب دے رہی تھی، بالکل جواب دے رہی تھی۔ مگر باروندا جبکی نے کہا تھا، جہاں برداشت ختم ہو جاتی ہے، ہمت جواب دے جاتی ہے، وہیں سے کامیابی کا عمل شروع ہوتا ہے۔ وہیں سے معجزے آغاز ہوتے ہیں۔ میں پوری توانائیاں صرف کر کے بڑھتا رہا اور ٹیلے پر پہنچ گیا۔ یہاں پختہ اینٹوں سے بنا ہوا ایک بُرا نا کٹھا سا تھا۔ ایک طرف سے اس کی چھت گر چکی تھی اور اس نے جھوپڑے کی سی شکل اختیار کر لی تھی۔ میں نے ٹارچ کی روشنی میں دیکھا۔ اس جھوپڑا نما جگہ کے اندر کوئلے بکھرے ہوئے تھے اور سالن کی چند ہڈیاں پڑی تھیں۔ ایک طرف بہت سی خشک ٹہنیاں رکھی تھیں۔ یوں لگا کہ دو چار دن پہلے یہاں کوئی مسافر یا شکاری وغیرہ رُکے ہیں اور انہوں نے چولہا بنا کر آگ جلائی ہے۔ ممکن تھا کہ یہ کمرہ کبھی فاریسٹ ڈیپارٹمنٹ یا رینجرز وغیرہ کے استعمال میں رہا ہو۔ مگر آج اس بارش رات میں یہ میری اور ثروت کی ضرورت پوری کر سکتا تھا۔ میں ثروت کو اس جھوپڑا نما کمرے میں لے آیا۔ ہم بارش سے محفوظ ہو گئے لیکن پانی ہمارے کپڑوں سے مسلسل ٹپک رہا تھا۔ میں نے ثروت کو اتار دیا۔ وہ دیوار کے سہارے بیٹھ گئی اور اپنی پنڈلی کو ہولے ہولے دبائے لگی۔ اس کا ٹخنہ کچھ اور سوج گیا تھا۔ وہ جب میری طرف دیکھتی تھی تو اس کی آنکھوں میں عجیب سا خوف نمودار ہو جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ مجھ سے بھی خوف کھانے لگی ہے۔ میرے کپڑوں پر تازہ خون کے دھبے بھی اسے دہشت زدہ کر رہے تھے۔ میں نے ایل ایم جی کو چیک کیا۔ کیونوس کے تھیلے میں سے گولیاں نکال کر اضافی میگنیزین کو پورا لوڈ کیا اور تیار ہو گیا۔

”ثروت! ہوش کرو۔“ میں نے اسے شانوں سے پکڑ کر جھوڑا۔ پھر بدحواسی میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ کسمسا کر رہ گئی۔ اس نے اپنی لال آنکھیں کھول کر مجھے دیکھا۔ ان میں خوف تھا۔ میں نے اسے پکارا۔ ”ثروت! سب ٹھیک ہے..... کچھ نہیں ہوا۔ میں یہاں ہوں، تمہارے پاس بیٹھا ہوں۔“

وہ دھیرے دھیرے حواس میں آگئی۔ غور سے مجھے دیکھنے لگی۔ میں نے اس کے پتے ہونٹوں سے اپنی ٹھنڈی ہتھیلی ہٹائی تھی۔ اس نے آنکھیں موند لیں۔ پلکوں کے نیچے سے دو موتی سرخ رخساروں کی طرح سرکنے لگے۔ اس نے کراہ کر پہلو بدلا اور کچھ دیر بعد پھر گہری غنودگی میں چلی گئی۔ اس کا بخار شدت اختیار کرتا جا رہا تھا۔

باہر دن کا اُجالا پھیل گیا۔ پرندوں کی چچہاہٹ نے نئے دن کا اعلان کر دیا۔ بارش رُک چکی تھی مگر مطلع اُبر آلود تھا۔ اس بات کا خدشہ موجود تھا کہ پیلی حویلی کے ہر کارے پھر سے اس ٹیلے کی طرف آئیں۔ میں پوری طرح چوکس تھا۔

کچھ دیر بعد ثروت نہایت تیز بخار کے زیر اثر پھر بڑبڑانے لگی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ نصرت اس کے آس پاس موجود ہے۔ وہ کہہ رہی تھی نہیں نصرت..... نہیں..... پر ایسا کیوں ہوتا ہے؟ میں کیوں سوچتی ہوں؟ مجھے ایسا نہیں سوچنا چاہیے..... یہ گناہ ہے..... وہ اب میرے لیے غیر ہیں..... مجھے پانی پلاؤ نصرت..... میرا گلا سوکھ گیا ہے..... میں یوسف کی بیوی ہوں۔ میں ان کے ساتھ رہنا چاہتی ہوں..... میرا جینا مرنا ہے ان کے ساتھ۔ میں کیا کروں..... مجھے پانی پلاؤ نصرت.....“

وہ پتا نہیں کیا کیا کہہ رہی تھی۔ پھر وہ یوسف کا نام لینے لگی۔ ”میں آپ کے سامنے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ آپ کے پاؤں پڑتی ہوں۔ آپ سب کچھ ہیں میرے لیے..... مجھے گناہ گار نہ کریں۔“ اس کے ہونٹوں پر پڑیاں جمی تھیں۔ خشک گلے کے باعث اسے شدید کھانسی ہوئی اور وہ ہڑبڑا کر اٹھ گئی۔ اسے پانی چاہیے تھا لیکن صاف پانی کہیں نہیں تھا۔ میں نے اپنے گیلے رومال سے اس کے ہونٹ تر کیے۔

وہ ننگے سر تھی اور اوڑھنی کی ضرورت محسوس کر رہی تھی۔ میں نے اسے اوڑھنی دی۔ اس کے پاؤں میں شدید درد تھا لیکن وہ غیر معمولی برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ وہ انگلیوں کو حرکت دے سکتی تھی۔ ٹخنہ بھی موڑ لیتی تھی۔ لگتا یہی تھا کہ سخت قسم کی موج آئی ہے۔ وہ میری طرف بالکل نہیں دیکھ رہی تھی۔ یقیناً میری شلوار قمیص پر خون کے بڑے بڑے دھبے اس کے خوف میں اضافہ کرتے تھے۔ میرے پاس فی الحال ان دھبوں کا کوئی حل نہیں تھا۔

کے درختوں میں کسی نارنج کی روشنی چمکتی نظر آ جاتی تھی۔ ہمارے گیلیے کپڑے ہمارے جسموں پر ہی دھیرے دھیرے خشک ہو رہے تھے۔ انہیں اُتارنے کا موقع تھا اور نہ کھانے کا۔ ثروت سکتہ زدہ سی بیٹھی تھی۔ وہ جب لاہور سے یوسف کی تلاش میں روانہ ہوئی تھی اس کے تصور میں بھی نہ ہوگا کہ حالات ایسا سنگین رخ اختیار کریں گے۔ مجھے لگا کہ اسے بخار ہو گیا ہے۔ میں نے اس کا ہاتھ چھوا، وہ تپ رہا تھا۔ وہ دھیرے دھیرے کانپ بھی رہی تھی۔ میں نے اصرار کر کے اسے لٹا دیا اور اس کے سر کے نیچے کینوس کا تھیلہ رکھ دیا۔ وہ بالکل گم صم تھی، ایک لفظ بھی نہیں بول رہی تھی۔ میں نے اس کی اوڑھنی نچوڑ کر ایک طرف پھیلا دی۔

رات کی تاریکی میں دھیرے دھیرے اُجالے کی آمیزش ہونے لگی۔ ہمارے ارد گرد صورتِ حال جوں کی توں رہی۔ ثروت سوچتی تھی یا شاید مدہوشی کی سی حالت میں تھی۔ میں نے بھی دیوار سے ٹیک لگا لی اور ترجمہی چھت کو گھورنے لگا۔ ذہن میں سوچ کے گھوڑے دوڑنے لگے۔ پہلے میں کرشمہ کپور اور راجا کو پیش آنے والے سانحات کے بارے میں سوچتا رہا پھر خیالات کا دھارا یوسف کی طرف مڑ گیا۔ یوسف کی گمشدگی ایک انوکھے اور بڑے اسکیٹزل سے جڑی ہوئی تھی۔ انڈین ڈان جادو جیسا شخص اس میں ملوث تھا۔ یہ لوگ میڈیا کے ذریعے معروف شخصیات سے ملتے جلتے لوگ تلاش کرتے تھے۔ پھر ان میں سے بہترین کا انتخاب کر کے انہیں مختلف طریقوں سے استعمال کرتے تھے۔ یوسف کی شکل کم از کم میری معلومات کے مطابق کسی معروف اداکار سے نہیں ملتی تھی، لیکن امکان تھا کہ کسی کھلاڑی یا سیاست دان وغیرہ سے ملتی ہوگی۔ عین ممکن تھا کہ وہ شخص کسی شدید خطرے کی زد میں ہو اور اس کی نقل و حرکت کو پوشیدہ رکھنے کے لیے یوسف فاروقی کو استعمال کیا جائے یا پھر اس طرح کی کوئی صورتِ حال ہو سکتی تھی۔ یوسف فاروقی ابھی پیلی حویلی میں تھا اور اسے کسی بھی وقت انڈین علاقے میں منتقل کیا جاسکتا تھا۔ اسے بجائے جانے کی ضرورت تھی لیکن ہم یہاں پھنس گئے تھے۔ مجھے عمران یاد آیا۔ اس کی جادوئی شخصیت اس کا ”دیواروں میں در بنانے کا ہنر“ کاش میرے پاس اس سے رابطے کا کوئی ذریعہ ہوتا۔ وہ میری مشکل کو جانتا تو اُڑتا ہوا یہاں پہنچ جاتا۔ عمران کا ساتھی جیلانی اور اقبال بھی اسی علاقے میں موجود تھے لیکن ہمارے درمیان رابطے کا واحد ذریعہ میرا سیل فون لطیف کی دکان میں دال کی ایک بوری کے اندر بے جان پڑا تھا۔

اچانک ثروت ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ چلانے والے انداز میں بولی۔ ”نہیں تابش.....

خدا کے لیے..... ایسا نہ کریں، مت ماریں، چاقو پھینک دیں۔“

یہ بڑا سنسنی خیز خیال تھا مگر ابھی میرے سامنے اس کا کوئی ثبوت نہیں تھا۔ جہاں تک پگڑی والے سکھ کی بات تھی، ایسے لوگ تو چودھری انور کی پہلی حویلی میں بھی آتے جاتے رہتے تھے۔

”کیا سوچ رہے ہیں؟“ ثروت کی آواز میرے کانوں سے ٹکرائی۔

”کچھ نہیں..... مجھے شک پڑتا ہے کہ یہ چودھری انور کے لوگ نہیں ہیں۔“

وہ سرسراتی سرگوشی میں بولی۔ ”اور کل رات جب آپ ان لوگوں سے لڑ رہے تھے، مجھے درختوں میں دو تین دفعہ تیز روشنی بھی نظر آئی تھی۔ یہ بجلی کی چمک نہیں تھی۔ یہ..... کچھ اور تھا۔

جیسے کوئی بڑی سرج لائٹ ہو۔“

”سرج لائٹس تو بارڈر پر ہوتی ہیں۔“

”تو اس کا مطلب ہے کہ ہم بارڈر کے بالکل پاس آگئے ہیں؟“ ثروت بولی۔

”کچھ کہا نہیں جاسکتا۔“ میں نے جواب دیا۔

اسی دوران میں ہمیں اپنے ارد گرد پھر قدموں کی آہٹیں سنائی دینے لگیں۔ وہ لوگ جو اوپر گئے تھے، واپس آ رہے تھے۔ وہ آپس میں باتیں بھی کر رہے تھے۔ کبھی کبھی ان کا کوئی فقرہ ہوا کہ دوش پر اڑتا ہوا ہماری سماعتوں سے آٹکراتا۔

ایک شخص نے دوسرے کو گالی دیتے ہوئے کہا۔ ”اوئے بدتمشاں! تیری آنکھیں ہیں کہ کول ڈوڈے۔ یہ پاؤں کا نشان نہیں ہے۔ یہ دیکھ، یہ بھی ایسا ہی نشان ہے کوئی تین پیروں والا جانور بھی ہوتا ہے؟“

باتیں کرتے ہوئے یہ لوگ کچھ آگے نکل گئے۔ ہم نے اطمینان کی سانس لی۔ لیکن یہ اطمینان بالکل عارضی ثابت ہوا۔ ایک بار پھر دل شدت سے دھڑک اٹھا۔ کوئی ہمارے بالکل قریب موجود تھا۔ اس کی عمر کوئی تیس بیس سال ہوگی۔ اس نے خاکی شلوار قمیص پہن رکھی تھی۔ گلے میں چادر لٹکا رکھی تھی۔ اسے دیکھتے ہی مجھے اندازہ ہوا کہ اس نے قمیص کے نیچے ہتھول وغیرہ لگا رکھا ہے۔ اس نے بڑے اطمینان سے شلوار کا ازار بند کھولا۔ قمیص تھوڑی اوپر اٹھائی اور پھر دیوار کی طرف منہ پھیر کر کھڑے کھڑے پیشاب کرنے لگا۔ زردی مائل پیشاب اس کے قدموں کے پاس سے بہہ کر دروازے کی طرف جانے لگا۔ پیشاب کرنے کے بعد اس نے ازار بند باندھا اور ایک بار پھر کمرے میں طائرانہ نظر ڈالی۔ خشک ٹہنیوں کے انبار پر اس کی نگاہیں چند سیکنڈ کے لیے رُک گئیں۔ میری انگلی ٹریگر پر تھی۔ اس جواں سال سکھ کا ایک قدم اسے موت کی وادی میں دھکیل سکتا تھا اور شاید ہمیں بھی۔

ہمارے ارد گرد بظاہر سکون ہی تھا لیکن ابھی یہاں سے نکلنے کا فیصلہ ہرگز نہیں کیا جاسکتا تھا۔ رات کی بارش نے قدموں کے نشان مٹا دیئے تھے اور یہ بات کسی حد تک ہمارے حق میں جاتی تھی۔ یہ ایک ویران جگہ تھی اور ہمارے ارد گرد ہمارے خون کے پیاسے تھے۔ مجھے مقامی پولیس کی طرف سے بھی کوئی امید یا خوش فہمی نہیں تھی۔ ظاہر تھا کہ یہاں لاشیں گری تھیں۔ عین ممکن تھا کہ پولیس بھی پہلی حویلی کے چودھریوں کے ساتھ مل کر ہمیں ڈھونڈنے اور مارنے کے درپے ہو۔

مجھے پاس ہی کسی گھوڑے کی مدھم ہنہناہٹ سنائی دی۔ میں نے آگے بڑھ کر نشیب میں جھانکا۔ ڈھلوان پر نقل و حرکت محسوس ہو رہی تھی۔ کچھ لوگ موجود تھے اور شاید محتاط طریقے سے اوپر آ رہے تھے۔ مجھے ایک نیلگوں پگڑی کی جھلک بھی نظر آئی۔ یوں لگا کہ آنے والوں میں کوئی سکھ بھی شامل ہے۔ ثروت میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ڈرے ہوئے سوال تھے۔

ہم خشک ٹہنیوں کے انبار کے پیچھے بالکل بے حرکت ہو گئے۔ آنے والوں کی آہٹیں سنائی دیتی رہیں۔ پتا نہیں کیوں وہ اس شکستہ کمرے کی طرف آنے کے بجائے اوپر چلے گئے۔ شاید وہ اس کھنڈر جگہ کو کلیئر قرار دے چکے تھے اور اب کسی اور مشتبہ جگہ پر تاک جھانک کرنا چاہتے تھے۔ اہل ایم جی میری گود میں تھی اور میری طرح ہر قسم کی صورت حال کے لیے تیار تھی۔ ثروت میرے کندھے سے لگی ہوئی تھی۔ اس کا بخار میں پھلکتا ہوا جسم مجھے آج دے رہا تھا۔

”کون لوگ تھے یہ؟“ اس نے سرگوشی میں مجھ سے پوچھا۔

”پتا نہیں۔“

”مجھے یہ حویلی کے لوگ نہیں لگتے کچھ اور طرح کی آوازیں تھیں ان کی۔“ ثروت نے

کہا۔

اس نے میرے خیال کی تصدیق کی تھی۔ نہ جانے کیوں مجھے بھی یہ شبہ ہو رہا تھا کہ ابھی کچھ دیر پہلے جو لوگ ہمارے سامنے سے گزرے ہیں، وہ پہلی حویلی کے ہرکارے نہیں تھے اور شاید..... رات کو بھی جن لوگوں نے اس شکستہ کمرے میں جھانکا تھا، ان کا تعلق پہلی حویلی سے نہیں تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے مجھے ایک سکھ کی رنگین پگڑی بھی دکھائی دی تھی۔ اچانک میرے جسم میں ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ دماغ سنسنا اٹھا۔ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ کل بادو باراں والی تاریک رات میں ہم دونوں بھاگتے بھاگتے انڈین علاقے میں داخل ہو گئے ہوں؟

اور یہ چادر ہمارے بہت کام آسکتی تھی۔ سب سے پہلے مجھے پانی لانا تھا، اس کے لیے میں نے ایمونیشن والے تھیلے کے اندر سے ایک چھوٹا سا شاپر ڈھونڈ لیا تھا۔

مگر اس سے پہلے کہ میں ڈھینگر یوں کے پیچھے سے نکلتا اور پانی کی طرف بڑھتا، ایک اور واقعہ ہوا۔ ایک بار پھر ہمارے آس پاس قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ اس بار یہ آہٹ زیادہ قدموں کی نہیں تھی۔ کوئی شخص ہولے سے کھانا اور پھر خستہ حال کمرے کے اندر آ گیا۔ اس کے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ میں فوراً پہچان گیا۔ یہ وہی نیلی پگڑی والا سکھ تھا جو دن کے وقت بھی یہاں آچکا تھا۔ میں نے ایک بار پھر گن کے ٹریگر پر انگلی رکھ لی اور سانس روک کر نو وارد کے اگلے قدم کا انتظار کرنے لگا۔ ثروت میرے کندھے سے لگی ہوئی تھی۔ اس کی سانس تیزی سے آ جا رہی تھی۔ آنے والے کی آواز کمرے میں گونجی۔

”باہر نکل آؤ۔ میں جانتا ہوں تم یہاں ہو۔“

میں چند سیکنڈ ساکت و جامد رہا پھر شاخوں کو حرکت دیتا ہوا باہر نکل آیا۔ میرے ہاتھ میں گن تھی۔ آنے والا خالی ہاتھ تھا۔ تاہم مجھے معلوم تھا کہ اس کی خاکی قمیص کے نیچے ہتھیار موجود ہے۔ مجھے دیکھ کر بھی وہ اطمینان سے کھڑا رہا۔ اس نے ٹارچ کا روشن دائرہ میرے چہرے پر ڈالا اور پھر ڈھینگر یوں پر اس جگہ روشنی کی جہاں ثروت دبکی ہوئی تھی۔ وہ دھیمے لہجے میں بولا۔ ”گن نیچے کر لو بھائیاجی! میں دشمن نہیں جتن ہوں۔ تمہاری مدد کرنا چاہتا ہوں۔“

”کون ہوتم؟“ میں نے کڑے لہجے میں پوچھا۔

”جگت سنگھ! پاس کے پنڈ جو پور کارہنے والا ہوں۔“

”یہاں..... پاکستانی علاقے میں کیا کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

وہ عجیب انداز سے مسکرایا۔ ”یہی سوال میں تم سے کرنا چاہتا ہوں۔ تم یہاں ہندوستانی علاقے میں کیا کر رہے ہو؟“

”ہندوستانی علاقہ؟“

”ہاں.....“ وہ دیوار سے پشت لگا کر بولا۔ ”تم اس ویلے (وقت) بارڈر پار کر چکے ہو اور ہندوستانی علاقے میں ہو۔ کسی بھی ویلے بی ایس ایف والے تم پر جھپٹا مار سکتے ہیں۔ بڑے زہریلے ہوتے ہیں یہ۔ تمہارے پاس زیادہ ٹائم نہیں ہے یہاں سے نکلنے کے لیے۔“

میں سنائے میں تھا۔ میرا بدترین اندیشہ درست ثابت ہوا تھا۔ کم از کم ابھی تو یہی لگ رہا تھا۔

اس نے ٹارچ نیچے جھکالی اور پھر بھجادی۔ میں نے دھیان سے اس کی طرف دیکھا۔

وہ کچھ دیر ٹہنیوں کو گھورتا رہا پھر باہر چلا گیا۔ اس وقت نہ کیوں مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ مجھے لگا کہ یہ شخص یہاں ہماری موجودگی سے آگاہ ہو چکا ہے۔ وہ جان چکا ہے کہ اس نیم تاریک کمرے میں خشک ٹہنیوں کے انبار کے پیچھے کوئی ہے۔

معلوم نہیں میرا یہ احساس غلط تھا یا درست۔ مگر چند لمحوں کے اندر میرے جسم کے ہر مسام سے پسینہ پھوٹ نکلا۔ مجھے ایک بار پھر رات والی صورت حال یاد آئی۔ ٹارچ کا روشن دائرہ کمرے میں حرکت کرتا رہا تھا اور پھر ایک جگہ ڈھینگر یوں (خشک ٹہنیوں) کے ڈھیر پر رُک گیا تھا۔ کیا اس وقت بھی ٹارچ اسی شخص کے ہاتھ میں تھی؟ یہ کون تھا؟ اگر وہ واقعی یہاں ہماری موجودگی کے بارے میں شبہ کر رہا تھا تو اب تک خاموش کیوں تھا۔

وہ پورا دن عجیب تناؤ اور سخت ترین پریشانی کے عالم میں گزرا۔ ہم اس بارہ ضرب بارہ فٹ کے کمرے میں محصور ہو کر رہ گئے تھے۔ یہاں سیلن تھی، گھٹن تھی اور حشرات الارض بھی تھے۔ ثروت کے بازو پر کوئی نامعلوم کیڑا ریگ گیا تھا اور جلد سرخ ہو گئی تھی۔ بخار نے بھی اس کی بُری حالت کر رکھی تھی۔ اوپر سے ٹخنے کا درد تھا۔ وہ بے مثال برداشت کا مظاہرہ کر رہی تھی۔ بہر حال وہ عورت تھی۔ گاہے بگاہے اس کے ہونٹوں سے بے ساختہ ایک درد بھری آہ نکل جاتی تھی۔ ہمیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ ہم کہاں ہیں؟ ہمارے ارد گرد جو لوگ ہیں وہ کون ہیں؟ اور کل شب جو خون ریز ہنگامہ ہوا ہے اس کے نتائج ہمارے لیے کیا نکلنے والے ہیں؟ پریشانی میں انسان کی بھوک تو دب جاتی ہے مگر پیاس کی شدت محسوس ہوتی رہتی ہے۔ بخار کی وجہ سے ثروت کو زیادہ پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ کمرے میں دس بارہ قدم کے فاصلے پر خودرو پودوں کے درمیان مجھے ایک چھوٹا سا گڑھا نظر آرہا تھا۔ اس میں کل رات کی بارش کا پانی جمع تھا اور اب کافی تھمر چکا تھا۔ میں نے کئی بار سوچا کہ وہاں تک جاؤں اور پانی لے آؤں۔ لیکن دو مسئلے تھے۔ ایک تو پانی کے لیے کوئی برتن نہیں تھا۔ دوسرے نگاہ میں آ جانے کا شدید خطرہ تھا۔ اس گڑھے تک جانے کے لیے ضروری تھا کہ میں رات ہونے کا انتظار کروں۔



کچھ مناظر بار بار نگاہوں میں گھوم رہے تھے۔ نیتو عرف کرشمہ کیور کا سرد بے جان جسم، راجا کی شہ رگ سے اُچھلنے والا خون، کیکر اور جنزت کے درختوں کے درمیان چودھری کے ہرکاروں سے میرا بورنگ معرکہ۔ یوں لگتا تھا جیسے کل رات جاگتی آنکھوں سے کوئی بھیا تک خواب دیکھا ہے۔ جیسے تیسے یہ پہاڑ جیسا بھاری بھر کم دن گزر گیا۔ ارد گرد پرندوں کی چچہاہٹ سنائی دی اور شام کے سائے اس دیرانے پر طویل ہونے لگے۔ اندھیرا ایک چادر تھا

تھا۔ ثروت میرے ساتھ تھی اور اس کی حفاظت کا جذبہ اتنا شدید تھا کہ کچھ دیر کے لیے میں اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا تھا۔ جب جارج کا چاقو میرے ہاتھ میں آیا تو مجھ پر وہی کیفیت طاری ہو گئی جو بھانڈیل اسٹیٹ میں ”زرگاں قلعے“ کی خونی لڑائی میں ہوئی تھی۔

کمرے کی تاریکی میں میرے اور جگت سنگھ کے درمیان تھوڑی سی گفتگو مزید ہوئی اور پھر میں اس نتیجے پر پہنچ گیا کہ فی الحال ہمیں وہی کرنا پڑے گا جو یہ جگت نامی شخص کہہ رہا ہے۔ ہم وہاں سے روانہ ہونے کے لیے تیار ہو گئے۔ ثروت پیاس کی انتہا کو چھو رہی تھی۔ سب سے پہلے ہم نے بارش گڑھے میں سے کچھ پانی لیا اور ثروت کو چند گھونٹ پلائے۔

ثروت کے لیے چلنا محال تھا۔ میں نے اس کا بازو کندھے کے قریب سے تھاما اور اسے چلنے میں مدد دی۔ وہ بمشکل اپنے قدم آگے بڑھانے لگی۔ چاروں طرف گہری تاریکی تھی۔ یہ احساس بڑا مختلف تھا کہ ہم پاکستان کے بجائے انڈیا کی سرزمین پر چل رہے ہیں۔ یکا یک میں چونک گیا۔ درختوں کے اندر سے تیز روشنی کا ایک ترچھا ستون سا نظر آیا۔ پھر وہ دھیرے دھیرے نیم دائرے کی شکل میں حرکت کرنے لگا۔ اس کی زد میں آنے والی ہر چیز روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی تھی۔ یہ وہ طاقتور سورج لائٹ تھی جو کل رات بھی متعدد بار چمکی تھی اور جس کا ذکر ثروت نے کیا تھا۔

کچھ دیر بعد لائٹ اوجھل ہو گئی اور ایک بار پھر ہر طرف گہری تاریکی چھا گئی۔ ہمارا راہنما جگت سنگھ بڑے اعتماد سے قدم بڑھا رہا تھا۔ وہ بار بار سرگوشی کر رہا تھا۔ ”گھبرانا نہیں۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بس میرے پیچھے پیچھے چلتے رہو۔“

کچھ دیر بعد ثروت کے لیے قدم اٹھانا مشکل ہو گیا تو جگت سنگھ نے بڑی ہمدردی کے ساتھ اور پُر خلوص انداز میں ثروت کو دوسری طرف سے سہارا دینے کی پیشکش کی۔ اس پیشکش کو قبول کرنے کے سوا چارہ نہیں تھا۔

اب ایک طرف سے جگت نے اور دوسری طرف سے میں نے ثروت کو تھاما ہوا تھا۔ وہ ہم دونوں کے کندھوں پر پورا دباؤ ڈالتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک جگہ پہنچ کر جگت سنگھ رُک گیا۔ اس نے میرے کان میں سرگوشی کرتے ہوئے کہا۔ ”لائٹ پھر چلنے والی ہے۔ ابھی تھوڑی دیر میں یہ گھومتی ہوئی ان سامنے والے لیکروں کے اوپر سے گزرے گی۔ جب وہ وہاں سے گزر جائے تو ہم کو فائٹ یہاں سے اٹھنا ہوگا اور ان دائیں طرف والے جنزروں تک پہنچنا ہوگا۔ بس ایک منٹ کے اندر اندر۔“

”لیکن اس سے تو چلا نہیں جا رہا۔“ میرا اشارہ ثروت کی طرف تھا۔

وہ شکل سے سیدھا سادہ پینڈو لگتا تھا مگر آنکھوں میں ہوشیاری کی چمک تھی۔ اس کے رویے میں مجھے ہمدردی کی لہر محسوس ہوئی۔

میں نے کہا۔ ”مجھے ابھی تک یقین نہیں آ رہا کہ میں انڈین علاقے میں ہوں۔“

وہ بولا۔ ”ابھی تھوڑی دیر میں سب کچھ تمہارے سامنے آ جائے گا۔“

”لیکن تم ہو کون؟“

”یار! ابھی تو اتنا جانو کہ میں جگت سنگھ ہوں اور تمہیں بڑے سخت خطرے میں سے نکالنا چاہتا ہوں۔“

”پر کیوں؟“

”بس سمجھ لو کہ دل آ گیا ہے تم پر۔“ وہ میرے خون آلود کپڑوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

ان لمحوں میں نہ جانے کیوں مجھے لگا کہ کل رات یہاں سے کچھ فاصلے پر میرے اور چودھری انور کے ہر کاروں میں جو خون ریز جھڑپ ہوئی تھی، وہ اس شخص نے کسی طور دیکھی ہے۔ میرے کہنے پر ثروت بھی شاخوں کے پیچھے سے نکل آئی۔ جگت سنگھ نے اسے بس ایک بار دیکھنے کے بعد دوبارہ اس کی طرف آنکھ نہیں اٹھائی۔ اگلے پانچ دس منٹ میں مجھے یقین ہو گیا کہ یہ جگت نامی شخص جو کہہ رہا ہے، درست ہے اور ہم پر واقعی کسی بھی وقت بی ایس ایف کا چھاپا پڑ سکتا ہے۔ جگت سنگھ کے لب و لہجے میں بہت اعتماد تھا۔ لگتا تھا کہ وہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے اور ہمیں بہ آسانی اس جگہ سے نکال سکتا ہے۔ لیکن وہ ہمیں انڈین علاقے کی طرف نکالنا چاہ رہا تھا جبکہ ہمارے لیے ضروری تھا کہ اپنا رُخ پاکستان کی طرف رکھیں۔

میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”اگر تم واقعی ہماری مدد کرنا چاہتے ہو تو پھر ہمیں پاکستانی علاقے کی طرف نکالو۔ تمہارے علاقے کی طرف جا کر تو ہم مزید پھنس جائیں گے۔“

وہ مسکراتے لہجے میں بولا۔ ”بھولے بادشاہ! کافی آگے آ گئے ہو تم۔ اب پاکستانی علاقے کی طرف جاؤ گے تو رنجرز والے بھون کر رکھ دیں گے۔ کل رات تو زور کی بارش تھی۔ تمہاری قسمت نے بھی ساتھ دیا اور تم گولی کھائے بغیر یہاں تک آ گئے۔ اب بہت مشکل ہے اور پھر دوسری گل کیوں بھول رہے ہو۔ تم نے وہاں پانچ چھ بندے پھڑکائے ہیں۔ ان کے وارث جنگلی کتوں کی طرح تمہاری بوسونگھتے پھر رہے ہوں گے۔ ہو سکتا ہے کہ پولیس اور رنجرز والے بھی ان کے ساتھ مل کر تمہیں ڈھونڈ رہے ہوں۔“

وہ بات تو ٹھیک کہہ رہا تھا۔ کل رات جو کچھ ہوا، وہ میری توقع اور نیت سے بہت زیادہ

مقاطع انداز میں چلتے ہوئے ایک گدھا گاڑی تک پہنچ گئے۔ گاڑی پر دودھ کے تین چار بڑے برتن رکھے تھے اور ایک طرف سبز چارے کا گٹھا پڑا تھا۔ جگت سنگھ نے ہمیں گاڑی پر بٹھایا اور گدھے کو ہانکنا شروع کر دیا۔ میں اس کے ساتھ بیٹھا تھا۔ ثروت پیچھے تھی۔ وہ ثروت سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”چھوٹی بھین! اگر کوئی تجھ سے کسی طرح کی کوئی بات پوچھے تو گوئی بن جانا۔ آپاں (ہم) کہیں گے کہ یہ بول نہیں سکتی۔ ٹھیک ہے؟“ ثروت نے میری طرف دیکھا پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

تب جگت مجھ سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”تمہارا نام صادق محمد ہے۔ یہ تمہاری پتی ہے۔ تم میرے بیلے ہو اور مجھ سے ملنے کھنڈوت پورہ سے آئے ہو۔ کھنڈوت پورہ ڈیک نالے کے پار سکھوں اور مسلمانوں کا پنڈ ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہونا؟“ میں نے کہا۔ ”سمجھ تو رہا ہوں۔ پر اس گن کو اور گولیوں والے تھیلے کو کہاں چھپانا ہے اور میرے کپڑوں پر یہ خون کے بڑے بڑے داغ؟“ ”اوہ..... میری بھی مت ماری گئی ہے۔“ جگت نے کہا۔ پھر جلدی سے اپنے گلے کی چادر اُتار کر میری طرف بڑھائی۔ ”لے یار! اس کی بکل مار لے اور بندوق کو گھسا دے اس چارے کے نیچے۔“

میں نے ایسا ہی کیا۔ چادر پلیٹ لی اور گن کے ساتھ ساتھ کینوس کا بیگ بھی چارے میں چھپا دیا۔ جس راستے پر ہم جا رہے تھے وہ کچا لیکن ہموار تھا۔ قریباً ایک کلومیٹر کے فاصلے پر روشنیاں نظر آرہی تھیں۔ یہ ایک سرحدی گاؤں تھا۔ جگت نے بتایا کہ ہم وہیں جا رہے ہیں۔ راستے میں ایک جگہ اس وقت ہماری دھڑکنیں بڑی طرح زیر و زبر ہوئیں جب اندھیرے میں کسی نے فوجی انداز میں پکار کر کہا۔ ”کون ہے؟“

جگت نے فوراً مسکین آواز میں کہا۔ ”میں ہوں جی جگتا! دودھ دے کر آیا ہوں۔“ ”یہ ساتھ کون ہے تیرے؟“ ”میری بھین ہے جی اور اس کا بندہ صادق۔ کھنڈوت پورہ سے آئے ہیں، ملنے کے لیے۔“

چند لمحے خاموشی رہی۔ یہ سنگین خاموشی تھی۔ ہماری تلاشی ہو جاتی تو قیامت آ جاتی۔ بہر حال، خیریت گزری۔ چند سیکنڈ بعد آواز آئی۔ ”ٹھیک ہے..... ٹھیک ہے..... نکلو..... نام زیادہ ہو گیا ہے۔“



”کچھ نہ کچھ تو کرا پڑے گا۔ اگر نکلنے میں دیر کر دی تو پھر ”لائٹ“ پکڑ لے گی۔“ میں نے دیکھا، بائیں طرف اندھیرے میں ایک اونچا مینار سا نظر آ رہا تھا جیسے سرو کا کوئی بلند وبالا درخت ہو۔ جگت میری الجھن بھانپ کر بولا۔ ”یہ لکڑی کا ٹاور ہے۔ اس پر بی ایس ایف والے ہیں۔ مشین گن بھی ہوتی ہے اوپر۔ پر ڈرنے کی کوڑ نہیں ہے۔ یہ ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ بس جیسا کہتا ہوں، ویسا کرتے رہو۔“

”لیکن.....“ وہ میری بات کاٹ کر بولا۔ ”اپنا ہاتھ ادھر لاؤ۔“ میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس نے میری کلائی مضبوطی سے پکڑ لی اور بولا۔ ”یہ دیکھو یہ ہمارے ہاتھوں سے ایک طرح کی کرسی بن گئی ہے۔ میری بھین (بہن) اس پر بیٹھ جائے گی۔ ہم دونوں طرف سے اس کا بازو پکڑ لیں گے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔“ مشکل سے جگت کے الفاظ مکمل ہوئے تھے کہ طاقتور سرچ لائٹ کا ترچھا ستون پھر روشن ہو گیا۔ وہ آہستہ آہستہ حرکت کرتا ہوا ہماری طرف بڑھا۔ میرے سینے میں دھڑکن کی رفتار بڑھ گئی۔ روشن ستون حرکت کرتا ہوا ہمارے سامنے نیکر کے درختوں کے اوپر سے گزر گیا تو جگت سنگھ نے تیز سرگوشی کی۔ ”چلو آؤ۔“

ہم نے ثروت کو اپنے بازوؤں کی کرسی پر بٹھایا۔ دونوں طرف سے اس کے کندھے تھامے اور تیزی سے آگے بڑھے۔ ثروت نے اپنا سر میرے کندھے سے ٹکا دیا تھا۔ واقعی جگت ان راستوں کا گہرا شناور تھا۔ تاریکی کے باوجود ہم کہیں ٹھوکر کھائے بغیر آگے بڑھ رہے تھے۔ ”یہاں ایک کھالا ہے۔ دھیان سے۔“ جگت نے تیز سرگوشی کی۔

کھالے کی مختصر گہرائی سے گزرنے کے فوراً بعد ہم جنتر کی محفوظ جھاڑیوں میں پہنچ گئے۔ جگت بڑی طرح ہانپ رہا تھا۔ تھوڑی بہت سانس مجھے بھی چڑھی تھی۔ ہمیں جنتروں میں پہنچنے مشکل سے چند سیکنڈ ہوئے تھے کہ سرچ لائٹ کا خطرناک روشن دائرہ اس مقام سے گزرا جہاں سے ہم ابھی گزر کر آئے تھے۔

کچھ دیر تک سانس درست کرنے کے بعد جگت نے کہا۔ ”ہم زیادہ دیر یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔ آگے بڑھنا ہوگا۔“

ہم نے ایک بار پھر ثروت کو دونوں طرف سے سہارا دیا اور وہ اپنے ایک پاؤں پر زور دیتے ہوئے ہمارے ساتھ آگے بڑھنے لگی۔ ایک جگہ پھر ہمیں تھوڑی دیر کے لیے رکتنا پڑا۔ کسی سکیورٹی اہلکار کی ٹارچ کی روشنی دکھائی دی تھی۔ روشنی فاصلے پر چلی گئی تو ہم پھر اٹھے اور

رکھی چار پائی پر بیٹھ گئے۔ میرے کہنے پر ثروت نے اپنا مضروب پاؤں بھی چار پائی پر رکھ لیا۔ میری گن ابھی تک چارے کے نیچے پڑی تھی۔ میں اسے جلد از جلد نکال کر اپنی تحویل میں لینا چاہتا تھا۔ جگت بظاہر کھرا بندہ لگتا تھا پھر بھی اتنی جلدی اس پر مکمل اعتماد کرنا ٹھیک نہیں تھا۔ جگت نے مجھے ایک صاف شلوار قمیص لا دی۔ میں نے کمرے میں جا کر اپنے خون آلود کپڑے تبدیل کر دیئے۔ جگت نے خون آلود کپڑے لے جا کر غسل خانے میں رکھ دیئے اور غسل خانے کا دروازہ بند کر دیا۔

اگلے ایک ڈیڑھ گھنٹے میں ہم جگت اور اس کے گھر کے بارے میں کافی کچھ جان چکے تھے۔ جگت سنگھ اپنی بیوی اور چھوٹے بھائی کے ساتھ اس گھر میں رہتا تھا۔ اس کی تھوڑی سی زمین تھی اور وہ دودھ بھی بیچتا تھا۔ آج کل وہ بی ایس ایف والوں کی سرحدی پوسٹ پر بھی دودھ دے کر آتا تھا۔ جگت کا ایک ماموں فوج میں نائب صوبیدار تھا اور اسی علاقے میں تعینات تھا۔ جگت سنگھ خود بھی ایک جی دار شخص تھا اور لڑائی بھڑائی کے کاموں میں کسی سے پیچھے نہیں رہتا تھا۔ اس کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ چند سال پہلے وہ آشا کو بھی اپنے سرالیوں سے بزور بازو جھین کر لایا تھا۔ جگت سنگھ کا چھوٹا بھائی گوبندر سنگھ قریبی شہر ”بکنایر“ میں پڑھتا تھا اور بہت اچھا کھلاڑی بھی تھا۔ وہ یہاں گاؤں میں آتا جاتا رہتا تھا۔ اس گاؤں کا نام جو پور معلوم ہوا۔

جگت نے مجھے اپنے بارے میں صاف صاف تو کچھ نہیں بتایا، تاہم مجھے اندازہ ہوا کہ وہ بی ایس ایف والوں کا ”خبری“ یعنی مخبر ہو سکتا ہے۔ مجھے پتا تھا کہ سرحدی علاقوں میں اکثر دیہات کے اندر ایسے خبری موجود رہتے ہیں۔ گاؤں کے لوگوں کو بھی پتا نہیں ہوتا کہ ان کے اندر کی خبریں وردی والوں تک کون پہنچاتا ہے لیکن اگر وہ واقعی خبری تھا تو پھر اس نے ہماری مدد کیوں کی تھی؟ کیوں ہمیں سیکورٹی فورس کے خطرناک گھیرے میں سے نکال کر یہاں اپنے گھر لایا تھا اور اب ہماری خاطر مدارات کر رہا تھا؟ وہاں کھنڈر کمرے میں، میں نے اس سے اس بارے میں پوچھا تھا تو اس نے بے تکلفی سے کہا تھا، بس تم پردل آ گیا ہے۔

میں نے ایک بار پھر یہی سوال اس سے کیا تو وہ دھیرے دھیرے کھلنے لگا۔ اس نے یہ بات تسلیم کی کہ پرسوں رات بارش کے دوران میں وہ پاکستانی علاقے میں موجود تھا۔ اس نے درختوں کے اندر سے وہ خون ریز جھڑپ دیکھی تھی جو میرے اور چودھری کے کارندوں کے درمیان ہوئی۔ وہ میری ہمت اور سخت جانی سے بے حد متاثر ہوا تھا۔ جس وقت میں لڑ رہا تھا وہ مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے اپنے آپ سے عہد کیا تھا کہ اگر میں یہاں سے بچ نکلا تو وہ میری

جگت نے ٹخنہ کر کے گدھے کی پشت پر چھڑی لگائی تو اس کی رفتار بڑھ گئی۔ قریباً دس منٹ بعد ہم اس سرحدی گاؤں میں داخل ہو رہے تھے۔ ابھی رات کے آٹھ نو ہی بجے تھے مگر گاؤں کی گلیاں سنسان تھیں۔ کسی کسی گھر سے ٹی وی چلنے کی مدھم آواز آرہی تھی۔ چند راہ گیر ملے لیکن کسی نے بھی ہم پر خصوصی توجہ نہیں دی۔ ثروت نے اپنی اوزھنی کو گھونگھٹ کی سی شکل دے دی تھی۔ ایک گلی میں ہینڈ پمپ نظر آیا۔ میں نے ابھی تک پانی نہیں پیا تھا۔ جی چاہا کہ اتر کر پی لوں مگر پھر ارادہ ملتوی کر دیا۔ بھوک پیاس برداشت کرنا میری عادت ثانیہ بنتی جا رہی تھی۔ خود کو تکلیف دینا اسے سہنا اور سہنے کی اس حد کو بڑھانا مجھے اچھا لگتا تھا۔ ثروت نے لطیف کے گھر میں مجھ سے پوچھا تھا کہ کیا میں اپنے آپ سے انتقام لے رہا ہوں لیکن یہ انتقام نہیں تھا، یہ اس سے جدا کوئی کیفیت تھی۔

جگت سنگھ ہمیں جس گھر میں لے کر گیا، وہ کچا تھا اور اس کا صحن خاصا کشادہ تھا۔ صحن کے آخر میں ایک برآمدہ تھا اور دو تین کمروں کے دروازے نظر آرہے تھے۔ برآمدے میں ایک میلا سا بلب روشن تھا۔ صحن کی ایک طرف دو چھپرے تھے جن کے نیچے چار پانچ بھینسیں بندھی ہوئی تھیں۔

گھر میں صرف ایک عورت تھی۔ وہ پچیس پچیس سال کی خاصی ٹکڑی دیہاتن تھی، شکل بھی اچھی تھی۔ جگت نے بے تکلفی سے عورت کا تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ آشا کور ہے۔ میری دھرم پتی! بڑی چنگی زنانی ہے۔ اتنی چنگی ہے کہ جی کرتا ہے، اس جیسی ایک اور ہو۔“

”تو لے آنا۔ میں نے منع کیا ہے؟ مجھ سے تو تیرا کچھ ہوا نہیں۔ شاید کسی اور سے تیری نسل آگے چل جائے۔“

”اے لے پھر..... پھر وہی گل لے کر بیٹھ گئی ہے۔ اوئے بال بچہ نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ بندہ دوسرا ویاہ کر لے اور ابھی دیر ہی کتنی ہوئی ہے۔ تین چار سال۔ اوئے تیرے جیسی ٹکڑی زنانیاں تو پچاس سال کی ہو کر بھی خوشخبری سنا دیتی ہیں۔“ اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

آشانے آگے بڑھ کر ثروت سے ہاتھ ملایا اور اسے نیچے سے اوپر تک غور سے دیکھنے لگی۔ جگت نے کہا۔ ”آشا..... یہ بیچارے..... دودن سے بھوکے ہیں۔ ایک مرغی بھون لے اور دو چار پراٹھے پکا لے فافٹ۔“

میں منع کرتا رہ گیا لیکن آشا گھر کے باورچی خانے کی طرف بڑھ گئی۔ جگت اس کے پیچھے گیا۔ یقیناً اسے ہمارے بارے میں تفصیل بتانے گیا تھا۔ میں اور ثروت برآمدے میں

اور میری ساتھی کی مدد ضرور کرے گا۔

اس نے جذباتی انداز میں کہا۔ ”صادق محمد! میرا مطلب ہے تابش محمد! میں نے اب تک کے جیون میں بڑی لڑائی بھرائی اور مار دھاڑ دیکھی ہے لیکن..... واہگرو کی سوگند، پرسوں رات جو کچھ دیکھا اس نے دو بوتل کا نشہ کر دیا۔ یہ مت سمجھو کہ منہ پر تمہاری تعریف کر کے تم سے کوئی فائدہ لینا چاہتا ہوں۔ آپاں (ہم) تو یاروں کے یار ہیں بادشاہ زادے! دلیری اور جوانمردی جہاں نظر آئے وہیں پرسیس جھکا دیتے ہیں۔ ہندو ہو یا مسلمان، سکھ ہو یا پارسی..... جو دلیر ہے، وہ سچن ہے، جو بھگنوار ہے، وہ ویری دشمن ہے۔“

اس گفتگو کے دوران میں آشا باورچی خانے میں مصروف تھی۔ بھنی ہوئی دینی مرغی کی خوشبو آرہی تھی۔ جگت سنگھ نے ذرا دھیمے لہجے میں کہا۔ ”پرسوں رات تم نے جو ماراماری کی ہے، اس کا آشا کو پتا نہیں چلنا چاہیے۔ خواہ مخواہ میں ڈرجائے گی۔ اس کو میں نے بس یہی بتایا ہے کہ چوکی کے پاس کوئی جھگڑا ہو گیا تھا، جس میں ایک دو بندے زخمی ہوئے اور تم کو بھی چوٹیں لگیں۔ تمہاری بندوق اور گولیاں میں نے وہ سامنے چھپر میں بھینسوں کی کھری کے پیچھے رکھ دی ہیں۔ وہاں انہیں کوئی نہیں چھیڑے گا۔ ٹھیک ہے نا؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وہ مجھ سے پوچھنا شروع ہو گیا کہ ہمارے پیچھے کون لوگ تھے اور وہ ہم سے کیا چاہتے ہیں۔ ابھی میں اس شخص پر پوری طرح اعتماد نہیں کر پا رہا تھا۔ میں نے اسے صرف اتنا بتایا کہ ایک مقامی زمیندار سے میری بُرائی دشمنی تھی۔ اس نے ہم میاں بیوی کو یہاں دیکھا اور اپنے بندے ہمارے پیچھے لگا دیئے۔ اللہ کا شکر ہے کہ ہم ان کے ہاتھ نہیں آئے ورنہ انہوں نے ہمیں بہت اذیت دے کر قتل کر دیتا تھا۔

جگت سنگھ نے کہا۔ ”شاید ابھی تم پوری بات بتانا نہیں چاہتے۔ چلو ٹھیک ہے میں آشا کو بھی یہی کچھ بتا دوں گا جو تم نے بتایا ہے۔ پر جو قتل شمل ہوئے ہیں ان کی گل نہیں کروں گا۔“

پھر جگت سنگھ کی نگاہ میرے ہاتھوں پر مرکوز ہو گئی۔ وہ میرے ہاتھوں کی جلد کو غور سے دیکھنے لگا اور مسکرا کر بولا۔ ”لگتا ہے کہ میرے یار نے لڑائی مار کٹائی کی بڑی سخت ٹریننگ لی ہوئی ہے۔ لڑائی کا اسٹائل دیکھ کر ہی مجھے پتا چل گیا تھا کہ کرائے شراٹے کا ماسٹر بندہ ہے۔ اب تمہارے ہاتھ دیکھ کر وہ اس ہو رہا ہے کہ تم نے ریت کے تھیلے کے ساتھ بڑی زبردست ماراماری کی ہوئی ہے۔“

”تم کیا جانتے ہو ریت کے تھیلے کے بارے میں؟“

”بہت کچھ۔“ وہ مسکرایا۔ ”میرا چھوٹا بھرا گوبندر چیمپئن ہے یار۔“

”کس چیز کا؟“

”یہی کرائے وغیرہ کا۔ بڑے مقابلے کیے ہوئے ہیں اس نے۔ وہ سامنے والے کمرے میں کئی ٹرافیاں اور کپ پڑے ہوئے ہیں اس کے۔“

”وہ خود کہاں ہے؟“

”شہر میں لیکن کل یا پرسوں اس کو آنا ہے۔ تم سے ملاقات کراؤں گا۔ بڑا خوش ہو گا تم سے مل کر۔ وہ ذرا غصے والا ہے، پرمن کا بُرا نہیں ہے۔ میرے آگے تو بالکل چوں چرا نہیں کرتا۔ سچی گل ہے، پہلے میں بھی اس جوڈو کرائے وغیرہ کو بیکار کا پنگا سمجھتا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جو دلیر ہوتا ہے وہ دلیر ہی ہوتا ہے۔ اس کرائے شراٹے سے کوئی ”لڑاکا“ نہیں بن سکتا۔ پر اب پتا چلا ہے کہ ایسی ٹریننگ چاندی کو سونا اور سونے کو ہیرا بنا دیتی ہے۔ پر تم نے میری گل کا جواب نہیں دیا۔ کیا تم نے بھی یہ ٹریننگ لی ہوئی ہے۔“

اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا آشا ہاتھوں میں ٹرے لیے چھم چھم کرتی نمودار ہو گئی۔ وہ کھانے سے پہلے ہمارے لیے دودھ پتی لے آئی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ کھانا تیار ہونے میں کچھ دیر ہے۔ اندازہ ہوا کہ وہ چاول وغیرہ پکانے لگ گئی ہے۔ وہ جاتے ہوئے ثروت کو بھی اپنے ساتھ باورچی خانے میں لے گئی۔ ہم دودھ پتی کے گھونٹ لیتے رہے اور باتیں کرتے رہے۔ میں نے اس سے کہا۔ ”یار! تم بارڈر کے آر پار آتے جاتے رہتے ہو۔ کیا کسی طرح ہمیں واپس پاکستان نہیں بھیج سکتے۔“

اس نے کہا۔ ”پھر وہی گل کر رہے ہو بادشاہ زادے! واہگرو کا لکھ شکر کرو کہ تم دونوں وردی والوں سے بچ کر نکل آئے ہو۔ میں نہ ملتا تمہیں تو اب تک ملٹری ہسپتال میں تمہاری لاشوں کی چیر بھڑ بھی ہو چکی ہوتی۔ فی الحال اس طرف جانے کی گل نہ کر۔ ابھی دو چار دن یہاں چھپ کر گزارو۔ پھر دیکھتے ہیں تمہارے لیے کیا کر سکتے ہیں۔ ویسے یہ سارا کام اتنی جلدی ہونے والا نہیں۔“

کھانا مزید اترتا لیکن ہماری اندرونی کیفیت ایسی نہیں تھی کہ اس سے لطف اٹھا سکتے۔ ثروت نے اپنے ننھے پرتیل کی ماش کی اور گرم پٹی باندھ لی۔ ہمیں سونے کے لیے گھر کا ایک پچھلا کمرہ دیا گیا۔ ہم دونوں دیر تک جاگتے رہے اور اپنے اپنے خیالوں میں گم رہے۔ حالات کی آندھی ہمیں اڑا کر کہاں سے کہاں لے آئی تھی۔ ہم یوسف کو ڈھونڈنے نکلے تھے اور شاید یوسف سے پہلے ہی خود انڈیا پہنچ گئے تھے اور اس دوران میں کئی بندوں کا قتل بھی

میرے کھاتے میں پڑ گیا تھا۔ راجا کی شکل رہ رہ کر نگاہوں میں گھوم رہی تھی۔ پتا نہیں کہ وہ مر چکا تھا یا زندگی کی کوئی رمت اس میں باقی تھی۔ نیتو عرف کرشمہ کپور کے بارے میں تو مجھے سو فیصد یقین تھا کہ وہ زندگی کی سرحد پار کر چکی ہے۔ میں عمران کے بارے میں بھی سوچتا رہا۔ پتا نہیں کہ وہ کہاں تھا اور اسے میرے حالات کی کہاں تک خبر ہو سکی تھی۔ ثروت بھی اپنے گھر والوں سے بس دو تین روز کی مہلت لے کر ہی نکلی تھی۔ یقیناً لاہور میں انہوں نے بھی اس کے بارے میں پریشان ہونا شروع کر دیا ہوگا۔ میں جانتا تھا، مجھے اور ثروت کو فون کر کر کے نصرت نڈھال ہو چکی ہوگی۔ بظاہر تو یہ سارا کام لطیف کریمانہ فروش کی بیوی کی وجہ سے خراب ہوا تھا لیکن تقدیر کے ”کردار“ کو اس حوالے سے کیسے نظر انداز کیا جاسکتا تھا۔

اگلے روز سویرے جگت نے بڑا انگڑانا شتہ ہمارے سامنے رکھا۔ مکی کے میٹھے پراٹھے جن میں گھی کی جگہ دودھ کی ملائی استعمال کی گئی تھی۔ گاڑھی میٹھی لسی، ساگ اور چاول۔ آخر میں دودھ پتی۔ رات کی طرح اب بھی ہم اس کھانے سے انصاف نہیں کر سکے۔ ثروت تو بس چند نوالے ہی لے کر رہ گئی۔ اس کے ٹخنے پر ایک بڑا سا پٹا بندھا ہوا تھا۔ یہ مرہم پٹی آشنا نے آج صبح کی تھی۔ کوئی گھریلو ٹوکا تھا۔ اس میں ہلدی، نمک اور آنا وغیرہ استعمال ہوا تھا۔ آشنا نے ثروت کو گلو اور جوائن سے بنی ہوئی کوئی دوا بھی کھلائی تھی اور اسے یقین تھا کہ ایک آدھ دن میں ثروت کا بخار فرو چکر ہو جائے گا۔

جگت نے مجھے اور ثروت کو گھر کا پچھلا کمرہ دیا تھا اور اس کی خواہش تھی کہ ہم ابھی برآمدے یا صحن میں نکلنے کی کوشش نہ کریں۔ یقیناً وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس کے گھر میں ہماری موجودگی دوسروں پر ظاہر ہو۔

ناشتے کے بعد ثروت دوسرے کمرے میں آشا کے پاس چلی گئی۔ میں اور جگت ادھر ہی بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ جگت نے مجھے گھر کے پچھواڑے ایک طویل نیم پختہ کمرہ بھی دکھایا۔ اسے وہ ڈھارا کہہ رہا تھا۔ میں دیکھ کر حیران ہوا کہ ڈھارے میں ورزش کا بہت سا سامان پڑا تھا۔ ویٹ لفٹنگ اور باڈی بلڈنگ کا انتظام بھی تھا۔ ایک طرف سینڈ بیگ لٹکا ہوا تھا۔ جگت نے بتایا کہ یہ اس کے چھوٹے بھائی گویندر کا کرائے کا اکھاڑا ہے۔ باتوں کے دوران میں جگت نے ایک بار پھر رات والا موضوع چھیڑ دیا۔ وہ مجھ سے ان لوگوں کے بارے میں پوچھنا چاہ رہا تھا جنہوں نے اس بارشی رات میں میرا خونی تعاقب کیا تھا۔ میں نے اسے بتایا تھا کہ وہ ایک زمیندار کے بندے تھے۔ وہ زمیندار کا نام پوچھنا چاہ رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”سرحد پار کا ایک گاؤں ہے روہی وال..... وہاں کا چودھری ہے۔ انور نام ہے اس کا.....“

جگت سنگھ کے چہرے پر خون کی سرخی دوڑی۔ وہ میری ران پر ہاتھ مار کر بولا۔ ”اوئے سیدی طرح بتانا کہ پہلی حویلی کا چودھری گنجانا نور.....“

”تم اسے جانتے ہو؟“ میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

”اس کی سات پشتوں کو جانتا ہوں۔ کئی بار واسطہ پڑ چکا ہے اس خانہ خراب سے۔ اب تو وہ بڑا پھنسنے خان بن گیا ہے۔ کچھ سال پہلے اس پر پاؤڈر اسمگل کرنے کا پرچہ ہوا تھا۔ زنانیوں کی طرح چھپتا پھرتا تھا پولیس والوں سے۔ میں اس کی ساری ہسٹری جانتا ہوں۔ ایک دفعہ لاہور کالج کی کسی کڑی سے عشق چلایا تھا اس نے۔ ون وے ٹکٹ کی طرح وہ ون وے عشق تھا۔ لڑکی کے بھائیوں نے اسے بڑا مارا تھا۔ یہ اس کڑی کا تو کچھ نہ کر سکا۔ پر کسی اور شہری کڑی سے دیاہ کر کے اسے اپنے پنڈ لے آیا۔ وہ کیا کہتے ہیں یار! ڈگا کھوتے توں تے غصہ کھارتے۔ اب سنا ہے وہ بہت بڑا ”چودھرو“ بنا ہوا ہے۔ دہشت ڈال رکھی ہے اس نے علاقے میں۔“

میں نے کہا۔ ”ہاں..... ہے تو کچھ ایسا ہی۔“

”پر یار! تیرے ساتھ چودھری انور کا پھنسا کیسے ہو گیا؟ وڈے جھگڑے تو بس تین ہی ہوتے ہیں۔ زنانی، زمین اور زر۔ تیرے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟“

”کیا یہ بتانا ضروری ہے؟“ میں نے قدرے خشک لہجے میں کہا۔

وہ جلدی سے بولا۔ ”نہیں یار نہیں..... تو ایویں غصہ نہ کر۔ تو تو اپنا جگر پارہ ہے۔ سچ بڑا مزہ آیا ہے تجھ سے مل کر۔ بس یوں سمجھ کہ اندر سے آتما خوش ہو گئی ہے۔“

اتنے میں باہر دروازے پر دستک ہوئی۔ جگت نے ثروت کو آواز دی۔ ”چھوٹی بھین! ٹو ادھر آ جا کرے میں۔“

ثروت میرے پاس آ گئی۔ جگت نے ہمیں اندر ہی رہنے کی ہدایت کی اور خود باہر چلا گیا۔

اس کی واپسی پندرہ بیس منٹ بعد ہوئی۔ ”خیریت ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں..... وہ ایک بھینس کچھ بیمار ہے۔ ڈنگر ڈاکٹر آیا تھا اسے ٹیکا لگانے کے لیے۔“

”باہر کے کیا حالات ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”باہر جاتا ہوں تو پتا کرتا ہوں۔ یہاں بی ایس ایف والے پنڈ کے اندر آتے جاتے رہتے ہیں۔ ہرنے آنے والے بندے کو خشک کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ تلاشیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔ تم کو ابھی باہر بالکل نہیں نکلتا۔ میں چوکی کی طرف جا رہا ہوں دودھ دینے۔ شاید تھوڑی

تھے۔

رات بارہ بجے کے لگ بھگ ثروت کو نیند آ گئی۔ اس کے تھوڑی دیر بعد میں بھی سو گیا۔ ہاتھیں کتنی دیر بعد میں کسی تیز آواز کی وجہ سے جاگا۔ شاید کسی نے زور سے دروازہ بند کیا تھا۔ میں نے سوچا کہیں جگت واپس تو نہیں آ گیا۔

بستر سے اتر کر میں نے ہولے سے دروازہ کھولا اور برآمدے میں جھانکا۔ بلب کی مدہم روشنی میں برآمدے کے اندر ایک موٹر سائیکل کھڑی نظر آئی۔ قریب ہی ہیلٹ بھی دھرا تھا۔ میرے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔ جگت نے بتایا تھا کہ اس کا چھوٹا بھائی شہر سے آنے والا ہے۔ لگتا تھا کہ وہ آ گیا ہے۔ مجھے کسی کمرے سے ایک قہقہے کی مدہم آواز بھی سنائی دی۔ یہ مردانہ آواز تھی اور جگت کی نہیں تھی۔ میں کچھ دیر تک تذبذب میں کھڑا رہا۔ پھر دوبارہ بستر پر آ گیا۔ چند منٹ دور دوسرے بستر پر ثروت سو رہی تھی۔ اس نے کروٹ بدلی ہوئی تھی اور شانوں تک چادر کھینچ رکھی تھی۔ سوتے میں بھی اوڑھنی اس کے سر پر تھی۔ میں کھڑکی سے آنے والی مدہم روشنی میں محویت سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالوں اور اوڑھنی نے اس کا نصف چہرہ ڈھانپ رکھا تھا جیسے پوری شب کا چاند آدھا بادلوں میں چھپا ہوا ہو۔ وہ میرے پاس تھی اور بہت دور تھی۔

کچھ دیر بعد مجھے احساس ہوا کہ کسی کمرے سے دبی دبی آوازیں آرہی ہیں۔ شاید آشنا اور جگت کا چھوٹا بھائی گو بندر ایک ہی کمرے میں بیٹھے تھے۔ لیکن ابھی میں نے دیکھا تھا، صرف برآمدے میں روشنی تھی۔ تینوں کمرے مکمل طور پر تاریک تھے۔ تو کیا آشنا اور جگت کا بھائی ایک ہی تاریک کمرے میں تھے؟

یہ کافی سنگین سوال تھا۔ میرے اندر تجسس جاگا اور میں ایک بار پھر اپنے کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔ میں نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر جھانکا۔ باورچی خانے کی طرف سے کھٹ پٹ کی آواز آرہی تھی۔ چند سیکنڈ بعد میں نے ایک صحت مند نو جوان کو دیکھا۔ وہ ہاتھ میں مٹھائی کا ادھ کھلا ڈبے لیے باورچی خانے کی طرف سے آرہا تھا۔ اس نے نیلی جینز اور دھاری دار قمیص پہن رکھی تھی۔ اس کی چھوٹی چھوٹی مونچھیں تھیں۔ ماتھے پر چوٹوں کے دو تین پُرانے داغ تھے۔ میں نے دیکھا اس کی قمیص کے سارے بٹن کھلے ہیں۔ میں اسے ایک سیکنڈ میں پہچان گیا۔ یہ جگت سنگھ کا چھوٹا بھائی گو بندر ہی تھا۔ ٹرائیوٹ اور ایوارڈز وغیرہ والے کمرے میں، میں نے اس کی تصویر بھی دیکھی تھی۔ مٹھائی لیے وہ ایک کمرے کے اندر اوجھل ہو گیا۔ باتوں کی آواز اسی کمرے سے آرہی تھی اور یہ کمرہ تاریک تھا۔

دیر ہو جائے۔ پر شام سے پہلے آ جاؤں گا۔“

”میرا خیال ہے کہ میں اپنی گن یہاں کمرے میں لے آؤں۔ ذرا اطمینان رہے گا۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ میں تمہیں خود ہی لادیتا ہوں۔“ اس نے کہا اور باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد وہ ایل ایم جی کو ایک چٹائی میں لپیٹ کر اندر لے آیا۔ گولیوں والا تھیلا بھی ساتھ ہی تھا۔ میں نے لوڈنگ ایک الماری کے پیچھے رکھ دی۔

جگت کے جانے کے بعد ہمارے ساتھ بس آشنا ہی رہ گئی۔ وہ ہمارا بہت خیال رکھ رہی تھی۔ اس نے دوپہر کا کھانا کھلایا اور دو تین بار دودھ پتی بھی پلائی۔ جگت نے کہا تھا کہ وہ شام تک واپس آ جائے گا مگر وہ نہیں آیا۔ میں انتظار کرتا رہا۔ رات گہری ہو گئی۔ ذہن میں کئی طرح کے اندیشے سر اٹھانے لگے۔ میں نے اس بارے میں آشنا سے پوچھا تو اس نے تسلی دی۔ وہ بولی۔ ”بھرا جی! پریشانی کی کوئی گل نہیں۔ وہ کئی دفعہ دیر سے آتے ہیں بلکہ کبھی کبھی تو رات بھی وہیں گزار دیتے ہیں۔ کئی وردی والوں سے ان کی یاری دوستی ہے۔ وہاں شکار کا گوشت پکاتے ہیں اور پیتے پلاتے ہیں۔“ آخری الفاظ اس نے ذرا مسکراتے ہوئے کہے۔

وہ بظاہر گھریلو عورت نظر آتی تھی۔ اپنے مرد کی ہاں میں ہاں ملانے والی اور اس کی خامیوں کو نظر انداز کرنے والی۔ وہ ہمیں سارا دن کام کرتی ہوئی ہی نظر آتی۔ کبھی بھینسوں کا دودھ دھورہی ہے، کبھی تندوری پر روٹیاں پکا رہی ہے، کبھی مکھن سے گھی نکال رہی ہے یا دودھ کو جاگ لگا رہی ہے۔ رات دس بجے کے قریب آشنا نے اعلان کیا کہ اگر جگت اب تک نہیں آیا تو اب سویرے ہی آئے گا۔ شاید دودھ دھونے کے وقت پہنچ جائے۔ اس نے ہم سے کہا کہ ہم آرام تسلی سے سو جائیں۔

مگر تسلی کہاں تھی۔ میرے ذہن میں مسلسل اندیشے سر اٹھا رہے تھے۔ کہیں کوئی گڑبڑ نہ ہو گئی ہو۔ بی ایس ایف یا پھر پاکستانی رنجرز نے اسے پکڑ نہ لیا ہو۔ انہیں رات والی کارروائی کا شک نہ ہو گیا ہو۔ ثروت بھی بالکل گم صم تھی۔ اس کا بخار ہلکا ضرور ہوا تھا مگر اس نے مکمل جان نہیں چھوڑی تھی۔ میں آٹھ دس فقرے بولتا تھا تو وہ اس کے جواب میں بس ایک فقرہ بولتی تھی۔ تین روز پہلے جو خونی واقعہ ہوا تھا، اس کے اثرات بھی اس کے دل و دماغ کو کچھ کے لگا رہے تھے۔ اس کے ذہن میں جو سب سے تکلیف دہ سوال تھا اور جو وہ کئی بار مجھ سے پوچھ بھی چکی تھی، یہ تھا کہ ہم واپس کیسے جائیں گے؟

میں اسے تسلی دے رہا تھا لیکن ٹھوس جواب میرے پاس بھی نہیں تھا۔ جو کچھ ہوا اتنا اچانک تھا کہ ہم اس کی مزاحمت ہی نہیں کر سکے تھے اور اب یہاں انڈین علاقے میں موجود

مذوں جیسی کرختگی تھی۔

”نہیں گوبندے! یہ ٹھیک نہیں ہے اور..... اور اس کڑی کا پاؤں بھی زخمی ہے۔ اتنا بڑا پٹابندھا ہوا ہے میں نے اس پر۔ بخار بھی ہے اسے۔“

”اوائے ہوئے۔ تو میں نے کون سا اس کو سیر سپاٹے کے لیے آگرے لے کر جانا ہے۔ آدھے پونے گھنٹے کی دل پشوری ہی تو کرنی ہے، کچھ نہیں ہوگا اسے۔“

”اور اگر وہ بندہ تیرے اندازے سے زیادہ ڈھاڈا (سخت) نکلا تو پھر؟“

”نہیں نکلے گا اور اگر نکلے گا تو اس کا علاج بھی میرے پاس ہے۔ ٹو بے فکر رہ۔ بس شانتی سے لیٹ یہاں۔“ گوبندر نے کہا اور اس کے ساتھ ہی گلاس اور بوتل لکرائے کی مدھم آواز بھی آئی۔ گوبندر شاید تھوڑی بہت پی بھی رہا تھا۔ بہر حال اس کی آواز میں شرایوں جیسی لڑکھڑاہٹ بالکل نہیں تھی۔

میں نے چار پانچ منٹ مزید ان کی گفتگو سنی۔ یہ کافی معلوماتی گفتگو تھی۔ اس گفتگو سے میں نے یہ انکشاف انگیز نتیجہ نکالا کہ آشا، جگت سنگھ کی دھرم پتی نہیں بلکہ محبوبہ ہے۔ وہ دو تین سال سے بغیر شادی کے ہی اس کے ساتھ اس سرحدی گاؤں میں رہ رہی ہے۔ جگت سنگھ کی اصل بیوی کہیں سورت نگر کے آس پاس رہتی تھی۔ جگت سنگھ، آشا کو بیاہ کر نہیں بلکہ کہیں سے بھاگ کر لایا ہوا تھا۔ اب وہ جگت کے ساتھ ساتھ گوبندر کی راتیں بھی چکا رہی تھی۔ معلوم نہیں کہ جگت کو اس کی خبر تھی..... یا وہ بے خبر تھا..... یا پھر باخبر ہو کر بھی بے خبر بنا ہوا تھا۔

جب مجھے اندازہ ہوا کہ گوبندر سنگھ کمرے سے نکلنے کی تیاری کر رہا ہے تو میں جلدی سے واپس اپنے کمرے میں چلا آیا۔ ثروت حالات کی سنگینی سے بے خبر سو رہی تھی۔ میں نے دروازے کو اندر سے کھنڈی لگائی اور گن الماری کے پیچھے سے نکال کر اپنی چار پائی کے نیچے اس طرح رکھ لی کہ نظر نہ آئے اور باسانی پکڑی بھی جاسکے۔ تب میں دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔

دو تین منٹ بعد دروازے سے باہر قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ پھر کسی نے بڑے زور سے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ثروت ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ میں تو پہلے ہی جاگ رہا تھا۔ ”کون؟“ میں نے پوچھا۔

”دروازہ کھولو۔ جلدی کرو۔“ گوبندر نے تیز لیکن دبی آواز میں کہا۔

ثروت ہراساں نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ ”تابلش! دروازہ نہ کھولیں۔“ وہ بولی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے تسلی دی اور بلب آن کر کے دروازہ کھول دیا۔

میرا دماغ سننا اٹھا۔ آج رات جگت سنگھ گھر میں موجود نہیں تھا۔ میں اور ثروت ہچکچاؤے والے کمرے میں سوئے ہوئے تھے۔ جگت کا چھوٹا بھائی شہر سے آیا تھا اور اب جگت کی پتی کے ساتھ کمرے میں تھا۔ کمرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔ میں نے میز سے ایک خالی گلاس اٹھایا۔ چند سیکنڈ بعد میں ننگے پاؤں اپنے کمرے سے نکلا اور اس بند کمرے کے قریب پہنچ گیا۔ اگر کوئی دیکھ لیتا تو دائرہ کمرے سے پانی لینے کا بہانہ نہایت معقول ثابت ہو سکتا تھا۔ میں ایک بند کھڑکی کے قریب پہنچا تو اندر سے ابھرنے والی آوازیں واضح سنائی دینے لگیں۔ شاید اندر وہ پلنگ، کھڑکی کے بالکل پاس تھا جہاں آشا اور جگت موجود تھے۔ میں نے دلیری کی اور کھڑکی سے کان لگا دیئے۔ اندر ہونے والی مدھم گفتگو بھان خیز تھی۔ جگت اور آشا ناگفتہ بہ حالت میں تھے۔ غالباً وہ اکٹھے ہی لیٹے تھے اور کھلی ڈلی گفتگو کر رہے تھے۔

آشانی بے تکلف لہجے میں کہا۔ ”کچھ خیال کر گوبندے! وہ تیرے وڈے بھرا کے پروہنے (مہمان) ہیں۔ وہ کیا سوچے گا؟“

گوبندر بولا۔ ”اوائے چھڈ اس بات کو۔ وڈے بھرا کے جس طرح کے پروہنے یہاں آتے ہیں ان سب کا ہمیں پتا ہے۔ کوئی پوڈر فروش ہوتا ہے۔ کسی کے پیچھے پولیس لگی ہوتی ہے۔ کوئی زانی کو بھگا کر لایا ہوتا ہے۔ کسی کو زانی بھگا کر لائی ہوتی ہے۔ مجھے بھی یہ دونوں ایسے ہی بھگوڑے لگتے ہیں۔ ویسے یہ دونوں پینڈو ہیں کہ شہری؟“

آشا کی آواز آئی۔ ”کپڑوں اور گل بات سے تو کسی پنڈے کے ہی لگتے ہیں۔ پر یہ جو کڑمی ثروت ہے نا، یہ کچھ پڑھی لکھی بھی لگتی ہے۔“

”پڑھی لکھی ہوتی تو اس طرح کے کام کرتی؟ یہ ساری دونمبریاں ہیں۔ تمہیں نہیں پتا۔“

”کچھ بھی ہے گوبندے! میں تجھ کو یہ غلط کام نہیں کرنے دوں گی۔ ٹو نے جو ٹھکر جھاڑنا ہے مجھ سے جھاڑ لے۔ میں ہوں نا تیرے پاس۔“

”اوائے میں کب کہتا ہوں کہ ٹو نہیں ہے میرے پاس۔ پر کبھی کبھی منہ کا سوا بد لنے کو بھی تو من کرتا ہے نا..... کڑی سوہنی ہے اور مجھے لگتا ہے کہ بندہ بھی کچھ زیادہ آکڑشا کر نہیں دکھائے گا۔“

”کیوں نہیں دکھائے گا؟“ آشانے پوچھا۔

”بس نہیں دکھائے گا۔ چور کے پاؤں نہیں ہوتے اور اس طرح بارڈر پار کرنے والے چور ہی تو ہوتے ہیں۔ ٹو دیکھنا، میں کس طرح ان دونوں کو اپنے کینڈے میں لاتا ہوں۔ جو کہوں گا، وہی کریں گے اور دیکھنا ساتھ منت ترا بھی کریں گے۔“ گوبندر کی آواز میں کپکپ

”تمہاری وڈی پھوپھی نے جا کر بتایا ہے ان کو۔“ وہ سخت طنزیہ لہجے میں بولا۔ ”اوئے بے وقوفا! یہ لوگ تو اڑتی چڑیا کے پر گنتے ہیں۔ بندہ سامنے سے گزرے تو اس کی سات پشتوں کا ایک سرے اُتار لیتے ہیں۔“

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ جگت کی اطلاع کے مطابق وہ واقعی غصیلا اور آتش پافخص تھا۔ اسے دیکھ کر ہی اندازہ ہو جاتا تھا کہ اس کی ہڈی بڑی سخت ہے اور لڑائی مار کٹائی اس کا پیشہ ہے۔ اس کی حرکات و سکنات میں چھپتے کی سی تیزی تھی۔ وہ اپنی چمکیلی آنکھیں میری آنکھوں میں گاڑ کر بولا۔ ”وہ لوگ ایک پاکستانی جوڑے کو ڈھونڈ رہے ہیں۔ اسی لیے تم دونوں کا ایک کمرے میں رہنا بالکل ٹھیک نہیں۔ اس کڑی کو وہاں بھیج دو بھابو کے پاس۔ اگر تمہیں لگے کہ کوئی کمرے کی طرف آ رہا ہے تو یہ پچھلی والی کھڑکی کھول کر باہر چھال مار دینا۔ ساتھ ہی پرالی والی کوٹھڑی ہے۔ پرالی کے کچھے چھپ جانا۔ لیکن پہلے اس کمرے میں سے اپنی نشانیاں ختم کرو۔ کوئی ایسی ویسی چیز نظر نہیں آتی چاہیے۔“

میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔ اس کی نگاہیں جیسے ثروت کا اسکین کر رہی تھیں۔ وہ اسے گھورتے ہوئے بولا۔ ”چلو آ جاؤ تمہیں بھابو کے پاس لے چلتا ہوں۔“ ثروت نے ڈری ہوئی سوالیہ نظروں سے مجھے دیکھا۔ وہ ہرگز جانا نہیں چاہتی تھی۔ میں نے کہا۔ ”بھائی صاحب! یہ ویسے شاید نہ مرے لیکن ڈرڈر کر ضرور مر جائے گی۔ اسے میرے پاس ہی رہنے دیں یا پھر ہم دونوں کو لے چلیں۔“

”تیرے کھوپڑے میں دماغ ہے یا گوبر؟ سمجھ میں نہیں آرہی میری بات۔ وہ چیز کر رکھ دیں گے تم دونوں کو۔ تمہارے ساتھ ساتھ ہمارا بھی حشر نشر ہو جائے گا۔ کر پا کرو ہمارے حال پر۔“ پھر وہ ثروت سے مخاطب ہوا۔ ”چل کڑیے، مجھے پتا ہے یہ سارا پواڑا تیری وجہ سے ہی پڑا ہے۔“

”مجھے نہیں جانا۔“ ثروت نے لرزاں آواز میں کہا۔ ”ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔ بیٹھی رہ یہاں اپنے اس یار کی گود میں..... بیٹھی رہ..... میں جاتا ہوں۔“

”کہاں جا رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔ ”سیکیورٹی والوں کے پاس۔ وہ خود تمہیں پکڑیں گے تو ساتھ میں ہماری بھی کڑا کے نکال دیں گے۔ بہتر ہے کہ میں خود ہی ان کو انفارم کر دوں۔“

میں نے اس کا بازو تھاما۔ ”نہیں یار! ہم پروہنے (مہمان) ہیں تمہارے وڈے بھائی

گو بندر تیزی سے اندر آیا اور کرخت آواز میں بولا۔ ”خود مرو گے اور ہمیں بھی مرواؤ گے۔ بند کرو یہ بلب۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے ہاتھ بڑھا کر بلب کا سوئچ آف کر دیا۔ کمرے میں ایک بار پھر کھڑکی سے آنے والی مدہم روشنی ہی رہ گئی۔

”کون ہیں آپ؟“ میں نے عام سے لہجے میں پوچھا۔ ”مالک ہوں اس گھر کا..... جگت سنگھ کا چھوٹا بھائی ہوں۔ پنڈ میں بی ایس ایف والے آئے ہیں۔ گھر گھر تلاشی لے رہے ہیں۔ انہیں کوئی شک ہے اور..... اور مجھے لگتا ہے کہ تمہارا ہی شک ہے۔“ وہ خوفزدہ کرنے والے انداز میں بولا۔

تب اس نے سر تا پا ثروت کو گھورا۔ وہ اڑھنی لپیٹے مٹی سمنائی کھڑی تھی۔ بالوں کی چند ٹہنی زخساروں پر جھول رہی تھیں۔ ”یہ کیا لگتی ہے تیری؟“ اس نے پوچھا۔ ”بیوی ہے۔“

”منہ بولی لگتی ہے۔ بھاگ کر آئے ہو بارڈر پار سے؟“ اس نے پولیس والوں کے انداز میں پوچھا۔

”جگت سنگھ جانتا ہے سب کچھ۔“ میں نے جواب دیا۔ ”بھائی جانتا ہوتا سب کچھ تو اس طرح کا بھیڑا پنکا ہی نہ لیتا۔ مجھے لگتا ہے کہ تم نے اسے بھی اُلو بنایا ہے۔ اچھا اب آواز شواز نہ نکالنا۔ دروازہ اندر سے بند کرو اور چپ چاپ پڑے رہو یہاں۔ ورنہ تمہارے ساتھ ساتھ ہماری چڑی بھی اُدھر جائے گی۔ وہ لوگ گلی میں ہی کھڑے ہیں۔ میں جا کر بات کرتا ہوں ان سے۔“

وہ ہمیں کھا جانے والی نظروں سے دیکھتا ہوا باہر چلا گیا۔ یہ بات تو ٹھیک تھی کہ بارڈر سیکیورٹی والے گاؤں میں آتے جاتے رہتے تھے۔ لوگوں کو جمع کر کے باقاعدہ شناخت پریڈ اور گنتی وغیرہ بھی ہوتی تھی مگر فی الوقت گو بندر سر اسر ڈراما کر رہا تھا۔

ثروت ہراساں تھی۔ میں نے اسے تسلی دی اور کہا کہ وہ آرام سے بیٹھ جائے۔ اگر یہ بندہ واپس آئے اور کوئی اُلٹی سیدھی بات کرے تو قتل سے سن لے۔

حسب توقع آٹھ دس منٹ بعد گو بندر پھر دندناتا ہوا اندر آ گیا۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کیا اور غصیلے لہجے میں بولا۔ ”گرو نے کرپا کی ہے تم پر۔ سمجھو بال بال بچے ہو لیکن ابھی خطرہ ملنا نہیں ہے۔ ان کی جب گلی میں ہی کھڑی ہے۔ وہ خود نمبر دار کی بیٹھک میں چاؤ وغیرہ پی رہے ہیں۔ ان کو شک ہے کہ تم دونوں اس گلی کے ہی کسی گھر میں موجود ہو۔“

”ان کو شک کیسے ہوا؟“ میں نے پوچھا۔ میں نے اپنا بلب ولجھ دیا بتاتی ہی رکھا تھا۔

کے۔ ایسا نہ کرو ہمارے ساتھ۔“

”تو پھر ویسا کرو جیسا کہہ رہا ہوں۔ اس کو بھیج دو میرے ساتھ۔ اس کے ٹنگیے نہیں اُتر جائیں گے۔ اور اتنی چوچی نہیں ہے جتنی بن رہی ہے۔ تیرے ساتھ بھاگی بھاگی پھر رہی ہے۔ راتیں گزار رہی ہے۔ ایسی کڑیاں بڑی کھوپل ہوتی ہیں۔“ گوبندر کا لہجہ واضح ہوتا جا رہا تھا۔ غالباً اسے یقین ہو گیا تھا کہ ہم دونوں مفور ہیں..... اور ایک بھاگی ہوئی مفور لڑکی سے مستفید ہونے کا اسے بھی اتنا ہی حق ہے جتنا مجھے ہے۔

میری خاموشی نے اس کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ بہت ہوشیار ہونے کے باوجود میرے بارے میں قطعی غلط اندازہ لگا رہا تھا۔ وہ کچھ دیر مجھے گھورتا رہا پھر اس نے اپنا ہاتھ ثروت کی طرف بڑھایا اور بولا۔ ”چلو۔“

میں نے اس کا راستہ روکا اور مستحکم انداز میں کہا۔ ”نہیں گوبندر! یہ یہاں سے نہیں جائے گی۔“

”اگر یہ میرے ساتھ نہیں جائے گی تو پھر بی ایس ایف والوں کے ساتھ جائے گی۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔“ وہ آگے بڑھا۔

”چھوڑ دو۔“ میں نے کہا۔

”اگر نہ چھوڑوں تو؟“ وہ سر تاپا آتش تھا۔

میری نگاہوں میں کچھ بھولے بسرے منظر گھوم گئے۔ مجھے لگا کہ آج پھر میرے کالج کے زمانے کا غنڈاواہی ایک نئی صورت میں پھرے سامنے کھڑا ہے۔ وہ پھر ثروت کو مجھ سے دور لے جانا چاہ رہا ہے لیکن آج میں بے بس نہیں تھا۔ میں آگے بڑھنے والے کا راستہ روک سکتا تھا اور مارنے والے کے ہاتھ توڑ سکتا تھا۔ میں نے گوبندر کی توانا کلائی پر ہاتھ ڈالا اور ایک جھٹکے سے اس کی گرفت ثروت پر سے ختم کر دی۔ اس کی آنکھوں میں برق لہرائی۔ اس نے اُلٹے ہاتھ کی زوردار ضرب میرے چہرے پر لگانی چاہی۔ میں نے اس کی دوسری کلائی بھی تھام لی۔ اس کی آنکھوں میں ایک لمحے کے لیے حیرت چمکی۔ شاید اسے توقع نہیں تھی کہ میں اتنی تیزی دکھاؤں گا اور میری گرفت بھی اتنی سخت ہوگی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ”اگر لڑنے کا اتنا ہی شوق ہے تو اپنے ”جم“ میں چلے چلو۔ وہیں دودو ہاتھ کر لیتے ہیں۔“

وہ سنبھل کر پھٹکارا۔ ”جانتے ہو میں کون ہوں؟“

”نہیں جانتا..... اور تم بھی نہیں جانتے۔“

”میں لڑنے والے کی کم از کم ایک ہڈی ضرور توڑتا ہوں۔“

”چلو دیکھ لیتے ہیں۔“ میں نے اس کی کلائیاں چھوڑتے ہوئے کہا۔

اس نے ایک بار پھر دھیان سے مجھے سرتاپا دیکھا۔ غالباً پہلی بار اس کی نظر میرے ہاتھ پاؤں کی غیر معمولی جلد پر بھی پڑی۔ وہ میرے حوالے سے اُبھن میں نظر آنے لگا۔ جیسے سمجھ نہ پا رہا ہو کہ میں جس حیثیت سے نظر آ رہا ہوں، وہ میری اصل حیثیت ہے یا نہیں۔ وہ اپنے دونوں ہاتھ کولہوں پر رکھتے ہوئے بولا۔

”کوئی بھیس شیس بدلا ہوا ہے تم نے؟“

”اس دنیا میں تو ہر کوئی بہرہ ویا ہے۔ تم کام کی بات کرو۔ ہماری جان چھوڑنی ہے یا لڑکی چھوڑنی ہے؟“

اس نے معنی خیز انداز میں سر ہلایا۔ پھر لمبی سانس لے کر بولا۔ ”لگتا ہے کہ اپنی فیلڈ کے ہی بندے ہو لیکن بے استاد ہو۔ کہاں ٹریننگ کرتے رہے ہو؟“

”گلیوں میں اور سڑکوں پر اور ہر اس جگہ جہاں تم جیسے منہ زور دولتیاں جھاڑتے پھرتے ہیں۔“

”چلو آ جاؤ..... آ جاؤ پھر۔“ اس نے فرط طیش میں میرا بازو پکڑ لیا اور تقریباً کھینچتا ہوا باہر لے آیا۔ اس نے کمرے کا دروازہ باہر سے بند کر دیا جیسے اسے ڈر ہو کہ ثروت موقع سے فائدہ اٹھا کر بھاگ جائے گی۔ اس کا رخ اپنے جم نما ڈھارے کی طرف تھا۔ وہ غالباً مجھے جان بوجھ کر اس کمرے کے اندر سے لایا جہاں اس کی ٹرافیاں اور لاتعداد کپ سجے ہوئے تھے۔ مارا ماری کی تصویریں بھی تھیں۔ اس نے جیسے بزبان خاموشی مجھے میرے ارادے سے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔

دو منٹ بعد ہم ڈھارے کے کچے فرش پر ایک دوسرے کے سامنے تھے۔ گوبندر نے دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا اور بلب آن کر لیا تھا۔ اس نے بڑے گھنڈی انداز میں اپنی دھاری دار شرٹ اُتار کر ایک طرف رکھی۔ وہ مجھے نگاہوں میں تول رہا تھا۔ غالباً یہ بات اس کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھی کہ میں اتنے اعتماد سے اس کے مد مقابل کیوں آ گیا ہوں۔ حالانکہ اس کے بارے میں سب کچھ جان چکا ہوں۔

جب اس نے دیکھا کہ میں واقعی اس سے دودو ہاتھ کرنے کے لیے تیار ہوں تو اس نے جارحانہ انداز میں اپنی دونوں منھیاں بھینچیں اور میرے زور و رو ہو گیا۔ میرے ہاتھ پر بھی جیسے مٹھلی ہو رہی تھی اور میں فائننگ کے موڈ میں تھا۔ میں نے باقاعدہ کھلاڑیوں کے انداز میں

اسے ”بو“ کیا، تاہم اس نے میرے سامنے جھکنے کی زحمت نہیں کی۔

پہلا وار اسی نے کیا۔ بجلی کی سی تیزی سے اس نے ٹانگ چلائی۔ کراٹے کی زبان میں اسے ”اپر پام“ کہا جاتا ہے۔ یہ عموماً مد مقابل کی پسلیوں یا کینٹی کو نشانہ بناتی ہے۔ گوبندر نے میری کینٹی کو نشانہ بنایا تھا۔ میر نے اطمینان سے یہ وار روکا۔ اس کے فوراً بعد گوبندر نے گھوم کر بڑی مہارت سے بیک کب لگائی۔ میں نے پیچھے ہٹ کر یہ وار بچایا۔ اس وار نے مجھے سمجھا دیا کہ گوبندر واقعی ایک ماہر ”لڑاکا“ ہے اور میں اسے کسی صورت ”ایزی“ نہیں لے سکتا۔ اس کے اس وار کے بعد ہم دونوں میں گھمسان کارن پڑ گیا۔ شروع میں، ہمیں دھیمارہا لیکن پھر گوبندر کو کچھ کاری ضربیں لگائیں۔ اسے میرے معیار اور ”کیلیمیر“ کا اندازہ ہوا اور اس کی حرکات میں جارحیت کے بجائے دفاعی انداز نمودار ہو گیا۔ اس کے چہرے پر کچھ حیرت بھی تھی۔ وہ ذرا ہانپا ہوا نظر آیا تو میں نے مزید چڑھائی کی۔ پھر ایک زوردار لٹ کھا کر وہ سینڈ بیگ سے ٹکرایا اور گھومتا ہوا رنگ مشین پر جا گرا۔ میں نے اسے اٹھنے کا موقع دیا اور ایک بار پھر سخت حملہ کیا۔

اس مرتبہ گوبندر کے ناک منہ سے خون چھوٹ گیا اور اس کی پشت کا دیوار سے شدید تصادم ہوا۔ وہ گھٹنوں کے بل گر گیا۔ اس کے بال عقب سے گرد آلود تھے۔ میں نے پھر اسے اٹھنے کی وافر مہلت دی۔ وہ ایک چنگھاڑ کے ساتھ مجھ پر آیا۔ اس کا ہک بیچ یقیناً مہلک ثابت ہوتا لیکن میں خود کو بچا گیا۔ سزا کے طور پر میں نے اس کی دونوں ٹانگوں کے درمیان ضرب لگائی۔ وہ سہمہ نہ سکا اور چوٹ کھا کر گرا اور پھجلی کی طرح تڑپنے لگا۔ میں نے تیسری بار اسے اٹھنے کی مہلت دی لیکن اس بار گوبندر نے لیٹے رہنا ہی مناسب سمجھا۔

میں نے کہا۔ ”کپ اور ٹرافیاں ہر کسی کو ناک آؤٹ نہیں کر سکتیں۔ بعض لوگوں کے ساتھ لڑنا بھی پڑتا ہے۔“

وہ کراہتا رہا۔ میں نے سہارا دے کر اسے اٹھایا اور ایک کرسی پر بٹھایا۔ پھر ایک تولیہ لیا جس سے اس نے اپنا خون آلود منہ پونچھا۔ وہ ایک دم ٹھنڈا ٹھار نظر آ رہا تھا۔ باہر سے آٹھانے دروازہ کھٹکھٹانا شروع کر دیا تھا۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیا کر رہے ہو تم دونوں؟“

گوبندر نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”کچھ نہیں۔ سب ٹھیک ہے۔ تم جاؤ اپنے کمرے میں۔“

وہ واپس چلی گئی۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں اور گوبندر گھر کی بیٹھک میں بیٹھے تھے اور

چینی کے پیالے میں دودھ پتی پینے کے ساتھ ساتھ باتیں بھی کر رہے تھے۔ گوبندر کی ایک آنکھ کے نیچے کافی بڑا نیل تھا۔ وہ جیسا بھی تھا لیکن اس نے اسپورٹ مین شپ کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنی ہار تسلیم کی تھی اور باقاعدہ اپنے رویے کی معذرت بھی چاہی تھی۔ باتوں باتوں میں اس نے مجھے یہ بھی بتا دیا کہ گاؤں میں بی ایس ایف والے نہیں آئے اور اس حوالے سے خیریت ہی ہے۔ وہ نہ صرف ذہنی طور پر مجھ سے مرعوب ہو چکا تھا بلکہ جسمانی طور پر میری برتری بھی تسلیم کر چکا تھا۔

میرے ساتھ فائٹ شروع ہوتے ہی اسے یقین ہو گیا تھا کہ میں باقاعدہ تربیت یافتہ ہوں اور اس شعبے میں اس سے کہیں آگے ہوں۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی جان چکا تھا کہ ہم نے دیہاتیوں کا بھیس بدل رکھا ہے ورنہ ہم دونوں پڑھے لکھے شہری ہیں۔ میں بھی اب اس سے بات کرتے ہوئے دیہاتی لب و لہجہ کا اہتمام نہیں کر رہا تھا۔

اب وہ مارشل آرٹ کے حوالے سے مجھ پر سوالوں کی بوچھاڑ کر رہا تھا اور جاننا چاہتا تھا کہ میں نے اس فیلڈ میں کب قدم رکھا اور کیسے یہاں تک پہنچا؟ وغیرہ وغیرہ۔ میں نے موقع محل کے لحاظ سے ان سوالوں کے جواب دیئے اور اسے مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

اب وہ مجھے احترام کے انداز میں صادق صاحب اور صادق بھائی کہہ کر مخاطب کر رہا تھا۔ اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کے بڑے بھائی جگت کو اس بارے میں کچھ نہ بتاؤں۔ بس نشے کی حالت میں اس سے غلطی ہوئی جس کے لیے وہ بہت شرمندہ ہے۔ میں نے وعدہ کیا کہ اس بارے میں، میں جگت کو بے خبر رکھوں گا۔ گوبندر نے اپنے بارے میں بھی کچھ باتیں بتائیں۔ اس نے امید ظاہر کی کہ وہ شاید اگلے ماہ انڈیا کے نیشنل کھیلوں میں حصہ لینے کے لیے نئی دہلی جائے گا۔ وہ اب جان چکا تھا کہ میں اور ثروت کسی خاص مقصد کے تحت یہاں اس سرحدی گاؤں میں موجود ہیں مگر اس نے مجھے اس بارے میں زیادہ کریدنے کی کوشش نہیں کی۔

جگت سنگھ کی واپسی اگلے روز دس بجے کے قریب ہوئی۔ اس کی جگہ آٹھانے گوبندر کے ساتھ مل کر بھینسوں کا دودھ دھویا۔ جگت سنگھ نے چھوٹے ساتھ ہی چھوٹے بھائی کو آڑے ہاتھوں لیا اور اس سے پوچھا کہ اس کے تھوڑے پر نیل کیوں پڑے ہیں؟ اس نے کس کے ساتھ مار دھاڑ کی ہے۔ گوبندر نے معقول بہانہ بنایا کہ یہ کسی مار دھاڑ یا اسٹریٹ فائٹ کا نتیجہ نہیں بلکہ ایک ٹریننگ باؤٹ یعنی تربیتی مقابلے کے دوران ہوا ہے۔ پتا نہیں کہ جگت کو یقین آیا یا نہیں۔ بہر حال اس کے سوال جواب کا سلسلہ ضرور رک گیا۔ آٹھانے بھی گوبندر کی

تھا۔ اس کے بارے میں کچھ پتا چلا ہے تمہیں؟“
جگت نے معاملہ فہم نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا۔ ”وہ تمہارا ساتھی تھا؟“
”یہی سمجھ لو۔“

”ٹھیک ہے، پتا کرا لیتے ہیں اس کا بھی۔ کیا نام تھا اس کا؟“
”راجا۔“ میں نے کہا۔

”وہ تمہارے ساتھ ہی پہلی حویلی گیا تھا؟“
”نہیں..... بعد میں آیا تھا۔“

”اس یوسف نامی بندے کے سلسلے میں ہی؟“

”ہاں.....“ میں نے کہا پھر ذرا توقف سے پوچھا۔ ”یوسف کے بارے میں اور کیا پتا چلا ہے تمہیں؟“

اس نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔ ”لو سب کچھ ایسے ہی ایک دم پوچھ لو گے۔ نہیں بادشاہ زادے! یہ تو رک رک کر بتانے کا زمانہ ہے۔ اب دیکھ لو اخباروں، رسالوں میں جو کہانیاں شہانیاں آتی ہیں یا پھر ٹی وی پر دھڑا دھڑا جو زنانہ ڈرامے چلتے ہیں، سب رک رک کر بتاتے ہیں اور تو اور اب تو فلمیں بھی ٹوٹوں میں آنے لگی ہیں۔ پارٹ دو اور پارٹ تین وغیرہ وغیرہ۔“

”لیکن یہ کوئی فلم تو نہیں ہے یا! ایک بندے کی زندگی موت کا سوال ہے۔“
”ہاں..... یہ گل تو ٹھیک ہے۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا۔ پھر اس نے اپنے تہہ بند کی ڈب میں سے شراب کا پوانا نکالا۔ ڈھکن کھول کر دو تین گھونٹ لیے اور اپنی جھاڑ جھکاڑ داڑھی سے قطرے پونچھ کر بولا۔ ”پہلے مجھے یہ بتاؤ کہ یوسف نام کا بندہ اصل میں ہے کون اور تمہارے ساتھ اس کا کیا سمبندھ ہے۔“

”سمجھ لو کہ میرا عزیز ہے۔ اسے ڈھونڈنا میرے لیے بہت ضروری ہے۔“
وہ ہنسا اور اپنی گھنی مونچھیں سنوار کر بولا۔ ”چنگا تماشا ہے۔ جس کو ڈھونڈا جاتا ہے وہ آگے ہوتا ہے، ڈھونڈنے والا پیچھے۔ پر یہاں تم پہلے ہمارے علاقے میں آگئے ہو، جس کو ڈھونڈ رہے ہو وہ بعد میں آیا ہے۔“
”کہاں ہے وہ؟“

”ابھی پکا پتا تو نہیں چلا ہے مگر صرف یہ سنا ہے کہ وہ فاضلکا کے قریب کسی وڈے وڈیرے کے پاس پہنچایا گیا ہے۔“

چوٹوں کے بارے میں کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ یقیناً وہ اور گو بندر ایک دوسرے کے ”رازدار“ بھی تھے۔

جگت سنگھ کے چہرے پر مجھے دبا دبا جوش نظر آ رہا تھا۔ مجھے یوں لگا کہ وہ مجھے کچھ بتانا چاہتا ہے۔ میرا اندازہ اس وقت درست ثابت ہوا جب بھینسوں کو چارا وغیرہ ڈالنے کے بعد جگت سنگھ میرے ساتھ علیحدہ کمرے میں آ بیٹھا۔ وہ دروازہ بند کر کے بولا۔ ”اس رات چودھری انور کا کافی ستیاناس کیا ہے تم نے..... پانچ بندوں کے ساتھ دو گھوڑیوں کے پران بھی گئے ہیں۔ دو تین بندے سخت پھسل بھی ہیں۔ میں نے سب پتا کر لیا ہے۔“

میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ ”تم..... بارڈر پار گئے تھے؟“
”اونیس یار! ہم پار نہ بھی جائیں تو وہاں کی خبریں اُڑ کر ہمارے پاس آ جاتی ہیں۔ مجھے جانکاری مل گئی ہے کہ چودھری انور کے ساتھ تمہارا کیا ٹینٹا ہوا ہے اور کیسے؟“
میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

وہ بولا۔ ”یہ جو کڑی تیرے ساتھ ہے نا، اس کا پتی یوسف غائب ہوا ہے۔ تم دونوں اسے لھٹے لھٹے (ڈھونڈتے ڈھونڈتے) چودھری انور گنجے کی حویلی تک پہنچے ہو۔ وہاں تم پکڑے گئے ہو اور پھر بھاگے ہو۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟“
”نہیں۔“ میں نے اپنے تعجب کو چھپاتے ہوئے کہا۔

”ایک اور اطلاع ہے اور مجھے وشواس ہے کہ اسے سن کر تمہیں ضرور پانچ ہزار دولٹ کا جھٹکا محسوس ہوگا۔ اور وہ یہ کہ..... اس کڑی کا پتی یوسف دو اور لڑکیوں کے ساتھ بارڈر پار کر کے انڈیا پہنچ چکا ہے۔ اسے پہنچانے والے چودھری انور گنجے کے لوگ ہی ہیں۔“
مجھے اپنے جسم میں سنناٹ محسوس ہوئی۔

”تم یہ بات کیسے کہہ سکتے ہو؟“ میں نے پوچھا۔
”جیسے دوسری ساری باتیں کہہ سکتا ہوں۔“ اس نے ترنت جواب دیا۔ ”اور اس بات کا وشواس رکھ، میں جو کہوں گا وہ انکر دی کر پاسے ٹھیک ہی کہوں گا۔“
”تمہیں یہ باتیں کس کے ذریعے معلوم ہوئی ہیں؟“

”سب باتیں، کسی کو کسی ذریعے سے ہی معلوم ہوتی ہیں یا! تم یہ بتاؤ۔ میں نے جو کچھ کہا ہے غلط تو نہیں ہے؟“

میں اثباتی انداز میں خاموش رہا۔ پھر میرا دھیان راجا کی طرف چلا گیا۔ میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”اچھا..... اس لڑائی میں ایک بندہ پہلی حویلی کے قریب بھی زخمی ہوا

میں سنائے میں تھا۔ بہر حال ابھی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں تھا۔ میں نے کہا۔
 ”جگت سنگھ! میں نہیں چاہتا کہ یوسف کی بیوی کے کانوں میں ان باتوں کی بھنگ بھی پڑے۔
 وہ پہلے ہی بہت دکھی ہے۔ ہمیں اس کا ذکر کم کرنا ہے، بڑھانا نہیں۔“
 جگت سنگھ نے مونچھیں مروڑ کر کہا۔ ”آپاں (ہم) یاروں کے یار ہیں تاہم! تو چنانہ
 کر۔ تو جو کہے گا ویسا ہی ہوگا۔ میں ایک آدھے دن میں پتا کراتا ہوں چھوٹی بھین کے اس
 وگڑے گٹرے پتی کا۔ اگر مجھے خود فاضلکا جانا پڑا تو خود بھی چلا جاؤں گا۔ تو یہاں آرام کر اور
 کھاپی۔ چھوٹی کے پاؤں کو بھی مرہم پٹی کی لوڑ ہے۔ وہ ٹھیک ہو جائے تو پھر آگے کا سوچتے
 ہیں۔“

رات کو ثروت بہت خاموش اور اُداس نظر آئی۔ اس نے کھانے میں بھی چند لٹے ہی
 لیے تھے۔ اس کا بخار اتر گیا تھا مگر کمزوری باقی تھی۔ میں نے بہت اصرار کر کے اسے تھوڑا سا
 دودھ پلایا۔ وہ چپ چاپ لیٹ گئی۔ وہ اپنے بیمار سر کے لیے بہت پریشان تھی۔ وہ انہیں
 بس یہ بتا کر آئی تھی کہ ایک دو روز کے لیے پیر تھانوی صاحب کے پاس ہارون آباد جا رہی
 ہے۔ سرفاروقی کو پہلے ہی بیٹے کی گمشدگی نے ہلکان کر رکھا تھا، اب بہو بھی لاپتا ہو گئی تھی۔
 یقیناً ان پر قیامت گزر رہی تھی۔ ثروت، یوسف کے لیے بھی از حد پریشان تھی۔ میں اس کی
 پریشانی بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ لہذا اسے یہ نہیں بتایا کہ جگت کے مطابق یوسف کو بھی
 بارڈر پار کر کے انڈیا پہنچا دیا گیا ہے۔



مجھے طبیعت میں کسلمندی محسوس ہو رہی تھی۔ شاید موسم میں تبدیلی کا اثر تھا۔ رات تک
 مجھے تیز بخار ہو گیا مگر میں ثروت کو بتا کر اس کی پریشانی میں اضافہ کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اسپرین
 کی گولیاں کھا کر سو گیا۔ رات کسی وقت اٹھا تو پورا جسم آگ کی طرح پھنک رہا تھا۔ گلا خشک تھا
 اور دماغ پر دھند سی چھائی ہوئی تھی۔ میں نے کولر سے پانی پیا۔ دروازہ بند کر کے واپس بستر پر
 آیا تو نظر ثروت پر پڑی۔ نیند کی حالت میں اس کا ملیح چہرہ معصومیت اور پاکیزگی کی تصویر تھا۔
 پتا نہیں کیا ہوا کہ میں اٹھ کر اس کی چار پائی کے بازو پر جا بیٹھا۔ میں نے اس کے چہرے پر
 جھونکے والی دوریشمی لٹیں پیچھے ہٹائیں اور عجب والہانہ پن سے اس کے چہرے کو سہلانے
 لگا۔ ایک ایک کی پلکوں میں جنبش نظر آئی اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ کھڑکی سے آنے
 والی مدھم روشنی میں اس نے مجھے دیکھا۔ حسین آنکھوں کے شبستان کچھ دیر خالی رہے پھر
 اس نے آنکھیں موند لیں۔ کچھ عجیب سی کیفیت تھی اس کے چہرے پر۔ اس کی لمبی پلکوں کے

”کس لیے؟“

”یہ بھی پتا نہیں۔ یہ باتیں تو وہاں جا کر ہی معلوم ہو سکتی ہیں۔ یہ بھی پتا چلا ہے کہ دو
 کڑیاں انڈیا آئی ہیں، ان کی شکلیں مشہور فلمی اداکاروں سے ملتی جلتی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ
 یوسف نامی منڈا ابھی کسی خاص بندے سے ملتا جلتا ہو اور اس سے ان لوگوں نے کوئی خاص
 کام لینا ہو۔ کسی کو چکر شکر میں ڈالنا ہو۔“

میں سوچ میں پڑ گیا۔ انڈیا میں پنجابی فلمیں بھی بہت بنتی ہیں۔ یہ عین ممکن تھا کہ
 یوسف کی شکل پنجابی فلموں کے کسی اداکار سے ملتی ہو۔ جس کو ہم نہ جانتے ہوں یا پھر اس طرح
 کا کوئی اور معاملہ ہو سکتا تھا۔

جگت سنگھ بولا۔ ”مجھے ایک اور گل کا بھی پتا چلا ہے۔ یہ تمہارا رشتے دار یوسف چنگی بھلی
 طوائف بازی بھی کرتا ہے۔ اپنی اسی طوائف بازی کی وجہ سے یہ ان لوگوں کے ہتھے بھی چڑھا
 ہے۔ سنا ہے کہ اس نے لاہور میں کسی بڑی مہنگی طوائف کے ساتھ رنگ رلیاں منائی تھیں اور
 جب.....“

”جگت سنگھ۔“ میں نے تیزی سے اس کی بات کاٹی۔ ”آہستہ بول یار! اس کی بیوی
 بھی یہاں ہے۔“

”اچھا..... وہ دو چاری بے خبر ہے۔ ویسے یہ پتیاں عام طور پر بے خبر ہی ہوتی ہیں۔“ وہ
 مسکراتے لہجے میں بولا۔ شاید اسے اپنی چٹی کا خیال آ گیا تھا جو سورت نگر کے آس پاس کہیں
 رہتی تھی۔

”اچھا..... یہ باتیں تجھے بتائی کس نے ہیں؟“

”یار! تو آم کھا درخت نہ گن..... مجھے تو یہ پتا بھی چلا ہے کہ وہ طوائف کسی فلمی ہیروئن
 سے بہت ملتی جلتی ہے اور سیدھی تیر کی طرح لگی ہے تیرے اس یار کے سینے میں۔ تیرے یار
 نے اس کو اپنے حق میں بٹھانے کی گل بھی کی ہے۔“
 ”حق میں بٹھانے کی؟“

”آہو یار! جب کسی کسی طوائف کو کام سے روکا جاتا ہے اور اپنے لیے سنبھال لیا جاتا
 ہے تو اسے حق میں بٹھانا کہتے ہیں لیکن وہ کوئی معمولی طوائف نہیں ہے۔ اس نے کافی پیسہ مانگا
 ہے پابند ہونے کا۔ شاید ادھے سال کا کوئی ڈیڑھ کروڑ روپیہ۔ تیرے اس یار یوسف نے اس
 پر بھی تقریباً ”ہاں“ کر دی ہے۔ بازاری زبانی میں کرنٹ ہو تو بندہ ایسے ہی لوٹو پوٹو ہو جاتا
 ہے اور یہ ساری کچی خبریں ہیں بادشاہ زادے۔“

بچے سے وہ سوتی نکلے اور اس کے زخموں پر پہنچے گئے۔ اس نے ہوا جتنا ہوا ہاتھ اپنے
 دونوں ہاتھوں میں لٹکھا ہر سرے ہاتھ پر اپنی بیانی لٹائی اور کہنے لگی۔ جیسے وہ کوئی چاندنی
 قہمی اور ایلے بے نیکی پر آسودہ ہو گئی۔ بھائی کی خدمت میں سے سوتی اور اس کو اٹھ کر رہی
 قہمی۔ میں جیسے بیٹھے بیٹھے۔ فرشتہ کی گردن کے بچے۔ سے اپنا بازو نکال کر اور ایک بے ساختہ
 حرکت کے ساتھ اس کا ہاتھ بھڑا لیا کر اسے اپنے چہرے سے لگا لیا۔ یہ فاضل بھائی سمجھ
 رہا تھا۔ وہ بھی جیسے ہم خود کی کی حالت میں قہمی۔ وہ میرے چہرے سے ٹک گئی۔ میں نے اپنی
 جذبات کی خدمت کے ساتھ اسے لٹکائی لیا۔ اس کے زخم پر اپنی باتوں پر اسے دینے لگا۔ وہ جیسے
 میرے چہرے میں جا گئی لیکن جب میرے سے جب خدمت اس کے باتوں سے آخر کر اس کے
 چہرے کی طرف بڑھا شروع ہوئے تو اس میں گریہ نمودار ہوا۔ وہ اپنی سر پر ہاتھ لگی۔ وہ
 مجھ سے ٹکھو ہو گئی۔ اس کا چہرہ لٹکوں سے تر تھا۔ میں بھی جیسے اپنے حواس میں لوٹ آیا۔
 ہاتھ کر اپنے ستر پر دھرا ہوا گیا اور بازو نکال کر اپنی آنکھوں پر ڈکھایا۔

رات کا بانی صبر میں نے جانتے ہی گزرا۔ دیر سے دیر سے اس نے خود کو سنبھال لیا۔
 اس نے لٹکے اپنے ہاتھ سے دھکائی۔ ہم اپنے اپنے ستر پر دھرا ہوا سے کہ لگے بیٹھے رہے
 ہر بات کرنے لگے۔

بکھرے ہوئے وہ دہائی تھوڑے میں ہوئی۔ "بھائی! لٹکے لٹکا ہے کہ پورا ہاتھ میری وجہ
 سے ہی اٹھ رہا ہے۔ لٹکے میری لٹکوں کو صاف کر دے۔"

میں نے کہا۔ "تو دے! ہمیں اپنی لٹکوں کی سوتی تو ہر جگہ دھنگی چاہیے تھی تم میں
 اعزاز میں سوچ رہی ہو۔ وہ لٹکے نہیں۔ تم رات کی میں آنے والی ہر مصیبت کو فوٹو اپنی طرف
 منسوب کر لیتی ہو۔ اسے اپنے ہی کسی عمل کا نتیجہ قرار دیتے گئی ہو۔ جو کہتا ہے کہ وہ ہاتھ ہور یا
 ہے۔ کسی اور کے عمل کا نتیجہ ہو۔"

"نہیں بھائی! میں قصور وار ہوں۔ میں نے جب پہلی بار غلام سوچا تو بھائی بصر میں
 کے لیے ہم سے بگڑ گئے۔ جب دوسری بار پھر سے لٹکے ہوئے کا خیال میرے ذہن
 میں آیا تو نصرت چار ہو گئی اور لٹکے چار وہ سوتی ہے، آپ کو چاہی ہے۔ وہ لٹکے اور سوت
 کے دو ہیں ہے۔ وہ ایک ہی صورت میں صحت پاب ہو گئی ہے۔ تو رات لٹکے میری لٹکوں کی
 پر صاف کر دے۔"

"تمہاری کوئی لٹکوں کی تو رات اور صبح کے گھر سے لٹکے۔ سب لٹکے ہو جانے
 گا۔ اس چاروں منظر کو دیکھنا ایک ایک کر کے ہر شخص کا دل ٹکڑے لے گا۔"

”ابھی تو کوئی حل نہیں نکل رہا تاہم! آپ دیکھ رہے ہیں، مشکلوں میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔ جب سے میں آسٹریا سے واپس آئی ہوں، یوسف سے میرا رویہ ٹھیک نہیں تھا۔ وہ مجھے ایک بیوی کا حق دینا چاہتے تھے۔ مجھے اس گھر میں ایک ماں تران دینے کی خواہش رکھتے تھے۔ جب میں نصرت کے ساتھ آسٹریا میں تھی، انہوں نے بے چینی سے میرا انتظار کیا، گھر کو بھایا بنایا۔ ہر طرح سے میرے آرام و آسائش کا بندوبست کیا لیکن میں نے ان کا دل توڑا۔ یہ اسی کی سزا مجھے مل رہی ہے۔“

میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ یہ اس کی بے رخی کی سزا نہیں ہے بلکہ یوسف کی اپنی بد اعمالیوں کا خمیازہ ہے لیکن اگر میں خود یہ بات کہتا تو ثروت اسے بھی میری رقابت پر محمول کرتی۔ میں نے اس سلسلے میں اپنی زبان بند رکھنے کا فیصلہ رکھا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ حقیقت خود ہی اس کے سامنے کھل جائے گی۔

میں نے صرف اتنا کہا۔ ”ثروت! تو ہمارے نکل کر حقیقت کی دنیا میں زندہ رہنا سیکھو اور اگر میری وجہ سے تمہیں کوئی پریشانی ہے تو میں بہت جلد تمہارے راستے سے ہٹ جاؤں گا۔ بہت دور چلا جاؤں گا۔“

اس کی آنکھوں میں نمی آگئی۔ ناک سرخ ہو گئی۔ وہ گھمبیر آواز میں بولی۔ ”تاہم! مجھے اعتراف ہے کہ میں ماضی کو اپنے دل و دماغ سے کھرچ نہیں سکی۔ لیکن وہ جو کچھ بھی ہے، میرے دل میں ہے۔ اور شاید ہمیشہ رہے گا لیکن..... یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ہمارے راستے بدل چکے ہیں۔ میں..... میں یوسف سے جدا ہونے کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ میرا اور ان کا رشتہ جیسے بھی بنا..... جو بھی تھا مگر اب وہ میرے اندر رنج بس چکا ہے۔ مجھے ہر صورت اسے بھانا ہے۔“

میرے سینے پر جیسے کوہ ہمالیہ آ کر ٹھہر گیا۔ میں نے بے حد بوجھل دل کے ساتھ کہا۔ ”ثروت! میرا وعدہ ہے یہ یوسف والا مسئلہ حل ہو جاتا ہے اور ہم پاکستانی علاقے میں واپس چلے جاتے ہیں تو میں چلا جاؤں گا اور یہ بھی وعدہ ہے کہ آئندہ کبھی تم مجھے اپنے آس پاس نہیں دیکھو گی۔“

وہ چپ رہی۔ اس کے ذہن میں بس اس کے آنسو ہی متحرک تھے جو زخموں پر سرک رہے تھے۔



گو بندر ایک دن کے لیے واپس بیکانیر جا چکا تھا۔ جگت کا بھی پچھلے چوبیس گھنٹوں سے

ہے۔ اس کی ماما بھی ابھی زندہ ہے۔ پچھلے مہینے اس کی ماما کو سکتہ ہو گیا تھا۔ لوگوں نے سمجھا وہ سورگ باشی ہو گئی ہے۔ اس کا سیا پاہور ہا تھا جب وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔ علاقے میں یہ بات کافی مشہور ہے۔“

میں نے کہا۔ ”جگت! تمہیں کتنے فیصد یقین ہے کہ یوسف سردار کی حویلی میں ہی ہے؟“

”ایک سو دس فیصد۔ میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ مجھے جانکاریاں دینے والے میری ہی طرح اکیل ہیں۔ میں تمہیں جو کچھ بتاؤں گا، ایک دم ٹھیک ہوگا۔“

میں نے گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”جگت! سردار اوتار کی مصروفیات کے بارے میں کچھ بتا چلا ہے؟“

جگت نے کہا۔ ”مصرفی..... یات..... کا کیا مطلب؟“

”بھئی..... یہی کام کاج۔“

”سرداروں کا کیا کام کاج ہونا ہے؟ بس وہی زمینوں کی دیکھ بھال اور تاریخیں، پیشیاں وغیرہ بھگتنا۔ پنڈ سے چھ سات میل دور کچی سڑک پر سردار کا فارم ہے۔ اس کو بیٹھک بھی کہتے ہیں۔ سردار دن میں ایک چکر وہاں کا ضرور لگاتا ہے۔ وہاں کوئی کام شام بھی کر رہا ہے۔ پر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟“

میں حاموش رہا۔ میرے اندر عجیب سی ہلچل تھی۔ ثروت سے جو بات چیت ہوئی تھی، وہ میرے اندر گہرائی میں اُتری ہوئی تھی۔ وہ کہتی تھی کہ میں چلا جاؤں۔ تو مجھے چلے جانا چاہیے تھا لیکن اس وقت تو ہم منجھارہ میں تھے۔ میں چاہتا تھا کہ جب میں جاؤں تو وہ کنارے پر ہو۔ میں اس اطمینان کے ساتھ اسے الوداع کہوں کہ وہ محفوظ ہے اور اپنے معاملات ٹھیک کر سکتی ہے۔



اگلے روز میں اور جگت صبح سویرے ہی اٹھ گئے تھے۔ میں نے گوبندر کی ایک چٹلون، شرٹ پہن رکھی تھی۔ ہم نے پہلے دیہاتی تانگے پر چار پانچ کلو میٹر سفر کیا پھر کچی سڑک پر پہنچے۔ وہاں سے بس پکڑی اور فاضلکا کی طرف روانہ ہو گئے۔ دوپہر بارہ بجے سے پہلے ہم فاضلکا کے نواح میں پہنچ چکے تھے۔ ایک بار پھر تانگے کا طویل سفر ہوا۔ سڑک تنگ لیکن پختہ تھی۔ دونوں طرف حدنگاہ تک چاول اور گنے کے کھیت تھے۔ چمکی دھوپ میں جو ہڑوں کا پانی چمک رہا تھا اور ان میں مویشیوں کے غول غوطے نظر آتے تھے۔ پگڈنڈیاں، نیوب دیل،

کچھ پتا نہیں تھا۔ اس نے بتایا تو نہیں تھا لیکن میرا اندازہ یہی تھا کہ وہ کہیں یوسف کی ٹوہ لگانے ہی گیا ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں آشنا نہ صرف چار بھینسوں کا دودھ دھوتی تھی بلکہ دیگر امور بھی سرانجام دیتی تھی۔ اس کے دودھ مکھن سے پہلے جسم میں خاصی توانائی موجود تھی۔ جگت کی ہدایت کے مطابق میں اور ثروت اپنا زیادہ وقت پچھوڑے والے کمرے میں ہی گزار رہے تھے۔ اگر گھر میں کوئی ملاقاتی آتا تھا تو آشنا وہ درمیانی دروازہ بند کر دیتی تھی جو گھر کے سامنے والے حصے کو پچھوڑے سے ملاتا تھا۔ آشنا ہمارے کھانے کا بھی خوب خیال رکھ رہی تھی۔ اس کے علاوہ وہ بڑی ہمدردی سے ثروت کے پاؤں کی مرہم پٹی بھی کرتی تھی۔ اسی کی کوشش کا نتیجہ تھا کہ ثروت اب بغیر سہارے کے چلنا شروع ہو گئی تھی۔ دیکھا جاتا تو اپنے ازدواجی معاملے کو چھوڑ کر آشنا ایک بھلی عورت ہی تھی۔

بہت انتظار کے بعد جگت کی واپسی اگلے روز شام سے کچھ پہلے ہوئی۔ وہ آتے ساتھ ہی مجھے ایک علیحدہ کمرے میں لے گیا اور بولا۔ ”بادشاہ زادے! تیرے بندے کا کھوج تو تقریباً لگ ہی گیا ہے۔“

”کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”فاضلکا سے پندرہ بیس میل فرید کوٹ کی طرف ترشولا نام کا ایک پنڈ ہے..... بلکہ سمجھو کہ تین چار پنڈوں کی ایک چھوٹی سی جاگیر ہی ہے۔ یوسف کو وہاں پہنچایا گیا ہے۔ سردار اوتار سنگھ وہاں کا کرتا دھرتا ہے۔ جہاں تک مجھے پتا چلا ہے، یوسف فی الوقت اوتار سنگھ کے گھر پر ہے۔“

”وہاں کس لیے؟“

”اس بارے میں کوئی جانکاری نہیں مل سکی۔“

”اور کیا پتا چلا ہے؟“

”سردار اوتار علاقے میں اپنی کچہری لگاتا ہے اور لوگوں کے فیصلے بھی کرتا ہے۔ لوگ اس کے فیصلے مانتے ہیں اور اس کی عزت کرتے ہیں۔ پچھلی تین چار پڑھیوں سے علاقے کے لوگوں کے جھگڑے سرداروں کی حویلی میں ہی نمٹائے جاتے ہیں۔ اوتار سنگھ کو تو خاص طور سے بڑا انصاف والا سمجھا جاتا ہے۔ پر اوتار سنگھ کا اپنا پتر کوئی چنگے کریکٹر کا مالک نہیں ہے۔ چار پانچ قتل اور دو تین اغوا بھی اس کے کھاتے میں ہیں۔ چار پانچ سال پہلے اس نے ایک پولیس سب انسپکٹر کو گولیوں سے چھانی کر دیا تھا۔ تب سے وہ مفرد ہے۔ پر سردار کا چھوٹا پتر کچھ چنگا ہے۔ لوگ اس کی تعریف کرتے ہیں۔ سردار کے باپ کی عمر نوے سال کے قریب

کوئی ایسا ویسا معاملہ ہو جائے تو ثروت اس کی ذمہ داری ہے۔ وہ اسے کسی بھی طرح پاکستان پہنچائے گا۔

جگت کی آنکھوں میں نمی چمک گئی۔ بہر حال اس نے وعدہ کیا کہ گرد نہ کرے اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی تو وہ اپنی چھوٹی بھین کی پوری ذمہ داری اٹھائے گا۔ ہم نے کچھ دیگر تفصیلات بھی طے کیں۔ میں نے احتیاطاً جگت سے موبائل فون نمبر بھی لے لیا۔ یہ نمبر اس کے چھوٹے بھائی گو بندر کا تھا۔ بہر طور میں نے یہ نمبر کہیں لکھا نہیں بلکہ حافظے میں محفوظ کر لیا۔ جگت سنگھ سمجھ چکا تھا کہ میرے ارادے کچھ اچھے نہیں ہیں اور میں اپنے گمشدہ بندے کی بازیابی کے لیے ہر حد تک جانے کو تیار ہوں۔

دوپہر ایک بجے کے لگ بھگ میں پیدل ہی سردار اوتار سنگھ کے زرعی فارم کی طرف روانہ ہوا۔ میرے ذہن میں کوئی واضح نقشہ تو نہیں تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے، بہر حال میں ہر طرح کی صورت حال کے لیے قطعی تیار تھا۔ اگر میں اپنے دل کی بات بتاؤں تو وہ یہ ہے کہ کچھ عرصے سے اس بات نے میری بہت ڈھارس بندھائی ہوئی تھی کہ میں نے بھانڈیل اسٹیٹ میں جارج گورا جیسے شخص کو زیر کیا ہوا ہے۔ جارج کی موت ایک ایسا تمغہ تھا جو میرے جسم پر نہیں میری روح پر سجا ہوا تھا اور جس نے میرے اندر کے اعتماد میں بے پناہ اضافہ کیا تھا۔ اب یہی اعتماد مجھے کشاں کشاں اس سکھ جاگیردار کے ٹھکانے کی طرف بھی لے جا رہا تھا۔ اس فارم کو عرف عام میں ”بیٹھک“ بھی کہا جاتا تھا۔ بیٹھک کے آثار مجھے دور ہی سے نظر آ گئے۔ کھیتوں کے درمیان دور تک خاردار باڑ چلی گئی تھی۔ بائیں طرف سات آٹھ فٹ اونچی کچی چار دیواری تھی۔ سامنے کی طرف کچھ کمرے تھے جن کے سامنے دھول میں اٹی ہوئی چار گاڑیاں کھڑی تھیں۔ ان میں سے دو جیپیں تھیں۔ ایک ٹریکٹر ٹرائی اور ایک کوئی لوڈر قسم کی شے۔ لاچے گرتے والا ایک مسلح سکھ یہاں چوکیداری کے فرائض انجام دے رہا تھا۔

میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں سیدھا سردار اوتار کے پاس پہنچوں اور ہر اندیشے کو ایک طرف رکھ کر اس سے دو ٹوک بات کروں۔ میرا صرف ایک ہی مقصد تھا، یوسف کی بازیابی۔ میں سیدھا چوکیدار کے پاس گیا۔ ”کس سے ملنا ہے؟“ چوکیدار نے مجھے سرتاپا گھور کر پوچھا۔ اس کا سراں کے باقی جسم کے مقابلے میں چھوٹا لگتا تھا۔

”سردار جی سے۔“ میں نے ترت جواب دیا۔

”کہاں سے آئے ہو؟“

”فرید کوٹ سے۔“

کنوئیں، کھیت مزدوروں کی ٹولیاں، سارے مناظر وہی تھے جو پاکستانی پنجاب کے دیہات میں نظر آتے ہیں۔ فرق صرف یہ تھا کہ کہیں کہیں سکھ حضرات کی پگڑیاں دکھائی دیتی تھیں یا گردواروں اور مندروں پر نگاہ پڑتی تھی۔

فارم سے تقریباً دو فرلانگ پہلے ہی تانگوں کا اڈا تھا۔ پمپل کے تین چار گھنے درختوں کے نیچے کچھڑ میں لتھڑے دیہاتی تانگے اور ریڑھے وغیرہ کھڑے تھے۔ ایک طرف جانوروں کو پانی پلانے کے لیے اینٹوں کی حوضی بنی ہوئی تھی۔ دو کھوکھا نما دکانیں بھی یہاں تھیں۔ ایک ڈھارے کے پاس کیکر کے درخت کے ساتھ ججام نے اپنا چوکور آئینہ لٹکا رکھا تھا۔ ہم یہاں اتر گئے۔

جگت سنگھ نے زچ ہوتے ہوئے کہا۔ ”یار! آخر تم بتاتے کیوں نہیں، تمہیں کرنا کیا ہے؟ اگر مجھے کوئی اتاپتا ہوگا تو جنگی طرح تمہارا ساتھ دے سکوں گا نا؟“

”میں تمہیں اپنا ساتھ دینے کے لیے یہاں نہیں لایا جگت! یہاں جو کچھ کرنا ہے مجھے اکیلے ہی کرنا ہے۔“

”کیا مطلب ہے تمہارا؟“

”وہی جو تم نے سنا ہے۔ یہ میرا مسئلہ ہے اور اسے حل بھی میں خود ہی کروں گا۔ تم جتنا ساتھ دے رہے ہو، یہ بھی بہت زیادہ ہے۔ میں تمہیں کسی بڑی مصیبت میں ڈالنا نہیں چاہتا۔“

جگت سنگھ نے اپنے پیٹ پر ہاتھ پھیرا۔ اس کے ہنسی رنگ کے گرتے کے نیچے بھرا ہوا پستول موجود تھا۔ وہ گردن اکڑا کر بولا۔ ”آپاں یاروں کے یار ہیں بادشاہ زادے! جس کے مونڈھے کے ساتھ موڈھا ملاتے ہیں، اسے بھی اکیلا نہیں چھوڑتے، بادشاہ زادے! تو ہمارا مہمان بھی ہے۔ تو نے یہ کیسے سوچ لیا؟“

پمپل کے اس درخت کے نیچے میرے اور جگت کے درمیان طویل بحث ہوئی۔ اس نے بہت دلیلیں دیں لیکن میں نے کسی بھی صورت اسے اپنے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔ جب جگت نے دیکھا کہ میں واقعی ناراض ہو جاؤں گا تو وہ ڈھیلا پڑ گیا۔ میں نے بس اتنا کیا کہ اس سے اس کا پستول لے کر اپنی قمیص کے نیچے لگا لیا۔ میں نے اسے ہدایت کی کہ اگر میں شام تک واپس نہ آؤں تو وہ واپس اپنے گاؤں جو پور چلا جائے۔

اس نے نکتہ اٹھایا کہ شام پانچ بجے کے بعد تو کوئی بس نہیں ملے گی۔

میں نے کہا کہ ٹھیک ہے، پھر صبح چلے جانا۔ میں نے اسے یہ بھی کہا کہ اگر میرے ساتھ

طور پر اپنی قمیص کے نیچے پستول کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔
 کیدار ناتھ کی باتوں سے پتا چلا کہ مجھے غلطی سے اکبر علی سمجھا جا رہا ہے جو بطور ملازم
 فریڈ کوٹ سے یہاں آنے والا تھا۔ اسے یہاں سردار اوتار کے نوے سالہ بیمار باپ کی دیکھ
 مہال کرنا تھی۔ ساتھ میں اس کی بیوی ثریا بھی آرہی تھی۔ ثریا بھی فریڈ کوٹ کے سول ہسپتال
 میں بطور نرس کام کرتی تھی۔ اکبر علی بھی سول ہسپتال میں بطور میل نرس ملازمت کرتا رہا تھا مگر
 اب ملازمت چھوڑ چکا تھا اور پرائیویٹ کام کرتا تھا۔ اکبر اور اس کی بیوی ثریا کو یہاں ترشولا
 میں سردار اوتار کی حویلی میں ایک مہینہ گزارنا تھا اور اس کے بوڑھے والدین کی دیکھ بھال کرنا
 تھی۔ اس کے لیے ثریا نے ہسپتال سے ایک ماہ کی چھٹی لی تھی۔ ثریا کو اس کام کے لیے قریباً
 ماٹھ ہزار اور اکبر کو دس ہزار معاوضہ ملنا تھا۔ یہ بھی امکان تھا کہ اکبر کو یہاں مستقل ملازمت مل
 جائے گی۔

یہ ساری معلومات میرے لیے مفید ثابت ہو سکتی تھیں، لہذا میں نے انہیں اچھی طرح
 ذہن نشین کر لیا۔ اس کے ساتھ ساتھ سارے متوقع سوالوں کے جواب بھی تیار کر لیے تاہم
 حیرت انگیز طور پر اگلے قریباً اڑتالیس گھنٹے تک مجھے ان میں سے کسی سوال کا جواب نہیں دینا
 پڑا۔

ترشولا نما گاؤں تھا۔ کچے کپے دونوں طرح کے مکانات موجود تھے۔ گردوارے ٹھیک
 مہارت اور اس پر لہراتے ہوئے جھنڈے دور ہی سے نظر آ جاتے تھے۔ جو دوسری چیز نظر آتی
 تھی، وہ سرداروں کی حویلی تھی۔ اس کے دو حصے تھے۔ ایک تو مکمل گارے مٹی کا تھا۔ دوسرا جو
 یقیناً بعد میں بنایا گیا تھا اینٹوں کا تھا۔ اس کے پلاسٹر پر نقش و نگار بھی بنائے گئے تھے۔

حویلی کے سارے رنگ برنگے تانگے اور تازہ دم گھوڑے کھڑے تھے۔ کئی تانگوں کی
 نشستوں کے ارد گرد ریشمی پردے بھی تنے ہوئے تھے۔ جیسا کہ بعد میں معلوم ہوا یہ تانگے
 سرداروں کی باپردہ عورتوں کے لیے آنے جانے کے لیے استعمال ہوتے تھے۔ حویلی کے
 پھانک سے باہر ایک بہت بڑی جہازی چارپائی پر چھ سات مسلح افراد بیٹھے آنے جانے والوں
 کو گھور رہے تھے اور چنے پھانک رہے تھے۔ یہ یہاں کے محافظ تھے۔

کیدار ناتھ کو دیکھ کر پھانک کھول دیا گیا۔ وہ مجھے ترت حویلی کے وسیع احاطے میں لے
 گیا۔ حویلی کے دو حصے تھے، ایک زنانہ دوسرا مردانہ۔ یہ مردانہ حصہ وہی تھا جو اینٹوں سے بنا
 ہوا تھا۔ کیدار ناتھ مجھے لے کر زنانہ حصے کی طرف گیا۔ تاہم میرے اندر جانے سے پہلے اس
 نے پچھلے کمرے کو لے کر لے دیا۔ ہم ایک طویل برآمدے میں سے گزر کر ایک کشادہ کمرے میں پہنچ گئے۔

”اچھا..... اچھا..... اکبر علی ہوتے..... پر تمہیں تو کل آنا تھا۔“
 میں ایک لمحے کے لیے ٹھنک پھر سنبھل کر بولا۔ ”سردار جی کہاں ہیں؟“
 ”وہ تو ابھی دس منٹ پہلے نکل گئے کسی کام سے..... پر تم بڑے ناظم پر آئے ہو۔ تمہاری
 بڑی لوڑ ہے حویلی میں۔ باپو جی کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہے۔“ اس سے پہلے کہ میں کچھ کہتا
 یا وضاحت کرتا فریبہ اندام چوکیدار اپنی پاٹ دار آواز میں پکارنے لگا۔ ”اوئے کیدار ناتھ.....
 اوئے کیدار ناتھ..... آج بھی..... بندہ آ گیا ہے۔ جلدی آ سے لے جا اپنے ساتھ..... آ جا
 بھی۔“

میں نے دیکھا، کچی چار دیواری کے قریب سے ایک نو جوان تیز تیز قدم اٹھاتا ہماری
 طرف بڑھا۔ اس نے میلا سا پاجامہ گرتہ پہن رکھا تھا۔ ماتھے پر تلک تھا۔ وہ ہاتھ میں چابی
 گھماتا آ رہا تھا۔ اندازہ ہوا کہ وہ قریب کھڑی گاڑیوں میں سے کسی ایک کا ڈرائیور ہے۔ وہ
 غالباً مجھے حویلی لے جانے آ رہا تھا اور میں خود بھی حویلی جانا چاہتا تھا۔ چوکیدار نے میری
 طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ ”لیکن تمہارے ساتھ تو تمہاری پتی نے بھی آنا تھا؟“

اب میں اپنا لائحہ عمل بنا چکا تھا۔ میں نے اطمینان سے کہا۔ ”میں آج آ گیا ہوں۔ وہ
 ابھی تیار نہیں تھی، تھوڑا سا کام بھی تھا اسے۔ کل یا پرسوں آ جائے گی۔“

چوکیدار بولا۔ ”تمہیں ہری جی نے بتایا ہی ہوگا جب باپو کی طبیعت خراب ہوتی ہے تو
 ساتھ ہی ماما جی کی بھی ہو جاتی ہے۔ ٹھیک ہوتے ہیں تو دونوں ہو جاتے ہیں۔ ان کا ہنسنا،
 رونا، سونا جا گنا، کھانا پینا، سب ایک ساتھ ہے۔ دکھ رے ٹائپ کی طبیعتیں ہیں دونوں کی۔“
 میں نے اثبات میں سر ہلایا۔

ڈرائیور کیدار ناتھ، سکھ چوکیدار سے بھی زیادہ پھر تیرا تھا۔ اس نے آؤ دیکھنا تاؤ۔ مجھے
 ایک گرد آلود جیب میں بٹھایا اور آنا فانا روانہ ہو گیا۔ راستہ کچا تھا، جیب بھی ایسی نئی نہیں تھی۔
 زبردست ہچکولے لگ رہے تھے۔ کیدار ناتھ قدرے باتوئی شخص تھا اور یہ بات میرے حق
 میں جاتی تھی۔ اسے میرے بارے میں جاننے یا کچھ پوچھنے کا وقت ہی نہیں مل رہا تھا۔ اس
 نے مجھ سے چوکیدار والا سوال ہی پوچھا تھا۔ کہنے لگا۔ ”تمہارے ساتھ تو زنانہ نرس بھی آرہی
 تھی۔ شاید پتی تھی تمہاری؟“

”وہ نہیں آ سکی۔ کل یا پرسوں آ جائے گی۔“

”سردار صاحب ناراض ہوں گے۔ تم پہلے ہی کوئی اچھا سا بہانہ سوچ لو۔“

”نہیں..... میرا خیال ہے کہ میں ان کو ناراض نہیں ہونے دوں گا۔“ میں نے غیر محسوس

ہوا کہ اس کے ملازموں سے کتنی بڑی غلطی ہوئی ہے اور وہ اکبر علی کے بجائے کسی اور شخص کو حویلی میں لے آئے ہیں۔ ہری نے بھی بس اتنا ہی پوچھا۔ ”تمہاری بیوی ساتھ نہیں آئی؟“ میں اب تک اس کا جواب تیار کر چکا تھا۔ میں نے کہا۔ ”جھوٹے سردار! اسے چھٹی نہیں مل سکی لیکن دو دن بعد وہ ہر صورت آجائے گی۔ میں خود اسے لے کر آؤں گا۔“

”دو دن کا مطلب..... دو دن ہی ہونا چاہیے۔ یعنی بدھ کے روز۔“

”ان شاء اللہ جی! بدھ کو شام سے پہلے وہ یہاں ماتا جی کی سیوا پر ہوگی۔“

ہری سنگھ نے مطمئن انداز میں سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا۔ وہ تیکھے نقوش اور چھریے جسم والا اونچا لمبا نوجوان تھا۔ گورے چہرے پر بڑی نفیس مونچھیں تھیں۔

یہ خیال میرے لیے بوا سنسنی خیز تھا کہ ثروت کا شوہر یوسف فاروقی یہاں انڈیا کے اس دور دراز گاؤں میں ایک نامی گرامی سردار کی حویلی میں ہے۔ وہ یہاں کیوں تھا؟ اسے یہاں پہنچائے جانے کا کیا مقصد تھا؟ جا دا اور اس کے لوگ اسے پاکستان سے یہاں لا کر کیا حاصل کرنا چاہتے تھے؟ یہ سارے سوال مسلسل میرے دماغ کو کچوکے لگا رہے تھے۔

شروع میں میرا اور عمران کا خیال تھا کہ شاید یہ بھی کوئی فلمی چکر ہو۔ جس طرح نیٹو کی شکل کرشمہ کپور اور سوینی کی شکل دوسری مشہور اداکارہ ایثور یارائے سے ملتی تھی، شاید یوسف کی صورت بھی کسی فلمی بندے سے ملتی ہو اور اسے چودھری انور کے ذریعے کشاں کشاں بمبئی پہنچا دیا جائے لیکن یہاں صورت حال مختلف نظر آ رہی تھی۔ یوسف اردو فلموں سے مرعوب نہیں تھا، نہ پنجابی فلموں کے کسی مرکز میں۔ وہ یہاں ایک خالص دیہاتی علاقے میں ایک جاگیردار نما شخص کے پاس تھا۔

میں نہیں جانتا تھا کہ میں اسے کیسے اور کب دیکھ پاؤں گا لیکن جو کچھ ہوا، وہ بالکل اچانک اور غیر متوقع تھا۔ ڈرائیور کیدار ناتھ میرے پاس آیا۔ وہ بڑی تیزی سے بات کرتا تھا۔ اس کی بات سمجھنے کے لیے خوب توجہ دینا پڑتی تھی۔ وہ بولا۔ ”اکبر بھائی! تمہاری ضرورت پڑ گئی ہے۔ تمہارے پاس دھاگے نکالنے والی چٹنی تو ہوگی۔“

”دھاگے نکالنے والی چٹنی؟“ میں نے ذرا حیرت سے پوچھا۔

”ہاں یار! وہی جس سے زخم کے ٹانکے کا دھاگا کھینچتے ہیں۔“

میں اس کی بات سمجھ گیا۔ اس سے پہلے جو بندہ میری جگہ کام کر رہا تھا، وہ اپنا میڈیکل باکس یہیں چھوڑ گیا تھا یا شاید یہ باکس حویلی ہی کا تھا۔ اس میں بینڈیج وغیرہ کا سارا سامان موجود تھا۔ میں نے اسپرٹ، روئی اور چٹنی لی اور ڈرائیور کیدار ناتھ کے ساتھ چل پڑا۔ مجھے

کمرے میں فینائل اور اسپرٹ کی ہلکی سی بو تھی۔ ایک شاندار پلنگ پر ایک شاندار بوڑھا سردار چت لیٹا تھا۔ اس کا جھریوں بھرا چہرہ دیکھ کر ہی بتایا جاسکتا تھا کہ وہ اپنی عمر کا سفر تقریباً مکمل کر چکا ہے اور اب صبح کے دیے کی طرح کسی بھی وقت بجھ سکتا ہے۔ اس کا رنگ بے حد گورا چٹا اور آنکھیں سبزی مائل براؤن تھیں۔ اس کا قد کاٹھ دیکھ کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ کسی وقت بڑا دبنگ شخص رہا ہوگا۔ اس کے سر ہانے ایک تپائی پر بہت سی انگریزی اور دیسی دوائیں پڑی تھیں۔ ایک طرف حاجت وغیرہ کے لیے خاص طرح کی کرسی پڑی ہوئی تھی۔

کیدار ناتھ نے کہا۔ ”باپو جی کے سر ہانے گھٹنی کا بٹن ہے، اس گھٹنی کا بہت دھیان رکھنا ہے۔ باپو جی بہت دھیمی آواز میں بات کرتے ہیں۔ کان لگا کر سننا پڑتی ہے۔“

پھر کیدار ناتھ نے ایک چھوٹا سا دروازہ کھولا اور بولا۔ ”یہ تمہارے آرام کرنے کا کمرہ ہے لیکن تمہیں رات کو دو ڈھائی بجے کے بعد سونا پڑے گا کیونکہ باپو جی بھی اسی وقت سوتے ہیں۔“

چند ضروری ہدایات دینے کے بعد اور قریب المرگ سردار کو میرے حوالے کرنے کے بعد کیدار ناتھ باہر چلا گیا۔ میں نے دھیان سے بزرگوار کو دیکھا۔ انہوں نے اشارے سے مجھے قریب بلایا۔ ان کی بات سننے کے لیے مجھے اپنا کان ان کے دانتوں اور سفید براق داڑھی کے بالکل پاس کرنا پڑا۔ یہ ضعیف افراد عموماً صاف نہیں ہوتے اور ان کے جسم سے بو وغیرہ بھی اٹھتی ہے لیکن باپو سردار ایک صاف ستھرا شخص تھا۔ انہوں نے تپائی پر رکھی ایک دوا کی طرف اشارہ کیا اور مجھ سے کہا کہ میں ایک جھج پلا دوں۔

میں نے اس ہدایت پر عمل کیا۔ دوا پینے کے بعد سردار نے اپنے ہونٹوں کی طرف اشارہ کیا۔ پاس ہی ایک صاف رومال رکھا تھا۔ میں نے رومال سے باپو سردار کے ہونٹ پونچھے۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا جیسے میری معاملہ نبھی کی تعریف کر رہے ہیں۔

دو تین گھنٹے کے اندر مجھے یہاں کے اکثر معمولات کا پتا چل گیا اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ مجھے یہاں کیا کرنا ہے۔ مجھ سے پہلے راج سنگھ نامی ایک ڈسپنسر باپو سردار کی خدمت پر معمور تھا۔ اس کی کسی غفلت پر سردار اوتار نے اسے تین چار دن بھوکا پیاسا ایک کمرے میں بند رکھا تھا اور پھر مار پیٹ کر گھر سے نکال دیا تھا۔ اس کے بعد ہی فرید کوٹ سے اکبر نامی شخص اور اس کی نرس بیوی کو یہاں بلایا گیا تھا۔

ابھی تک سردار اوتار سے میری ملاقات نہیں ہوئی تھی، تاہم اس کے جھوٹے بیٹے ہری سنگھ کو میں نے دیکھا تھا اور اس سے تھوڑی سی بات چیت بھی کی تھی۔ اسے بھی یہ اندازہ نہیں

مرہم پٹی کا ایسا زیادہ تجربہ نہیں تھا لیکن جو کام کیدار بتا رہا تھا وہ تو میں کر ہی سکتا تھا۔ منہ دل ہو جانے والے زخم سے بچا کھچا دھاگا کھینچنا بہت مشکل کام نہیں تھا۔ اس کے علاوہ میں انجکشن وغیرہ بھی لگا لیتا تھا۔ گلوکوز کی ڈرپ اُتارنے اور لگانے کا تجربہ بھی تھا۔

کیدار پندرہ بیس قدم چل کر ایک کمرے کے بند دروازے کے سامنے پہنچا اور رُک گیا۔ وہاں سے اس نے ایک چابی لی اور مجھے لے کر حویلی کے مردانے حصے میں آ گیا۔ یہاں پختہ فرش تھا اور اس پر رنگوں سے نقش و نگار بنے ہوئے تھے۔ کراپانوں اور رائفلوں والے مسلح سکھ ملازم بھی نظر آ رہے تھے۔ کیدار مجھے لے کر ایک برآمدے میں سے گزرا اور ایک الگ تھلگ کمرے کے سامنے آ گیا۔ اس نے چابی لگا کر دروازے کا ہضمی قفل کھولا۔ اندر داخل ہوا اور مجھے بھی اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں اندر گھسا اور دنگ رہ گیا۔ میرے سامنے ایک پلنگ پر یوسف ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ اس کی شیو بڑھی ہوئی تھی تاہم کپڑے صاف ستھرے تھے۔ ایک دوسرے کو دیکھ کر ہم چونکے۔ خاص طور سے یوسف تو بڑی طرح چونکا۔ اس کی آنکھیں حیرت سے کھلی رہ گئیں۔ چہرے کا رنگ بدل گیا۔ خوش قسمتی سے یہ وہ لمحہ تھے جب کیدار ناتھ گھوم کر دروازے کو اندر سے چٹخنی لگا رہا تھا۔ اس نے یوسف کے تاثرات نہیں دیکھے تھے۔ میں نے جلدی سے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر یوسف کو خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔

یوسف نے بھی بڑی تیزی سے خود کو سنبھالا۔ لیکن اس کے چہرے کا رنگ ابھی تک بدلا ہوا تھا۔ کیدار ناتھ نے یوسف کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ”یہ سردار جی کے خاص مہمان ہیں۔ کچھ دن پہلے قتل خانے میں پاؤں پھسل گیا تھا۔ کہنی اور منہ پر چوٹ آئی ہے۔“ میں نے دیکھا۔ یوسف کے رخسار پر بائیں کنپٹی کے پاس انگریزی حرف ”سی“ کی طرح کا زخم تھا جس پر پانچ چھ ٹانکے لگائے گئے تھے۔ زخم منہ دل ہو گیا تھا مگر ایک دو ٹانکوں کے دھاگے موجود تھے۔ چہرے پر زخم کا یہ نشان یوسف کی خوبصورتی کو گھنارہا تھا۔ میں نے دیکھا، یوسف کا یہ کمرہ خوب سجا سنورا تھا۔ دیہات کی بڑی حویلیوں میں میسر آنے والی ساری آسائشیں موجود تھیں۔ ایک طرف ٹی وی بھی رکھا ہوا تھا۔ سائیڈ کی میز پر مجھے ایک ایسا گلاس بھی نظر آیا جس کے پینڈے میں بچی کچھی شراب موجود تھی۔

کیدار ناتھ کی ہدایت کے مطابق میں یوسف کے قریب بیٹھ گیا اور بڑی احتیاط سے اس کے منہ دل زخم میں سے دھاگے کھینچنے لگا۔ میں نے محسوس کیا کہ یوسف کے ہاتھوں میں ابھی تک لرزش موجود ہے۔ میری اچانک آمد نے اسے اعصابی طور پر ہلا کر رکھ دیا تھا۔

اس بات کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کیدار کی موجودگی میں ہم ایک دوسرے

سے کچھ کہہ سکیں۔

میں دھاگے کھینچ چکا تو کیدار نے کہا۔ ”صاحب جی کی کہنی کی پٹی بھی بدل دو۔“ پھر وہ سوالیہ نظروں سے یوسف کی طرف دیکھنے لگا۔

یوسف نے کہا۔ ”ہاں..... بدل ہی دو۔ تین دن تو ہو گئے ہیں۔“

میں نے یوسف کی کہنی کی پٹی کھولی۔ کھال بڑی طرح چھلی ہوئی تھی۔ پٹی اُتارنے سے خون رسنے لگا۔ ایک بات میں نے فوراً محسوس کی۔ چہرے کا زخم پُرانا جبکہ کہنی کا تازہ تھا۔ شاید یہ زخم دو تین دن پہلے ہی آیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ کیدار نے جھوٹ بولا ہے۔ چہرے اور کہنی کی چونٹیں ایک ہی واقعے کا نتیجہ نہیں تھیں۔ بہر حال ابھی ان باریکیوں میں پڑنے کا موقع نہیں تھا۔ ایک دو دوائیں یوسف کے قریب ہی میز پر موجود تھیں۔ کاشن کی پٹی بھی رکھی تھی۔ میں نے زخم کو روٹی سے صاف کیا اور ”آئنٹ مینٹ“ لگا کر پٹی باندھ دی۔

کچھ ہی دیر بعد ہم حویلی کے مردانے حصے سے نکل کر واپس زنان خانے میں بوڑھے بیمار باپو کے پاس پہنچ چکے تھے۔ میرے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ یوسف نہ صرف یہاں موجود تھا بلکہ زخمی بھی تھا۔ اسے ایک کمرے میں باقاعدہ تالا لگا کر رکھا گیا تھا اور اندازہ ہو رہا تھا کہ دو چار خاص ملازموں کے سوا کسی کو اس کی موجودگی کا علم بھی نہیں۔ اس کی چونٹوں سے کچھ بھی اندازہ لگانا مشکل تھا۔ عین ممکن تھا کہ اس پر کسی طرح کا تشدد کیا گیا ہو یا پھر ہوسکتا تھا کہ اس نے بھاگنے کی کوشش کی ہو اور یہ چونٹیں اسے اسی سلسلے میں لگی ہوں۔

میں جلد از جلد یوسف سے بات کرنا چاہتا تھا مگر اس کے لیے کوئی موقع نظر نہیں آ رہا تھا۔ یہی ہوسکتا تھا کہ کل یا پرسوں پھر یوسف کی کہنی کی پٹی بدلنے کی ضرورت پیش آئے اور میں اس سے مل سکوں۔ لیکن یہ بات بھی یقینی تھی کہ کیدار ناتھ میرے سر پر کھڑا ہے گا اور مجھے اس سے بات کرنے کا موقع نہیں مل سکے گا۔

مخڑے لیے فی الوقت سب سے اہم مسئلہ یہ تھا کہ کہیں میرا بھانڈا نہ بھوٹ جائے۔ کل کسی وقت دوپہر کے بعد فریڈ کوٹ سے اصلی اکبر علی اور اس کی نرس بیوی ثریا یہاں ترشولا پہنچ رہے تھے۔ اگر میں یہاں رہنا چاہتا تھا تو ضروری تھا کہ انہیں یہاں پہنچنے سے روکوں۔ لیکن ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ شاید اکبر علی کا یہاں حویلی سے ٹیلی فونک رابطہ بھی ہو۔ ایسے میں وہ یہاں کسی کو فون کر سکتا تھا۔ اگر ایسا ہوتا تو میں فوراً مشکوک قرار پاتا اور پکڑا جاتا۔ بہر حال، اس طرح کے سارے رسک تو میں نے پہلے ہی ذہن میں رکھے ہوئے تھے۔

میں نے کیدار ناتھ سے بات چیت جاری رکھی۔ معلوم ہوا کہ سردار اوتار مو بائل فون

پہنچنے سے روکنا ہے۔“

جگت سنگھ دلیری سے بولا۔ ”لے بس اتنی سی گل ہے۔ میں سمجھا شاید کسی بندے کا منکا وغیرہ توڑنا ہے یا کوئی بیج (برات) لوٹی ہے۔ تم بتاؤ وہ پتی پتی ہیں کون؟ اور کیا کرنا ہے ان کے ساتھ؟“

میں نے جگت کو تفصیل بتائی اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچنا چاہیے۔ بس وہ کچھ ایسا کرے کہ یہ میاں بیوی تین چار دن کے لیے ترشولا نہ آسکیں اور نہ کسی سے رابطہ کر سکیں۔

وہ ہنس کر بولا۔ ”یار! تم کہو گے تو وہ قیامت تک ترشولا نہیں آسکیں گے۔ ایسی کون سی بات ہے۔ اپنے یار پر تاب سنگھ کے پاس پرانی فوجی جیب ہے۔ اس پر جائیں گے اور ان دونوں مہمانوں کو بڑے عزت اور پریم سے یہاں لے آئیں گے۔ تو اس بارے میں کوئی فکر نہ کر۔ ٹو یہ بتا کہ وہاں تیرا کوئی کام بنا ہے یا نہیں؟“

”بس سمجھو کہ تھوڑا تھوڑا بن رہا ہے۔ تم یہ گو بندر والا فون دو تین دن اپنے پاس رکھ سکتے ہو؟“

”کیوں نہیں یار! تم جو کہو گے ویسا ہی ہوگا۔“ اس گفتگو کے آخر میں، میں نے جگت سنگھ سے ایک بار پھر راجا کے انجام کے بارے میں پوچھا۔ جگت نے بتایا کہ پوری کوشش کے باوجود اسے ابھی پتا نہیں چل سکا۔ بس اتنا معلوم ہوا ہے کہ ایک بندہ حویلی سے باہر درختوں میں سخت زخمی ہوا تھا جو کل ہارون آباد کے ہسپتال میں دم توڑ گیا ہے۔ یہ بالکل نامکمل اطلاع تھی جس سے مجھے کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

جگت کو کال کرنے کے بعد میں نے کال کاریکارڈ ختم کر دیا اور موبائل فون کیدار کو واپس دے دیا۔

رات قریب پانچ بجے تک میں بیماروں کی دیکھ بھال میں مصروف رہا۔ انہیں بڑھاپے کی کئی بیماریاں لاحق تھیں جن میں سب سے اہم جسم کے دائیں حصے کا فالج تھا۔ اس کے علاوہ شوگر، ہائی بلڈ پریشر اور دل کی تکلیف بھی اس ”بیماری پیکیج“ کا حصہ تھی۔ باپو کے سونے کے بعد میں بھی لمحہ کمرے میں چلا گیا۔ گھنٹی بالکل میرے سر ہانے لگی تھی۔ ایک بال پوائنٹ میں نے کل ہی حاصل کر لیا تھا۔ کاغذ بھی موجود تھا۔ بلب کی میلی سی روشنی میں، میں نے یوسف کے نام ایک مختصر رقعہ لکھا۔

”یوسف بھائی! بہت مشکلوں سے تمہارے پیچھے یہاں تک پہنچا ہوں۔ سمجھو کہ جان پر

استعمال نہیں کرتا۔ ہار حویلی میں ایک فون لائن موجود ہے لیکن وہ دو چار روز سے خراب پڑی ہے۔ میرے کریدنے پر یہ خوشگوار انکشاف ہوا کہ کیدار ناتھ کے پاس ایک موبائل فون موجود ہے۔ میں نے اس سے درخواست کی اور اس نے مجھے ایک کال کرنے کی اجازت دے دی۔ میں موبائل لے کر اس چھوٹے کمرے میں چلا گیا جو باپو کے کمرے کے ساتھ تھا اور میرے سونے کے لیے مختص کیا گیا تھا۔ میں نے دروازہ بند کر کے جگت سنگھ کے چھوٹے بھائی گو بندر کا نمبر ملایا۔ مجھے توقع تھی کہ وہ بڑے بھائی کے گھر میں ہی ہوگا۔ وہاں اسے دل لگی کے لیے بہت کچھ مل رہا تھا۔ دوسری، تیسری بیل پر کال ریسپو ہو گئی۔ ”ہیلو کون؟“ گو بندر کی آواز اُبھری۔ وہ قدرے ہانپا ہوا تھا۔

”ہیلو گو بندر! میں صادق بول رہا ہوں۔“ میں نے دبی آواز میں کہا۔
”صادق بھائی! کہاں ہو تم؟ ہم ابھی تھوڑی دیر پہلے تمہاری ہی باتیں کر رہے تھے۔“ وہ گرجوٹی سے بولا۔

”پہلے تم بتاؤ کہ تم کہاں ہو؟“
”گاؤں میں ہی ہوں..... گھر میں۔“ وہ بدستور ہانپے ہوئے لہجے میں بولا۔
اس کے ہانپنے کی دو ہی وجوہ ہو سکتی تھیں۔ آشا اس کے آس پاس موجود تھی اور اپنے شباب سے اس کی تنہائی کو چکار ہی تھی یا پھر وہ ڈھارے کے اندر اپنے ”دیہاتی جم“ میں ہاتھ پاؤں چلا رہا تھا۔ میرا یہ دوسرا اندازہ درست ثابت ہوا کیونکہ جگت سنگھ بھی گھر ہی میں تھا۔ پس منظر میں جگت کی آواز سنائی دی۔ وہ گو بندر سے پوچھ رہا تھا کہ کس کا فون ہے۔ ”صادق بھائی کا ہے۔ پتا نہیں کہاں سے بول رہے ہیں۔“ گو بندر نے جگت کو جواب دیا۔
میں نے تیزی سے کہا۔ ”گو بندر! میرے پاس زیادہ وقت نہیں۔ تم ذرا جگت بھائی کو فون دو۔“

چند سیکنڈ بعد موبائل فون پر جگت کی بھرائی ہوئی آواز اُبھری۔ میں نے کہا۔ ”جگت! میں سردار اوتار کی حویلی میں ہوں۔ مجھے تمہاری مدد کی فوری ضرورت ہے۔“
وہ بلا توقف بولا۔ ”بادشاہ زادے! تجھے کہا تو ہے کہ آپاں یاروں کے یار ہیں..... بتا کس دریا میں چھال ماری ہے اور کس اوکھلی میں سردینا ہے؟“

”نہیں یار! ابھی کوئی بڑی چھال تو نہیں ماری بس ایک چھوٹی چھلانگ لگانی ہے اور مجھے امید ہے کہ تم لگا لو گے۔ کل دوپہر کے بعد ذیکوٹ سے ایک میاں بیوی بس پر بیٹھ کر آئیں گے اور ترشولا موڑ کے پاس نہر کے پل پر اتریں گے۔ تم نے کسی طرح انہیں ترشولا

کروں گا اور اس کے بعد وہ سب کچھ بھی کروں گا جو کرنا میرا فرض ہے اور اس کے لیے جان بھی خطرے میں ڈالنا پڑی تو ڈالوں گا۔



اگلے دن میں نے بہت بے چینی سے جگت سنگھ کو کال کی۔ یہ کال پھر کیدار ناتھ کے موبائل سے ہی ہوئی۔ وقت سہ پہر چار بجے کا تھا۔ کال ریسیو ہوئی تو جگت سنگھ کی جوشیلی آواز سنائی دی۔ ”تیرا کام ہو گیا بادشاہ زادے! اکبر علی اور اس کی تک چڑھی زبانی، دونوں اس ویلے میرے پاس ہیں۔ آلو والے پراٹھے کھا رہے ہیں نمک مرچ والے دہی کے ساتھ۔“

”کہاں ہو تم؟“ میں نے دریافت کیا۔

”اپنے یار پر تاب سنگھ کے پنڈ میں۔ زیادہ دور نہیں ہے ہمارے پنڈ سے۔ یہاں پر پر تاب سنگھ کا چھوٹا سا باغ ہے۔ باغ میں ایک ڈھارا ہے۔ دونوں ڈھارے میں ہیں۔ آٹھ دس دن شانتی سے یہاں گزار سکتے ہیں۔“

”کس طرح لائے ہو انہیں؟“

”بس یار! لے آئے جیسے بھی ہوا۔ پراپنا دچن نہیں توڑا میں نے۔ کانٹا چھنے کی تکلیف بھی نہیں ہوئی ہے دونوں کو۔“

میرے اصرار پر جگت سنگھ نے بتایا کہ جب وہ دونوں فرید کوٹ والی بس سے اترے تو پر تاب سنگھ اور وہ تانگے کے اڈے پر موجود تھے۔ انہوں نے فوراً دونوں کو پہچان لیا۔ انہوں نے اکبر علی کو بتایا کہ وہ سردار اوتار کے ملازم ہیں اور ترشولا پنڈ سے ان دونوں کو لینے کے لیے آئے ہیں۔ وہ دونوں پرانی فوجی جیب میں بیٹھ گئے۔ اس کے بعد جگت اور پر تاب کے لیے کوئی مسئلہ نہ رہا۔ جگت کے پاس اعشاریہ تین آٹھ کا پستول موجود تھا۔ اس نے میاں بیوی کو خاموش رہنے کی دھمکی دی اور باسانی منزا پہنچ گئے۔

جگت سنگھ کی کارکردگی تسلی بخش تھی۔ مجھے خوشی محسوس ہوئی کہ مجھے ایسی اجنبی جگہ پر ایسا بے لوث مددگار مل گیا ہے۔ کم از کم وہ ابھی تک تو بے لوث ہی تھا۔ میں نے جگت سے کہا۔

”جگت پیارے! اب تجھے ایک اور کام کرنا ہے۔“

”اوئے بادشاہ زادے! تو پوچھنا نہ کر، بس کام بتایا کر۔“ وہ حسب معمول گرجوشتی سے

بولا۔

”ثروت کو کسی طرح یہاں پہنچانا ہے لیکن وہ ثروت کے طور پر نہیں ثریا کے طور پر آئے، یعنی اکبر علی کی نرس بیوی بن کر۔“

کھینا پڑا ہے۔ ابھی تک کچھ پتا نہیں کہ تمہیں یہاں کیوں لایا گیا ہے اور یہ لوگ تم سے کیا چاہتے ہیں۔ مجھے جوابی رقعے کے ذریعے اپنے حالات سے آگاہ کرو اور بتاؤ کہ میں تمہاری مدد کس طرح کر سکتا ہوں۔ ہو سکے تو مجھے ان لوگوں کی تعداد بھی بتاؤ جو یہاں تمہاری پہرے داری کر رہے ہیں۔ ان کے پاس کس طرح کا اسلحہ ہے اور ان سے کیسے نمٹا جاسکتا ہے۔ میں یہ بال پوائنٹ تمہارے کمرے میں ہی چھوڑ آؤں گا۔ اگر تمہارے پاس کاغذ نہ ہو تو اسی رقعے کی پشت پر جواب لکھ دینا۔ امید ہے کہ کل کسی وقت ملاقات ہوگی۔“ رقعہ لکھ کر میں نے جیب میں رکھ لیا۔

اگلے کئی گھنٹے میں نے سخت سوچ بچار کی کیفیت میں گزارے۔ بالآخر میں نے یوسف کو ڈھونڈ لیا تھا۔ لیکن ابھی تک ثروت اور جگت سنگھ سمیت کسی کو خبر نہیں تھی کہ یوسف کا پتا چل گیا ہے۔ صرف میں جانتا تھا کہ وہ کہاں اور کس حال میں ہے۔ میں اپنے دل کی کیفیت کھل کر بیان کرنا چاہتا ہوں۔ اپنی قلبی واردات کے سلسلے میں کچھ بھی ڈھکا چھپا نہیں رکھنا چاہتا۔ کمزوریاں کس میں نہیں ہوتیں۔ ایک انسان ہونے کے ناتے مجھ میں بھی نہیں۔ کچھ دیر کے لیے میرا دل چاہا کہ سرداروں کو ان کی حویلی کو اور حویلی میں موجود یوسف فاروقی کو بھول کر خاموشی کے ساتھ یہاں سے نکل جاؤں۔ یوسف کے ساتھ جو بھی ہونا ہے ہوتا رہے۔ اگر اس کی زندگی ہے تو اس نے بچ ہی جانا ہے۔ دوسری صورت میں کوئی اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتا۔

یہ سوچ اس تابش کی تھی جو لڑکپن سے ثروت کو چاہتا تھا، جس سے ملن کے لیے گھڑیاں اور پل گنا کرتا تھا اور اپنے دل کی گہرائیوں میں شاید اب بھی گنتا تھا۔ ہاں یہ وہی تابش تھا جس کو آج ایک رقیب کا سامنا تھا۔ ایک ایسا رقیب جو کسی طور بھی ثروت کے قابل نہیں تھا لیکن حالات نے جسے ثروت کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا تھا، آج وہ رقیب ایک بے بس شخص کی حیثیت سے یہاں اس حویلی میں موجود تھا۔

بہر حال میری اس سوچ کی عمر زیادہ طویل نہیں رہی۔ بہت جلد ایک دوسرا تابش میرے اندر ابھر آیا۔ یہ تابش ثروت کو چاہتا تھا لیکن اس کے حصول کے لیے کوئی غلط راہ اختیار کرنا نہیں چاہتا تھا۔ کسی اخلاقی گراؤ کا مظاہرہ، کوئی خود غرضی، کوئی چشم پوشی، کچھ نہیں۔ یہ تابش..... یوسف فاروقی کا مددگار بن کر یہاں پہنچا تھا اور اس نے ثروت سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ثروت کو اس کے شوہر سے ملانے کی ہر ممکن کوشش کرے گا۔ جیت اسی تابش کی ہوئی۔ میں اس فیصلے پر پہنچ گیا کہ جگت سنگھ اور ثروت کو یہاں یوسف کی موجودگی سے آگاہ

”میں سمجھ گیا۔ سب سمجھ گیا۔ کب آنا ہے چھوٹی بھین کو وہاں؟“

”کل شام سے پہلے پہلے آجائے تو زیادہ اچھا ہے۔“

”اچھا تو ایسا کر بادشاہ زادے! چھوٹی بھین کو اپنی زبانی ساری بات سمجھا دے۔ اس نے کون سے کپڑے پہنے ہیں، اپنے ساتھ کیا لانا ہے وغیرہ وغیرہ۔ باقی اسے وہاں پہنچانا میرا کام ہے۔ پر ایک بات ہے۔ وہ عورت ذات فرید کوٹ سے اکیلی آتی ہوئی کچھ اوپری (عجیب) نہیں لگے گی؟“

”تم ایک بات بھول رہے ہو کہ وہ عام عورت نہیں پڑھی لکھی نرس کے طور پر آئے گی۔ وہ جب بس سے اترے گی تو میں تانگے کے اڈے سے اسے لے لوں گا۔ تم چاہو تو بس پر آگے چلے جانا۔ چاہو تو اتر کر واپسی کی بس پر بیٹھ جانا۔“

”ٹھیک ہے۔“ جگت نے کہا۔ ”تم ایسے کرو کہ ٹھیک دو گھنٹے بعد پھر کال کرو۔ میں اس ویلے گھر میں ہوں گا۔ تمہاری گل چھوٹی بھین سے کرا دوں گا۔“

دو گھنٹے بعد فون پر میری بات پھر جگت سنگھ سے ہوئی۔ جگت سنگھ نے فوراً ثروت کو فون پر بلا لیا۔ ”ہیلو ثروت!“ میں نے کہا۔

میری آواز پہچانتے ہی ثروت بے چین ہو گئی۔ ”تابش! آپ کہاں ہیں؟ میں بہت پریشان ہوں آپ کے لیے۔ اس اجنبی جگہ آپ کے سوا میرا کوئی سہارا نہیں۔ آپ اپنا بہت خیال رکھیں پلیز۔“

”گھبراؤ مت۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے اپنا خیال رکھیں گے۔ تم میرے پاس آنے کی تیاری کر لو۔“

ثروت کو تھوڑا بہت تو جگت نے بتا دیا تھا۔ باقی میں نے اس کے گوش گزار کر دیا۔ وہ بڑی معاملہ فہم تھی۔ دو تین منٹ کے اندر ساری بات سمجھ گئی اور تفصیل بھی جان گئی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ یوسف یہاں حویلی میں موجود ہے اور میں اس سے مل چکا ہوں تو وہ حیران رہ گئی۔ اس کی آواز میں ایک مسرت آمیز لرزش نمودار ہوئی۔ وہ مجھ سے بہت کچھ پوچھنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس وقت کم ہے اور میں کسی دوسرے کے فون سے کال کر رہا ہوں۔ میں نے ثروت سے بات کرنے کے بعد پھر جگت سے بات کی اور اس سے کہا کہ وہ میرے لیے ایک موبائل فون کا انتظام کرے اور جب ثروت یہاں آئے تو موبائل ساتھ لے آئے۔

اگلے روز دس بجے کے قریب ہی کیدار ناتھ نمودار ہو گیا۔ میں اس وقت ناشتے کے لیے

باپو کا منہ ہاتھ دھلوار ہاتھ۔ بابا ناک چند کی بہت بڑی تصویر کمرے میں لگی تھی۔ بیمار باپو جب بھی اس تصویر کی طرف دیکھتے تھے ان کی بھی ہوئی آنکھوں میں عجیب سی روشنی ابھر آتی تھی۔ وہ گاہے بگاہے مجھ سے باتیں بھی کرتے رہتے تھے۔ ان کی باتوں سے پتا چلتا تھا کہ ان کی کسی پوتی یعنی سردار اوتار کی بیٹی کی شادی ہونے والی ہے اور یہ شادی چند روز میں ہی انجام پا جائے گی۔ حویلی میں شادی کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ میں نے خود بھی دیکھا تھا۔ حویلی کی ملازمائیں کمرؤں کی جھاڑ پونچھ اور آرائش میں مصروف رہتی تھیں۔ مردانے کی طرف بچی حویلی میں رنگ وغیرہ بھی ہو رہا تھا۔ گاہے بگاہے مہمانوں کی آمد و رفت جاری رہتی تھی۔ کل رات مجھے ڈھولک کی آواز بھی سنائی دی تھی۔

ایک بالٹی نما برتن میں باپو کے ہاتھ اور پاؤں دھلوا کر میں پانی گرانے غسل خانے کی طرف گیا تو کیدار نمودار ہوا اور اس نے مجھ سے کہا کہ میں فارغ ہو کر سیدھا مردانے میں آؤں۔ مہمان کی پٹی بدلنی ہے۔ وہ یوسف کو مہمان ہی کہتا تھا۔ لگتا تھا کہ اسے یوسف کے نام کا پتا نہیں۔

اندھا کیا چاہے..... دو آنکھیں۔ میں تو خود ہی کافی دیر سے اس بلاوے کے انتظار میں تھا۔ باپو کے ناشتے سے فارغ ہو کر میں نے میڈیکل باکس اٹھایا اور کیدار ناتھ کے ساتھ یوسف فاروقی کی طرف روانہ ہو گیا۔ حسب سابق کیدار نے ایک چابی کے ساتھ یوسف کے کمرے کا دروازہ کھولا اور ہم اندر داخل ہوئے۔ یوسف نے مجھے دیکھا تو اس کے چہرے پر رونق آ گئی۔ وہ پلنگ پر نیم دراز لی دی یعنی دور درشن دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر اٹھا اور مجھ سے مصافحہ کرنے کے بعد صوفی پر آ بیٹھا۔ اس کی چال میں ہلکی سی لنگڑاہٹ نے مجھے یاد دلایا کہ اس کی ٹانگ پر بھی زخم موجود ہے۔ یہی زخم تو تھا جس نے اسے پہلے ہسپتال میں اور پھر جاوا کے جال میں پھنسایا تھا۔ یہ زخم اسے روڈ ایکسیڈنٹ کے بعد ہونے والی لڑائی میں آیا تھا۔ بہر طور اب اس کی ٹانگ کی حالت سے لگتا تھا کہ یہ زخم بہتر ہو چکا ہے۔ اصل مسئلہ اسے کہنی کی تازہ چوٹ کا تھا۔ میں نے ”ڈسٹل وائر“ لگا لگا کر آرام سے اس کی پٹی کھولی اور زخم صاف کر کے دوبارہ دوا لگا دی۔ زخم سے ابھی تک خون کا رساؤ جاری تھا۔ میں نے پٹی ذرا زور سے باندھی اور اس سے کہا۔ ”جناب! میں نے پٹی تھوڑی سی ٹائٹ باندھی ہے تاکہ ”بلیڈنگ“ رُک جائے۔ اگر پٹی تنگ کرے تو مجھے بتا دیجیے گا، میں اس کو ڈھیلا کر دوں گا۔“

مرہم پٹی کے دوران میں ہی میں نے کیدار کی نظر بچا کر رقعہ یوسف کے ہاتھ میں تم دیا۔ وہ ذرا سا چونکا لیکن پھر سنبھل گیا۔ جانے سے پہلے میں نے اپنا بال پوائنٹ بھی یوسف کی

مشابہت رکھتی تھیں۔

یہاں چند دن پہلے میرے بازو کی نس میں پھر ایک انجکشن لگایا گیا جس کے بعد میں بے ہوش ہو گیا۔ اسی بے ہوشی کی حالت میں مجھے اس دوسرے گاؤں پہنچا دیا گیا۔ شروع میں میرا خیال تھا کہ میں پاکستان میں ہی ہوں لیکن یہاں اتنی کثرت سے سکھ نظر آئے کہ میں سمجھنے پر مجبور ہو گیا کہ بارڈر پار کر کے انڈین علاقے میں آچکا ہوں۔ پتا نہیں کہ اب میرے ساتھ کیا ہونا ہے۔

مجھے چودھری انور نے کچھ نہیں بتایا تھا، نہ یہ لوگ یہاں کچھ بتا رہے ہیں۔ چودھری انور کی حویلی میں ہی میرے چہرے پر یہ زخم بھی لگایا گیا جس کے ٹاکوں کے دودھاگے تم نے کل نکالے ہیں۔ زخم لگانے والی بات پر تم حیران ہوئے ہو گے۔ ہاں، ابیسا ہی ہوا ہے۔ یہ زخم لگانے سے پہلے میری کھال کون کیا گیا اور پھر تیز چاقو کی نوک سے بڑی صفائی کے ساتھ کٹ لگایا گیا۔ کسی وقت تو لگتا ہے کہ شاید یہ لوگ مجھ پر کوئی جادو ٹونا کر رہے ہیں۔ دو دن پہلے میں نے یہاں سے بھاگنے کی کوشش بھی کی ہے۔ کیدار ناتھ کھانا دینے کے لیے اندر آیا تو میں اسے دھکا دے کر بھاگ نکلا۔ رات کا وقت تھا۔ لائٹ بھی گئی ہوئی تھی مگر میں برآمدے تک ہی پہنچا تھا کہ دو نثار چیں روشن ہو گئیں اور ایک بندے نے میری طرف رائفل سیدھی کر لی۔ اسی کھینچا تانی میں میری کہنی پر بھی یہ چوٹ آئی ہے۔ تب سے میرے کمرے کو باہر سے تالا بھی لگایا جانے لگا ہے۔ میں نے اندازہ لگایا ہے کہ میرے کمرے کے آس پاس ہر وقت تین چار بندے موجود رہتے ہیں۔ رات کو بارہ بجے کے بعد بھی کم از کم دو بندے تو سامنے والے برآمدے میں ضرور ہوتے ہیں۔ یہ بڑے سخت لوگ ہیں۔ ہر وقت جھگڑوں، مقدموں اور مارا ماری کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ یہ حویلی اوتار سنگھ کی ہے۔ وہ علاقے میں لوگوں کے فیصلے کراتا ہے اور اس کی پچائیت کو پورے علاقے میں بڑی اہمیت دی جاتی ہے لیکن وہ خود کوئی ایسا نیک پارسانہ نہیں ہے۔ میرے اندازے کے مطابق کئی جرم اس کے کھاتے میں ہوں گے۔ اس کا ایک بیٹا بھی کافی بدنام ہے۔ اس پر سنگین مقدمے ہیں اور وہ کچھ عرصہ سے روپوش بھی ہے۔ اس کا نام اشوک سنگھ ہے۔ چھوٹا بیٹا ہری سنگھ کسی حد تک اچھا ہے اور لوگ اس کی عزت بھی کرتے ہیں۔ مگر حویلی کے دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی شراب، گانجے اور عورت کا رسیا ہے۔ کل ہری سنگھ میرے پاس آیا تھا۔ مجھ سے کہہ رہا تھا۔ ”تمہارا کہنی اور ٹانگ کا زخم کچھ اور ٹھیک ہو جائے تو پھر تم سے ایک چھوٹا سا کام لینا ہے۔ اس کے بعد تم پر کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی۔“ میں نے کہا۔ ”اس کا کیا مطلب ہے؟ مجھے آزاد کر دیا جائے گا؟“ کہنے

جھولی میں گر دیا جس پر یوسف نے اخبار رکھ دیا۔

میں کیدار کے ساتھ دوبارہ زنان خانے میں بیمار باپو کے پاس آ گیا۔ راستے میں مجھے چند ملازمائیں نظر آئیں جو اسٹیل اور تانبے کے بڑے بڑے تھالوں میں مٹھائی وغیرہ لے کر اندرونی کمروں کی طرف جا رہی تھیں۔

میں بے چینی سے یوسف کے رد عمل کا انتظار کرنے لگا۔ آتے ہوئے میں نے اس سے کہا تھا کہ پتی کس کر باندھ رہا ہوں تاکہ خون کا رساؤ ختم ہو جائے۔ حالانکہ زخم میں خون کا رساؤ روکنے کے لیے یہ طریقہ اختیار نہیں کیا جاتا۔ مجھے امید تھی کہ یوسف میرا اشارہ سمجھ جائے گا اور پتی نرم کرانے کے بہانے مجھے پھر بلا لے گا۔ بالکل ایسا ہی ہوا۔ قریب دو گھنٹے بعد کیدار پھر میرے پاس آیا اور بولا۔ ”یار! وہ تمہارے مریض صاحب تمہیں پھر یاد فرما رہے ہیں۔ ان کو درد ہو رہا ہے۔“

میں دوبارہ اس کے ساتھ چل دیا۔ مجھے امید تھی کہ یوسف نے میرے رقعے کا جواب لکھ لیا ہوگا۔ ہم مسلح پہرے داروں کے درمیان سے گزر کر مقفل دروازے تک پہنچے۔ حسب سابق کیدار نے دروازہ کھولا۔ یوسف چہرے پر تکلیف سجائے پلنگ پر دراز تھا۔ ”او بھئی ڈسپنسر صاحب! تم نے تو بازو کو کٹنا لگا دیا ہے۔“

”سوری جی! شاید کچھ زیادہ ہی ٹائٹ ہو گئی ہے پتی۔“

میں نے پتی کھولی۔ کچھ مزید آئٹ مینٹ لگائی اور روئی رکھ کر پھر بینڈج کر دی۔ اسی دوران میں یوسف نے تہ شدہ رقعہ بھی میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ یہ کام بالکل صفائی سے ہوا اور کیدار کو کسی طرح کا شک نہیں ہوا۔

میں واپس اپنے کمرے میں پہنچا اور دروازہ بند کر کے رقعہ پڑھنے لگا۔ یوسف نے اپنا کاغذ استعمال کیا تھا۔ کاپی سائز کے ایک صفحے پر لکھا تھا۔

”تائبش بھائی! السلام علیکم..... تمہیں یہاں انڈیا کے اس گاؤں میں دیکھا تو اپنی آنکھوں پر بھروسہ نہیں ہوا۔ سچ پوچھو تو میں خود کشی کا سوچنے لگا تھا۔ تمہیں دیکھ کر پھر سے زندگی کی امید بندھ گئی ہے۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں ہسپتال سے نکلنے کے کچھ دیر بعد ہی بے ہوش ہو گیا تھا۔ جب ہوش آیا تو میں ہارون آباد سے کافی آگے آچکا تھا اور یہاں بارڈر کے پاس ایک پنڈ میں تھا۔ پنڈ کے چودھری کا نام انور ہے اور اس کی پہلی حویلی پورے علاقے میں مشہور ہے۔ اس پہلی حویلی میں مجھے چار پانچ دن رکھا گیا۔ یہاں میں نے ایک دو ایسی لڑکیاں دیکھی ہیں جو انڈیا کی مشہور اداکاراؤں سے کافی

لگا۔ ”آزادی نہیں کیا جائے گا، تمہیں پاکستان واپس بھی پہنچایا جائے گا۔ تم ہمارے مہمان ہو، دشمن نہیں ہو۔“ میں نے کہا۔ ”اگر مہمان ہوں تو پھر مجھے کمرے میں بند کیوں رکھا ہوا ہے اور باہر پھرے دار ہیں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”صرف اس ڈر سے کہ تم کہیں بھاگنے کی دوسری کوشش نہ کرو۔“

”میں بہت پوچھتا رہا کہ وہ کیا کام ہے جو انہوں نے مجھ سے لینا ہے۔ اس نے کہا کہ میں اس بارے میں پریشان نہ ہوں۔ یہ بالکل معمولی سا ٹاسک ہے۔ بس میں یوں سمجھوں کہ ایک بندے سے ملاقات کرائی جانی ہے میری۔ میرے اس رقعے کا جواب جلد از جلد لکھو تاکہ مجھے حالات سے کچھ آگاہی ہو۔ کیا تمہارے ساتھ کوئی اور بھی یہاں آیا ہے؟ مجھے ثروت کی خیر خیریت سے بھی آگاہ کرو۔ اپنی رائے بھی مجھے بتاؤ کہ مجھے اس سچویشن میں کیا کرنا چاہیے۔ کیا ہری سنگھ کی بات پر اعتبار کر کے انتظار کرنا چاہیے یا پھر یہاں سے از خود نکلنے کی کوشش کرنی چاہیے؟ اگر نکلنے کی کوشش کرنی ہے تو کیا تمہارے ذہن میں کوئی پلان ہے؟ تمہارے جواب کا شدت سے انتظار کروں گا۔ خط کو پڑھنے کے بعد فوراً ضائع کر دینا۔“

یوسف کی اس تحریر میں ایک دو باتیں چونکا دینے والی تھیں۔ سردار اوتار کے چھوٹے بیٹے ہری سنگھ نے کہا تھا کہ وہ لوگ یوسف سے ایک چھوٹا سا کام لینا چاہتے ہیں لیکن اس کام کی نوعیت کے بارے میں یوسف کو کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ شاید وہ کسی سے یوسف کی ملاقات کرانا چاہتے تھے لیکن اس ملاقات کے بعد کیا صورت حال ہوگی، اس کے بارے میں کیا کہا جاسکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ یہ ملاقات والی بات بس ڈھکوسلا ہی ہوتی۔ ایک اور خاص بات جو یوسف بتا رہا تھا، یہ تھی کہ اس کے چہرے پر زخم لگایا گیا تھا۔ اس زخم کے حوالے سے کیا ڈراما رچایا جانے والا تھا، اس کا بھی کچھ اندازہ نہیں تھا۔ عین ممکن تھا کہ یوسف کے چہرے کی مشابہت کسی دوسرے چہرے سے بنائی جا رہی ہو اور اس کے خدو خال کو کسی دوسرے کے خدو خال سے قریب تر کیا جا رہا ہو لیکن یہ زخم لگائے جانے کا مقصد کچھ اور بھی ہو سکتا تھا۔ مثلاً یوسف کو کسی جرم میں ملوث کرنا وغیرہ۔

یہ سارا معاملہ خاصاً اُلجھا ہوا تھا۔ ایک بات تو صاف تھی کہ یہ کوئی معمولی چکر نہیں ہے۔ یوسف کو کہاں سے کہاں پہنچایا گیا تھا اور اس سلسلے میں کئی خطرات مول لیے گئے تھے۔ اب وہ یہاں ایک بڑے سکھ سردار اوتار سنگھ کی عظیم الشان حویلی میں موجود تھا۔ کاش عمران میرے ساتھ ہوتا۔ اس کی سحر انگیز شخصیت ان سارے حالات کا احاطہ کر لیتی۔ وہ اپنے ناخن تدبیر سے مشکل ترین گتھیاں سلجھاتا تھا اور بڑے بڑے مرحلے ہستے کھیلنے طے کر جاتا تھا۔ وہ خطروں

کا کھلاڑی تھا۔ اس نے مجھے بھی موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالنا سکھایا تھا لیکن میرے اور اس کے معیار میں ابھی بہت فرق تھا۔

پروگرام کے مطابق میں نے دو بجے کے قریب جگت سنگھ کو فون کیا۔ میری تیسری چوتھی کوشش کامیاب ہوئی اور اس سے رابطہ ہو گیا۔ آوازوں سے اندازہ ہوا کہ وہ بس میں سوار ہے اور ترشولا کی طرف آ رہا ہے۔ اس نے میری بات کی تصدیق کی اور بتایا کہ ایک گھنٹے کے اندر اندر وہ مجھ تک پہنچ جائے گا۔ ثروت بھی اس کے ساتھ تھی۔ اس نے ثروت سے میری بات کرائی۔ وہ کچھ ڈری ہوئی لگتی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ”بس سٹاپ پر آپ اکیلے ہوں گے یا کوئی ساتھ ہوگا؟“

میں نے کہا۔ ”اکیلا ہوں گا۔ لیکن اگر تانگے کے بجائے گاڑی پر آیا تو پھر ہندو ڈرائیور میرے ساتھ ہوگا۔ ہم دس پندرہ منٹ میں حویلی پہنچ جائیں گے۔ باقی باتیں تو تمہیں یاد ہی ہیں۔ تمہارا نام ثریا ہے۔ تم فریڈ کوٹ کے سول ہسپتال میں نرس کے طور پر کام کرتی ہو اور ایک مہینے کی چھٹی پر میرے ساتھ یہاں آئی ہو۔ ہم دونوں فریڈ کوٹ کے محلہ مندرانی میں کرائے کے مکان میں رہتے ہیں۔ ہمارا کوئی بچہ نہیں ہے۔“

ثروت نے ذرا توقف کے بعد پوچھا۔ ”اس سوال کا کیا جواب دینا ہے کہ میں آپ کے ساتھ نہیں آسکتی تھی؟“

”یہی کہ ہسپتال میں ایمر جنسی ہوگئی تھی اور چھٹی نہیں مل سکی تھی۔“

چند مزید ہدایات دینے کے بعد میں نے فون بند کر دیا اور تانگا اڑے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ حسب توقع عین موقع پر کیدار ناتھ موت کے فرشتے کی طرح میرے سر پر آن کھڑا ہوا۔ اس نے کہا۔ ”بھابی کو لینے جا رہے ہو؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ وہ بولا۔ ”تو ٹھیک ہے گاڑی پر لے آتے ہیں۔“

میں نے کہا۔ ”میرا خیال تھا کہ تم باپو کے پاس رہو گے۔“

وہ بولا۔ ”اس کا انتظام بھی ابھی ہو جاتا ہے۔“

پھر اس نے ایک اصغ سنگھ نامی ملازم کو آوازیں دیں اور اسے ایک گھنٹے کے لیے باپو کی دیکھ بھال پر مقرر کر دیا۔ باپو سو رہے تھے۔

آدھ پون گھنٹے کے اندر ہم ثروت کو حویلی لے آئے۔ وہ کچھ ڈری سہی تھی مگر میری باتوں سے جلد ہی اس کی دھارس بندھ گئی۔ وہ اپنے ساتھ ایک چھوٹا چڑی بیک لائی تھی۔ اس میں وہ سامان تھا جو نرسنگ کے حوالے سے مطلوب ہو سکتا تھا۔ ایک اٹیچی کیس میں اس کے اور

میرے کپڑے وغیرہ تھے۔ ثروت نے جو لباس پہن رکھا تھا وہ بھی اس کے کریکٹر کے عین مطابق تھا۔ میں نے اسے پہلے ہی سمجھا دیا تھا کہ اسے کس انداز سے بات چیت کرنی ہے اور یہاں کیا کیا ڈیوٹیاں سرانجام دینی ہیں۔

حویلی میں پہنچ کر چند منٹ ہم نے تنہائی میں بھی بات چیت کی۔ یہ بات چیت اس چھوٹے کمرے میں ہوئی جو میرے زیر استعمال تھا۔ ”یوسف کہاں ہیں؟“ ثروت نے چھوٹے ہی پہلا سوال کیا۔

اس کے ایسے سوال میرے سینے میں دھواں سا بھر دیتے تھے۔ میں نے خود پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔ ”وہ مردانے حصے میں ہے۔ ایک کمرے میں بند ہے، وہاں کوئی آجائیں سکتا۔ ہم نے جو کچھ کرنا ہے، بڑی احتیاط اور صبر تحمل سے کرنا ہے۔“

”آپ نے انہیں میرے بارے میں بتا دیا ہے۔ یعنی انہیں پتا ہے کہ میں آپ کے ساتھ ہوں؟“

”نہیں..... ابھی تو نہیں بتایا..... اور اس سلسلے میں تم سے مشورہ بھی کرنا تھا۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوگا کہ وہ خواہ مخواہ کسی طرح کے شبہ میں پڑ جائے۔“

”کیسا شبہ؟“

”ثروت! جہاں تک میرا اندازہ ہے، یوسف ہمارے ماضی کے بارے میں کچھ نہ کچھ ٹوہ لگا چکا ہے۔ نصرت کے علاج میں، میں نے جو دلچسپی لی ہے، اس نے بھی اسے چونکایا ہے۔ اب اگر اسے پتا چلے گا کہ ہم کئی دنوں سے اسے سفر کر رہے ہیں، کئی جگہ ہم نے ایک ہی چھت تلے رات گزاری ہے تو اس کے دل میں یقیناً سو سے بڑا ہوں گے۔“

ثروت کے تلخ چہرے پر گہری بخمیدگی چھیل گئی۔ وہ بولی۔ ”تائبش! سچ ہی ہوتا ہے اور اس میں بڑی طاقت ہوتی ہے، اور مجھے یقین ہے کہ یوسف کی سوچ ایسی پست نہیں ہو سکتی۔“

میں اس سلسلے میں مزید بحث کرنا نہیں چاہتا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے ثروت! اس بارے میں سوچ لیتے ہیں۔“ تھوڑے سے توقف کے بعد میں بولا۔ ”ثروت! اس رات کے لیے مجھے معاف کر دینا۔ میں تیز بخار میں تھا۔ بس اسی مدہوشی میں وہ بات ہوئی۔“ وہ جواب میں کچھ نہیں بولی۔ بس پلکیں جھکا کے کھڑی رہی۔

کچھ ہی دیر بعد ثروت اپنی ڈیوٹی پر باپو کی پتی یعنی وڈی بے بے کے پاس پہنچ گئی۔ جانے سے پہلے اس نے اپنی اوزر مٹی کے نیچے سے موبائل فون نکال کر میرے حوالے کر دیا۔

کیدار ناتھ اب میرے ساتھ کافی بے تکلف ہو چکا تھا۔ فارغ وقت میں ہم دونوں اکثر حویلی کی چھت پر چلے جاتے۔ دور تک پھیلے کھیتوں کھلیانوں کا نظارہ کرتے اور اس کے ساتھ گفتگو بھی جاری رہتی۔ حویلی میں شادی کی تیاریاں زور پکڑتی جا رہی تھیں۔ ڈھولک اور گیتوں کی آواز اکثر حویلی کے اندرونی حصوں سے ابھرتی رہتی تھی۔ پتا چلا کہ سردار اوتار کی بیٹی سرنوں کی شادی علاقے کے ایک ہم پلہ سردار کے بیٹے سے ہو رہی ہے اور اس میں بہت ہلکا گلا ہونے والا ہے۔

یوسف کے خط کا جواب ابھی مجھے لکھنا تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ کیا اور کوئی بھی میرے ساتھ یہاں آیا ہے یا میں اکیلا ہوں؟ اس کا جواب ”ہاں“ میں تھا۔ میرے ساتھ ثروت یہاں آئی تھی لیکن ابھی تک میں حتمی فیصلہ نہیں کر سکا تھا کہ یوسف کو ثروت کی آمد کے بارے میں بتاؤں یا نہیں۔ یوسف نے یہ بھی پوچھا تھا کہ اسے ہری سنگھ کی بات کا اعتبار کر کے انتظار کرنا چاہیے یا یہاں سے فوری طور پر نکلنے کی کوئی تدبیر کرنی چاہیے۔ فی الوقت مجھے یہی بہتر لگ رہا تھا کہ انتظار کیا جائے۔

میں نے ایک رقعہ لکھ کر جیب میں رکھ لیا اور کیدار کی آمد کا انتظار کرنے لگا۔ میں جب بھی یوسف کی بینڈ تھ کے لیے جاتا تھا، کیدار ساتھ ہی ہوتا تھا، کیدار کی آمد سے پہلے ہی باپو نے مجھے آواز دی۔ میں حسب معمول ان کے چہرے کی طرف جھک گیا اور اپنا ایک کان ان کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ انہوں نے اپنی پیار مدھم آواز میں کہا کہ میں بائیں طرف والی الماری کھول کر اس کی مٹھی دراز سے تصویر والی کاپی (الیم) نکالوں۔

میں نے اس ہدایت پر عمل کیا، باپو نیم دراز تھے۔ میں نے الیم ان کی جھولی میں رکھ دی اور موٹے شیشوں والی عینک ان کی آنکھوں سے لگا دی۔ وہ اپنے سلامت ہاتھ کو ہولے ہولے حرکت دینے لگے اور تصویریں دیکھنے لگے۔ یہ ان کے خاندان ہی کی تصاویر تھیں۔ کچھ بلیک اینڈ وائٹ، کچھ رنگین۔ پھر انہوں نے بڑے سائز کی ایک رنگین تصویر پر انگلی رکھی اور بہت مدھم آواز میں مجھے بتایا کہ یہ ان کی پوتی سرنوں کی تصویر ہے جس کی کچھ ہی دن بعد شادی ہو رہی ہے۔ تیکھے نقوش والی یہ لڑکی خوبصورت تھی۔ حالانکہ وہ دیہاتی لباس میں تھی اور اس کے عقب میں ایک گھوڑا بھی دکھائی دے رہا تھا پھر بھی یوں لگا کہ وہ پڑھی لکھی ہے۔

اس تصویر کے ساتھ والے نسخے پر میری نظر ایک اور تصویر پر پڑی اور میں بُری طرح چونک گیا۔ یہ کھڑی ناک والا ایک پچیس پچیس سالہ جوان تھا۔ اس کے رخسار پر ایک دیباہی کٹ تھا جیسا یوسف کے رخسار پر نظر آتا تھا۔ یہ نیم گول کٹ کپٹی کی طرف سے شروع ہوتا تھا

کے قتل میں بہت دلچسپی لیتے ہیں۔ انہوں نے پنجاب میں اور پنجاب سے باہر بھی اپنے جاسوس چھوڑ رکھے ہیں۔ دو تین مہینے پہلے احمد آباد سے کسی مخبر نے یہ اطلاع دی تھی کہ کسی سینما کے گیٹ کیپر نے اشوک کو کسی سینما ہال سے نکلنے دیکھا ہے۔ بس اس اطلاع پر پولیس کی دوڑیں لگ گئیں۔ یہاں فاضلک اور بیکانیر وغیرہ سے بھی پولیس کی دو تین پارٹیاں بھاگ بھاگ احمد آباد پہنچ گئیں۔ کئی دن چھان بین ہوتی رہی پر کوئی نتیجہ نہ نکلا۔ بعد میں یہ لوگ یہاں حویلی کے دو ملازموں کو پکڑ کر لے گئے۔ وہ ان سے مار پیٹ کا ارادہ رکھتے تھے مگر ایسے موقعوں پر سردار اوتار سنگھ کے تعلقات بہت کام آتے ہیں۔ دو تین گھنٹے کے اندر ملازم واپس آ گئے۔ ایسے سلسلے پہلے بھی چلتے رہے ہیں۔۔۔۔۔

کیدار باتیں کر رہا تھا اور میرے دماغ کی پھر کی تیزی سے گھوم رہی تھی۔ میرے ذہن میں ایک اندیشہ بڑی تیزی سے سر اٹھا رہا تھا۔ میرے سامنے سب سے اہم سوال یہ تھا کہ سردار اشوک کی صورت سے ملنے جلتے یوسف فاروقی کو پاکستان سے اٹھا کر یہاں کیوں لایا گیا تھا؟ یہ لوگ اس سے کیا مطلب حاصل کرنا چاہتے تھے۔

میں نے کیدار ناتھ سے پوچھا۔ ”تم نے سردار اشوک کو دیکھا ہوا ہے؟“

”نہیں یار! تمہیں بتایا ہے نا کہ وہ چار پانچ سال سے روپوش ہے۔“

”کہیں اس کی تصویر بھی نہیں دیکھی؟“

”تصور شاید ایک آدھ بار دیکھی ہے۔“

میں نے محسوس کیا کہ کیدار ناتھ کا ذہن اس طرف نہیں جا رہا جدر میں نے لے جانا چاہا رہا ہوں۔ یوسف اور اشوک سنگھ کی صورتوں میں جو نمایاں مماثلت نظر آرہی تھی، کیدار نے اس پر غور نہیں کیا تھا۔ خاص طور سے چہرے پر کٹ لگنے کے بعد تو یہ مماثلت اور بڑھ گئی تھی۔ اب دو ہی صورتیں تھیں۔ کیدار واقعی بے خبر تھا یا پھر وہ سب کچھ جانتا تھا لیکن مجھ سے چھپا رہا تھا۔ شام کے بعد میری اور ثروت کی ملاقات ہوئی۔ ثروت کو زیادہ مشکل پیش نہیں آئی تھی۔ اوتار سنگھ کی بوڑھی ماما جسے وڈی بے بے کہا جاتا تھا، خاموش طبع اور مذہبی عورت تھی۔ اس کی صحت بھی کچھ دنوں سے اچھی نہیں تھی۔ بوڑھے کی دیگر بیماریوں کے علاوہ اس کی کمر کے مہروں میں بھی نقص تھا جس کے سبب وہ سارا وقت بستر پر ہی گزارتی تھی۔ چونکہ وہ بہت ہلکی پھلکی تھی اس لیے اسے اٹھانے بٹھانے میں ثروت کو خاص دقت پیش نہیں آرہی تھی۔ ثروت نے اس کی باتوں سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ کسی وجہ سے اپنی پوتی کی شادی پر زیادہ خوش نہیں ہے۔ ڈھولک بجتی تھی تو وہ اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنے کا کہہ دیتی تھی۔

اور زخار کے وسط تک جاتا تھا۔ مجھے اس شخص کی شکل بھی یوسف سے ملتی جلتی نظر آئی۔ پھر اگلے صفحے پر میں نے اسی شخص کی ایک اور تصویر دیکھی اور حیران رہ گیا۔ اس کا سائڈ پوز ستر اسی فیصد یوسف سے مل رہا تھا۔ ایک دم بہت سی بکھری ہوئی کڑیاں آپس میں مل گئیں۔ اس کا مطلب تھا کہ یوسف واقعی اپنی شکل و صورت کی وجہ سے یہاں موجود تھا۔ کم از کم ان دو تصویروں کو دیکھنے کے بعد تو یہی محسوس ہو رہا تھا۔

میں نے مودب انداز میں باپو سے پوچھا۔ ”باپو جی! یہ کون ہے؟“

وہ بھرائی ہوئی بہت دھیمی آواز میں بولے۔ ”میرا بڑا پوتا اشوک سنگھ۔“

”ماشاء اللہ بڑے گبرو جوان ہیں یہ۔۔۔۔۔ لیکن ان کو کبھی یہاں دیکھا نہیں۔“

”یہ باہر ہوتا ہے۔“ باپو کی طرف سے مختصر اور مبہم جواب ملا۔

میں ششدر تھا۔ کچھ دیر بعد کیدار ناتھ آیا تو میں نے اس کو اشوک کے حوالے سے تھوڑا سا کریدا۔

کیدار کی باتوں سے پتا چلا کہ مخالفوں نے سردار اشوک پر کچھ جھوٹے مقدمے بنائے ہوئے ہیں۔ دشمن داری بھی بہت بوڑھی ہوئی ہے جس کی وجہ سے سردار اوتار سنگھ نے اشوک سنگھ کو یہاں نہ آنے کی ہدایت کر رکھی ہے۔

”دشمن داری سے تمہارا کیا مطلب ہے؟“ میں نے کیدار سے پوچھا۔

وہ بولا۔ ”سردار اشوک کی سب سے بڑی دشمنی تو یہ حرام خور پولیس ہی ہے۔ لاکھوں کھا بھی گئی ہے پھر بھی سردار اشوک کا پیچھا نہیں چھوڑ رہی۔ اس کو گولی کا آرڈر دیا ہوا ہے بڑے افسروں نے۔“ کیدار نے آخری الفاظ دھیمی آواز میں سے بڑے دراز دارانہ لہجے میں کہے۔

”کوئی خاص جرم کیا تھا اشوک صاحب نے؟“

”میں سمجھ لو۔ ایک بڑا کرخت قسم کا پولیس افسر قتل ہو گیا تھا سردار اشوک سے۔ جب سے ان لوگوں نے اشوک کو اپنی ہٹ لسٹ پر رکھا ہوا ہے۔ پنجاب کا چچا چچا چھان چکے ہیں اور اب بھی چھان رہے ہیں۔ اپنے بیٹی بھائیوں کے لیے ان پولیس والوں کی بھاگ دوڑ بہت بڑھ جاتی ہے۔ عام قتل ہو تو ڈیڑھ دو سال بعد ہی قاتل بند ہو جاتی ہے۔ یہاں چار پانچ سال گزر گئے ہیں مگر یہ لوگ اسے ابھی تک ڈھونڈ رہے ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ پولیس کو جہاں بھی سردار اشوک کا کھوج لگ گیا، اسے مقابلے میں پار کر دیا جائے گا۔“

”تو وہ پیش کیوں نہیں ہوتا؟“

”تو بھی سیدھی سیدھی پھانسی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ کئی اہم سیاسی لوگ بھی سردار اشوک

رکھا۔ میں نے پوچھا۔ ”تم نے یہ بھی بتایا کہ ہم ہوٹل میں اور جگت سنگھ کے گھر میں اکٹھے رہتے رہے ہیں۔“

”ہاں تابش! اس میں چھپانے کی کوئی بات نہیں تھی۔ یوسف کی سوچ بُری نہیں ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ میاں بیوی کے طور پر سفر کرنا ہماری مجبوری تھی۔“

میں نے ثروت کی اس وضاحت کا کوئی جواب نہیں دیا۔ بہر حال میرے ذہن میں یہ خدشہ بدستور موجود رہا کہ یوسف کے دل میں شکوک و شبہات کی کونپلیں کھلیں گی۔

رات کو میں دیر تک جاگتا رہا۔ دل میں عجیب سی بے چینی تھی۔ ثروت ایک بار پھر اپنی سوچوں کا رُخ یوسف کی طرف موڑ رہی تھی۔ وہ ملے تھے..... انہوں نے طویل تبادلہ خیال کیا تھا۔ یقیناً ان کے درمیان وہ فاصلہ کم ہوا تھا جو لاہور میں اس وقت پیدا ہو گیا تھا جب ثروت آسٹریا سے آئی تھی اور اس نے یوسف کے گرم جوش استقبال کو کوئی اہمیت نہیں دی تھی۔ بہر حال یوسف جس قسم کے حالات میں پھنسا ہوا تھا اس کے لیے ہمدردی اور فکر مندی کے احساسات پیدا ہونا قدرتی بات تھی اور یہ احساسات ثروت میں بھی پیدا ہو رہے تھے۔

میں دیر تک جاگتا رہا پھر ہوا خوری کے لیے پچھلے صحن میں چلا گیا۔ تاہم اس سے پہلے میں نے اطمینان کر لیا کہ باپو سور ہے ہیں۔ نیند کی حالت میں یہ قریب المرگ باپو سردار کسی مومی تصویر کی طرح نظر آتا تھا۔ میں صحن میں آ گیا۔ تاریک آسمان پر ستاروں کی بساط بھی ہوئی تھی۔ انہی میں سے کوئی ایک ستارہ میری والدہ تھی اور کوئی ایک ستارہ شاید بھانڈیل اسٹیٹ کی سلطانہ بھی تھی اور سلطانہ نے مجھ سے کہا تھا۔ ”مہر و ج! ایک دن وہ لڑکی تمہیں جبرور ملے گی جس سے تم بہت زیادہ پریم کرت ہو۔ اور جب وہ تم سے ملے تو اس سے کہنا کہ ایک وردیس میں تمہاری ایک بہن تھی جو بن دیکھے ہی تمہاری محبت میں گرفتار تھی اور پھر میرے بالو کو میری اس بہن کی گود میں ڈال دینا۔“

اس نے اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ امید اور محبت کے آمیزے میں اتھڑی ہوئی کئی باتیں کی تھیں لیکن ضروری تو نہیں ہوتا کہ انسان جو کچھ سوچے، وہ پورا بھی ہو۔ یہاں ثروت کی شادی ہو چکی تھی۔ اس نے خود کو ایک عجیب لیکن بڑے مضبوط ازدواجی رشتے میں باندھا ہوا تھا۔ ہوا میں نمی تھی۔ سفیدے اور سرو کے طویل درخت چاند کی خنک روشنی میں ہو لے ہو لے جھوم رہے تھے، جیسے دھیمے سروں والے کسی گیت پر سر ہلا رہے ہوں۔ کبھی کسی کتے یا بلی کی آواز سنائے میں ارتعاش پیدا کرتی اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ دل میں دھواں سا بھرنے لگا۔ کسی کا لکھا ہوا یہ فقرہ ذہن میں بار بار ابھرنے لگا۔ اگر قسمت میں محرومیاں لکھی ہوں تو

میں اور ثروت تقریباً آدھ گھنٹہ ایک ساتھ رہے۔ ثروت جلد از جلد یوسف کو دیکھنا اور اس سے ملنا چاہتی تھی۔ اس کی یہ بے تابی میرے دل پر چڑکا سا لگاتی تھی۔ میں نے اسے یوسف سے ملنے میں جو مضمرات تھے، وہ بتا دیئے تھے۔ اب فیصلہ اسے ہی کرنا تھا اور اس کا فیصلہ یہی لگتا تھا کہ وہ یوسف سے ملے گی۔ میں نے یوسف کے لیے رقعہ لکھ رکھا تھا۔ اس میں چند لائنوں کا اضافہ کر دیا۔ ان لائنوں میں، میں نے یوسف کو بتا دیا کہ ثروت یہاں آچکی ہے اور اس سے ملنا بھی چاہ رہی ہے۔ وہ کسی بھی وقت اس سے ملنے آجائے گی۔ یہ نہ ہو کہ اسے اچانک دیکھ کر وہ چونکا ہوا نظر آئے..... اور کیدار کو شک ہو۔

اس روز کیدار کے ساتھ میں یوسف کی بینڈ تاج کرنے گیا تو میں نے یہ رقعہ حسب سابق بڑی صفائی سے یوسف تک پہنچا دیا۔ یوسف کی کہنی کا زخم ابھی پوری طرح ٹھیک نہیں تھا۔ مزید مرہم پٹی کی ضرورت تھی۔ اگلے روز میں نے ثروت اور یوسف کے ملنے کا انتظام کر دیا۔ میں باپو کے پاس کمرے میں تھا اور بائیں ہاتھ سے ان کی لمبی سفید داڑھی میں کنگھی کر رہا تھا۔ دائیں ہاتھ کی کلائی پر میں نے پٹی باندھ رکھی تھی۔ میں نے باپو کو بتایا تھا کہ ان کے لیے پانی گرم کرتے ہوئے میرا پاؤں پھسلا ہے اور کلائی کا جوڑ مڑ گیا ہے۔

کچھ دیر بعد جب کیدار ناتھ مجھے لپٹنے کے لیے آیا تا کہ میں یوسف کی پٹی بدل سکوں تو میں نے اسے بتایا کہ آج تو میں خود بھی زخمی ہوں۔ میرے لیے دایاں ہاتھ ہلانا مشکل ہو رہا ہے۔

”تو پھر؟“ اس نے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”ثریا کو لے جاؤ۔ وہ مجھ سے بہتر کرے گی۔“

”اس کے لیے سردار ادتار جی سے آگیا لینی پڑے گی۔“

”تو لے لو۔“ میں نے کہا۔

کیدار چلا گیا اور اس روز ثروت اور یوسف کی ملاقات بھی ہو گئی۔ شام کو ثروت مجھ سے ملنے آئی تو اس نے اس ملاقات کی ساری تفصیل بتائی۔ یہ ایک اتفاق تھا کہ اسے یوسف سے تفصیلی بات چیت کا موقع مل گیا تھا۔ جب وہ یوسف کی پٹی بدلنے کے لیے مردانے کے اس کمرے میں گئی تو دو تین منٹ بعد ہی کیدار ناتھ کو ہری سنگھ کی آواز پڑ گئی۔ وہ ”جی چھوٹے سردار“ کہتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کی واپسی آدھ گھنٹے سے پہلے نہیں ہوئی۔ یہ موقع ان دونوں کے لیے غنیمت تھا۔ انہوں نے سرگوشیوں میں ہر طرح کے سوال جواب کیے۔ ثروت نے یوسف کو لاہور سے لے کر یہاں تک کی ساری رُوداد سنائی۔ کچھ بھی اس سے چھپا کر نہیں

حالات کی کروٹ بھی بے کار ہی ثابت ہوتی ہے۔ کیا میرے ساتھ بھی یہی سب کچھ ہونے والا تھا.....؟

ایک طرف چھوٹی سی برآمدہ نما جگہ تھی۔ یہاں دیوار پر اُپلے نظر آرہے تھے اور چھت تلے پرالی کے بڑے بڑے گٹھے پڑے تھے۔ میں اپنے دونوں ہاتھ سر کے نیچے رکھ کر ایک گٹھے پر نیم دراز ہو گیا اور بادل کی ایک ٹکڑی میں ہولے ہولے حرکت کرتے ہوئے چاند کو دیکھنے لگا۔ اسی دوران میں حویلی کے زنان خانے میں پھر سے ڈھولک کی آواز ابھرنے لگی۔ لڑکیوں نے کورس کی شکل میں گانا شروع کیا۔ تیرے باجرے دی راکھی منڈیا میں نہیں بیندی دے..... (اے میرے محبوب میں تیرے باجرے کے کھیت کی رکھوالی کے لیے نہیں بیٹھ سکتی) گیت کی مدھم آواز میری ساعت تک پہنچ رہی تھی۔ اچانک میں بُری طرح چونکا۔ دوسائے تیزی سے اس تنہا برآمدے کی طرف آئے اور خشک پرالی کے ڈھیر کے پیچھے اوجھل ہو گئے۔ چند سیکنڈ بعد مجھے ایک ہانپی ہانپی سی آواز سنائی دی۔ ”میں سوگند کھاتی ہوں کیدار صاحب! میں آپ کی گڈی کے پاس بھی نہیں گئی۔ میں نے تو سارا دن باورچی خانے میں گزارا ہے۔“

چند سیکنڈ کے بعد کیدار پھنکارا۔ ”تو گڈی کی طرف نہیں گئی تو پھر تجھے یہ بڑا ملا کیسے؟“

”یہ گڈی سے کافی دور کیاری میں پڑا ہوا تھا۔ م..... مجھے پتا نہیں تھا کہ یہ آپ کا ہے۔ نہیں تو اسی ویلے آپ کو واپس کر دیتی۔“

”اس میں پورے نو سو روپے تھے۔ اب پانچ سو سے بھی دس پندرہ کم ہیں۔ باقی کہاں گئے؟“ کیدار نے کرخت آواز میں پوچھا۔

”نو سو نہیں تھے جی۔ صرف سات سو تھے۔ دو سو روپیہ..... م..... مجھ سے خرچ ہو گیا۔ میں وچن دیتی ہوں کہ آپ کو واپس کر دوں گی۔“

”چوری لکھ کی ہو یا لکھ کی، چوری ہی ہوتی ہے اور ٹونے کی ہے اور اگر آج کی ہے تو اس سے پہلے بھی کرتی رہی ہوگی۔ میں مالکوں کو بتاؤں گا تو تیرے اور بھی بہت سے پول کھل جائیں گے۔“

”میں سوگند کھاتی ہوں۔ واہگرو جانتا ہے۔ میں نے کبھی ایسا نہیں کیا۔“

”سردار داتا راجی کو بکوانا آتا ہے وہ بکوالیس گے تجھ سے۔“

وہ روہانسی ہو گئی۔ ”میں آپ کے آگے ہتھ جوڑتی ہوں۔ میری ماں پہلے ہی بیمار ہے۔ وہ یہ نہیں جھیل سکے گی۔“

کچھ دیر خاموشی رہی۔ میں بھی اپنی جگہ بالکل بے حرکت لیٹا رہا۔ پھر تارکی میں کیدار

ناٹھ کی سرسراہٹ ہوئی سرگوشی ابھری۔ ”کا کا کہاں ہے تیرا؟“

”وہ کوٹھڑی میں سو رہا ہے۔“

”تو پھر تھوڑا سا ناٹم گزار میرے ساتھ..... سوچتے ہیں تیرے بارے میں۔“

”میں..... سمجھی نہیں؟“

”تو سب سمجھتی ہے۔ پر بھولی بن رہی ہے۔ یہ لے..... یہ لے باقی کے پیسے بھی اپنے پاس رکھ۔ پر کرنا وہی پڑے گا جو میں کہہ رہا ہوں۔“

”لیکن.....“ وہ منمنائی۔

اس کے بعد خاموشی چھا گئی۔ صرف خشک پرالی کے سرکنے کی آواز آتی رہی۔ یقیناً کیدار لڑکی کو جال میں پھنسانے میں کامیاب رہا تھا۔ یقیناً وہ اس سے دست درازی کر رہا تھا اور وہ خاموش رہنے پر مجبور تھی۔ کچھ دیر بعد اس کی مدھم آواز سنائی دی۔

”اچھا اب مجھے جانے دیں۔ مجھے سویرے سویرے ناشتہ بھی بنانا ہے۔ چھوٹے سردار ہری جی نے تاریخ پر جانا ہے نا۔ پانچ بجے نکل جانا ہے انہوں نے۔“

کیدار ناٹھ نے بھاری آواز میں کہا۔ ”ہاں ناشتے سے یاد آیا، وہ سردار راجی کا لاڈلا پروہنا (مہمان) کہہ رہا تھا کہ اس کے لیے انڈا اگھول کر نہ بنایا کرو۔ فرائی کیا کرو انگریزی طریقے سے۔ سفیدی علیحدہ زردی علیحدہ اور دودھ جتی بھی نہ بھیجا کرو۔ چائے بنایا کرو تھوڑے مٹھے والی.....“

لڑکی بولی۔ ”ایک تو جی اس پروہنے کی فرمائشیں ہی بہت ہیں۔ کل مکئی کا مٹھا پر انٹھا پکا یا ہے اس کے لیے، پرسوں حلوے کی فرمائش تھی۔ پتا نہیں سردار راجی اتنے نخرے کیوں دیکھ رہے ہیں اس کے.....“

چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر کیدار کی طنزیہ آواز ابھری۔ ”یہ وہی نخرے ہیں جو مسلمان قربانی کے بکرے کے دیکھتے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“

”کچھ نہیں..... بس سمجھ لے کہ اس پروہنے والی مصیبت ایک دودن ہی کی ہے، یہ چلا جائے گا کہیں۔“

”پر یہ ہے کون؟ میں نے تو ابھی تک اس کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ سنا ہے تین چار دن پہلے اس نے یہاں سے نس جانے (بھاگ جانے) کی کوشش بھی کی تھی؟“

”پورا پتا تو مجھے بھی نہیں۔ سنا ہے کہیں پاکستانی پنجاب سے آیا ہے۔ پر تو چھوڑا ان

دیکھ کر وہ سکتہ زدہ رہ گیا۔ پھر اس نے چلانے کی کوشش کی لیکن میں پہلے سے تیار تھا۔ میں اس کے اوپر گرا۔ اپنے بائیں ہاتھ سے میں نے اس کا منہ ڈھانپا اور دائیں ہاتھ سے چاقو اس کی توانا گردن پر رکھ دیا۔ میری گرفت اتنی سخت تھی کہ کیدار کی بلند آواز اس کے منہ کے اندر ہی گونج کر رہ گئی۔ اس نے دوسری آواز نکالنے کی جرأت نہیں کی کیونکہ چاقو اس کی شہ رگ صابن کی طرح کاٹ سکتا تھا۔ میں پھنکارا۔ ”اگر آواز نکالو گے تو ذبح کر ڈالوں گا۔“

وہ میری گرفت کی سختی اور میری جسمانی برتری کو پوری طرح محسوس کر چکا تھا۔ چند سیکنڈ کے اندر اندر اس نے اپنے ہاتھ پاؤں ڈھیلے چھوڑ دیئے۔ اس کی بڑی بڑی آنکھوں کے اندر حیرت کا سمندر ملکورے لے رہا تھا۔ کچھ ہی دیر پہلے یہ شخص باورچی خانے کی سکھ ملازمہ کو جنسی طور پر ہراساں کرنے میں مصروف تھا اور اس میں کامیاب بھی ہو چکا تھا مگر اب وہ خود شدید خوف و ہراس کے زرنے میں تھا۔

اس بات سے مطمئن ہونے کے بعد کہ اب وہ مزاحمت نہیں کرے گا، میں نے اس کے ہونٹوں پر سے اپنی ہتھیلی ہٹا لی۔ میں نے چاقو بدستور اس کی گردن پر رکھا اور اسے سر کے بالوں سے کھینچتا ہو کڑی کی اس سیڑھی تک لے گیا جو نیچے ڈنگی پمپ والے زمین دوز کمرے میں جاتی تھی۔ کیدار ناتھ کو معاملے کی سنگینی کا پوری طرح احساس ہو چکا تھا۔

وہ لرزاں آواز میں بولا۔ ”میرا خیال ہے کہ تم وہ نہیں ہو جو نظر آرہے ہو۔“
میں نے کہا۔ ”اور تم بھی وہ نہیں ہو جو دکھائی دیتے ہو۔ تم سردار اوتار کے راز دار ملازموں میں سے ہو۔ ورنہ وہ درجنوں ملازموں میں سے صرف تمہیں ہی یوسف کی دیکھ بھال کے لیے نہ چنتا۔“

یوسف کے نام پر کیدار ناتھ نے کسی تعجب کا اظہار نہیں کیا۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ اس کے نام سے آگاہ ہے اور اس کے علاوہ بھی بہت کچھ جانتا ہے۔ میں نے سب سے پہلے کیدار ناتھ کی تلاشی لی۔ اس نے پینٹ، شرٹ پہن رکھی تھی۔ اس کی جیبوں سے گاڑی کی چابی اور سگریٹ کا پیکٹ ملا۔ اس کے علاوہ وہ بٹوہ بھی نکلا جس کا ذکر وہ ابھی تھوڑی دیر پہلے ڈری سہی امرت سے کر رہا تھا۔ اس کی جیب سے نکلنے والا موبائل فون میں نے فوراً آف کر دیا۔ یہ وہی موبائل تھا جس کے ذریعے میں جگت سے رابطہ کرتا رہا تھا۔ کیدار کے لباس سے ملنے والی سب سے اہم شے اس کمرے کی چابی تھی جہاں یوسف بند تھا۔

میں نے یہ چیزیں ایک طرف رکھ دیں۔ میں نے ایک بار پھر اس کے سر کے بال پکڑے اور آتشیں لہجے میں کہا۔ ”کیدار ناتھ! آج رات تیری جان صرف ایک ہی صورت

باتوں کو۔ یہ بتا مجھ سے کب ملنے کے لیے آرہی ہے کمرے میں؟“

”میں نہیں آؤں گی۔“ ساتھ ہی چوڑیوں کی چھن چھن سنائی دی۔

”تو پھر یہ بٹوے والی ساری بات سردار جی تک پہنچنے گی اور مجھے لگتا ہے کہ اور بھی کئی پول کھل جائیں گے تیرے۔ دو مہینے پہلے انگوٹھی گم ہو جانے والے معاملے میں بھی تیرا نام آیا تھا۔ اب لگ رہا ہے کہ وہ الزام بھی ٹھیک ہی تھا۔“

”میں سو گند کھاتی ہوں۔ میں نے وہ انگوٹھی کبھی دیکھی بھی نہیں۔ آپ..... اپنے مطلب کے لیے مجھے خوانخواہ چھسانے کی کوشش کر رہے ہیں۔“

”تو جو بھی سمجھ لے امرت..... میں نے جو کہنا تھا کہہ دیا ہے۔“
چند سیکنڈ خاموشی رہی پھر امرت کی آواز ابھری۔ ”آپ مجھے..... بار بار تنگ کر دے گے۔“

”بار بار نہیں..... بس ایک آدھ بار۔“ کیدار کی شیطانی آواز ابھری۔

اس دوران میں کسی اندرونی کمرے سے بچے کے رونے کی باریک آواز آئی۔ ”ہائے میں مری۔“ امرت نے کہا پھر پرالی میں ہلچل ہوئی اور ایک سایہ ساتیری سے اندرونی حصے کی طرف اوجھل ہو گیا۔

یقیناً جانے والی امرت تھی۔ کیدار ناتھ وہیں لیٹا رہا۔ غالباً وہ چاہ رہا تھا کہ امرت اپنی جگہ پر پہنچ جائے اور بچی چپ کر جائے تو پھر وہ بھی اپنے کمرے کا رخ کرے۔

میں پرالی کے کٹھوں کی دوسری طرف کیدار ناتھ سے فقط دس پندرہ فٹ کی دوری پر موجود تھا۔ میرے ذہن میں ہلچل مچی ہوئی تھی۔ میں جان گیا تھا کہ کیدار ناتھ جان بوجھ کر انجان بنا رہتا ہے ورنہ اسے بہت کچھ معلوم ہے۔ آج اس کا اصلی چہرہ میرے سامنے آیا تھا اور یہ خاصا مکروہ تھا۔ میں نے وہیں لیٹنے لیٹے ایک اہم فیصلہ کیا۔ یہ راست اقدام کا فیصلہ تھا اور اس کے لیے موقع بھی بہت اچھا تھا۔ شکار خود چل کر ایک نہایت مناسب جگہ پر آیا ہوا تھا۔ میں جانتا تھا کہ پرالی کے کٹھوں کے پیچھے ایک چھوٹا سا خانہ ہے۔ یہ دراصل ایک زمین دوز کچا کمرہ تھا جس میں ایک بڑا ڈونگی پمپ لگایا گیا تھا۔ اب یہ پمپ بیکار ہو چکا تھا۔ یہاں بس تھوڑا بہت کاٹھ کھاڑ پڑا تھا اور پرانی مشینری کے پرزے وغیرہ تھے۔ میں نے اپنا خیمہ دار چاقو ہاتھ میں لیا۔ نیم تیرگی کے باوجود مجھے اندازہ تھا کہ کیدار ناتھ کہاں موجود ہے۔ درمیانی فاصلہ تیزی سے طے کر کے میں کیدار کے سر پر جا پہنچا۔ وہ نیم دراز تھا۔ اس نے بے پناہ حیرت سے میری طرف دیکھا۔ میرے ہاتھ میں چمک دار چاقو اور میرے چہرے پر بھجانی تاثرات

۴۔ از میری تھیلی کے نیچے ہی گونج کر رہ گئی۔ میں نے جھٹکے سے چاقو کھینچا۔ اس کی پتلون خون سے رنگین ہونے لگی اور جسم تکلیف سے لرزنے لگا۔ ”اگلا دار تہارے پیٹ پر کروں گا اور ناف کے ساتھ ایک اور ناف بنا دوں گا۔“ میں نے بے زرم لہجے میں کہا۔

وہ مسلسل کراہ رہا تھا۔ میں نے چاقو اسی کی پتلون سے صاف کیا اور اسے کچھ اور بھی دھکیل کر دیوار کے ساتھ لگا دیا۔ میری تھیلی بدستور اس کے ہونٹوں پر تھی۔ کہیں دور حویلی کے اندرونی کمروں سے خواتین کا مدہم قہقہہ سنائی دیا اور اس کے ساتھ ہی ڈھولنگ بجنے لگی۔ یہاں اس زمین دوز کمرے میں کیدار ناتھ سمجھ چکا تھا کہ صورت حال اس کی توقع سے کہیں زیادہ سنگین ہے اور اگر اس نے میری بات نہیں مانی تو یہ سہانی شب اس کے جیون کی آخری شب ثابت ہو سکتی ہے۔

قریباً دس منٹ بعد کیدار ناتھ زنگ آلود ڈونکی پمپ سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھا تھا اور اس نے اپنی زخمی ران دونوں ہاتھوں سے تھام رکھی تھی۔ میں اس کے عین سامنے دیوار سے ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ وہ کراہ رہا تھا اور میرے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ اس نے جو کچھ بتایا اور جو کچھ میں نے اس سے اپنے سوالوں کے ذریعے اُگلویا۔ خاصا سنسنی خیز تھا۔ یوسف کو واقعی موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا تھا اور یہ کام بس اڑتالیس گھنٹے کے اندر ہی ہونے والا تھا۔

آدھ پون گھنٹے کی گفتگو میں کیدار ناتھ نے جو کچھ بتایا، اس کا خلاصہ کچھ یوں ہے۔ مقامی پولیس کو ہمیشہ شک رہا تھا کہ حویلی میں ہونے والی کسی اہم تقریب میں اشوکا سنگھ چوری چھپے شریک ہو گا۔ یہ بھی ایک ایسا ہی موقع تھا۔ اشوکا کی اکلوتی بہن سرنو کو رکی شادی دھوم دھام سے ہو رہی تھی۔ کل اس کی تیل وغیرہ کی رسم تھی۔ اس رسم کے فوراً بعد یوسف کو ختم کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا تھا۔ پروگرام بڑا سنسنی خیز تھا۔ اس پروگرام کے مطابق یوسف کو ایک چمکا دیا جا رہا تھا۔ اسے ایک گاڑی دی جا رہی تھی اور ”آزاد“ کیا جا رہا تھا۔ اس سے کہا جا رہا تھا کہ فاضلکا کی طرف چلا جائے۔ فاضلکا کے بڑے ڈاک خانے کے سامنے اسے ایک بندہ ملے گا۔ باقی کا کام وہ سنبھالے گا اور اسے پوری حفاظت سے بارڈر پار کر کے پاکستان پہنچا دے گا۔ پروگرام کے مطابق یوسف کو کبھی فاضلکا کے قصبے تک نہیں پہنچنا تھا۔ راستے میں کچھ کم تین جگہ پولیس نا کے موجود تھے، گاڑیوں کی چیکنگ ہوتی تھی۔ ان میں سے ہی کسی نا کے پر یوسف کو بطور اشوکا سنگھ پہچان لیا جانا تھا یا اس پر نہایت نگراں قسم کا شک ہو جانا تھا۔ دوسری طرف یوسف کو ہدایت تھی کہ اگر کہیں پولیس اسے روکنے کی کوشش کرے تو فوراً کھانسی کرے۔

میں بچے گی۔ مجھے سچ سچ بتائے گا کہ یہاں یوسف فاروقی کے ساتھ کیا کھیل کھیلا جانے والا ہے اور کس طرح؟ اب میری بات کے جواب میں یہ مت کہنا کہ میں کچھ نہیں جانتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ تم جانتے ہو۔ تم نے ابھی تھوڑی دیر پہلے امرت سے کہا ہے کہ مہمان یعنی یوسف کا کھیل ختم ہونے والا ہے۔ تم نے اسے قربانی کا بکرا بتایا ہے۔ مجھے اس قربانی کی ساری تفصیل چاہیے۔“

کیدار بولا۔ ”میں..... بس رعب ڈال رہا تھا امرت پر۔ اسے..... بتانا چاہتا تھا کہ میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ میرا دوش اس کرو میں نے جو کچھ کہا، بس قیافے سے کہا۔“

میں نے ایک بار پھر اس کے سر کے بال اپنی ٹھٹی میں جکڑ لیے اور اسے دیوار کے ساتھ لگا کر چاقو کی نہایت تیز دھار اس کی گردن پر رکھ دی۔ ”کیدارے! میں نے کہا ہے نا کہ یہ صابن کی طرح کاٹے گا اور یہ ایسا ہی کرے گا۔ مجھے گولی مت دے ورنہ اسی جگہ تیرا ”بولو رام“ ہو جائے گا۔ میں بہت کچھ جان چکا ہوں۔ بس بہت تھوڑا اتھ سے جانا ہے۔ اگر تو نہیں بتائے گا تو کوئی اور بتا دے گا لیکن تو یہاں سے کبھی زندہ نہیں نکل سکے گا۔“

”مم..... میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا۔ کیا جانتے ہو تم؟“

”بہت کچھ۔“ میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”تمہارے سردار اوتار سنگھ کا بڑا بیٹا اشوکا سنگھ پانچ سال سے مفرد ہے۔ کئی صوبوں کی پولیس اسے اب بھی ڈھونڈ رہی ہے۔ اب سردار اوتار سنگھ کو اتفاق سے یوسف کی شکل میں ایک ایسا بندہ مل گیا ہے جو شکل صورت اور قد کاٹھ میں بہت حد تک اشوکا سنگھ سے ملتا ہے۔ اشوکا سنگھ کے گلے سے ساری بلائیں اُتارنے کے لیے یوسف کو بلی کا بکرا بنایا جا رہا ہے۔ یوسف کو اس طرح سے مارا جائے گا کہ اس کی موت کو اشوکا کی موت سمجھا جائے اور یہ معاملہ جتنا میں جل کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ بڑی فلمی قسم کی پلاننگ کی ہے تم لوگوں نے اور اس پلاننگ کی اصل وجہ یہی ہے کہ جاوانام کے ”فلم لائن بد معاش“ نے تمہیں حیرت انگیز طور پر اشوکا سے ملتا جلتا بندہ دے دیا ہے۔ اس نے بہت بڑا کام کیا ہے تمہارے سردار اوتار سنگھ کے لیے..... یقیناً بہت بڑا کام۔“

اچانک کیدار ناتھ نے زور مارا۔ اس نے مجھے زوردار دھکا دے کر بیڑھی کی طرف بڑھنا چاہا تھا۔ میں کسی ایسی حرکت کے لیے پہلے سے تیار تھا۔ اس کے سر کے قدرے لمبے بالوں پر میری گرفت بڑی مضبوط تھی۔ وہ مجھے پیچھے ہٹانے میں ناکام ہوا۔ اس کا دھکا سہنے کے بعد میں نے ایک بار پھر اس کے ہونٹوں پر اپنی تھیلی جمائی اور چاقو کا بھرپور وار کیا۔ چاقو کا تین چوتھائی پھل کیدار کی دائیں ران میں گھس گیا۔ وہ چلا یا اور مچھلی کی طرح تڑپا لیکن اس کی

مگر میں نے اپنا سراستعمال کیا۔ میری دھواں دھار نکر کیدار ناتھ کی پیشانی پر لگی اور وہ ذکر اتا ہوا پشت کے بل گرا۔ میرا خیال تھا کہ وہ اٹھے گا مگر وہ اٹھا نہیں۔ اس کے گلے سے عجیب سی پُر درد آواز برآمد ہوئی۔ اس کے سینے پر سامنے کی طرف لہو کی سیاہی پھیلتی جا رہی تھی۔ میں نے دھیان سے دیکھا اور میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ٹریکٹر کے بل کا ایک ٹوٹا ہوا حصہ اس کی پشت میں گھسا تھا اور سامنے کی طرف اس کی خمیدہ چونچ باہر نکل آئی تھی۔ آٹھ دس سینڈ کے اندر کیدار ناتھ کا جسم ساکت ہو گیا۔ وہ ختم ہو گیا تھا۔ میں ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا۔ کتنی ہی دیر تک میں سکتے زندہ سا اپنی جگہ کھڑا رہا۔ پھر حرکت میں آ گیا۔ اب سب سے پہلا کام یہ تھا کہ کیدار ناتھ کے لہو لہان جسم کو جو آٹا فانا لاش میں تبدیل ہو چکا تھا، کہیں چھپایا جائے۔ مرنے سے چند سینڈ پہلے مجھ پر حملے کے دوران میں کیدار ناتھ نے ایک چنگھاڑ بھی بلند کی تھی۔ اس امر کا اندیشہ موجود تھا کہ یہ بلند آواز کسی کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی۔

میں نے دو تین منٹ تک سن گن لی پھر سڑھی چڑھ کر اوپر گیا اور بغیر آواز پیدا کیے کچھ پرائی اُتار کر نیچے لے آیا۔ یہ پرائی میں نے کیدار کی لاش پر اس طرح پھیلا دی کہ وہ اس میں کیو فلاج ہو کر رہ گیا۔ کچھ سڑی ہوئی سیاہی مائل پرائی پہلے ہی اس جگہ موجود تھی۔ جب تک کوئی نیچے نہ اُترتا اور اچھی طرح جائزہ نہ لیتا، کیدار ناتھ والے سامنے کا علم اسے نہیں ہو سکتا تھا۔ تہ خانے میں خون کے داغوں کو چھپانے پر میں نے خصوصی توجہ دی اور پھر کیدار کی جیب سے برآمد ہونے والی اشیاء کو اپنے لباس میں رکھ کر باہر نکل آیا۔ ان اشیاء میں یوسف کے کمرے کی چابی اہم ترین تھی۔



دوپہر کو ثروت سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ رات والے خونی واقعے سے یکسر بے خبر تھی اور وہی کیا، حویلی میں کوئی کچھ نہیں جانتا تھا۔ حیرت کی بات تھی کہ ابھی تک کسی کو کیدار ناتھ کی غیر موجودگی کا احساس بھی نہیں ہوا تھا۔

ثروت نے کہا۔ ”ابھی تھوڑی دیر پہلے میں نے یوسف کی پٹی بدلی ہے۔ ان سے دو چار باتیں بھی کی ہیں۔ وہ کچھ پریشان لگ رہے ہیں۔ انہیں لگتا ہے کہ شاید آج رات تک کچھ ہونے والا ہے۔“

”مثلاً کیا؟“ میں نے پوچھا۔

”یوسف کا خیال ہے کہ شاید آج کسی بندے سے ان کی ملاقات کرائی جائے گی اور اس کے بعد ہو سکتا ہے کہ انہیں یہاں سے روانہ کر دیا جائے۔“

ہر صورت فاضل کا کی حدود میں پہنچے گا۔ اب اس سے آگے کا ڈرامہ اور بھی سنگین تھا۔ یوسف کی گاڑی کے نیچے قریباً چار کلونی این ٹی والا ایک ریوٹ کنٹرول بم نصب کر دیا گیا تھا۔ جب سردار اوتار سنگھ کے اہلکار یہ دیکھتے کہ پولیس یوسف کے پیچھے لگ گئی ہے اور اسٹیج پوری طرح تیار ہو چکا ہے تو وہ یوسف کی گاڑی کو دھماکے سے اڑا دیتے۔ ان اہلکاروں کو ایک دوسری گاڑی میں یوسف کے پیچھے پیچھے رہنا تھا۔

یہ ایک تفصیلی پلان تھا۔ اس میں بہت سی مزید جزئیات کا بھی خیال رکھا گیا تھا ممکن تھا کہ میں اس دو چار خامیاں بھی ہوں پھر بھی اس کی کامیابی کے امکان روشن تھے۔ یوسف اور اشوکا کی مشابہت سے دھوکا کھا کر ایک بار پولیس اس کے پیچھے لگ جاتی اور وہ مارا جاتا تو سرداروں کا مقصد پورا ہو جاتا۔ اشوکا سنگھ کی جان قانون کے مسلسل تعاقب سے چھوٹ جاتی۔ وہ انڈیا میں یا پھر انڈیا سے باہر کسی جگہ کسی اور شناخت سے پُر سکون زندگی گزار سکتا۔

کیدار ناتھ کی زبانی یہ تفصیلات سن کر میں سنائے میں رہ گیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ لاہور میں یوسف ایک نعمت غیر مترقبہ کی طرح جاوا گروپ کے ہاتھ لگا تھا۔ جاوا کے کسی ایسے بندے نے یوسف کو دیکھا تھا جو اشوکا سنگھ کو بھی اچھی طرح جانتا تھا۔ اشوکا سے یوسف کی مشابہت دیکھ کر اس کے دماغ میں سوچ کے گھوڑے دوڑے تھے اور ان لوگوں نے یوسف کو ہسپتال سے اٹھانے کا پروگرام بنایا تھا۔

صورت حال میری توقع سے کہیں زیادہ سنگین تھی۔ میں تملکار رہ گیا۔ سردار اوتار سنگھ جو اپنے تئیں بہت بڑا منصف بناتا تھا۔ اپنے ذاتی مقصد کے لیے بڑی بے رحمی سے ایک بے گناہ کی جان لینے کا پروگرام بنا چکا تھا۔ اب یہ ضروری ہو گیا تھا کہ جلد از جلد اس قاتل حویلی سے نکلنے کی کوشش کی جائے۔ بلکہ یہ کام اگر آج کی رات ہی ہو سکتا تو بہتر تھا۔ مجھے لگا کہ کیدار ناتھ اس سلسلے میں میری مدد کر سکتا ہے۔ وہ پوری طرح میرے ٹرانس میں تھا اور مجھے لگ رہا تھا کہ میں اس سے کام لے سکوں گا۔ لیکن جو کچھ ہوا، وہ اتنا غیر متوقع اور اچانک تھا کہ میں ششدر رہ گیا۔ کیدار ناتھ نے میری توقع سے زیادہ پھرتی کا مظاہرہ کیا۔ اس نے پمپ کے فریب بیٹھے بیٹھے پانی کے ڈیزہ انچ موٹے جستی پائپ کا ڈھائی تین فٹ لمبا ٹکڑا ہاتھ میں لے لیا تھا۔ پھر اچانک بے حد تیزی سے اس نے میرے چاقو والے ہاتھ پر وار کیا۔ یہ سخت ضرب تھی۔ چاقو میرے ہاتھ سے نکلنے میں بس ذرا سی کسر ہی رہ گئی۔

دوسرا وار اس نے میرے سر پر کیا۔ یہ بھی مہلک وار تھا۔ میں نے جھک کر خود کو بچایا۔ تیسری دفعہ پائپ کا وزنی ٹکڑا میرے کان کو چھوتا ہوا گزر گیا۔ میں چاقو سے بھی حملہ کر سکتا تھا

”مطلب کہ آزاد کر دیا جائے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں..... لیکن ابھی وقت کا کوئی ٹھیک پتا نہیں ہے۔ یہ کام آج رات ہو سکتا ہے۔ یوسف کو کالے رنگ والی ٹویٹا جیپ پر یہاں سے بھیجا جائے گا اور وہ خود ہی ڈرائیو کر کے جائیں گے۔ وہ فاضل کا میں کسی بندے سے ملیں گے جو انہیں سرحد پار کرائے گا۔“

”کیا تمہیں یقین ہے کہ ایسا ہوگا؟“

”میں کچھ کہہ نہیں سکتی لیکن سردار اوتار تسلی تو پوری دے رہا ہے۔“

مجھے ثروت کا چہرہ اُترا ہوا سا نظر آیا تھا۔ مجھ سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں ایک طرح کا رد کھاپن بھی محسوس ہو رہا تھا۔ پتا نہیں ایسا کیوں تھا؟

مجھے کل رات جو کچھ معلوم ہوا، وہ بہت سنگین تھا۔ میں اس بارے میں ثروت کو کچھ نہیں بتا سکتا تھا۔ میں نے صرف اتنا کہا۔ ”ثروت! ہمیں بہت ہوشیار اور چوکس رہنے کی ضرورت ہے۔ اگلے دس بارہ گھنٹے بہت اہم ہیں۔ مجھے لگتا ہے کہ ہمیں کسی طرح یوسف کو یہاں سے نکالنا پڑے گا۔ ورنہ اسے کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے۔“

”سگ..... کیا..... آپ کو کچھ معلوم ہوا ہے؟“ اس نے چونک کر پوچھا۔

”نہیں کوئی خاص نہیں۔ بس میری چھٹی حس کہہ رہی ہے کہ ہمیں زیادہ دیر نہیں کرنی چاہیے۔“

”لیکن ہم کیا کریں گے؟“

”حویلی سے باہر میرے کچھ دوست موجود ہیں، جگت بھی شامل ہے ان میں۔ میں موبائل پر ان سے رابطے کی کوشش کرتا ہوں ممکن ہے کہ وہ ہماری مدد کر سکیں۔ ان سے بات ہو جائے تو پھر میں تمہیں ساری صورت حال بتا دوں گا۔“

”لیکن تابش! میں نے بہت خون خرابا دیکھ لیا ہے۔ پلیز مجھے ایسا اور کچھ نہ دکھانا۔ کچھ ایسا سوچیں کہ بغیر کسی فساد کے یہ معاملہ حل ہو جائے۔“

”تم فکر نہ کرو ثروت! جو ہوگا اچھا ہی ہوگا۔ تم نے یوسف کو بارڈر والے واقعے کے بارے میں تو کچھ نہیں بتایا؟“ میرا اشارہ کم از کم پانچ افراد والے قتل سے تھا۔

میری توقع کے مطابق ثروت کا جواب نفی میں تھا۔

اسی دوران میں بیمار باپو مجھے پکارنے لگے۔ میں نے ثروت سے کہا کہ وہ تین بجے کے قریب کسی بہانے دوبارہ مجھ سے ملنے کے لیے آئے۔ میں اسے ساری صورت حال بتا دوں گا۔

ثروت کے جانے کے دس پندرہ منٹ بعد میں اپنے کمرے میں چلا گیا۔ باپو دو لکھا کر سوچکے تھے۔ میں نے موبائل پر جگت سے رابطہ کیا اور اسے الف سے بیٹے تک ساری صورت حال بے کم و کاست بتا دی۔ اس سنسنی خیز روداد نے جگت کو بھی حیران کیا۔ اپنے قاتل بیٹے کا بچھا قانون سے چھڑانے کے لیے سردار اوتار کتنی عیاری سے ایک بے گناہ کی جان لے رہا تھا۔ حالانکہ یہ بات سو فیصد یقینی نہیں تھی کہ اس طرح اس کی جان چھوٹ جائے گی۔

میں نے کہا۔ ”جگت پیارے! میں نے کسی بھی طرح یوسف کو یہاں سے نکالنا ہے۔ کیا تم اس سلسلے میں کچھ مدد کر سکتے ہو؟“

وہ بولا۔ ”بادشاہ زادے! تو مدد کی بات کر رہا ہے، آپا جان دینے کو تیار ہیں۔ گو بندر بھی لمبک دم تیرا عاشق بنا ہوا ہے۔ اگر کہو تو اس پوری حویلی کو بارود سے آزادیں گے۔ اپنے فوجی ماموں صاحب نے بہت سا بارود ہی سامان رکھا ہوا ہے اپنے گھر میں۔ ڈائنا میٹ، چھوٹی توپ کے پُرانے گولے اور ہمدردی سرنگیں وغیرہ۔“

”نہیں..... اس کی ضرورت نہیں۔ بس تم اتنا کرو کہ دو چار چوکس بندے اور ایک فٹ گاڑی لے کر حویلی کے پاس پہنچ جاؤ اور تھوڑا سا ہلا گلا کر دو حویلی کے باہر۔“

”پیارا! تو مجھے غصہ چڑھانے والی گل کر رہا ہے۔ مزہ نہیں آ رہا تیری باتوں کا۔“

”کیا مطلب؟“

”شیر سے چڑی مارنے کا مت کہو۔ کوئی ساڈ شاڈ ڈکار کر داؤ۔ تھوڑا سا ہلا گلا آپاں (ہم) سے نہیں ہوگا اگر ہوگا تو لمبا چوڑا ہوگا۔“

”لیکن پیارے! اتنا لمبا چوڑا بھی نہیں چاہیے نا کہ کام ہی خراب ہو جائے۔ میں بس اتنا چاہتا ہوں کہ دس پندرہ منٹ کے لیے حویلی کے گارڈز کی توجہ حویلی کے بوے گیٹ کی طرف ہو جائے۔ میں یوسف کو چھوٹے گیٹ کی طرف سے لے کر نکل جاؤں۔ چھوٹے گیٹ سے تیس چالیس قدم دور تیری گاڑی کھڑی ہو، ہم اس میں سوار ہو جائیں۔“

جگت سگھ دلیری سے بولا۔ ”میں ساری گل سمجھ گیا ہوں۔ کیا خیال ہے دو چار گولے لٹاؤں گا۔“

”کالے اناڑ (دستی بم) ہیں تمہارے پاس؟“

”اُوئے پورا ٹوکرا بھرا ہوا ہے بادشاہ زادے! تو یہ باتیں نہ پوچھ۔ بس آرڈر کر آرڈر۔ تیرے لیے اور چھوٹی کے لیے سب کچھ کر سکتا ہوں میں..... مگر پہلے مجھے اندر کا نقشہ بتا۔ کوئی بڑا ہتھیار بھی ہے تیرے پاس کہ نہیں؟“

”بڑا ہتھیار بھی مل جائے گا۔“ میں نے دھیمی آواز میں کہا۔ ”باپو کی الماری میں انگریزوں کے زمانے کی ایک بڑی زبردست رائفل میں نے دیکھی ہے۔ کافی گولیاں بھی ہیں اور یہ تیری کالے اناروں والی بات بھی ٹھیک ہے۔ ایک دو انار پھینکے جاسکتے ہیں، پر خواخوہ ان میں سے کسی کی جان نہیں جانی چاہیے۔ میری بات سمجھ رہا ہے نا تو؟“

”بادشاہ زادے! تم پاکستانیوں نے ہم سرداروں پر خواخوہ لطیفوں کے ڈھیر لگائے ہوئے ہیں۔ اتنے بھی کھوتے نہیں ہوتے ہم۔ ویسے یہ بتا میرے شیر بہر! تو کرنا کیا چاہ رہا ہے؟“ جگت سنگھ جو شیلے انداز میں بولا۔ لگتا تھا کہ اس کے گرم خون نے ابھی سے اُبالے کھانے شروع کر دیئے ہیں۔

میں نے اسے وہ سب کچھ بتا دیا جو پچھلے آٹھ دس گھنٹوں میں اپنے ذہن میں ترتیب دیا تھا۔ بہر حال اس زرداد میں سے کیدار ناتھ کی موت کا ذکر حذف کر دیا۔ ہم نے تفصیل سے بات کی اور چھوٹی بڑی ساری جزئیات پر غور کیا۔ موبائل فون پر ہماری یہ گفتگو تقریباً ایک گھنٹہ جاری رہی۔ میرے موبائل کا بیلنس ختم ہو گیا تو جگت سنگھ نے کال کر لی۔ بہر حال ہم نے رات نو بجے کے لیے ایک مفصل پلان تیار کر لیا۔

میں پچھلے دو دنوں سے حویلی کی اندرونی صورت حال کا بغور جائزہ لے رہا تھا۔ پہرے داروں کی تعداد، ان کے اوقات، ان کے پاس موجود اسلحہ اور اس طرح کی ساری معلومات مجھے مل چکی تھیں۔ ڈھائی بجے کے لگ بھگ میں نے بڑی احتیاط سے باپو کی آٹومیک رائفل بھی الماری سے نکال لی۔ یہ باپو ہی کی طرح نفیس اور صاف ستھری تھی۔ میرا دل گواہی دینے لگا کہ اگر شام کو سب کچھ پروگرام کے مطابق ہو گیا تو ہم یوسف کو بآسانی یہاں سے نکالنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ثروت کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ وہ جب چاہتی از خود یہاں سے نکل کر جو پور پہنچ سکتی تھی۔

ثروت کو سہ پہر تین بجے مجھ سے دوبارہ ملنے آنا تھا۔ لیکن وہ وقت پر نہیں آئی۔ شاید ”وڈی بے بے“ کو نہلانے دھلانے میں مصروف ہو گئی تھی۔ میں بے چینی سے اس کا انتظار کرتا رہا۔ چار بجے اور پھر پانچ بج گئے۔ اس کی شکل دکھائی نہیں دی۔ میں بے قراری سے کمرے میں ہل رہا تھا جب اچانک میری نظر بستر کے نیچے ایک مڑے مڑے کاغذ پر پڑی۔ میں نے اسے اٹھایا۔ یہ ایک تہ شدہ رقعہ تھا۔ ایسا ہی رقعہ جو یوسف مجھے لکھتا تھا۔ پہلے تو میں یہی سمجھا کہ یہ میرے نام لکھا ہوا کوئی پُرانا رقعہ ہے لیکن جب میں نے اسے کھولا تو پتا چلا کہ یہ ثروت کے نام تھا۔ غالباً یوسف نے کل کی ملاقات میں اسے تھمایا ہوگا۔ ثروت نے پڑھ کر

لباس میں رکھ لیا ہوگا لیکن وہ اتفاقاً یہاں گر گیا۔ یہ خطرناک پھولیشن تھی۔ اگر رقعہ کہیں اور گرتا تو قیامت برپا ہو سکتی تھی۔

ثروت بے حد محتار لڑکی تھی۔ اس سے ایسی غلطی کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی۔ لیکن آج وہ مجھے اتنی ڈسٹرب نظر آئی تھی کہ پہلے میں نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ میں نے دروازے کو اندر سے بند کیا اور پڑھنا شروع کیا۔ سینے میں ایک بار پھر دھواں سا بھرنے لگا۔ رگوں میں کڑواہٹ اُتر گئی۔ یہاں ثروت سے ملنے کے بعد یوسف نے وہی رد عمل دیا تھا جس کی توقع اس جیسے شخص سے کی جاسکتی تھی۔ یوسف نے ایک جگہ لکھا تھا۔ ”مجھے تم پر پورا بھروسہ ہے ثروت! لیکن تمہارے اس کزن پر نہیں۔ میں پہلے کہہ چکا ہوں اور اب بھی کہتا ہوں۔ یہ ہماری زندگی میں زہر گھولنے پر تیار ہوا ہے۔ ثروت! یہ تمہارے ساتھ اس لیے یہاں نہیں پہنچا کہ اسے میری سلامتی کی فکر ہے۔ صرف اس لیے آیا ہے کہ وہ تمہارے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔“

خط میں ایک اور جگہ لکھا تھا۔ ”میرا دل بہت وسیع ہے ثروت! جس طرح کی باتیں یہ شخص تمہارے بارے میں کرتا ہے، یہ میرا ہی حوصلہ ہے کہ سن لیتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نصرت کے علاج میں بھی جو دلچسپی اس نے دکھائی ہے اور جس طرح بار بار تم دونوں سے رابطے کرتا رہا ہے، اس میں بھی اس کی بدینتی کو ہی دخل ہے۔ بہر حال میں پھر کہتا ہوں، ماضی جو کچھ بھی تھا لیکن اب مجھے تم پر مکمل بھروسہ ہے۔ مجھے تو ارد گرد کی کوئی خطر نہیں۔ تم دیکھنے اور سمجھنے کی بہتر پوزیشن میں ہو۔ فی الحال ہمیں ان ساری باتوں کو ایک طرف رکھ کر یہاں سے نکلنے کے بارے میں سوچنا ہے۔ اس سلسلے میں اگر تابش سے رابطہ رکھنا ضروری ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔“

سارا خط پڑھنے کے بعد میں بے دم سا ہو کر بیٹھ گیا۔ اب یہ بات اچھی طرح میری سمجھ میں آرہی تھی کہ ثروت کے رویے میں اچانک تبدیلی کیوں آئی ہے۔ وہ بہت خاموش اور کھچی کھچی تھی۔ آج اس نے تین بجے آنے کا وعدہ کیا تھا لیکن آئی نہیں تھی۔ پتا نہیں اس کے ذہن میں کیا چل رہا تھا۔

اب شام کے سائے طویل ہونے لگے تھے۔ حویلی میں چہل پہل بڑھتی جا رہی تھی۔ حویلی کے باغیچے کی طرف دگیں کھڑکھڑائے جانے کی آوازیں بھی آرہی تھیں۔ اب کیدار ناتھ کی غیر موجودگی کو محسوس کر لیا گیا تھا۔ کیدار ناتھ بظاہر جیپ ڈرائیور تھا لیکن اصل میں سردار اوتار سنگھ کا خاص کارندہ تھا۔ دو تین مہینے آکر مجھ سے اس کے بارے میں پوچھ چکے تھے۔ خود ہری سنگھ نے بھی بار بار اس کے سیل فون پر رابطہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ فون

خاموش تھا۔ اسے میں نے ہی بند کر کے کمرے میں چھپایا ہوا تھا۔ موسم میں خشکی تھی۔ سارا دن بھی ہلکے بادل رہے تھے۔ مجھے توقع تھی کہ ابھی لاش سے بواٹھنا شروع نہیں ہوگی۔ جب تک بواٹھنا شروع نہیں ہوگا، میرے اندازے کے مطابق لاش کا پتہ چلنا مشکل ہی تھا۔ احتیاطاً میں ایک دفعہ کنواں نما یہ خانے کی طرف گیا تھا اور چائزہ لیا تھا کہ کوئی مشکوک شے وہاں موجود نہ رہ گئی ہو۔

چھ بجے کے لگ بھگ میں نے خود ثروت سے ملنے کی کوشش کی۔ ایک ملازمہ کے ہاتھ اسے پیغام بھجوایا لیکن وہ ملازمہ کسی اور کام میں لگ گئی یا پھر ویسے ہی بھول گئی۔ اب میں چھتا رہا تھا کہ میں نے دو پہر والی ملاقات میں ہی کیوں نہ ثروت کو صورت حال کی سگینی سے آگاہ کر دیتا۔ آدھ گھنٹے بعد میں نے حویلی کے ایک خواجہ سرا موہنا سنگھ کو ایک رقعہ دے کر بھیجا۔ موہنا سنگھ نے آکر بتایا کہ وڈی بے بے کی طبیعت بہت خراب ہے۔ نرس بی بی ابھی بہت مصروف ہے، آنہیں سکتی۔

میں شیشا کر رہ گیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا۔ پروگرام کے عین مطابق آٹھ بجے کے لگ بھگ جگت سنگھ کا فون آ گیا۔ حسب معمول اس کا لہجہ جوش اور حرارت سے بھرا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”بگڑا ہوا بادشاہ زادے! آپاں چل پڑے ہیں۔ دو گڈیوں میں آ رہے ہیں۔ ایک گڈی دور کھڑی رہے گی۔ دوسری حویلی کے پاس چلی جائے گی۔ ایک بار اپنی گھڑیاں پھر ملالیتے ہیں۔ بتا کیا ٹائم ہوا ہے تیرے پاس؟“

”آٹھ بج کر اٹھارہ منٹ.....“ میں نے کہا۔

”چل ٹھیک ہے۔ میں بھی آٹھ بج کر اٹھارہ منٹ کر لیتا ہوں۔ ٹو نے اپنا موبائل ہر ویلے آن رکھنا ہے۔ بیٹری شمیری پوری ہے نا۔“

”ہاں..... بیٹری تو پوری ہے۔ کسی وقت نہ آٹھاؤں تو سمجھتا کہ کوئی پاس ہے۔“ میں نے کہا۔ جگت سنگھ نے مجھے بتایا کہ وہ میری والی ایل ایم جی اور اس کے ڈھیر سارے راؤنڈ بھی لے کر آ رہا ہے۔

اسی دوران میں باپو نے ٹھنی بھائی۔ میں سلسلہ منقطع کرتا ہوا اپنے کمرے سے نکلنا اور باپو کے پاس آ گیا۔ وہ آج کافی بے چین نظر آتے تھے۔ میں نے کئی بار اندازہ لگایا تھا کہ وہ اپنی بیوی کی اس شادی پر خوش نہیں ہیں۔ آج چونکہ شادی کی پندرہ روز تقریب کا باقاعدہ آغاز ہوا تھا اس لیے وہ زیادہ اضطراب محسوس کر رہے تھے۔ بہر حال یہ ان کا گھریلو معاملہ تھا، مجھے کرید کرنے کی ضرورت تھی اور نہ میرے کریدنے سے باپو نے کچھ بتانا تھا۔ میں نے انہیں وہ

سکون بخش گولی وقت سے پہلے ہی دے دی جو وہ رات گئے کھاتے تھے۔

چہرہ میں منٹ بعد میں نے پھر جگت سنگھ سے رابطہ کیا لیکن اس مرتبہ رابطہ نہیں ہو سکا۔ مجھے لگا کہ سنگھ پورے نہیں آ رہے۔ دس پندرہ منٹ بعد دوبارہ رابطہ کیا تو ناکامی ہوئی۔ اب میں ذرا چونکا۔ مجھے جگت سنگھ سے کوئی دوسرا نمبر بھی لے لینا چاہیے تھا۔ جگت خود بھی رابطہ نہیں کر رہا تھا۔ ”کہیں کوئی مسئلہ نہ ہو گیا ہو؟“ میرے ذہن میں دسویں سو سے سر اٹھانے لگے۔ قریباً آدھ گھنٹے بعد میں نے پھر ٹرائی کی۔ اس مرتبہ بل جانے لگی لیکن دوسری طرف سے جو بھاری فیشلی آواز آئی وہ جگت کی نہیں تھی۔ ”کون ہے؟“

”تم کون ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”میں جگت کا دوست ہوں اور تم؟“

”جگت کہاں ہے؟“

”اس کے ساتھ تھوڑا سا مسئلہ ہو گیا ہے۔ گاڑی لگ گئی ہے۔ اسے چوٹ آئی ہے۔“

”چوٹ آئی ہے؟ اس کا چھوٹا بھائی گو بندر بھی ساتھ تھا، وہ کہاں ہے؟“

”وہ بھی یہیں کہیں ہے۔ تم کون ہو؟“ پھر پوچھا گیا۔

مجھے بیک گراؤنڈ سے آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔ کچھ جھگڑا سا ہو رہا تھا۔ کوئی

فصص بڑی بلند اور کرحٹ آواز میں بول رہا تھا۔ میں نے فون بند کر دیا۔

کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہوا ہے؟ کیا واقعی کوئی حادثہ ہو گیا تھا یا پھر کسی ناکہ و غیرہ پر ان کو روک لیا گیا تھا ان کی گاڑی میں اسلحہ موجود تھا اور یقیناً دو چار دستی بم بھی ہوں گے۔ حادثے والی بات دل کو نہیں لگ رہی تھی۔ دونوں گاڑیاں ایک ساتھ تو حادثے کا شکار نہیں ہو سکتی تھیں۔ اگر ایک گاڑی کے ساتھ کچھ ہوا تھا تو دوسری گاڑی کے لوگ مجھ سے رابطہ کر کے صورت حال سے آگاہ کر سکتے تھے۔

گھڑی کی سوئیاں حرکت میں تھیں۔ وقت گزر رہا تھا اور ہمارے خلاف گزر رہا تھا۔ حویلی میں اب جشن کا سماں تھا۔ جزیئر جل رہا تھا اور آسائشی روشنیاں جگمگا رہی تھیں۔ حویلی کے بڑے پھاٹک کے سامنے دو ڈھونچے مسلسل ڈھول پیٹ رہے تھے۔ کبھی کبھی بھنگڑا ڈالنے والوں کی ایک پارٹی محور قص بھی ہو جاتی تھی۔

زنان خانے کے جس حصے میں باپو موجود تھے اس حصے کو شور سے محفوظ رکھنے کے لیے درمیانی دروازے بند کر دیئے گئے تھے۔ اب میرے لیے یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا کہ ثروت سے رابطہ کر سکتا۔ وہ خود کوشش کرتی تو اود بات تھی۔ اب میرے لیے یہ بھی ممکن نہیں

رہا تھا کہ یوسف کو صورت حال سے آگاہ کرتا اور اسے بتاتا کہ کتنا بڑا اور سنگین مسئلہ درپیش ہے۔ دوسری طرف جگت سنگھ والا ”آپ سیٹ“ ہو گیا تھا۔ کچھ دیر بعد میں نے پھر جگت سے رابطے کی کوشش کی۔ اس بار پھر وہی بھاری کرخت آواز سنائی دی جس پر مجھے شبہ تھا کہ یہ کسی پولیس والے کی ہے۔ ایک دم میرے ذہن میں آیا کہ میں غلطی کر رہا ہوں۔ یہاں ڈھول اور باجے گاجے کا شور تھا۔ یہ شور دوسری طرف بھی سنا جاسکتا تھا۔ اگر جگت واقعی پولیس یا بی ایس ایف کی تحویل میں تھا تو وہ لوگ جان سکتے تھے کہ میں کسی شادی والے گھر سے بول رہا ہوں اور اگر وہ آس پاس تھے تو پھر اس حویلی تک بھی پہنچ سکتے تھے۔ اسی دوران میں دوسری طرف سے خود ہی فون بند ہو گیا۔ شاید سنگل کمرور پڑ گئے تھے۔ میں نے موبائل کے ماؤتھ پورشن پر انگلی رکھ کر کال ملائی لیکن کل نہیں ملی۔

اگلا قریباً ایک گھنٹہ قریباً اسی کشمکش میں گزر گیا۔ رسم اب آخری مراحل میں تھی۔ دس بجنے والے تھے۔ اب وقت نہ ہونے کے برابر رہ گیا تھا۔ اگر سردار اوتار سنگھ کا پہلے والا پروگرام برقرار تھا تو اب کسی بھی وقت یوسف کو اس کے بندی خانے سے نکال کر موت کے سفر پر روانہ کیا جاسکتا تھا۔ اسے جس کالی گاڑی میں بھیجا جانا تھا، وہ چھوٹے گیٹ کے پاس درختوں میں کھڑی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ اس گاڑی کو پوری طرح تیار کیا جا چکا ہے۔ کیدار ناتھ نے بتایا تھا کہ گاڑی کے اگلے حصے میں انجن کے نیچے قریباً چار کلو وزن کی بم نصب کر دیا جائے گا اور یقیناً اسے نصب کر دیا گیا تھا۔ ابھی کوئی ایک گھنٹہ پہلے میرے اس گاڑی کے قریب اس کے ڈرائیور کو دیکھا تھا، وہ اس کا تیل پانی چیک کر رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا کہ گاڑی موت کے سفر پر نکلنے کے لیے تیار ہے۔ میرے ذہن میں فوری خیال آیا کہ مجھے اس سیاہ ٹویونا گاڑی تک پہنچنا چاہیے۔ کچھ ایسا ہونا چاہیے کہ یہ گاڑی یہاں سے روانہ ہونے کے قابل نہ رہے۔

میں درختوں کی اوٹ لیتا ہوا بڑی احتیاط سے اس تنہا کھڑی گاڑیوں کی طرف بڑھا۔ کچھ آگے جا کر مجھے زمین پر اوندھا لیٹنا پڑا۔ دو ملازم مٹھائی کے بڑے بڑے ٹوکے اٹھائے ہوئے میرے سامنے سے گزرے۔ میں تقریباً ریٹنگنے والے انداز میں گارڈینا کی اس باڑ تک پہنچ گیا اور پھر جھک کر اس کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا ٹویونا جیپ کے پاس نکل آیا۔ حویلی کا یہ حصہ زیادہ روشن نہیں تھا۔ میں نے تیزی سے دروازے چیک کیے۔ وہ لاک تھے، پچھا! دروازہ بھی مقفل تھا۔ اندر گھسنے کا کوئی چانس نہیں تھا۔ میں گاڑی کے نیچے ریگ گیا۔ میں نے چند سیکنڈ کے لیے اپنے موبائل فون کی ٹارچ روشن کی اور میرا دل شدت سے دھڑک اٹھا۔

گاڑی کے دواگلے پہیوں کے درمیان ایک ایسی چیز نظر آرہی تھی جو جیپ کا حصہ نہیں تھی۔ یہ ایک سیاہ شاپر تھا۔ اس شاپر میں کوئی وزنی چیز تھی جسے ایک رسی کے ساتھ جیپ سے باندھا گیا تھا۔ یہی وہ مہلک بم تھا جس کا علم مجھے کل رات کیدار ناتھ کی باتوں سے ہوا تھا۔ یہ گاڑی کسی بھی وقت یہاں سے روانہ ہو سکتی تھی۔ گاڑی کے نیچے بندھی ہوئی یہ خاموش موت ایک دھماکے کے ساتھ یوسف کے پر نیچے اڑا دیتی۔ ثروت اور یوسف سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ان کے ساتھ کیا ہونے والا ہے۔ میری سمجھ میں فوری طور پر یہی بات آئی کہ میں اس خاموش موت کو جیپ کی باڈی سے علیحدہ کر دوں۔ میں نے قیص کے نیچے سے اپنا خم دار چاقو نکالا۔ اسے بغیر آواز پیدا کیے کھولا اور احتیاط سے وہ رسی کاٹ دی جس نے دھماکہ خیز مواد کو گاڑی سے پیوست کر رکھا تھا۔ یہ مواد ڈائنامیٹ کے ساتھ آٹھ شیلز کی شکل میں تھا جنہیں باہم باندھا گیا تھا۔ دھماکہ خیز مواد کو یوں ہاتھوں میں تھامنا ایک سنسنی خیز تجربہ ہوتا ہے جسے صرف محسوس کیا جاسکتا ہے۔ میں یہ مواد لے کر باہر نکل ہی رہا تھا جب ایک کرخت آواز گونجی۔ ”کون ہے؟“

میں جہاں کا تھاں ساکت رہ گیا۔ تب ایک ٹارچ کا روشن دائرہ گاڑی پر مرکوز ہوا۔ میں ایک بار پھر گاڑی کے نیچے ریگ گیا۔ یکا یک بہت سی آوازیں سنائی دیں۔ بھاگتے دوڑتے قدموں کی آہٹیں اُبھریں۔ کئی ٹارچیں روشن ہو گئیں۔ پھر میں نے سردار اوتار سنگھ کی بھاری بھر کم آواز سنی۔ ”کیا ہے؟“

’انت سنگھ نامی ملازم نے پکار کر کہا۔“کوئی گڈی کے نیچے گھسا ہوا ہے۔“
ٹارچوں کے روشن دائرے گاڑی کے نیچے ریٹنگنے لگے۔ اب مجھے واضح طور پر دیکھ لیا گیا تھا۔ دھماکہ خیز مواد میرے ہاتھ میں تھا اور میں بچی زمین پر اوندھا لیٹا ہوا تھا۔ گاڑی کے نچلے حصے کی آئل کی بوتھنوں میں گھس رہی تھی۔ میں نے دیکھا تین چار مسلح افراد زمین پر اوندھے لیٹ گئے اور انہوں نے اپنی ”رشیں“ رائفلوں کے منہ میری طرف کر دیئے۔

”باہر نکلو۔“ ایک شخص دھاڑا۔ ”نہیں تو نیچے ہی بھون دیں گے۔“
اچانک ہی حویلی کا یہ حصہ روشن تر ہو گیا۔ ارد گرد کئی بلب اور ٹیوب لائٹس روشن ہو گئیں۔ باجے گاجے کا شور مچ گیا۔ مہمانوں نے ہنگامے کی بوسنکھی تو مصروفیات چھوڑ کر ارد گرد جمع ہونے لگے۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ باہر نکل آتا لیکن اس سے پہلے کہ میں از خود باہر نکلتا، کسی نے گاڑی میں بیٹھ کر گاڑی آگے بڑھا دی۔ اب میں سب کی نظروں کے سامنے تھا۔ کسی شخص نے چلا کر کہا۔ ”کھڑے ہو جاؤ اور ہاتھ اوپر کرلو۔“

میں نے نیچے گرے گرے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور پھرتی سے کرپان کھینچی۔ اس سے پہلے کہ کوئی سمجھتا، میں اٹھا اور تیزی سے اپنے ٹارگٹ کی طرف بڑھا۔ یہ ٹارگٹ میں پہلے ہی منتخب کر چکا تھا اور یہ اونچے زرتار شملے والا سردار اوتار سنگھ تھا۔ وہی پُرانی کہات والا معاملہ تھا۔ بھرے دربار میں بادشاہ نے بڑھیا سے کہا تھا جس چیز پر ہاتھ رکھو گی وہ تمہاری ہو جائے گی۔ بڑھیا نے بادشاہ پر ہاتھ رکھ دیا تھا اور کہا تھا، جب تم میرے ہو تو سب کچھ میرا ہے۔

میں بھی سردار اوتار سنگھ پر کرپان رکھنا چاہتا تھا۔ اگر وہ میرے قبضے میں آ جاتا تو سب کچھ آ جاتا۔ اس کی شررگ پر کرپان آ جانے کا مطلب یہ تھا کہ سب کی شررگ پر کرپان آ گئی۔ میں تیزی سے اوتار سنگھ پر چھٹا۔ میرا اور اس کا درمیانی فاصلہ آٹھ دس فٹ سے زیادہ نہیں تھا لیکن سب کچھ ویسا ہی نہیں ہوتا جیسا انسان چاہتا ہے۔ یہاں میرے ساتھ بھی قسمت نے تھوڑا سا دھوکا کیا۔ اس سے پہلے کہ میں اوتار سنگھ تک پہنچتا اور اس کو عقب سے جکڑ کر کرپان اس کی توانا گردن پر رکھتا، ایک چمک دار لاشی لہرائی اور بڑے زور سے میرے چہرے پر لگی۔ میں اوتار سنگھ تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک بار پھر اوندھا گر گیا۔ پہلی دو چوٹوں کا اثر بھی ابھی دل و دماغ پر موجود تھا۔ اس تازہ ضرب نے مجھے جکڑا ڈالا۔

سردار اوتار سنگھ ٹپ کر پیچھے ہٹ گیا۔ ایک ساتھ کئی افراد دوبارہ مجھ پر پل پڑے۔ وہ مجھ پر لاشیاں اور رائفل کے کندے برسا رہے تھے۔ میرا پورا جسم بے رحم ضربات کی زد میں آ گیا۔ خود کو شدید زخمی ہوانے سے بچانے کے لیے میں نے اپنا سر اور چہرہ بازوؤں میں چھپا لیا۔ میری پشت پر تو اتر سے لاشیاں برس رہی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی گالیوں کی بو چھاڑ بھی۔

”مارو، ہڈیاں توڑ دو اس نمک حرام کی۔“ کوئی گرجا۔

”کتے کی موت دو۔ فائر مارو اس کے سر میں۔“ ایک پاٹ دار آواز نے آتشیں مشورہ دیا۔

”نہیں..... نہیں..... گولی نہیں چلائی۔“ میرے اندازے کے مطابق یہ سردار اوتار کی آواز تھی۔

میرے چہرے سے بہنے والا خون میری آنکھوں میں بھر رہا تھا اور میرے منہ میں نمک کی طرح گھل رہا تھا۔ وہ لوگ مجھے گھسیٹ کر ایک کمرے میں لے آئے اور اوندھے منہ رکھیں پھول بوٹوں والے پختہ فرش پر پھینک دیا۔ شدید چوٹوں نے مجھے واقعی بے دم کر ڈالا تھا۔ ترشولا کے سردار بھی وہی غلطی کر رہے تھے جو معرکے کی رات چودھری انور کے کارندوں نے کی تھی۔ وہ تلاشی کے دوران میں میری ٹانگ سے بندھا ہوا چاقو چھوڑ گئے تھے۔ یہاں بھی

میں نے اٹھ کر ہاتھ کھڑے کر دیئے۔ سردار اوتار سنگھ مجھ سے بیس پچیس قدم کی دوری پر کھڑا تھا۔ وہ قد کاٹھ میں سب سے بلند اور نمایاں تھا۔ اس کی اونچی پگڑی کا زرتار شملہ ٹیوب لائٹس میں دمک رہا تھا۔ چاروں طرف لوگ تھے۔ رنگ برنگے کپڑوں والی سکھ عورتیں بھی تھیں تاہم وہ موقع سے کچھ فاصلے پر تھیں۔ ان میں سے زیادہ تر مختلف چیزوں کی اوٹ میں تھیں۔ عین ممکن تھا کہ ان میں ثروت بھی شامل ہو۔ میں نے دھماکہ خیز مواد نیچے رکھ دیا تھا۔ سردار اوتار سنگھ نے اپنی پاٹ دار آواز میں کہا۔ ”اکبر علی! آگے آ جاؤ۔“

میں اس کے حکم پر چند قدم آگے آ گیا۔ مسلح گارڈ نے آگے بڑھ کر دھماکہ خیز مواد کو دیکھا اور مہمانوں کو سنانے کے لیے بولا۔ ”یہ کافی بڑا بم ہے۔ یہ تو گڈی کے پرزے کر سکتا تھا۔“

ایک ایک کسی نے ایک ہیڑ کے پیچھے سے نکل کر عقب سے میرے سر پر رائفل کا وزنی کندا مارا شدید چوٹ آئی۔ آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے ستارے ناچ گئے۔ میں گھٹنوں کے بل گرا۔ ایک اور چوٹ لگی۔ مجھے لگا کہ میری آنکھوں کے سامنے سیاہ پردہ ساتن رہا ہے لیکن میں مکمل بے ہوش نہیں ہوا۔ یقیناً میری سخت جانی میرا ساتھ دے رہی تھی۔ کئی افراد مجھ پر پل پڑے۔ مجھے اپنا چاقو نکالنے کی مہلت بھی نہیں ملی۔ میرے کانوں میں ٹلی جلی کی آوازیں پڑ رہی تھیں۔ بس ٹھٹھ بجاہی کے اڑتے اڑتے سے ففرے تھے۔ ”کون ہے یہ؟ اس کے ساتھی بھی ہوں گے..... ہوا کیا ہے چودھری جی؟ گڈی کے نیچے بم لگا رہا تھا..... دوسری گاڑیاں بھی دیکھو بھی..... پھانک بند کر دو..... مارو اس کو..... بم کے اوپر ریت ڈال دو۔“ کئی طرح کی آوازیں تھیں۔ میرے دل کے اندر سے کہیں آواز آئی۔ کہاں ہو عمران؟ دیکھو میں پھر پھنس گیا ہوں۔ مجھے ضرورت ہے تمہاری۔ لیکن وہ کہیں نہیں تھا۔ نہ آس پاس، نہ دور دور..... اس کے نہ ہونے سے میرے اندر ایک اضافی ہمت اور توانائی پیدا ہونے لگی۔ میں سمجھ گیا کہ یہاں جو کچھ کرنا ہے، مجھے اکیلے ہی کرنا ہے۔ میں اوندھا پڑا تھا۔ میری نظر ایک چمکتی کرپان پر پڑی۔ یہ کرپان ایک گارڈ کی کمر سے بندھی ہوئی تھی۔ میں جانتا تھا کہ اگلے چند سیکنڈ میں بہت کچھ ہوگا۔ میری جان بھی جاسکتی تھی لیکن موت سے زیادہ خدشہ مجھے ایک اور بات کا تھا۔ کہیں بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح ثروت بھی تو یہ نہیں سمجھے گی کہ میں واقعی اس گاڑی کے نیچے بم لگا رہا تھا۔



میری ٹانگ کے ساتھ میرا خنم دار چاقو بھی بندھا ہوا تھا مگر وہ نسبتاً دور تھا اور کرپان نزدیک تھی۔ گارڈ کی کمر سے بندھی ہوئی یہ کرپان مجھ سے بمشکل ایک ہاتھ کے فاصلے پر تھی۔

یہی ہوا تھا مگر سوچنے کی بات یہ تھی کہ زندگی موت کی اس بازی میں ابھی مجھے اپنا یہ پتا استعمال کرنا چاہیے یا نہیں۔ میری طرف دو تین رائفلیں اٹھی ہوئی تھیں۔ چمکیلے لوگوں والی لائٹھیوں نے سر پر سایہ کر رکھا تھا۔ صورت حال کسی فوری مہم جوئی کے حق میں نہیں تھی۔

کچھ فاصلے سے سردار اوتار سنگھ کی گرج دار آواز میرے کانوں تک پہنچی۔ وہ اپنے بیٹے ہری سنگھ کو مخاطب کر کے بولا۔ ”اس کی پتی کو دیکھو۔ وہ کہیں بھاگ نہ جائے پڑاؤ اس کو بھی۔“ بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ وہ لوگ زنان خانے کی طرف جا رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد وہ لوگ ثروت کو بھی کھینچتے ہوئے وہاں لے آئے۔ ثروت کا رنگ ہلکی ہو رہا تھا۔ خوفناک صورت والے انت سنگھ نے ثروت کو دھکیل کر میرے قریب فرش پر پھینک دیا۔ وہ کراہ کر رہ گئی۔ اس کی کئی چوڑیاں ٹوٹ کر فرش پر بکھر گئیں۔ سردار اوتار سنگھ کے اشارے پر انت سنگھ نے بھرا ہوا پستول میرے سر سے لگا دیا اور کڑک کر بولا۔ ”کیا چکر چلا رہے ہو تم؟ کس کے کہنے پر کیا ہے یہ سب؟“

اس سے پہلے کہ وہ مزید کچھ کہتا، میرے موبائل فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ موبائل ہری سنگھ کے ہاتھ میں تھا، اسے میری تلاشی کے دوران میں ملا تھا۔ ہری سنگھ نے میری طرف گہری نظروں سے دیکھا پھر کال ریسیو کی۔ میرے خدشے کے عین مطابق یہ میرے مددگار جگت سنگھ کی ہی کال تھی۔ جب میں سخت بے چینی سے اس کال کا انتظار کرتا رہا تھا، یہ نہیں آئی تھی اور اب جبکہ اسے نہیں آنا چاہیے تھا، یہ آگئی تھی۔ ہری سنگھ نے اسپیکر آن کر دیا۔ ”ہیلو کون؟“ ہری سنگھ نے پوچھا۔

دوسری طرف جگت آواز پہچاننے میں ناکام رہا۔ وہ جگت سے بولا۔ ”یار تاشے! یہاں بڑی گڑبڑ ہو گئی تھی۔ کچھ بندوں سے ٹاکرا ہو گیا تھا۔ بڑی مشکل سے نکلے ہیں۔ اب کہاں ہو تم؟“

ہری سنگھ نے ذرا توقف کیا اور بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”یہیں حویلی میں.....“

اب دوسری طرف جگت سنگھ ذرا چونکا۔ ”ہیلو! کون بول رہا ہے..... ہیلو۔“

ہری سنگھ نے فوراً بات بنائی۔ ”تاشے کا دوست! تاشا ذرا غسل خانے میں ہے۔“

”کون دوست؟“ جگت نے پھر چونکی ہوئی آواز میں پوچھا۔

”دلیپ سنگھ۔“

”کون دلیپ سنگھ؟“ جگت اب پوری طرح ٹھنک گیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے

فون بند کر دیا۔

ہری سنگھ نے اپنے باپ اوتار سنگھ کی طرف دیکھا۔ اوتار سنگھ کی بھوری آنکھوں میں ہلاکی چمک تھی۔ وہ بڑی ہنسوج نظروں سے مجھے اور ثروت کو گھور رہا تھا۔ پھر وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ”مجھے اس منڈے پر پہلے ہی شک تھا۔ میرے خیال میں یہ اکبر علی نہیں، اس کے بھیس میں کینے نہالوں کا کوئی بندہ ہے۔“

ہری سنگھ نے باپ کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”اگر یہ اکبر علی نہیں ہے تو پھر یہ زس بھی ثریا نہیں ہوگی۔“

سردار اوتار سنگھ نے آگے بڑھ کر ثروت کے بال مٹھی میں جکڑے اور زور سے جھٹک کر بولا۔ ”کون ہو تم دونوں؟ کس چکر میں آئے ہو یہاں؟“

ثروت کی گردن مڑ گئی تھی، وہ بس کراہ کر رہ گئی۔ میرے دماغ میں چنگاریاں سی چھوٹ گئیں۔ اس کی تو بین مجھ سے برداشت نہیں ہوتی تھی لیکن میں فوری اشتعال میں آ کر کوئی ایسا قدم بھی اٹھانا نہیں چاہتا تھا جس کا نتیجہ ناکامی کی صورت میں نکلتا۔ میں نے ضبط کیا۔ انت سنگھ نے میرے سر پر پستول کا دباؤ بڑھا دیا۔ میرے سر کا پچھلا حصہ دیوار سے لگ گیا۔ انت سنگھ کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ پستول کو کسی چاقو یا نیزے کی طرح میری کینٹی میں گھسا دے۔

”بولو..... کون ہو تم؟“ وہ خطرناک لہجے میں پھنکارا۔

اس سے پہلے کہ میں جواب میں کچھ کہتا یا ثروت کچھ بولتی، ایک شخص تقریباً دوڑتا ہوا آیا۔ اس کا رنگ اڑا ہوا تھا۔ اس نے چڑھی ہوئی سانسوں کے ساتھ ہری سنگھ کے کان میں کچھ کہا۔ ہری سنگھ کا سرخ و سپید چہرہ بھی ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ سردار اوتار سنگھ کا سرخ و سپید چہرہ بھی ایک دم پھیکا پڑ گیا۔ سردار اوتار سنگھ سوالیہ نظروں سے بیٹے اور ملازم کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سردار ہری سنگھ اپنے باپ سردار اوتار سنگھ کے پاس پہنچا اور اس کے کان میں چند سرگوشیاں کیں۔ اوتار سنگھ کا چہرہ بھی متغیر ہوا۔ اس کا ہاتھ بے ساختہ اپنی کرپان کی طرف بڑھا۔ بہر حال اس نے کرپان نکالی نہیں۔ سخت اضطراب کے عالم میں وہ زنان خانے کی طرف بڑھا۔

ہری سنگھ ہماری طرف اشارہ کر کے کرخت لہجے میں ملازموں سے بولا۔ ”بند کرو ان کو کمرے میں۔ ابھی لیتے ہیں ان کی خبر بھی۔“

ہمارے کمرے کا وزنی چوہی دروازہ ایک دھماکے سے بند کر دیا گیا۔ باہر سے وزنی کنڈی چڑھا کر تالا لگا دیا گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بیشتر مسلح افراد اس کمرے کے سامنے سے اوجھل ہو گئے۔ میں گرل دار کھڑکی میں سے دیکھ رہا تھا۔ ارد گرد کچھ افراتفری سی نظر آتی تھی۔

پلیز چپ ہو جائیے۔“ اس نے اپنے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے اور اپنا سر بے بسی کے انداز میں دیوار سے ٹک دیا۔

میں سنائے میں تھا۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ میرے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ میں نے یہاں ثروت اور یوسف کے لیے اپنی جان داؤ پر لگا رکھی تھی، اپنے جسم کو زخم زخم کر رہا تھا اور یہاں ثروت مجھے ہی شک کی نظر سے دیکھ رہی تھی۔ میں نے کہا۔ ”ثروت! تمہیں کچھ خبر نہیں یہاں کیا ہو رہا ہے۔ بڑی خطرناک سازش ہو رہی ہے۔ یوسف کو یہاں اس لیے لایا گیا ہے کہ اس کی شکل سردار اوتار سنگھ کے بیٹے سے بہت ملتی جلتی ہے اور اس بیٹے نے قتل کیے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ یوسف کو مارنا چاہتے ہیں، اس طرح.....“

”پلیز تابش! آپ چپ ہو جاؤ۔ مجھے آپ سے کچھ نہیں سننا۔ شاید آپ وہ تابش ہو ہی نہیں جسے میں جانتی تھی۔ میں یوسف کی باتوں کو غلط سمجھتی تھی۔ میں انہیں سمجھاتی تھی کہ انہیں دھوکا ہوا ہے۔ تابش ایسا نہیں کر سکتے۔ ان کا خون ایسے سفید نہیں ہو سکتا لیکن اب تو بہت کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔“

”تم کس دھوکے کی بات کر رہی ہو۔ میری وجہ سے یوسف کو کیا دھوکا ہونا تھا؟ کیا کیا ہے میں نے؟“

”آپ نے کچھ نہیں کیا۔ آپ بے قصور ہیں۔ یہ سردار بھی بے قصور ہیں۔ جو لوگ انہیں لاہور سے پکڑ کر یہاں لائے ہیں، وہ بھی بے قصور ہیں۔ اصل مجرم میں ہی ہوں۔ آپ مجھے مار دیں۔ آپ کا سینہ ٹھنڈا ہو جائے گا اور میری جان بھی چھوٹ جائے گی۔“ وہ باقاعدہ رونے لگی۔

”ثروت! مجھے بتاؤ تو سہی، میں نے کیا کیا ہے؟“

”آپ سب جانتے ہیں۔ آپ سے کچھ ڈھکا چھپا نہیں۔ آپ نے درد کی گولیوں کے نام پر یوسف کو ایسی گولیاں دیں۔ آپ ان کی زندگی سے کھیلے..... آپ.....“ اس کی آواز بھرا گئی۔ وہ اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکی اور ہچکیوں سے رونے لگی۔

میں سنائے میں تھا۔ وہ کوئی ایسی بات کہہ رہی تھی جس کی مجھے مطلق خبر نہیں تھی لیکن وہ بات موجود تھی۔ شاید ثروت اور یوسف کے درمیان موجود تھی۔ مجھے لگا کہ شاید یوسف نے جان بوجھ کر ثروت کو کسی غلط فہمی کا شکار کیا ہے۔ اس کا رویہ تو اس کے لکھے ہوئے رُقعے سے ہی ظاہر ہو جاتا تھا۔ یقیناً کوئی سنگین بات تھی جس کے سبب ثروت کے رویے میں مجھے پھسلے چوبیس گھنٹوں میں نمایاں تبدیلی محسوس ہوئی تھی اور یہ تبدیلی اب عروج پر پہنچی ہوئی تھی۔ مجھے

ملازم تیز رفتاری سے حرکت کر رہے تھے۔ دروازے بند ہو رہے تھے اور کھل رہے تھے۔ ایک دم ہی جیسے ہمارے والا اہم ترین معاملہ پس منظر میں چلا گیا تھا۔ اس کی جگہ کسی اور معاملے نے لے لی تھی۔ میں نے گرل دار کھڑکی میں سے دیکھا کہ حویلی کا بڑا بھانگ بند کر دیا گیا تھا اور اس کے سامنے مسلح افراد کی تعداد بھی بڑھ گئی تھی۔

میں بے دم سا ہو کر دیوار کے سہارے بیٹھ گیا۔ میرے پورے جسم پر ضربات آئی تھیں۔ بازو میں سے مسلسل شدید ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ یوں لگ رہا تھا کہ کہیں فریکچر ہو گیا ہے۔ چہرے پر لگنے والی لاشی نے پیشانی کے قریب سے سر پھاڑ ڈالا تھا اور وہاں سے بہنے والا خون میرے پورے چہرے کو کھڑکھڑاتا تھا۔ میں نے پتلون کے اندر سے قمیص نکالی اور اس کے دامن سے چہرہ پونچھنے کی اپنی سی کوشش کی۔ ثروت مجھ سے بالکل لاتعلقی بیٹھی تھی۔ پلب کی زرد روشنی میں اس کے بال منتشر تھے اور کندھے پر سے قمیص ادھڑی ہوئی تھی۔

”ثروت!“ میں نے اسے مخاطب کیا۔

میں حیران رہ گیا۔ اس نے میری طرف دیکھا بھی نہیں۔ چہ جائیکہ وہ میری چوٹوں پر پریشان ہوتی یا مجھے طبی امداد دینے کی کوشش کرتی۔

میں نے کہا۔ ”ثروت! تم نے تین بجے آنے کا کہا تھا، تم آئی کیوں نہیں؟ تمہارے نہ آنے سے بہت کچھ گڑبڑ ہوا۔ یہاں..... ایک..... بڑا خطرناک کھیل کھیلا جا رہا ہے ثروت! یوسف کی زندگی کو خطرہ ہے۔“

وہ عجیب لہجے میں بولی۔ ”جو خطرناک کھیل کھیلا جا رہا تھا، اس کا ”اینڈ“ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“

میرے جسم میں سر تا پا ایک سرد لہر دوڑ گئی۔ میرا اندیشہ حقیقت لگتا تھا۔ وہی ہو رہا تھا جس کا ڈر تھا۔ یہاں موجود بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح ثروت بھی غلط فہمی کا شکار ہو رہی تھی اور یہ وہی غلط فہمی تھی جس کی داغ بیل ابھی کچھ دیر پہلے سردار اوتار اور اس کے بیٹے نے ڈالی تھی۔ انہوں نے حویلی میں آئے ہوئے مہمانوں کے سامنے اپنے جرم کا سارا ملبہ مجھ پر ڈال دیا تھا اور صورت حال بھی ایسی بنی تھی کہ بہت سے لوگوں کو اس سفید جھوٹ پر فوراً یقین آ گیا تھا۔ میرے ہاتھ میں دھماکا خیز مواد تھا اور میں سیاہ ٹو پونا جیب کے نیچے سے برآمد ہوا تھا۔

میں نے ثروت کا شانہ تھامتے ہوئے کہا۔ ”ثروت! کہیں تم بھی تو یہ نہیں سمجھ رہی ہو کہ میں یوسف کی گاڑی کے نیچے بم لگا رہا تھا؟“

وہ عجیب بیگانے انداز میں بولی۔ ”میں کچھ نہیں سمجھ رہی..... میں کچھ نہیں سمجھ رہی.....“

محسوس ہوا کہ وہ جب مجھے دیکھتی ہے، اس کی آنکھوں میں ایک ڈرسمٹ آتا ہے۔ جیسے وہ مجھے نہیں کسی خطرناک قاتل کو دیکھ رہی ہے۔ میں جانتا تھا کہ اس ڈر کا تعلق اس خون ریز لڑائی سے ہے جس میں چودھری انور کے پانچ بندے مارے گئے تھے۔ ثروت وہ واقعہ دیکھنے کے بعد ایک سکتے کی سی کیفیت میں چلی گئی تھی۔

میں ڈکھ کی اتھاہ گہرائی میں ڈوب گیا۔ میرا جی چاہا کہ اپنے سر پر دو ہتھر سید کروں۔ خود کو دیواروں سے ٹکراؤں۔ کچھ ایسا کروں کہ میرا زخمی جسم اور بھی لہو لہان ہو جائے۔ وہ تو میری زندگی کا محور تھی اور وہی مجھ سے رُخ پھیر رہی تھی۔ مجھے محرم سے مجرم بنا رہی تھی۔ میں نے لجاجت سے کہا۔ ”ثروت! میری بات سنو..... حقیقت وہ نہیں جو تمہیں نظر آ رہی ہے۔ تمہیں پتا نہیں، یوسف کتنے خطرے میں ہے۔ میں نے.....“

میرے الفاظ منہ میں ہی رہ گئے۔ کھڑکی سے آٹھ دس فٹ دور کرسی پر پڑا ہوا ایک موبائل زور زور سے بجنے لگا۔ موبائل کا مالک کسی جانب سے برآمد ہوا اور کھڑکی کے سامنے پہنچ گیا۔ اس نے کال ریسیو کی۔ دوسری طرف سے اس کا کوئی ساتھی خشونت بول رہا تھا۔ خشونت نے پوچھا ہو گا کہ کیا ہوا ہے۔ کال ریسیو کرنے والے نے دبی آواز میں کہا۔ ”خشونت! بڑی کڑ بڑ ہو گئی ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا ہے۔ سرنوں بی بی اپنے کمرے وچ نہیں۔ کہیں بھی نہیں ہیں۔ سب انہیں ڈھونڈ رہے ہیں۔ نہیں..... نہیں..... یہ تو نہیں ہو سکتا۔ دونوں پھانگ بند تھے، پھر ابھی تھا..... اچھا ٹھیک ہے۔ مجھے آوازیں پڑ رہی ہیں۔ پھر بات کرتے ہیں۔“ اس نے کہا اور ایک طرف اوجھل ہو گیا۔

میں ششدر کھڑا تھا۔ یہ بڑی حیرت ناک بات تھی۔ سرنوں، سردار اوتار سنگھ کی اس بیٹی کا نام تھا جس کی شادی کا ہنگامہ برپا تھا اور وہ غائب تھی۔ اب سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ سردار اوتار اور اس کے کارندے آنا فانا ہمیں چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے۔ میری پیشانی سے ٹپ ٹپ لہو گر رہا تھا۔ ثروت نے آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھا تھا کہ مجھ پر کیا ہوتی ہے۔ جسم کی طرح میرے دل کے اندر سے بھی خون رسنے لگا تھا۔

اچانک ایک زوردار آواز آئی اور اس نے ہماری ساری توجہ اپنی طرف کھینچ لی۔ یہ آٹو بینک رائل کی خوفناک ”ترتر“ تھی۔ یہ پورا ایک برست تھا جو چھوٹے گیٹ کی طرف سے آیا اور کسی ایک قریبی کھڑکی سے ٹکرایا۔ ششے ٹوٹنے اور گرنے کی آوازیں آئیں۔ جواب میں چند گولیاں چلیں اور پھر ایک دم اندھا دھند فائرنگ شروع ہو گئی۔ ثروت سمٹ کر دیوار سے جا لگی۔ پہلا خیال تو میرے ذہن میں یہی آیا کہ کہیں باہر سے جگت سنگھ وغیرہ نے حملہ کر دیا ہے

لیکن اگر وہ کوئی ایسی کارروائی کرتے تو طے شدہ ٹائم کے مطابق کرتے اور مجھ سے رابطہ کر کے بعد کرتے۔ لگتا تھا کہ یہ کوئی اور لوگ ہیں۔ اگلے دو تین منٹ میں اس کی تصدیق بھی ہو گئی۔ مجھ پر یہ سنسنی خیز انکشاف ہوا کہ یہ غالباً وہی اوتار سنگھ کی لڑکی والا معاملہ ہے۔ یقیناً کچھ لوگ یہ شادی نہیں چاہتے تھے اور اب وہی مسلح حالت میں یہاں آن موجود ہوئے تھے۔ اس کا مطلب تھا کہ یہ ایک نہایت سنگین سلسلہ ہے۔ یہاں لوگ مر سکتے تھے اور زخمی یا اغوا وغیرہ بھی ہو سکتے تھے۔ یکا یک ایک اور آواز آئی۔ یوں لگا جیسے کوئی بھاری گاڑی حویلی کے بڑے پھانگ سے ٹکرائی ہے اور اسے توڑ دیا ہے۔ فائرنگ میں ایک دم شدت آ گئی۔ میں نے ایک فرہبہ اندام شخص کو زمین پر گرتے اور لوٹ پوٹ ہوتے دیکھا۔ اسے شاید کرپان کا زخم آیا تھا۔ گرنے سے اس کی پگڑی کھل گئی تھی اور کیس بکھر گئے تھے۔

دو بٹے کٹے سکھ اسلحہ لہراتے اور بڑھکیں مارتے بڑے پھانگ کی طرف لپکے۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ اس کمرے کا عقبی دروازہ بھی موجود ہے۔ مجھے لگ رہا تھا کہ یہ زیادہ مضبوط بھی نہیں ہے۔ میرا گھائل جسم مجھے کسی مہم جوئی کی اجازت نہیں دے رہا تھا لیکن باروندا جبکی کہنا تھا کہ جسم سے اجازت مت لو، اس کو حکم دو۔ آنکھیں بند کر کے اسے تکلیف کی بھٹی میں جھونک دو اور پھر دیکھو کہ اس کے جلنے سے راحت کے کیسے پھول کھلتے ہیں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ میں نے چوٹوں کی پروا کیے بغیر خود کو اٹھایا اور چند قدم دوڑ کر کندھے سے دروازے کے زوردار ٹکر رسید کی۔ میری دوسری ٹکر سے دروازہ سبکی دونوں چٹخیاں اُکھڑ گئیں اور پٹ باہر کی طرف کھل گئے۔ میں نے ٹانگ سے بندھا ہوا خنم دار چاقو ہاتھ میں لے لیا۔ میرے جسم میں برق دوڑ رہی تھی۔ ”آؤ ثروت!“ میں نے کہا۔

وہ چند سیکنڈ تذبذب میں رہنے کے بعد میرے ساتھ آگے بڑھی۔ ہم دروازے میں سے نکلے اور عقبی برآمدے میں آ گئے۔ یہاں نیم تاریکی تھی۔ میں ایک دیوار کے ساتھ ساتھ آگے بڑھا۔ ثروت میرے پیچھے تھی۔ ہم حویلی کے کچے حصے، یعنی زنان خانے میں داخل ہوئے۔ میرا خیال تھا کہ ہم زنان خانے کے پہلو سے گزرتے ہوئے چھوٹے گیٹ کے قریب پہنچ جائیں گے اور پھر باہر نکلنے کے لیے موقع کا انتظار کریں گے لیکن اچانک سامنے سے دو مسلح افراد آتے دکھائی دیئے۔ ان کی نظر سے بچنے کے لیے ہم زنان خانے کے اندر گھس گئے۔ سامنے ہی بیمار باپ والا کرا تھا۔ اب میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس کمرے کو وقتی پناہ گاہ کے طور پر استعمال کروں۔ میں چاقو قمیص کے نیچے چھپا کر باپو کے کمرے میں گیا اور ساتھ ہی ثروت بھی آ گئی۔

بیار باپو تنکے کے سہارے بیٹھے تھے۔ ان کا مفلوج ہاتھ ان کی گود میں تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر مزید پریشان ہوئے پھر بہت دھیمی آواز میں بولے۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے اکبر علی؟“ میں نے کہا۔ ”شاید آپ کو پتا نہیں کہ کچھ لوگوں نے حویلی پر ہلا بول دیا ہے۔ دونوں طرف سے گولیاں چل رہی ہیں اور سرنوں بی بی کا بھی کچھ پتا نہیں ہے۔“

یوں لگا کہ ہمارے باپو سرنوں کی کشدگی کے بارے میں پہلے سے جانتے ہیں۔ وہ سرنوں کے بارے میں میری اطلاع کو نظر انداز کرتے ہوئے بولے۔ ”اور تمہیں کیا ہوا ہے؟ کہاں سے لگی ہیں تمہیں یہ چوٹیں؟“

”سیڑھیوں سے گر گیا ہوں۔“ میں نے بات بنائی۔

باپو نے مجھے اکبر علی کہہ کر مخاطب کیا تھا، اس کا مطلب تھا کہ وہ اس واقعے سے بے خبر ہیں جس میں مجھے مارا پینا گیا تھا اور مجھ پر دھماکا خیز مواد والا الزام لگایا گیا تھا۔

ایک دم میں چونک گیا۔ میری نگاہ اچانک ہی اس چھوٹے کمرے کی طرف اٹھ گئی تھی جو میں آرام کے ساتھ استعمال کرتا تھا۔ کمرے کا دروازہ بند تھا لیکن اس کے پیچھے آہٹ سی ہوئی۔ مجھے یوں لگا جیسے اندر کوئی ہے۔ میں نے دروازہ کھول کر دیکھا اور دنگ رہ گیا۔ اندر ایک خوبصورت لڑکی موجود تھی۔ اس کے ہاتھ پر مہندی رچی تھی۔ کانوں میں اور گلے میں پھولوں کا زیور تھا۔ وہ ڈری سہمی ہرنی کی طرح نظر آ رہی تھی۔ میں چند سیکنڈ میں پہچان گیا۔ میں نے سرداروں کے خاندانی اہم میں اس کی تصویر دیکھی تھی۔ یہی سردار اوتار سنگھ کی بیٹی اور باپو کی پوتی سرنوں کو تھی۔ ساری حویلی میں لوگ اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے اور وہ یہاں اپنے دادا کے کمرے میں چھپی ہوئی تھی۔

باپو نے کہا۔ ”میری گل سنو اکبر علی! ادھر آؤ میرے پاس۔“

میں چھوٹے کمرے کا دروازہ بھیڑ کر باپو کے پاس چلا گیا۔ وہ کچھ کہنا چاہ رہے تھے۔ میں نے کان ان کے ہونٹوں کے قریب کر دیا۔ وہ بولے۔ ”اکبر علی! سرنوں میری مرضی سے یہاں چھپی ہوئی ہے۔ اس دچاری کے ساتھ بڑا ظلم ہو رہا ہے۔ اس کے ماں پپو اس کا دیاہ اس کی مرضی کے خلاف کر رہے ہیں۔ میں نے ان کو بہت سمجھایا ہے لیکن یہ نہیں مانے۔ اب اس کا انت (انجام) ان کے سامنے آ گیا ہے۔ ساری آن عزت خاک میں مل رہی ہے۔“

میں نے پوچھا۔ ”باپو! حویلی پر ہلا بولنے والے کون ہیں؟“

”یہ نہالوں کے لوگ ہیں۔ نہالوں سے ہی سرنوں کے رشتے کا جھگڑا چل رہا ہے۔ میں

نے بڑا سمجھایا تھا پتروں کو، واگرو کے واسطے دیئے تھے لیکن انہوں نے میری ایک نہیں مانی۔ اب دیکھو ان کی اپنی اولاد ہی ان کے سامنے کھڑی ہو گئی ہے۔“ بوڑھے باپو کا اشارہ یقیناً سرنوں کی طرف ہی تھا۔ مجھے یاد آیا کہ ابھی کچھ دیر پہلے سردار اوتار کو مجھ پر ”نہالوں“ کا بندہ ہونے کا شک ہوا تھا۔

یکا یک بھاگتے قدموں کی آوازیں آئیں۔ کچھ لوگ اندھا دھند گولیاں چلاتے ہوئے زنان خانے کے اس حصے کی طرف آرہے تھے۔ باپو گھبرا کر بولے۔ ”دیکھو..... اگر اوتار سنگھ یا اس کا کوئی بندہ سرنوں کے بارے میں پوچھے تو اسے یہی بتانا ہے کہ وہ ادھر نہیں آئی۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ثروت کے ساتھ تیزی سے اس چھوٹے کمرے میں چلا گیا جہاں سرنوں پہلے سے موجود تھی۔ سرنوں نے اب خود کو لکڑی کی الماری کے پیچھے تاریک خلا میں چھپا لیا تھا۔ میں نے ثروت کو بھی الماری کے پیچھے بھیج دیا۔ چاقو اب پھر میرے ہاتھ میں تھا۔ میں نے دروازے کو اندر سے کنڈی چڑھائی اور اس کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ آوازوں سے مجھ پر انکشاف ہوا کہ باپو کے کمرے میں داخل ہونے والے حویلی کے افراد نہیں بلکہ نہالوں کے لوگ ہیں۔ ایک ادھیڑ عمر شخص ہانپی ہوئی بھاری آواز میں باپو سے کہہ رہا تھا۔ ”باپو جی! آپ کے پترنے سرنوں کو کہیں چھپا دیا ہے..... یا پھر مار دیا ہے۔ وہ ہمیں کہیں نظر نہیں آ رہی۔“

جواب میں باپو کی بہت مدھم آواز ابھری۔ ”پالے! سرنوں یہیں ہے میرے پاس..... تم اسے لے جاؤ لیکن اگر اسے کچھ ہوا تو میں تمہیں کبھی شائیں نہیں کروں گا۔“

پالے دوبارہ بولا تو اس کی آواز جذبات کی شدت سے لرز رہی تھی۔ اس نے کہا۔ ”نہیں باپو جی! آپ کی پوتی ہے تو میری دھی ہے۔ میں اپنے پران دے دوں گا لیکن اپنی دھی کو کچھ نہیں ہونے دوں گا۔ میں وچن دیتا ہوں آپ کو۔“

اسی دوران میں باہر ہونے والی فائرنگ کی آوازیں نزدیک آ گئیں۔ پالے کے ساتھ آنے والے افراد شاید برآمدے کی طرف چلے گئے اور فائرنگ میں شامل ہو گئے۔

باپو نے سرنوں کو آواز دینے کے لیے غالباً جسم کی ساری طاقت صرف کر دی تھی۔ ”سرنوں..... سرنوں..... باہر آ جا۔“ باپو کی بھرائی ہوئی کمزور آواز ابھری۔

سرنوں الماری کے پیچھے سے نکل آئی۔ میں نے ایک لمحے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور سمجھ گیا کہ وہ اپنے دادا کی بات ماننے کے لیے اور پالے نامی بندے کے ساتھ جانے کے لیے پوری طرح تیار ہے۔ میں ثروت کے پاس الماری کی اوٹ میں چلا گیا۔ سرنوں نے ذرا

تھا۔ حیرت انگیز طور پر پچانک تک ہمارا سامنا کسی سے نہیں ہوا۔ ہم پچانک میں تھے جب اوتار سنگھ کے ایک کارندے نے ہمارا راستہ روکا لیکن اس سے پہلے کہ وہ فائر کرتا، میری چلائی ہوئی دو گولیاں اس کی چھاتی میں لگیں اور وہ پچانک کے ستون سے ٹکرا کر دھوئیں میں گم ہو گیا۔ ثروت بُری طرح کھانس رہی تھی۔ میرے سینے میں بھی سانس نہیں سارہی تھی۔ ہم جانتے تھے کہ جتنی جلدی یہاں سے دور ہو جائیں گے، اتنا ہی ہمارے لیے اچھا ہوگا۔ ہم درختوں کی طرف بھاگے۔ اچانک ایک دھواں چھوڑتی گاڑی میرے پاس آ کر رُکی۔ یہ ایک لوڈر تھا، اس کے عقب میں چار اوغیرہ لدا ہوا تھا۔ میں نے دیکھا لوڈر کی ڈرائیونگ سیٹ پر یوسف بیٹھا تھا۔ گاڑی کی اندرونی روشنی میں اس کے چہرے پر نیم گول زخم کا نشان نمایاں نظر آ رہا تھا۔ وہ ہماری طرف دیکھ کر پکارا۔ ”اندر آ جاؤ۔“

میں اور ثروت لوڈر کی طرف لپکے۔ میرے دائیں ہاتھ میں ٹرپل ٹورائل تھا اور میں ٹریگر دبانے کے لیے بالکل تیار تھا۔ یوسف نے گاڑی مکمل نہیں روکی۔ میں نے ریٹنگی گاڑی میں ثروت کو سوار کرایا مگر اس سے پہلے کہ میں بھی سوار ہوتا، یوسف نے گاڑی ایک جھٹکے سے آگے بڑھادی۔ اس کا دروازہ بھی کھلا ہی رہ گیا جو کچھ دور تک لہراتا رہا پھر ایک درخت سے ٹکرا کر بند ہو گیا۔

میں ششدر کھڑا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسا کیوں ہوا ہے۔ اگر یوسف جان بوجھ کر مجھے چھوڑ کر جا رہا تھا تو بہت بڑی غلطی کر رہی تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اس خطرناک صورت حال میں ثروت کی حفاظت نہیں کر سکے گا بلکہ شاید اپنی حفاظت بھی نہ کر سکے۔ طیش کی ایک لہر سی میرے اندر ابھری۔ لوڈر مجھ سے پچیس تیس میٹر دور جا چکا تھا۔ میں نے اس کے پیچھے دوڑ لگا دی۔ دس پندرہ سیکنڈ میں، میں اس کے نزدیک پہنچ گیا۔ نہ جانے اس وقت کیوں مجھے عمران کی رُوداد کا ایک منظر یاد آ گیا۔ شاید وہ بدمعاش عورت ماجھاں بھی اسی طرح عمران اور راجا کے پیچھے بھاگتی تھی۔ وہ دونوں پھٹکا لوڈر پر سوار تھے۔ پھر ماجھاں کے ہاتھ کا کڑا چلتے لوڈر کے کنڈے میں پھنس گیا تھا۔ بہر حال پتویشن کچھ مختلف تھی۔

یہاں کوئی بھی گاڑی کے عقبی حصے میں موجود نہیں تھا۔ بس چارے کے گٹھے جو جھنکوں کے سبب زور زور سے بل رہے تھے۔ معلوم نہیں کہ یوسف عقب نما آئینے میں مجھے دیکھ سکا یا نہیں۔ بہر حال میں نے لوڈر کا جنگلا پکڑ کر جست لگائی اور چارے کے گٹھوں کے اوپر گرا۔ لوڈر اب رفتار پکڑتا جا رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ راستہ نسبتاً ہموار ہو گیا تھا۔ دائیں بائیں درخت تھے۔ عقب میں سرداروں کی حویلی سے شعلے بلند ہو رہے تھے اور دھوئیں کے بادل گھٹا

ایڑیاں اٹھا کر دروازے کی چٹختی کھولی اور باہر نکل گئی۔ میں نے اندازہ لگایا کہ یہ پالے نامی شخص اس لڑکے کا باپ یا چچا وغیرہ ہے جس سے سرنوں شادی کرنا چاہتی ہے۔ باہر جو بات ہو رہی تھی، اس میں مجھے ”نکانہ صاحب“ کا نام بھی سنائی دیا۔ یقیناً یہ کوئی سنگین تازہ تھا جو بہت عرصے سے چل رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ باپ کی عمر رسیدہ بیوی بھی اپنے شوہر کے ہم خیال ہو۔ شاید ہم اس کہانی کا کلائمیکس سین دیکھ رہے تھے۔

سردار اوتار سنگھ ایک نامی گرامی چودھری کی حیثیت سے لوگوں کے فیصلے کرتا تھا لیکن وہ اپنی بیٹی کو انصاف نہیں دے سکا تھا۔ وہ اپنا فیصلہ خود کرنے پر مجبور ہو گئی تھی۔ وہ ان لوگوں کے ساتھ جا رہی تھی جن کو اپنے گھر والوں سے زیادہ اپنا ہمدرد سمجھتی تھی۔

فائرنگ اب بالکل ہمارے آس پاس ہو رہی تھی۔ اچانک ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور حویلی کے دائیں حصے میں آگ بھڑک اٹھی۔ میں نے دروازے کی جھری میں سے دیکھا، سرخی مائل روشنی حویلی کے احاطے میں پھیلی جا رہی تھی۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا یہ ایک ٹریکٹر کی ڈیزل ٹینگی پھٹنے کا دھماکا تھا۔ پرانی کے بڑے بڑے ڈھیر پاس ہی پڑے تھے۔ انہوں نے بارود کی طرح آگ پکڑ لی۔ فائرنگ بھی مسلسل ہو رہی تھی لیکن اب اس کا زور بس ایک ہی جگہ نہیں تھا۔ حویلی میں ہر طرف افراتفری تھی۔ دھوئیں کے سیاہ مرغولے بڑی تیزی سے بلند ہوئے اور اس افراتفری میں اضافہ کرنے لگے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ سرداروں کی اس خونی حویلی سے نکلنے کے لیے یہ بہترین موقع ہے۔ میں نے ثروت کا ہاتھ تھاما۔ میرے دوسرے ہاتھ میں کھلا ہوا چاقو تھا۔ ہم بڑے کمرے میں پہنچے تو بیمار باپو خون میں لت پت تھے۔ کسی جانب سے پرواز کر کے آنے والی کوئی گولی ان کے سر میں لگی تھی اور ان کے سفید کیس ”لہورنگ“ ہو رہے تھے۔ یقیناً اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔

ہمارے پاس اتنی مہلت نہیں تھی کہ میں ان کے پاس رکتا، ان کو دیکھتا۔ ہم باہر نکل کر دھوئیں کے مرغولوں میں سے گزرے۔ ثروت نے اپنے منہ کو اوڑھنی کی دھری تہ سے ڈھانپ لیا تھا۔ میں نے بھی سانسیں روک لیں۔ جگہ جگہ گولیوں کے خول بکھرے ہوئے تھے اور دیواروں پر گولیوں کے سوراخ تھے۔ برآمدہ نما جگہ پر مجھے بھیانک چہرے والے انت سنگھ کی تلاش نظر آئی۔ گولی اس کی گردن چیر کر نکل گئی تھی۔ اس کے پاس ہی مجھے ٹرپل ٹورائل اور گولیوں والی بیٹل نظر آئی۔ میں نے یہ دونوں چیزیں اٹھا لیں، چاقو دوبارہ لباس میں رکھا اور رائفل کو تیار حالت میں کر لیا۔ رائفل کے وزن سے اندازہ ہو رہا تھا کہ اس کے میگزین میں اب بھی گولیاں موجود ہیں۔ بڑا پچانک تو ٹوٹ چکا تھا۔ چھوٹا پچانک بھی چوہٹ کھلا ہوا

کی شکل اختیار کر رہے تھے۔ فائرنگ کی آوازیں اب رُک رُک کر آرہی تھیں۔ کچھ دور مجھے ایک دل خراش منظر نظر آیا۔ ایک گھوڑا سرپٹ بھاگ رہا تھا۔ اس کی چری زین کو آگ لگی ہوئی تھی۔ زین کے ساتھ ساتھ گھوڑے کی پشت کی چربی بھی جل رہی تھی۔ وہ درختوں سے ٹکراتا، گرتا پڑتا میرے سامنے ایک جوہڑ میں جا گرا اور نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں نے دو تین بھینسوں کو بھی دیکھا جوڑ کراتی ہوئی ادھر ادھر بھاگ رہی تھیں، یقیناً وہ بھی حویلی میں لگنے والی آگ سے متاثر تھیں۔ میں نے چارے کے کٹھوں پر اوندھے لیٹے لیٹے عقب میں دیکھا۔ کسی گاڑی کی روشنیاں دکھائی نہیں دیں، نہ ہی کوئی گھڑ سوار نظر آیا۔ مطلب یہ تھا کہ ہم تعاقب سے محفوظ رہے ہیں۔ وہاں اتنی افراتفری تھی کہ کسی کو کسی کا ہوش ہی نہیں تھا۔

میری پیشانی کی چوٹ سے اب بھی خون برس رہا تھا۔ پورا بدن جیسے چوٹوں کے سبب پھوڑا بنا ہوا تھا۔ یہ اذیت تلخ تھی اور میٹھی بھی۔ درد کی ٹیسیں میرے اندر عجیب سی ترنگ بھر رہی تھیں۔ میں نے وہیں سبز چارے پر لیٹے لیٹے رائفل کو اچھی طرح چیک کیا۔ اس کے میگزین میں اب بھی چھ سات گولیاں موجود تھیں۔ میں نے میگزین فل کر لیا اور رائفل کو آلٹ پلٹ کر اس کے میگزین کو سمجھ لیا۔ میں جانتا تھا کہ آج رات کسی بھی وقت مجھے اس کی ضرورت پڑ جائے گی۔ بہر حال یہ معلوم نہیں تھا کہ اتنی جلدی پڑ جائے گی۔

یوسف گاڑی کو بھگاتا ہوا چلا جا رہا تھا۔ میں اس کے ذہن کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ وہ کہاں جانا چاہ رہا تھا؟ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ وہی کر رہا ہے جو اسے کرنا چاہیے۔ وہ بس حویلی سے دور ہونا چاہ رہا تھا۔ درختوں اور جھاڑیوں کے درمیان اسے جدھر بھی بہتر راستہ نظر آتا، وہ اس طرف گاڑی گھما دیتا تھا۔ میں نے سوچا کیا مجھے ان دونوں کو اپنے بارے میں اتنا چاہیے؟ یہ ذرا مشکل سوال تھا۔ ابھی میں اس کا جواب ڈھونڈ ہی رہا تھا کہ گاڑی کی رفتار بڑھ گئی۔ ہم حویلی سے سات آٹھ میل دور آچکے تھے۔ میں نے کیمین کی چھت کے اوپر سے دیکھا، آگے راستہ بند تھا۔ ایک بڑی جیب اس طرح کھڑی تھی کہ پہلو سے ٹکنا دشوار تھا۔ جیب کی چھت پر کافی ساز و سامان لدا نظر آ رہا تھا۔ لوڈز کی ہیڈ لائٹس میں، میں نے دیکھا۔ یہ مچھلیاں پکڑنے والے جال تھے اور کیمپنگ کے لوازمات تھے۔ دو تومند سکھ جیب سے باہر کھڑے ہماری طرف دیکھ رہے تھے۔ یوسف نے لوڈز روک لیا۔ دونوں تومند سکھ یوسف والی کھڑکی کی طرف آئے۔ ایک نے کہا۔

”سوری بھراجی! جیب ذرا بند ہو گئی ہے۔ ابھی اشارت کر لیتے ہیں۔ کہاں جانا ہے

آپ نے؟“

”جی توڑی ہی ہو۔“ یوسف نے کوئی مسئلہ جواب دیا۔

”جواب دینا توڑی دہکا کوئی نام نہاد تو ہو گا؟“ دوسرے شخص نے ہنسنے لگا۔

اسی دہائی میں تیسرا شخص بھی پیپ سے نکل کر لوہار کی طرف آ گیا۔ اس نے پتھر کی لیس بنی پہلی قمی۔ میں نے دیکھا، اس کے ہاتھوں میں ٹکریٹ ہے اور وہ نئے کے سبب واضح طور پر ڈکڑا رہا ہے۔ اس نے سب سے پہلے ثروت والی کمزری میں ہی دیکھا اور ہانک لگائی۔ ”کوئی تو مجھ کے قصوں سے ملے۔“ لگتا ہے بدبو سے۔“

اس دہائی میں پہلے والے دونوں شخصوں نے پیپ سے چند اور سولہ پونڈے بھی کے وہ حساب جواب نہ دے سکا۔ پہلا شخص بولا۔ ”ہماری اسٹیجس نے گنا ہے کہ آپ نے آج رات رات بھولا ہی بھولا ہے۔ ہم کو آپ کی نگاہ کرنی چاہیے۔ ویسے آپ دونوں بھی سے ”نہی“ کر رہی تھیں؟“

یوسف بولا۔ ”آپ کبھی باتیں کرتے ہو مردہ کی؟ کیا ہم آپ کو ایسے لگتے ہیں؟“
شرابی بولا۔ ”ایسے نہیں لگتے تو دوسرے بھی نہیں لگتے۔ ویسے مطلق مستحق کر کوئی ہمارا ہوا تو نہیں ہے ہرگز۔“

”آپ بدتمیزی کر رہے ہیں۔“ یوسف کی چٹائی سولی آواز آئی۔
سونا بگڑی دہائے نے کہا۔ ”پرانی ہی کہنا کوئی بدتمیزی نہیں ہوتی مجھ پر۔“
تم نے دہکا ہانک۔ ”خار۔“ وہ کہتا ہے کوئی چوری نہیں کی۔“

یوسف نے دہکا ہانک اسرار نہ کیا۔ ”خار“ وہ دہکا ہانک کہ وہ لوہار کو دہکا کر کے دوسری طرف سے اٹھ جائے۔ لوہار ہی اٹھ نہ ہو کیا۔ اس کے ساتھ ہی چابی کی جھنک جھنک سنائی دی۔ ”لکھے تمام لوہار کے دہکا ہانک میں سے کسی نے بھرتی سے نکلیں میں سے چابی لگائی لی ہے۔“ سناٹا بگڑا چلا ہوا۔

شرابی نے لپک کر کہا۔ ”پپ پیپ پیٹھے ہو غور کوئی بات ہے۔ ایسی طاقت ہے ہی ایسی طاقت ہے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے کمزری میں سے ثروت کے ساتھ کوئی بھڑکی۔
میں نے چائے کی آواز باطل صاف سنی۔ چھاپہ ثروت کی طرف سے جواب تھا۔ اس کے بعد یہ کہہ کر وہ دروازے کے صحن مطابق تھا۔ شرابی شخص نے ایک ٹھٹھے سے گازی کا دروازہ کھولا اور ثروت کو باز سے بکا کر باہر نکال دیا۔ ”نہ کرنا اس سے سوچے گا۔“ دہانے کے لیے نہیں چھوٹے۔“ کے لیے جاتے ہیں۔“

وہ ڈکرایا۔ ”اوائے چومتی ہے میری جتی۔ میں تو اس کا حشر نشر کر دوں گا۔“

یوسف جلدی سے آگے آیا اور لرزتی آواز میں بولا۔ ”ہمارے ساتھ ایسا مت کریں۔ میں آپ کی منت کرتا ہوں۔“

شرابی اجو بولا۔ ”غٹیں بھی کرتے ہو اور چیپڑیں بھی مارتے ہو۔ تمہاری تو.....“ اس نے یوسف کو زور سے دھکا دیا۔ وہ لوڈر کی سائڈ سے ٹکرایا اور کراہنے لگا۔ اس میں اتنا دم خم ہر گز نہیں تھا کہ ان ڈشکروں کی مزاحمت کر سکتا۔ وہ ٹائی لگا کر سارا دن کمپیوٹر کے سامنے بیٹھنے والا شخص تھا۔ ان تینوں کی نیت واضح ہوتی جا رہی تھی۔ ان میں سے ایک سرخ گکڑی والا، قدرے بھلا مانس تھا لیکن باقی دونوں ایک دم حرصی غنڈے نظر آتے تھے۔ وہ شکار کے لیے نکلے ہوئے تھے۔ لیکن مچھلی کے بجائے ایک خوبصورت لڑکی جال میں آگئی تھی اور وہ اس صورت حال پر نہال نظر آ رہے تھے۔

اسی دوران میں ان میں سے ایک نے لوڈر کے عقب کا معائنہ شروع کر دیا۔ یقیناً وہ چارہ دیکھ کر حیران ہو رہا تھا۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے پہلے میری ٹانگیں دیکھیں۔ پھر ٹاراج جلائی اور تیزی سے میری طرف آیا۔ ”اوائے..... یہ کون ہے؟“ ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ میں نے ٹرپل ٹورائل کا کندا بڑی طاقت سے اس کے منہ پر مارا۔ وہ کسی ایسے حملے کے لیے بالکل تیار نہیں تھا۔ اُچھل کر ایک کیکر سے ٹکرایا اور پھر ثروت کے پاؤں کے پاس جا گرا۔

میں چھلانگ لگا کر نیچے آ گیا۔ شرابی اجو خطرہ بھانپ کر چیپ کی طرف لپکا۔ اس کے انداز سے عیاں تھا کہ وہ کوئی ہتھیار وغیرہ نکالنا چاہتا ہے۔ میں نے بے دریغ اس کی ٹانگ میں گولی ماری۔ دھماکے کی آواز کے ساتھ ہی وہ چلا یا اور تڑپ کر لمبی گھاس میں گرا۔ باقی دونوں افراد سکتے کی کیفیت سے نکلے اور مجھ پر پل پڑے۔ انہوں نے دیوانہ وار مجھ سے رائفل چھیننے کی کوشش کی۔ میں نے ان کے چہروں پر ٹنگریں رسید کیں اور ان کی کوشش ناکام بنا دی۔ حوصلہ افزا صورت حال دیکھ کر یوسف نے ایک شخص کو عقب سے جکڑ لیا۔ چند سیکنڈ کے اندر پانسابلٹ گیا۔ میں نے ان دونوں افراد کے چہرے کا بھرتہ بنا دیا۔ وہ باقاعدہ چلانے لگے۔ انہیں ایسی شدید مزاحمت کی ہرگز توقع نہیں تھی۔ ان میں سے ایک تو خود کو چھڑا کر جنگل میں بھاگ گیا۔ دوسرا بھی اسی تاک میں تھا۔ جونہی موقع ملا، اس نے بھی دوڑ لگا دی۔ اتفاقاً ان دونوں بھگوڑوں کے رنگ برنگے موبائل فون وہیں پر گر گئے تھے۔

شرابی اجو سنگھ لمبی گھاس میں لوٹ پوٹ ہو رہا تھا۔ ٹرپل ٹو کی گولی، دیکھے انگارے کی صورت اس کی فربہ ران میں گھس گئی تھی۔ میں نے اسے ٹھوکر رسید کی اور اوندھا کر کے اس کی جامہ تلاشی لی۔ اس کے پاس موبائل فون نہیں تھا۔ ایک بٹوا اور چند دیگر اشیائیں ملیں۔ پھر میں چیپ کی طرف آ گیا۔ چیپ میں سامان خورد و نوش موجود تھا۔ انڈین وہسکی کی دو بوتلیں اور سگریٹوں کے پیکٹ پچھلی نشست پر نظر آ رہے تھے۔ اگلی نشست کے نیچے سے ایک بھرا ہوا پستول بھی نکل آیا۔ اجو سنگھ یقیناً یہی پستول لینے کے لیے لپکا تھا۔ میں نے پستول اپنی بیلٹ میں اڑس لیا اور وہ بیک بھی اٹھایا جس میں قیے والے پراٹھے، آلو کے تلے ہوئے قتلے اور کوک کے ٹن وغیرہ تھے۔ اس کے علاوہ ایک بڑے سائز کی گرم چادر بھی میں نے چیپ میں سے نکال لی۔

ثروت اور یوسف حیرت سے میری کارروائی دیکھ رہے تھے۔ وہ میری موجودگی سے ایک ہی وقت میں خوش بھی تھے اور پریشان بھی۔ میں نے ان سے کوئی سوال جواب نہیں کیا۔ بس اتنا کہا۔ ”آگے راستہ بالکل نہیں۔ درخت ہی درخت ہیں۔ ہمیں گاڑی چھوڑنی پڑے گی۔“

یہ بات یقیناً یوسف کی سمجھ میں بھی آ رہی تھی۔ دو ہی آپشن تھے۔ گاڑی چھوڑ دی جائے یا پھر واپس پلٹا جائے۔ پلٹنے میں شدید خطرے کے سوا اور کچھ بھی نہیں تھا۔ یوسف کو خاموش دیکھ کر میں نے کہا۔ ”ضائع کرنے کے لیے وقت بالکل نہیں ہے تمہارے پاس۔ یہاں ایک فائر ہو چکا ہے۔ کسی وقت کوئی بھی یہاں آ سکتا ہے۔ ہمیں جلدی نکلنا چاہیے اور بہتر ہے کہ ان کی چیپ پر سے تھوڑا بہت شکار کا سامان بھی اُتار لیا جائے۔“

”وہ کس لیے؟“ یوسف نے پہلی بار زبان کھولی۔

”ابھی کچھ دیر پہلے جب ان غنڈوں نے تم سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو تو تمہاری زبان کو تالا لگ گیا تھا۔ ہمارے پاس شکار کا سامان ہو گا تو بتائیں گے کہ شکار پر نکلے ہیں۔“

میرے خشک لہجے کو محسوس کر کے یوسف نے جلدی سے اثبات میں سر ہلایا اور چیپ کی چھت پر بندھے ہوئے سامان کو کھولنے میں مدد کی۔ ہم نے ایک جال اور کچھ کنڈیاں وغیرہ سامان سے علیحدہ کر لیں۔ زمین پر گرے ہوئے دونوں موبائل فون ثروت نے اٹھا کر مجھے دے دیے۔ شرابی اجو سنگھ کو وہیں لوٹ پوٹ ہوتے چھوڑ کر ہم تیزی سے گھنے درختوں کی طرف بڑھ گئے۔ ٹرپل ٹورائل کو چھپانے کے لیے اس چادر نے بہت مدد کی جو مجھے چیپ سے ملی تھی۔ میں نے یہ چادر بالکل کی طرح اپنے ارد گرد پھیلت لی۔

اُتارا اور بیٹھ گئے۔ میں نے ایک بار پھر موبائل آن کیا اور جگت سنگھ کا نمبر ملانے کی کوشش کی۔ میرے والا موبائل تو سرداروں کے پاس ہی رہ گیا تھا۔ یہ موبائل ان دو میں سے ایک تھا جو اس جگت کے ساتھی بھاگتے ہوئے چھوڑ گئے تھے۔ ایک بار پھر جگت سے رابطہ نہیں ہو سکا۔

میرے سینے میں ایک آگ سی جل رہی تھی۔ میں یوسف سے بہت کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن میں نے بس ایک ہی بات پوچھی۔ میں نے کہا۔ ”یوسف! تم نے ثروت سے کہا ہے کہ میں نے تمہیں ”پین کمر“ کے نام پر زہریلی گولیاں کھلانے کی کوشش کی۔ یہ جھوٹ کیوں بولا تم نے؟“

یوسف چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔ ”ان سوال جواب کے لیے یہ جگہ مناسب نہیں ہے تابش! کسی محفوظ جگہ پہنچ کر جو چاہو پوچھ لینا۔“
میں نے کہا۔ ”کون کہہ سکتا ہے کہ محفوظ جگہ پہنچنے تک تم میرے ساتھ ہو گے یا مجھے کہیں چھوڑ جاؤ گے۔ اگر تمہارے پاس میرے سوال کا جواب ہے تو ابھی دے دو۔“

یوسف میرا مصمم ارادہ دیکھ کر بولا۔ ”میں نے ثروت سے یہ کبھی نہیں کہا کہ تم نے مجھے زہریلی گولیاں دی تھیں۔ میں نے بس یہ کہا ہے کہ ان کی ”ڈیٹ“ دو سال پہلے ایکسپائر ہو چکی تھی اور جس قسم کی وہ دوا تھی وہ ایکسپائر ہونے کی صورت میں بندے کی جان بھی لے سکتی ہے۔“

میں نے کہا۔ ”مجھے بڑے افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے یوسف کہ تم پھر جھوٹ بول رہے ہو۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے، میں نے گولیوں کا جو پتا تمہیں دیا تھا، اس پر خود ڈیٹ پڑھی تھی۔ وہ ایکسپائر نہیں تھیں۔ مجھے ٹھیک سے یاد ہے۔“

”اب میں کیا کہوں۔“ یوسف کمزور آواز میں بولا۔ ”میں نے خود بھی ڈیٹ پڑھی ہے۔ بندے سے غلطی ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تم سے پڑھنے میں غلطی ہوئی ہو۔“
”اور تم سے نہیں ہو سکتی؟“ میں نے پوچھا۔

وہ خاموش رہا۔ تاریکی کی وجہ سے میں اس کے تاثرات نہیں دیکھ سکتا تھا لیکن مجھے یقین تھا کہ اس کے چہرے کا رنگ بدلا ہوا ہوگا۔ وہ سفید جھوٹ بول رہا تھا۔ میری بدقسمتی تھی کہ اس سفید جھوٹ کو موجودہ صورت حال بھی سہارا دے رہی تھی۔ وہاں چند گھنٹے پہلے، حویلی میں جو کچھ ہوا، وہ سراسر یوسف کے حق میں جاتا تھا۔ سردار اوتار نے اپنے درجنوں مہمانوں کے سامنے اپنا جرم میرے سر تھوپا تھا۔ کالی چپ کے نیچے سے نکلنے والے تقریباً چار کلو دھماکا

مجھے ایک گھنٹہ پہلے والا افسوس ناک تجربہ ابھی بھولا نہیں تھا۔ یوسف مجھے چھوڑ کر آنا فانا اوجھل ہوا تھا۔ اب وہ پھر کوئی ایسی حماقت کر سکتا تھا۔ میں یوسف اور ثروت کے پہلو میں چل رہا تھا مگر ہر وقت انہیں اپنی نظروں میں بھی رکھے ہوئے تھا۔ عجیب صورت حال تھی۔ ایک دو روز کے اندر ہی ہمارے تعلق میں کتنی دوری آگئی تھی۔ میں ثروت اور یوسف کے لیے لہو لہو ہو رہا تھا اور اب وہ مجھے ہی اپنا دشمن سمجھ رہے تھے۔

یوسف نے دھیمے لہجے میں کہا۔ ”کیا کوئی لیگل طریقہ نہیں ہو سکتا؟“
”کیا مطلب؟“ میں نے پوچھا۔

ثروت نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ ”کیا ہم کسی پولیس اسٹیشن تک نہیں پہنچ سکتے؟“
”پہنچ سکتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن پھر وہاں سے نکل نہیں سکتے۔ وہ لوگ سب سے پہلے ہم سے پاسپورٹ اور ویزا مانگیں گے۔ اس کے بعد ہم جاسوس یا دہشت گرد ٹھہریں گے اور ہم سے بے رحم قسم کی تفتیش کا آغاز ہو جائے گا۔ فی الحال تو کسی جگہ کسی کے پاس پناہ ڈھونڈنی پڑے گی، پیار محبت سے یا زبردستی..... چار پانچ دن بعد جب یہ سارا معاملہ ٹھنڈا پڑ جائے گا پھر ہی کسی طرف نکل سکیں گے۔“

”جگت سنگھ سے مدد نہیں لی جاسکتی؟“ ثروت نے پوچھا۔

”لی جاسکتی ہے پر ابھی نہیں۔ ابھی ہمارے ساتھ ساتھ وہ بھی مشکل میں پڑ سکتا ہے۔“
”فون کر کے دیکھ لیں۔“ ثروت منمنائی۔

”ابھی ٹرائی کی تھی۔ اس کا فون بند ہے۔ ویسے بھی کبھی سنگل آر ہے ہیں کبھی نہیں۔“
سردی محسوس ہو رہی تھی۔ میری ساری چوٹیں ٹھنڈی ہو کر زیادہ تکلیف دینے لگی تھیں۔ پیشانی کے عین اوپر سر سے بار بار خون رسنے لگا تھا جسے میں ایک رومال سے پونچھتا تھا۔ یہ ایسی جگہ تھی جہاں اپنی بھی نہیں باندھی جاسکتی تھی۔

یوسف نے مجھ سے نہیں پوچھا کہ مجھے سر کی یہ شدید چوٹ کیسے لگی ہے۔ ثروت نے بھی اس چوٹ کی کیفیت دریافت نہیں کی۔ یقیناً وہ دونوں اپنے طور پر خجالت بھی محسوس کر رہے تھے کہ انہوں نے حویلی میں ایک خطرناک چویشن میں مجھے تنہا چھوڑنے کی کوشش کی۔ خاص طور سے یوسف تو یقیناً جھل تھا اور اب اسے یہ بھی پتا تھا کہ میں دوبارہ اسے کوئی ایسی حرکت نہیں کرنے دوں گا۔

قریباً ڈیڑھ گھنٹے کے سفر میں ہم لوڈروالی جگہ سے چار پانچ کلو میٹر آگے نکل آئے۔ ثروت بڑی طرح تھک چکی تھی۔ آخر وہ ایک جگہ بے بس ہو کر بیٹھ گئی۔ ہم نے بھی بوجھ

خیز مواد کا تعلق میرے ساتھ بنا دیا گیا تھا۔

اچانک فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ وہی اجوستھ کے ساتھی والا رنگ برنگ فون تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ مجھے امید تھی کہ شاید دوسری طرف جگت سنگھ ہو لیکن ایک بھاری بھر کم آواز سنائی دی۔ ”ہیلو! میں انسپکٹر انوپ سنگھ بول رہا ہوں۔ تم جو کوئی بھی ہو خود کو پولیس کے حوالہ کر دو۔ تمہارے حق میں بہت اچھا ہوگا۔ ہم تمہیں پوری سکیورٹی دیں گے۔ جو کارروائی ہوگی، قانون کے عین مطابق ہوگی۔ میں تمہیں وچن دیتا ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”لیکن ہمیں کیسے پتا چلے کہ تم واقعی پولیس والے ہو اور اگر ہو بھی تو پولیس والوں کی بات پر اعتبار کرنا کافی مشکل کام ہوتا ہے۔“

دوسری طرف چند لمحے خاموشی رہی پھر آواز اُبھری۔ ”وشواس تو کرنا ہی پڑے گا۔ ہم سے زیادہ دور نہیں ہیں۔ تم نالے کا پل پار کر چکے ہو۔ نالے اور سوباروڈ کے درمیان تین چار مربع کلومیٹر کے علاقے میں موجود ہو۔ ہمیں زیادہ دوڑاؤ گے تو پھر ہم سے رعایت کی آشا بھی نہ رکھنا۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم سے پہلے کچھ اور لوگ تم تک پہنچ جائیں۔“

میں نے فون بند کر دیا۔ مجھے شک ہو رہا تھا کہ یہ پولیس والا نہیں ہے۔ یہ ان شکاریوں میں سے کوئی ہو سکتا تھا یا پھر ممکن تھا کہ سرداروں میں سے کچھ لوگ ان شکاریوں تک پہنچے ہو اور ان سے فون نمبر لے کر کال کر رہے ہوں۔

ہمارے چاروں طرف تاریکی اور سناٹا تھا۔ اس سناٹے میں خطرات کے مہیب سانسے رنگ رہے تھے۔ فون کرنے والے نے جو معلومات دی تھیں، وہ غلط نہیں تھیں۔ ہم نے تھوڑی دیر پہلے ایک برساتی نالے کا بوسیدہ پل پار کیا تھا۔

اپنی پیشانی کے اوپر سر میں سے بہنے والا خون بند کرنے کے لیے میں نے اس میٹر تھوڑی سی چٹنی مٹی بھر دی۔ اس کے سوا میں کر بھی کیا سکتا تھا۔ میں یوسف کو بتانا چاہتا تھا کہ اس کے ساتھ آج رات کیا ہونے جا رہا تھا۔ اسے کس طرح دھماکے کا شکار بنایا جانا تھا اور کس طرح سردار اوتار کے مفروضے پر بیٹے اشوکا سنگھ کی مشکلیں آسان ہونا تھیں لیکن میں یہ بھی جانتا تھا کہ وہ میری کسی بات پر اعتبار نہیں کرے گا اور شاید ثروت بھی نہ کرے۔ میں جو بھی کہوں گا، یہ دونوں اسے کسی سازش کے زمرے میں لائیں گے۔

ہمیں وہاں بیٹھے آدھ پون گھنٹہ گزر چکا تھا۔ ہم اُٹھنے کی تیاری ہی کر رہے تھے جب اچانک مجھے جھانڑیوں میں ایک چمک سی نظر آئی۔ اس کے بعد سرسراہٹ کی آواز سنائی دی جیسے کوئی جانور تیزی سے گزرا ہو۔ یوسف اور ثروت بھی چونک گئے۔ ثروت نے ڈری ہوئی

نظروں سے میری طرف دیکھا۔ میں نے رائفل کا سیفٹی کیچ ہٹایا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ کوئی جاندار ارد گرد موجود ہے۔ وہ کوئی جانور ہو سکتا تھا، کوئی جنگل واسی یا پھر ہمارا کوئی دشمن۔

دفعہ ایک برسٹ سے قرب و جوار لرز اُٹھے۔ یہ برسٹ غالباً ہوا میں چلایا گیا تھا۔ گھونسلوں میں دبکے ہوئے بہت سے پرندے پھڑ پھڑاتے ہوئے خوب پرواز ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی ایک نہایت کرخت آواز اُبھری۔ ”خبردار! اپنی جگہ سے ہلنا نہیں۔“

میں ایک لکھلے میں پہچان گیا۔ یہ وہی آواز تھی جو ایک گھنٹہ قبل موبائل فون پر سنائی دی تھی۔ یہ لوگ توقع سے زیادہ تیزی کے ساتھ ہم تک آن پہنچے تھے۔

”چلو نکلو۔“ میں نے ثروت اور یوسف سے کہا۔

وہ سامان اُٹھا کر جھانڑیوں کی طرف لپکے۔ میں انہیں ”کور“ دیتا ہوا اُلٹے پاؤں پیچھے ہٹ رہا تھا۔ ایک اور برسٹ چلا۔ میرے پاؤں کے ارد گرد بھر بھری مٹی کئی فٹ تک ہوا میں اُچھلی اور شاخیں ٹوٹنے کی آواز آئی۔ میں نے جوابی برسٹ چلایا۔ رات کا سناٹا تہلکہ خیز آوازوں سے گونج اُٹھا۔ کوئی چلایا اور زخمی ہو کر درختوں میں گرا۔ اگلے ڈیڑھ دو منٹ بڑے قیامت خیز تھے۔ میں، یوسف اور ثروت کے پیچھے تھا۔ انہیں کور دیتا ہوا کبھی اُلٹے اور کبھی سیدھے قدموں بھاگ رہا تھا اور ساتھ ساتھ چھوٹے برسٹ چلا رہا تھا۔ ہمارے ارد گرد انگارے سے بکھر رہے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ ایک اور شخص میری فائرنگ سے زخمی ہو کر گر گیا ہے۔ میگزین میں گولیاں کم تھیں۔ میں سنگل شاٹ چلانے لگا۔

ایک ایک مجھے لگا کہ فائرنگ ختم گئی ہے۔ دو افراد زخمی ہو گئے تھے، تیسرا شاید اسے سنبھالنے میں لگ گیا تھا۔ عین ممکن تھا کہ وہ تین ہی ہوں اور اگر زیادہ تھے تو پھر دونوں میں ہو سکتے تھے۔ کوئی دوسری ٹولی ہمارے آس پاس نہیں تھی۔ فائرنگ ختم گئی تو ہم زیادہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے۔ یوسف کی ٹانگ میں پرانے زخم کی وجہ سے ابھی تک ہلکی لنگڑاہٹ موجود تھی تاہم ثروت پاؤں کا موج سے پوری طرح اُبھر چکی تھی اور تیزی سے ہمارا ساتھ دے رہی تھی۔

قریباً ایک گھنٹہ مسلسل چلنے کے بعد ہمیں رکنے کے لیے ایک بڑی مناسب جگہ نظر آئی۔ غالباً تین چار ہفتے پہلے تیز آندھی کی وجہ سے یہاں دو تین درخت اوپر نیچے گرے تھے۔ ان تناور درختوں کے نیچے ایک خلا تھا۔ اس خلا کو اوپر سے زرد پتوں اور شاخوں نے پوری طرح ڈھانپ رکھا تھا۔ اس خلا میں گھس کر خود کو پوری طرح کیو فلاج کیا جاسکتا تھا۔ یوسف اور

وہ چونک کر میری طرف دیکھنے لگی۔ سمجھ گئی کہ میرا اشارہ کس طرف ہے۔ یوسف نے مجھ پر یہ بھونڈا الزام لگایا تھا کہ میں نے اسے زہریلی گولیاں دینے کی کوشش کی ہے۔

میں باہر بیٹھا رہا۔ ٹھنڈ میں دھیرے دھیرے اضافہ ہو رہا تھا۔ بھاگ دوڑ میں تو جسم گرم تھا، اب پھر چوٹیں تکلیف دینے لگیں۔ اندر سے کبھی کبھی باتوں کی مدھم آواز آتی تھی۔ جھنے ہوئے گوشت کی خوشبو سے اندازہ ہوا کہ اندر انہوں نے پرائیوٹ والا ٹفن کھولا ہے۔ کچھ دیر بعد خلا کے سرے پر ثروت کا ہیولا نظر آیا۔ وہ رومال پر رکھا ہوا پراٹھا میری طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔ ”آپ بھی کھالیں۔“

”نہیں..... بھوک نہیں۔“ میں نے بے دلی سے کہا۔

”تھوڑا سا لے لیں۔“

”نہیں۔“

وہ بوجھل انداز میں واپس چلی گئی۔

پتا نہیں کیوں میری آنکھوں کے گوشے بے ساختہ نم ہو رہے تھے۔ میں خود کو ایک دم بیگانہ محسوس کر رہا تھا بلکہ اس سے بھی بڑھ کر دشمن..... ایک ایسا دشمن جس کے ہاتھوں میں بھری ہوئی رائفل تھی۔ جیب میں پستول اور وہ کسی بھی وقت یوسف کے ساتھ کچھ بھی کر سکتا تھا۔ ان لمحوں میں، میں نے بڑے درد کے ساتھ سوچا، اگر اس قسم کے حالات پیدا ہوئے تھے تو پھر ثروت اتنی جلدی مجھے ملی ہی کیوں تھی؟ دل میں یہ آس تو رہتی کہ ابھی کسی موڑ پر اس نے پھر سے ملنا ہے، کوئی معجزہ ہونا ہے، کسی کرشمے نے جدائیوں کو ریزہ ریزہ کرنا ہے لیکن وہ مل گئی تھی اور پھر بچھڑ بھی رہی تھی۔ دوبارہ کبھی نہ ملنے کے لیے۔ سرداروں کی حویلی میں، میں نے ثروت کی آنکھوں میں جو غیریت دیکھی تھی، اس نے سینہ چھلنی کر ڈالا تھا۔ ایک ایسا زخم دیا تھا جس نے بہت دیر تک لہو بہانا تھا۔

ثروت! میں ایسا تو نہیں تھا۔ میں تو کبھی ایسا نہیں تھا، پھر تم نے کیوں سوچا اس طرح؟ ساری دنیا مجھے ملزم ٹھہرا دیتی لیکن تم تو ایسا نہ کرتیں۔ تم تو کہہ دیتیں کہ نہیں، یہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اس نے پیار کیا ہے، بڑے صبر سے جدائیوں کا زہر پیا ہے اور آئندہ بھی پیئے گا۔ یہ ان لوگوں میں سے ہے جو محبت کرتے ہیں اور محبت کے نام پر بڑی خاموشی سے ذبح ہو جاتے ہیں۔ اُف تک نہیں کرتے۔ آہ تک نہیں بھرتے۔ یہ میری زندگی کو لہو بہان کیسے کر سکتا ہے؟ یہ میرے شریک حیات کو مجھ سے کیسے چھین سکتا ہے؟ تم کو کہہ دینا تھا ایسے..... میں نے تصور میں اسے مخاطب کیا۔

ثروت تھک کر پُور ہو چکے تھے۔ ہم نے گھنے درختوں میں موجود اس قدرتی پناہ گاہ کو استعمال کرنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے بھی یہ جگہ قدرے بلاندی پر تھی۔ ہم ارد گرد نگاہ رکھ سکتے تھے۔ پہلے میں ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چل کر اندر داخل ہوا۔ ٹارچ کی مدد سے جگہ کا جائزہ لیا۔ یوں لگا جیسے میں انسانی کوشش سے بنائی گئی کسی جھوپڑی میں آ گیا ہوں۔ جگہ محفوظ تھی۔ یوسف اور ثروت بھی میرے ہی انداز میں اندر آ گئے۔ میں نے ٹارچ بجھا دی۔

ہم تینوں خاموش تھے۔ جیسے کہنے کے لیے کسی کے پاس کچھ بھی نہ ہو۔ چند گھنٹوں کے اندر جو کچھ بیٹا تھا، وہ کسی ایکشن مووی کی طرح ذہن کے پردے پر متحرک تھا۔ مجھے یقین تھا کہ ثروت اور یوسف کی کیفیت بھی مختلف نہیں ہوگی۔ حویلی میں نہال برادری کے افراد بیمار۔ باپو کی رضامندی سے اس کی پوتی کو کہیں لے گئے تھے۔ پتا نہیں کہ اب وہ کہاں اور کس حال میں تھی۔ یقیناً سردار اوتار سنگھ جلے پاؤں کی بلی بنا ہوا ہوگا۔ وہ اور اس کے ہرکارے پورے علاقے میں دندنارہے ہوں گے۔ یقینی بات تھی کہ وہ سرنوں کے ساتھ ساتھ ہمیں بھی تلاش کرنا چاہ رہے ہوں گے۔ خاص طور سے یوسف ان کے لیے بہت اہم تھا۔ وہ ان کے لیے منہ سے گر جانے والے نوالے کی طرح تھا اور یہ نوالہ یقیناً سونے کا تھا۔ یہ نوالہ حاصل کرنے کے لیے انہوں نے لازماً جاوا گروپ کو خطرہ رقم ادا کی ہوگی۔ آج رات وہ اسے چبا جانا چاہتے تھے مگر ان کے دانتوں کے نیچے آنے سے ذرا پہلے وہ گر گیا تھا۔

میں، ثروت اور یوسف کو اندر چھوڑ کر باہر نکل آیا۔ شکار کا سامان، جال اور کنڈیاں وغیرہ باہر پڑی تھیں۔ میں نے سب چیزیں ایک ایک کر کے اندر بھیج دیں اور خود درخت سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ رائفل میری گود میں تھی۔ اس کے ٹھنڈے بیرل میں سے ابھی تک بارود کی بو آرہی تھی۔ میں نے بیلٹ میں سے گولیاں نکال کر میگزین ایک بار پھر لوڈ کر لیا۔

اچانک میں نے دیکھا کہ قیے کے پرائیوٹ والا چھوٹا بیک باہر ہی پڑا رہ گیا ہے۔ میں نے وہ بیک اٹھایا اور ثروت سے کہا کہ وہ اندر رکھ لے۔

”کیا ہے اس میں؟“ ثروت نے پوچھا۔

”کھانے پینے کی چیزیں ہیں۔“

”لیکن اندر تو جگہ نہیں ہے۔ آپ باہر ہی رہنے دیں۔“

”نہیں..... ان کو اپنے پاس رکھو۔ زیادہ محفوظ رہیں گی۔“ میں نے زخمی لہجے میں

کہا۔

ہوا چل رہی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ تیز ہوتی گئی۔ پھر اس نے آندھی کی سی شکل اختیار کر لی مگر ایک دو دن پہلے بارش ہوئی تھی اس لیے اس آندھی میں گرد نہیں تھی۔ ہوا کی شدت دیکھ کر یوسف نے خلا میں سے سر باہر نکالا اور بولا۔ ”تابلش! اندرا جاؤ۔ ہم نے جگہ بنا لی ہے۔“

”نہیں..... میں ٹھیک ہوں۔ ویسے بھی میرا ہر ہنا ضروری ہے۔“ میں نے خشک لہجے میں کہا۔

اس نے دوبارہ کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن پھر میرے تاثرات دیکھ کر خاموش رہ گیا۔ یوں لگتا تھا کہ اس نے بھی بس حجت ہی پوری کرنے کی کوشش کی ہے ورنہ مجھے اندر بلانے کی اسے کچھ زیادہ چاہت نہیں تھی۔

ہوا سائیں سائیں کر رہی تھی۔ درختوں اور جھاڑیوں کے ہیو۔ دیوانہ وار جھوم رہے تھے۔ خشک پتے اڑتے ہوئے آتے اور میرے چہرے سے ٹکراتے۔ تیز ہوا کی کاٹ سے بچنے کے لیے میں تھوڑا سا ترچھا ہو کر بیٹھ گیا۔ اندر شاید یوسف اور ثروت تھک کر لیٹ گئے تھے۔ مجھے ان کی باتوں کی بھنبھناہٹ سنائی نہیں دے رہی تھی۔ میرے ذہن میں ایک بار پھر حویلی کے خونی ہنگامے کی فلم سی چلنے لگی۔ یکا یک میں چونک سا گیا۔ مجھے وہ منظر یاد آیا جب سرنوں چھوٹے کمرے میں چھپی ہوئی تھی اور اس کا دادا نہالوں کے ”پالے“ نامی شخص سے باتیں کر رہا تھا۔ اس گفتگو میں نکانہ صاحب کا نام بھی آیا تھا۔ مجھے ایک اور بات یاد آگئی۔ جب چند روز پہلے میں پاکستان میں تھا اور جو پورے قریب کریمانہ فروش لطیف کے گھر میں رہ رہا تھا تو لطیف نے مجھے چودھری انور گنجے کے بارے میں کچھ باتیں بتائی تھیں۔ ان باتوں میں اس نے کسی ایسی سکھ لڑکی کا ذکر بھی کیا تھا جس کا کسی پاکستانی سکھ سے رومانس چلا تھا اور وہ اس سے شادی کرنے کے لیے کسی طرح نکانہ صاحب پہنچ گئی تھی۔ مگر بعد میں اس لڑکی کو زبردستی پھر سے اس کے والدین کے پاس انڈیا بھیج دیا گیا تھا۔ اس لڑکی کو چودھری انور کے ذریعے ہی دوبارہ بارڈر پار کرایا گیا تھا۔ تو کہیں یہ سرنوں وہی لڑکی تو نہیں؟ میں سوچتا رہا اور حیران ہوتا رہا۔ ابھی میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا تھا لیکن اگر یہ واقعی وہی سلسلہ تھا تو پھر اس کو کوئی بڑا ڈرامائی انجام ہونے والا تھا۔ عین ممکن تھا کہ یہ سرنوں نامی لڑکی پھر سے نکانہ صاحب پہنچ جاتی۔

رات آخری پہر میں غنودگی محسوس کرنے لگا لیکن رائفل پھر بھی میری گود میں رہی۔ میری سماعت ارد گرد کی آوازوں اور آہٹوں پر لگی ہوئی تھی۔ احتیاطاً میں نے موبائل بھی آف

کروا رہا تھا۔



میں نیم غنودگی کی کیفیت میں درخت کے سہارے نیم دراز تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ دن چڑھ آیا ہے اور درختوں پر لاتعداد پرندے چھپا کر ایک نئی صبح کی آمد کا اعلان کر رہے ہیں۔ اچانک مجھے لگا کہ پستول میری پتلون کی جیب میں نہیں ہے۔ مجھے اس کا وزن اور چھین محسوس نہیں ہوئی۔ میرا ہاتھ بے ساختہ پتلون کی جیب پر آیا، جیب خالی تھی۔ پہلا خیال ذہن میں آیا کہ پستول جیب سے پھسل کر گھاس پر گر گیا ہے۔ میں تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔

”خبردار!“ ایک چنگھاڑتی ہوئی آواز میرے کانوں میں پڑی۔

میرے سامنے یوسف فاروقی کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر بیجانی کیفیت تھی۔ آنکھوں میں خوف آمیز طیش کے لشکارے تھے۔ اس نے پستول دونوں ہاتھوں میں بڑی مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ بیرل کا رخ میرے سر کی طرف تھا۔ وہ جنونی انداز میں دھاڑا۔ ”خبردار! میں گولی چلا دوں گا..... میں گولی چلا دوں گا۔“

وہ اتنے سخت تناؤ میں تھا کہ گھبرا کر بھی ٹریگر دبا سکتا تھا۔ میں اپنی جگہ ساکت بیٹھا رہ گیا۔ اس نے ٹانگ کی زوردار ٹھوک سے رائفل کو مجھ سے سات آٹھ فٹ دور کر دیا۔ پھر اسے ہاتھ سے اٹھا کر مزید کچھ پیچھے پھینک دیا۔ وہ ایک ساعت کے لیے بھی میرے چہرے سے نگاہیں نہیں ہٹا رہا تھا۔ اسے جیسے ڈرتا تھا کہ میں ہوا بن کر اڑ جاؤں گا۔ پستول دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس نے عین میرے سر کا نشانہ لیا اور چلا کر بولا۔ ”ثروت! بڑا بیک لے کر باہر آ جاؤ۔“

چند سیکنڈ بعد ثروت ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل چل کر خلا میں سے باہر نکل آئی۔ دن کی روشنی میں اس کے رنجیدہ چہرے پر کئی خراشیں اور نیل نظر آرہے تھے۔ نیل تو یقیناً کل رات کی اس کھینچا تانی کا نتیجہ تھے جو سرداروں کی حویلی میں اس سے ہوئی تھی۔ خراشیں رات کے وقت درختوں اور جھاڑیوں میں سے گزرتے وقت آئی تھیں۔ اس کا رنگ برف کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ وہ یوسف کے قریب کھڑی ہو گئی۔

میں نے کہا۔ ”یوسف! تم وہی بے وقوفی کر رہے ہو جو تم نے رات کو کی تھی۔ تم اکیلے یہاں سے نکل نہیں سکو گے۔“

وہ پھر چنگھاڑا۔ ”ہمیں تمہاری ضرورت نہیں..... نہیں ہے ہمیں تمہاری ضرورت..... تم ہمارا پیچھا چھوڑ دو۔ دفع ہو جاؤ۔“

”مجھے تمہارا پیچھا کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ ثروت کی مجبوری دیکھ کر میں اس کے ساتھ یہاں آیا ہوں اور حالات نے ثابت کیا ہے کہ مجھے آنا چاہیے تھا۔“

”بکواس بند کرو۔ تم ثروت کی مجبوری دیکھ کر نہیں، اپنی مجبوری سے یہاں آئے ہو۔ اور تمہاری مجبوری کیا ہے، یہ میں اچھی طرح جانتا ہوں اور شاید یہ بھی جانتی ہے۔ تم..... تم صرف ہماری زندگیوں میں زہر گھولنے کے لیے، ہمارے ساتھ چھپے ہوئے ہو۔ میں اتنا اندھا نہیں ہوں کہ دیکھ نہ سکوں، سمجھ نہ سکوں۔ ازبانی ہمدردی کا جو بھوت تمہارے سر پر چڑھا ہوا تھا، میں اسے بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔ تم نے نصرت کی بیماری کو سیڑھی بنایا ہوا تھا، ثروت تک پہنچنے کے لیے۔ تمہارے پیٹ میں رات دن نصرت کے علاج کا جو مروڑ اٹھ رہا تھا، اس کی وجہ مجھے بڑی اچھی طرح معلوم ہے۔ تیرے جیسے خسیس کتے کسی کو دمڑی نہ دیں پر تو اور تیرا وہ دوست نصرت کے لیے حاتم طائی کی قبر پر لائیں مار رہے تھے۔ میں سب جانتا ہوں۔ ایک نکلے کا روز گار نہیں ہے تمہارا۔ وہ اتنی بڑی بڑی رقیں کہاں سے آرہی تھیں؟ سب حرام کا مال تھا، کالے دھندوں کی کمائی تھی۔ بولو کمائی تھی یا نہیں؟“ اس نے جنونی انداز میں پستول کو میرے سر کے کچھ اور قریب کر دیا۔ یوں لگتا تھا کہ وہ کسی بھی وقت ٹریگر دبا دے گا۔

میں نے کہا۔ ”تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔ میں تم سے کوئی بحث کرنا نہیں چاہتا۔“

”کیوں بحث کرنا نہیں چاہتے؟“ وہ چلایا۔ ”رات کو تو تم پورے وکیل بنے ہوئے تھے۔ اپنی صفائی میں دلیلیں دے رہے تھے۔ بتا رہے تھے کہ وہ گولیاں زہریلی نہیں تھیں۔ اب بتاؤ وہ تھیں زہریلی یا نہیں؟ بتاؤ تم نے مجھے مارنے کی کوشش کی یا نہیں..... بتاؤ؟“

اس کا انداز ڈرانے والا تھا لیکن وہ مجھے ڈرا نہیں سکا۔ میں سکون سے بیٹھا رہا۔ ڈر صرف ایک بات کا ہی تھا کہ کہیں وہ خود ڈر کر گولی نہ چلا دے۔ میں نے کہا۔ ”یوسف! وہی باتیں ہیں، تم جھوٹ بول رہے ہو یا پھر تمہیں غلط فہمی ہوئی ہے۔“

اس نے پستول پر اپنی گرفت کچھ اور مضبوط کی اور بولا۔ ”اور یہ بھی غلط فہمی ہی ہے کہ کل رات تم نے مجھے راستے سے ہٹانے کی پلاننگ کی۔ جب ثروت نے تمہیں بتایا کہ کالی ٹویٹا گاڑی پر مجھے یہاں سے روانہ کیا جا رہا ہے تو تم نے اس گاڑی کو شکار بنا لیا۔ اس کے نیچے بارود لگانے کے لیے گھس گئے۔ وہ ریموٹ کنٹرول ڈیوائس تم نے لگائی یا نہیں؟“

”میں بارود لگانے کے لیے نہیں اتارنے کے لیے گھسا تھا۔ تمہاری جان بچانے کے

لیے اپنی جان خطرے میں ڈال رہا تھا۔ تمہیں معلوم نہیں کہ تمہارے ساتھ کیا ہونے والا تھا۔“

”مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ہمیں کچھ پتا نہیں۔ سارا پتا تو تمہیں ہی ہے۔ ہمیں تو بس غلط فہمیاں ہی ہو رہی ہیں۔ غلط فہمیوں کا ٹھیکا لیا ہوا ہے ہم نے۔ اور یہ ثروت تو ایسی بے وقوف جاہل ہے کہ اپنا اچھا برا سمجھ ہی نہیں سکتی۔ تم اس کے سہاگ کو بچانے کے لیے اس کا ساتھ دینا چاہتے تھے، اس کے ساتھ ہارون آباد جانے کے لیے اس کے پیچھے پیچھے پھر رہے تھے۔ پر یہ تمہیں بتائے بغیر بس اڈے چلی گئی۔ تم نے پھر بھی ہمت نہیں ہاری، اس کے پیچھے گئے۔ اس کے ساتھ ڈر ڈر کر ٹھوکریں کھائیں۔ ہوٹلوں کے کھانے زہر مار کیے، اپنی جان خطرے میں ڈالی، کس لیے؟ صرف اس لیے کہ اس کا سہاگ بچ جائے۔ تمہارے جیسے کزن تو سونے میں

تولنے کے قابل ہوتے ہیں۔ چچا اور ماموں زاد بہنوں کی شادیاں خاندان سے باہر بھی ہو جائیں تو وہ پُرانی باتیں بھولتے نہیں۔ ان کے لیے جان ہتھیلی پر لیے پھرتے ہیں۔ ہر جگہ ان کی زندگی کو گل و گلزار بنانے کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ بڑے اعلیٰ پائے کے خدائی خدمت گار ہوتے ہیں یہ کزن۔“

میں نے گمبھیر آواز میں کہا۔ ”یوسف! تمہارے اندر ایک شکی شوہر بول رہا ہے۔ اس کے سوا اور کچھ نہیں۔“

”شٹ اپ..... آئی سے شٹ اپ۔“ وہ دھاڑا۔ ”ایک لفظ اپنی گندی زبان سے نہ نکالنا اور نہ ہمارے پیچھے آنے کی کوشش کرنا۔ میں نے کبھی مکھی تک نہیں ماری لیکن..... لیکن میں قسم کھاتا ہوں کہ اگر تم نے ہمارا پیچھا نہ چھوڑا تو میں شوٹ کر دوں گا تمہیں۔ شوٹ کر دوں گا۔“

میں نے ثروت کی طرف دیکھا۔ سینے میں بھرتا ہوا ڈکھ کا دھواں کچھ اور گہرا ہو گیا۔ ثروت کی آنکھوں میں بھی مجھے اپنائیت کم اور خوف زیادہ نظر آیا۔ وہ واضح طور پر مجھ سے ڈری ہوئی لگتی تھی۔

یوسف اُلٹے قدموں پیچھے ہٹا۔ اس نے ٹرپل ٹوراٹفل اٹھا کر اپنے کندھے سے لٹکا لی۔ ایک بیک اپنے گلے میں جھلا لیا اور جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ اس کا روانی کے دوران میں اس نے ایک سیکنڈ کے لیے بھی اپنی نظریں مجھ پر سے نہیں ہٹائی تھیں۔ پستول اس کے دونوں ہاتھوں میں تھا۔ ہاتھوں میں لرزش تھی۔

”چلو ثروت۔“ اس نے کہا۔

ثروت نے ایک بار بے بسی سے میری طرف دیکھا اور پھر شوہر کی ہدایت پر عمل کیا۔

پہلے ہی پھر آن کیا تھا۔ میں نے اسکرین دیکھی اور دل دھڑک اٹھا۔ یہ جگت سنگھ کا نمبر تھا۔ رات کو جب میں اس سے رابطہ کی کوشش کر رہا تھا، ایک مس کال اس تک پہنچی تھی۔ اب جگت ”کال بیک“ کر رہا تھا۔

میں نے اپنی نگاہ یوسف پر رکھتے ہوئے کال ریسیو کی۔ جگت کی آواز آئی۔ ”ہیلو..... کون؟“

میں نے تصدیق کے لیے کہا۔ ”ہیلو! آپ کون ہیں؟“

”آپ کی مس کال آئی تھی۔“ جگت فوری طور پر میری آواز نہیں پہچانا۔

اب تصدیق ہو چکی تھی کہ یہ جگت ہی تھا۔ میں نے کہا۔ ”جگت! میں تابش بول رہا ہوں۔ بندہ خدا کہاں ہو تم؟ پچھلے دس بارہ گھنٹوں میں بہت کچھ ہو چکا ہے۔“

”یہاں بھی بڑی گڑبڑ ہوئی ہے بادشاہ زادے! دماغ کی بینڈج گئی ہے۔ تیرا اپنا موبائل فون کہاں ہے؟“

”وہ سرداروں کی حویلی میں رہ گیا ہے۔“

”کیا مطلب؟ تو خود نہیں ہے سرداروں کی حویلی میں؟“

”نہیں۔“

”یہ تو پھر بڑی چنگلی گل ہے۔ وہاں تو بڑی تباہی مچی ہے۔ چھ سات بندے مرے ہیں۔ چودہ پندرہ زخمی ہوئے ہیں۔ ابھی تک آگ لگی ہوئی ہے وہاں۔ پر تم اس ویلے کہاں ہو اور چھوٹی تو خیر خیریت سے ہے نا؟“

”ہاں..... خیریت سے ہے۔ ہم اس وقت مصیبت میں ہیں۔ سرداروں کے لوگ ہمیں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں۔ رات تو کسی نہ کسی طرح گزاری لی ہے ہم نے، پر دن نہیں گزرے گا۔ تم کسی طرح ہم تک پہنچو۔“

”لے بادشاہ زادے! ٹو نے کہا اور جن پہنچ گئے۔ ٹو ذرا اپنے آلے دوالے کے بارے میں بتا..... اور اگر کوئی نشانی بھی آس پاس ہے تو اس کے بارے میں بھی نوہ دے مجھ کو۔“

ہم ذرا بلندی پر تھے۔ میں نے ارد گرد دیکھا۔ دور کچھ فاصلے پر ایک بھٹا خشت کا کھنڈر سا نظر آیا۔ میں نے اس بارے میں جگت سنگھ کو بتایا۔ وہ بولا۔ ”میرے خیال میں یہ ایک نہیں دو بھٹے ہوں گے۔ ذرا غور سے دیکھ میرے شہزادے۔“ میں نے انکار میں جواب دیا تو وہ بولا۔ ”نہیں..... نہیں دو ہوں گے۔ ذرا آگے پیچھے ہو کے دیکھ۔“

یوسف نے ایک بار پھر تہرناک نظروں سے مجھے دیکھا اور اُلٹے قدموں پیچھے ہٹا۔ یہی وقت تھا جب اسے ٹھوکر لگی اور وہ لڑکھڑا کر پشت کے بل گرا۔ میرے لیے یہ مہلت بہت تھی۔ درمیانی فاصلہ دس پندرہ قدم سے زیادہ نہیں تھا۔ میں جھپٹا۔ اس نے لیٹے لیٹے گولی چلائی۔ دھماکے سے شعلہ نکلا۔ گولی میرے چہرے کو سینٹی میٹرز کے حساب سے چھوتی ہوئی گزر گئی۔ اس سے پہلے کہ وہ دوسرا فائر کر سکتا، میں اس کے اوپر تھا۔ میں نے سب سے پہلے، اس کے پستول ہی کو دبوچا۔ پورے زور سے اس کی کلائی مروڑ کر میں نے اس کے ہاتھ کو جھکا دیا۔ پستول پکے ہوئے پھل کی طرح اس کے ہاتھ کی شاخ سے جدا ہو گیا۔ میں نے چند زوردار گھونپے اس کے نہایت گورے چنے چہرے پر رسید کیے۔ اس کے ہونٹوں اور ناک سے خون بہہ نکلا۔ میں نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا اور پیٹ میں لات رسید کی۔ پھر چہرے پر گھٹنے کی بھرپور ضرب لگا کر دو۔ پھینک دیا۔ میرا دماغ انگارہ بنا ہوا تھا۔ میں نے مٹی میں لتھڑا ہوا پستول اٹھایا۔ رائفل ابھی تک یوسف کے کندھے سے جھول رہی تھی لیکن اسے استعمال کرنے کا اسے ہوش ہی نہیں تھا۔ جیسا کہ بعد میں پتا چلا، اسے اس کے سیفٹی کچ کا ہی پتا نہیں تھا۔ میں نے پستول اس کی گردن میں دھنسا دیا، وہ لمبی زرد گھاس پر چٹ پڑا تھا۔

”پلیز تابش!“ ثروت لپک کر آگے آگئی۔

میں نے دانت پیستے ہوئے کہا۔ ”کتے! اگر میں تیری جان ہی لینا چاہتا تو اب تک بہت سے موقع ملے تھے۔ میں..... اب بھی تجھے مار کر یہاں دفن کر سکتا ہوں۔ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی۔ بتا مار دوں؟ چلا دوں گولی؟“

وہ سکتہ زدہ پڑا تھا۔ اس کی ہلکی براؤن آنکھوں میں گہرے خوف کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ چہرہ خون سے لتھڑا چلا جا رہا تھا۔

ثروت تھر تھر کانپ رہی تھی اور بے بسی کی تصویر نظر آتی تھی۔ اس کی حالت دیکھ کر میں نے یوسف کی گردن پر سے پستول ہٹا لیا۔ اس کے کندھے سے رائفل بھی اُتاری اور دو تین قدم پیچھے ہٹ گیا۔ میں نے کہا۔ ”یوسف! ٹو بہت بڑا احسان فراموش ہے۔ اس کی سزا تجھے ضرور ملے گی۔ میں نہیں دوں گا تو کوئی اور دے گا..... اور یہ بھی یاد رکھ..... ٹو آج ثروت سے جو بھی کہہ لے لیکن سچ میں بڑی طاقت ہوتی ہے۔ یہ اپنے آپ کو ظاہر کر کے رہتا ہے۔ تیرا سچ بھی ضرور ظاہر ہوگا..... اور شاید وہی تیری سزا بھی ہوگی۔“

اچانک میری جیب میں پڑے ہوئے فون کی بیل ہونے لگی۔ یہ فون میں نے دو گھنٹے

میں نے تھوڑا سا دائیں بائیں ہو کر دیکھا۔ جگت سنگھ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ دوسرے بھٹے کا مینارہ پہلے بھٹے کی بالکل اوٹ میں ہو گیا تھا۔ یہ دونوں بھٹے نہ جانے کتنی مدتوں سے بند پڑے تھے۔ میں نے جگت کو بتایا کہ میں نے دوسرا بھٹا بھی دیکھ لیا ہے۔

وہ جوش سے بولا۔ ”میں سمجھ گیا۔ بالکل سمجھ گیا لیکن اب ایک کام کرنا ہے تم نے۔ جہاں پر ہو، وہاں سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہلنا نہیں سمجھنا ہر جگہ سرداروں کے بندے گھوم رہے ہیں۔ روک روک کر لوگوں کی تلاشیاں لے رہے ہیں اور ان کو بے عزت کر رہے ہیں۔ ہم بڑے طریقے سے پہنچیں گے یہاں۔ بس تمہیں تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا۔ اور ایک گل تو میں بھول ہی گیا۔ چھوٹی کا پتی ملا ہے یا نہیں؟“

”ہاں مل گیا ہے۔“ میں نے سپاٹ لہجے میں یوسف کو دیکھ کر کہا جو ابھی تک گھاس پر چپٹ پڑا تھا۔

”مبارک!..... بہت بہت ودھائیاں۔ واہگرو نے تم کو سہل کیا ہے۔ چھوٹی تو اب خوش ہے نا؟“

”ہاں..... ہاں خوش ہے..... بس اب تم آنے والی بات کرو۔“

”سمجھو کہ ہم چل پڑے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ گھنٹے میں پہنچ جائیں گے تم تک۔“



اگلا ڈیڑھ گھنٹہ بڑے اضطراب میں گزرا۔ یہاں بھی ایک گولی چل گئی تھی۔ ڈر تھا کہ اس گولی کی آواز جگت سنگھ سے پہلے ہی سرداروں کے ہر کاروں کو یہاں نہ پہنچا دے۔ میں نے یوسف اور ثروت کو دوبارہ درختوں کی قدرتی جھونپڑی میں بھیج دیا تھا اور خود باہر پہرہ دے رہا تھا۔ ثروت اندر یوسف کا خون آلود چہرہ دھلا رہی تھی۔ دراصل یوسف رات ہی سے کسی موقع کی تاک میں تھا۔ تھکن کے سبب جب مجھے کچھ دیر کے لیے نیند آئی تو شکاری اجو سنگھ والا پستول میری پیٹ کی جیب سے پھسل کر گھاس پر گر گیا۔ تب تک اُجالا ہو چکا تھا۔ پستول یوسف کو نظر آ گیا۔ یہ موقع اس کے لیے بڑا غنیمت تھا۔ اس نے قسمت آزمائی کا فیصلہ کیا۔

قریباً ڈیڑھ پونے دو گھنٹے بعد کچھ ایسے آثار نظر آئے جن سے اندازہ ہوا کہ جگت سنگھ ہمارے آس پاس پہنچ چکا ہے۔ درختوں میں کچھ لوگوں کے حرکت کرنے کے شواہد تھے۔ پھر جگت کی کال بھی آگئی۔ اس نے کہا کہ وہ پہنچ گئے ہیں۔ ہمیں ایک مختصر سا جلوس نظر آیا۔ دس پندرہ بندے تھے۔ دیکھنے میں یہ ارٹھی کا جلوس تھا۔ چار پائی پر کوئی فریبہ شخص بے سدھ لیٹا تھا۔ چھ سات افراد چار پائی کو کندھا دیتے ہوئے لا رہے تھے۔ ان میں چوڑا چکلا جگت سنگھ سب سے نمایاں نظر آیا۔ اس کا جھوٹا بھائی گویندر بھی اس مختصر جلوس میں شریک تھا۔

وہ لوگ سیدھے ہمارے پاس پہنچے اور ذرا دم لینے والے انداز میں چار پائی درختوں کے نیچے رکھ دی۔ ادھر ادھر دیکھ کر جگت سنگھ میرے پاس آیا۔ میرے چہرے کی چوٹوں کو دیکھ کر وہ حیران ہوا۔ ”اوئے! یہ کیا کیا ہے بادشاہ زادے! یار نیلی ہر چیز رل مل کر کھاتے ہیں، تم نے اکیلے اکیلے ہی مار کھالی اور وہ بھی پیٹ بھر کے۔“

”بس ہو گیا تھا کچھ ایسا..... اور یہ چار پائی پر کون ہے؟“

”ہے ایک مریض..... ڈاکٹروں نے لا جواب کر کے ہسپتال سے واپس بھیج دیا ہے،

یہ سامان وہ ہسپتال میں قیام کے دوران میں استعمال کرتے رہے تھے۔ دور دراز دیہات میں رہنے والے لوگ اسی طرح بمع فیملی ہسپتال میں داخل ہوتے ہیں۔ میرے اور یوسف کے کپڑے بہت خستہ حال تھے۔ میری شرٹ پر خون کے بڑے بڑے داغ بھی تھے۔ گوبندر سنگھ نے مریض کے لواحقین کو بتایا کہ کچھ بد معاشوں نے ہم دونوں کو مارا پیٹا ہے اور ہمارے حلیے خراب کیے ہیں۔ گوبندر کے کہنے پر ان لوگوں نے دو جوڑے ہمیں فراہم کر دیئے جو میں نے اور یوسف نے پہن لیے۔ یہ قریباً ہمارے ناپ ہی کے تھے۔ دراصل دھوتی کا تو کوئی ناپ ہی نہیں ہوتا، مگر تے ہمیں ٹھیک آئے۔ جگت نے ثروت کو ایک لمبی دیہاتی چادر فراہم کر دی جس نے اسے سر تاپا چھپا لیا۔

کچھ ہی دیر بعد ہم جگت اور گوبندر کے ہمراہ چار پائی کے پیچھے پیچھے روانہ ہو رہے تھے۔ جگت اور اس کے ساتھی باری باری چار پائی کو کندھا بھی دے رہے تھے۔ جگت نے کہا تھا کہ وہ گاؤں پہنچنے تک مجھ سے میری زرداد نہیں سنے گا مگر وہ صبر نہیں کر سکا۔ میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے دھیمی آواز میں بولا۔ ”یار! وہاں حویلی میں تو بڑا اکہرام مچا ہے۔ پتا چلا ہے کہ سردار اوتار سنگھ کی دھمی کا معاملہ تھا۔ وہ کسی پاکستانی منڈے سے پریم کرتی تھی۔ کوئی سکھ منڈا تھا۔ وہ ایک دفعہ بھاگ کر پاکستان بھی چلی گئی تھی۔ پر یہ لوگ اسے واپس لے آئے۔ اب زورازوری اس کا دیا ہ کر رہے تھے۔“

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میرا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا۔ یہ وہی نکانہ صاحب والا معاملہ تھا جس کا تھوڑا سا تذکرہ کرنا نہ فروش لطیف نے کیا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ہاں جگت! کچھ ایسا ہی معاملہ تھا۔ اب کیا حالات ہیں، کچھ پتا چلا ہے لڑکی کے بارے میں؟“

”بس یہی کہ نہال برادری کے لوگ اسے اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ اب وہ کچھ دن اسے کہیں چھپا کر رکھیں گے، پھر ہو سکتا ہے، کسی طرح پاکستان بھیج دیں یا وہ منڈا یہاں آ جائے اور لڑکی کے ساتھ پھیرے کر لے۔ وہ نہال برادری کا ہی منڈا ہے۔ نہالوں کے کچھ رشتے دار یہاں انڈیا میں ہیں، کچھ پاکستان میں۔“

”اور کیا پتا چلا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بس وہی خون خرابے کی باتیں ہی ہیں۔“ وہ دھیمی آواز میں بولا۔ ”اس لڑائی میں نبیوں کے تین اور سرداروں کے چار بندے مارے گئے ہیں۔ مرنے والوں میں لڑکی کا دادا بھی ہے۔ پتا نہیں کہ وہ کس کی گولی سے مرا ہے۔ حویلی کا بھی کافی نقصان ہوا ہے۔ کچے حصے

اس کو اس کے پنڈ پہنچانا ہے۔ پر ٹو بتا، چھوٹی اور اس کا پتی کہاں ہیں؟“

”اندر..... ان ٹہنیوں کے نیچے۔“ میں نے قدرتی جھونپڑی کی طرف اشارہ کیا۔

”اس کا پتی ٹھیک ٹھاکہ تو ہے نا؟ میرا مطلب ہے کوئی چوٹ شوٹ؟“

”نہیں..... کوئی ایسی خاص نہیں۔“

”پھر ٹو اتنا چپ چپ کیوں ہے؟ کوئی خوشی نہیں ہے تیرے چہرے پر؟“

”تیرا کیا خیال ہے؟ مجھے قہقہے لگانے چاہئیں..... یار! ہم جانی دشمنوں کے گھرے میں ہیں۔ کسی وقت کچھ بھی ہو سکتا ہے ہمارے ساتھ۔“

”اوہ..... اب کچھ نہیں ہو گا میرے جگر کے ٹوٹے۔ آپاں (ہم) آگے ہیں نا۔ سب سنبھال لیں گے۔“

”یہ چار پائی پر واقعی کوئی مریض ہے یا ڈرامہ کیا ہے؟“

جگت دھیمی آواز میں بولا۔ ”مریض بھی ہے اور ڈرامہ بھی۔ یہ بندہ واقعی کینسر کا مریض ہے۔ دلی کے ڈاکٹروں نے لاعلاج کر کے بھیج دیا ہے۔ یہ لوگ اسے واپس پنڈ لے جا رہے ہیں چار پائی پر ڈال کر۔ ترشولا سے تین چار میل آگے تک ٹریکسٹر ٹرائی پر آئے ہیں، اب پیدل جا رہے ہیں۔ ان میں سے ایک بندہ گوبندر کا واقف نکل آیا ہے۔ دراصل یہ اسی پنڈ کے ہیں جہاں گوبندر کا رشتہ ہونے والا ہے۔ ہم نے کہا کہ ہم بھی آپ لوگوں کے ساتھ چلتے ہیں۔ آپ لوگوں کی مدد بھی ہو جائے گی۔“

”اسلمہ وغیرہ کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔

جگت سنگھ نے اپنی ڈبی دار سوتی چاندری کی بکل ذرا سی کھولی۔ ”یہ دیکھ..... یہ ہے تیری لاڈلی ایل ایم جی۔ اس کی گولیاں وکھرے تھیلے میں ہیں فروٹ کے نیچے۔ دو اور رائفلیں بھی ہیں، وہ بھی اسی طرح بکلوں میں ہیں۔ دو تین پستول بھی ہیں یار لوگوں کے پاس۔ اس کے علاوہ آدھی درجن کالے انار ہیں۔“ وہ معنی خیز لہجے میں بولا۔

”کتنے لوگ ہوتے؟“ میں نے پوچھا۔

”ہم گوبندر سمیت کل نو بندے ہیں۔ اگر کہیں سرداروں سے ٹاکرا ہو گیا تو دیکھنا چھکے چھڑا دیں گے۔ پر یار! انھوں نے بتایا نہیں تیرے موبائل پر رات کو بول کون رہا تھا؟“

”وہ اوتار کا بیٹا ہری سنگھ تھا۔ اس وقت انہوں نے مجھے پکڑا ہوا تھا۔“

”لگتا ہے کہ لمبی اسٹوری ہے۔ چل پھر پنڈ پہنچ کر ہی سنیں گے۔“

مریض کے وارثوں کے پاس کھانے پکانے کے برتن، بستر اور کپڑے وغیرہ بھی تھے۔

مانی تو چونڈی وڈ کر چلا گیا۔“

جگت سنگھ نے تہقہہ لگایا۔ وہ ٹھنک کر بولی۔ ”آپ ہنس کر مال دیتے ہیں، اس کا حوصلہ بڑھتا جاتا ہے۔ شادی سے پہلے مجھ پر اتنا ظلم کرتا ہے، بعد میں کیا کرے گا۔ کچھلی بار ایویں میں نے کہہ دیا تم اتنے بڑے کھلاڑی ہو، مجھے بھی تھوڑی سی جوڈ و سکھا دو۔ چھت پر لے گیا اور ایسے شکنجہ لگایا مجھے کہ میرا سہا رکنے لگا۔ بے بے نے مشکل سے جان بچائی میری۔“ جگت ہنس ہنس کر سرخ ہو رہا تھا۔ وہ بولتی جا رہی تھی۔ بڑی شوخ تھی۔ میرے دل سے ہوک سی اٹھی۔ کوئی دن تھے کہ ثروت بھی ایسے ہی ہوا کرتی تھی۔

جگت نے بہت کہا کہ میں اپنے سر کی چوٹ کا کچھ کروں لیکن مجھے ان چوٹوں کی طرف سے غافل رہنا اچھا لگ رہا تھا۔ رات کا کھانا رجنی اور ثروت نے مل کر بنایا۔ تاہم کھانا سرد کرنے کے لیے رجنی ہی آئی۔ ثروت اپنا اور یوسف کا کھانا کمرے میں لے گئی تھی۔ رجنی میرے سامنے ماش کی دال اور دیسی گھی کا پراٹھا رکھتے ہوئے بولی۔ ”یہ خاص آپ کے لیے ہے ویرجی! ثروت دیدی کہہ رہی تھیں کہ آپ شوق سے کھاتے ہیں۔“

میں خاموش رہا۔ بھوک کا کہیں نام و نشان نہیں تھا۔ میں نے جگت سنگھ اور رجنی کا ساتھ دینے کے لیے بس ایک دو لقمے زہر مار کیے۔ رجنی ٹھنک کر بولی۔ ”آپ کھا کیوں نہیں رہے؟ ثروت دیدی کہہ رہی تھیں، آپ نے کل شام سے کچھ نہیں کھایا ہے۔“

”ابھی دل نہیں چاہ رہا۔ بھوک ہوئی تو خود کہہ دوں گا۔“

”کہیں آپ میں اور ثروت دیدی میں کوئی جھگڑا تو نہیں ہے؟ آپ ایک دو بے کی طرف دیکھ کر بات بھی نہیں کرتے۔“

جگت سنگھ نے ذرا گھور کر رجنی کو دیکھا تو وہ خاموش ہو گئی۔ اس کے مزید سوال جواب سے بچنے کے لیے میں اٹھ کر کمرے میں آ گیا۔

حسب عادت بستر کے بجائے ایک چٹائی پر لیٹ گیا۔ جسم پھوڑا بنا ہوا تھا۔ اسے نرم بستر اور دوا دار کی ضرورت تھی لیکن میں ایسی آسانسٹوں کو خیر باد کہہ چکا تھا۔ کچھ دیر بعد جگت سنگھ بھی میرے پاس چلا آیا۔ بے تکلفی سے بولا۔ ”بادشاہ زادے! کچھ اور نہیں تو یہ اپنے سر کے پھٹ پر ہی کوئی مرہم پٹی کروالو۔“

”نہیں..... خود ہی ٹھیک ہو جائے گا اور دیکھنا جلدی ٹھیک ہو گا۔“

”تم وکھری ٹائپ کے بندے ہو۔ لگتا ہے کہ کوئی جنگل واسی آبادی میں آکر رہنے لگا ہے۔ شاید تم جان بوجھ کر اپنے شریر کو تکلیف میں رکھتے ہو۔ شریر کو اور من کو بھی۔“

اکثر نام اسی طرح کے ہوتے ہیں۔ ہم جس گھر میں اترے، وہ جگت کے چھوٹے بھائی گو بندر کا ہونے والا سرال تھا۔ اس گھر میں گو بندر کی ہونے والی بیوی رجنی کو اور اس کی بیوی ماما کے سوا اور کوئی نہیں تھا۔ رجنی کو بی اے کی تیاری کر رہی تھی۔ گاؤں میں رہنے کے باوجود شہری رنگ ڈھنگ کی لڑکی تھی۔ والدہ کی نظر خاصی کمزور تھی اور وہ دن کے وقت بھی بمشکل دیکھ پاتی تھی۔ میں نے جگت سے مشورہ کر کے ثروت اور یوسف کو گھر کا اندرونی کمرادیا۔ آج سویرے والے واقعے کے بعد میں یوسف پر اعتبار کرنے کو ہرگز تیار نہیں تھا۔ میں نے جگت سے بھی کہہ دیا تھا کہ گھر میں یوسف کی نقل و حرکت پر نظر رکھنی ہے۔

جگت کے باقی ساتھی جو صورتوں سے ہی مار دھاڑ کرنے والے لوگ نظر آتے تھے، ایک پڑوسی گاؤں میں چلے گئے تھے۔ یہاں ہمارے علاوہ صرف گو بندر اور جگت ہی تھے۔ پھر گو بندر بھی چلا گیا۔ میں نے جگت سے پوچھا۔ ”وہ کہاں گیا ہے؟“

جگت دھسکی کے پوے میں سے گھونٹ بھر کر بولا۔ ”جو پور۔ کل سویرے تک آجائے گا۔“

”خیریت ہے؟“

”آہو یار! وہ آشنا کو لینے گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ہمیں آٹھ دس دن یہاں رہنا پڑے۔ گو بندر کی ہونے والی دوہنی تو امتحان کی تیاری کر رہی ہے۔ ہماری روٹی شوٹی کون پکائے گا؟“

پتا نہیں کہ گو بندر کو اس طرح کے موقع ویسے ہی مل جاتے تھے یا جگت جان بوجھ کر دے دیتا تھا۔ اب جگت یہاں تھا اور گو بندر آشنا کو لینے گیا ہوا تھا۔ رات کو ان دونوں نے اکیلے ہونا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے مواقع ان دونوں ”چور پریموں“ کے لیے بڑے قیمتی تھے۔

مجھے یہ ساری فیملی ہی کچھ کھلی ڈلی لگتی تھی۔ کہنے کو یہ لوگ دیہاتی تھے لیکن شہریوں سے زیادہ ایڈوانسڈ نظر آتے تھے۔ گاؤں میں اپنے تھاپنے والی لڑکیوں کے پاس بھی موبائل موجود تھے۔ میں نے اندازہ لگایا کہ سیل فون اور اس سے وابستہ قباحتوں کے حوالے سے انڈیا، پاکستان سے بھی آگے ہے۔ رجنی کو رقتا نہیں بھرتی ہوئی آئی اور اپنا گورا چٹا کندھا جگت سنگھ کے سامنے عریاں کرتے ہوئے بولی۔ ”دیکھو وڈے بھا..... آپ کے لاڈلے بھرانے کیا کیا ہے؟“

کندھے پر گہرائیل نظر آ رہا تھا۔ ”یہ کیا ہے رجو؟“ جگت نے پوچھا۔

یہ چونڈی کافی ہے آپ کے لاڈلے نے۔ مجھ سے کہتا تھا اوپر چھت پر آؤ۔ میں نہیں

”کیا مطلب؟“

اس نے دیوار سے ٹیک لگا کر دھسکی کا ایک آتشیں گھونٹ لیا اور بولا۔ ”بادشاہ زادے! تجھے بڑا پسند کرنے لگا ہوں میں۔ سمجھ لے تجھ سے کوئی عشق سا ہو گیا ہے۔ کسی بڑے کی طرح تیری عزت بھی کرتا ہوں۔ یار بلی کی طرح تجھ سے محبت بھی کرتا ہوں اور وڈے بھرا کی طرح تجھ پر لاڈ بھی آتا ہے۔ ایک گل کرنا چاہتا ہوں تجھ سے..... بُرا نہ ماننا۔“

میں نے بوجھل لہجے میں کہا۔ ”کہو۔“

”بادشاہ زادے! دنیا دیکھی ہے میں نے۔ جس دن میں نے تجھے اور چھوٹی کو دیکھا تھا، اسی دن سمجھ گیا تھا کہ تم پریمی ہو یا پھر کسی وقت پریمی رہے ہو۔ اب میں نے چھوٹی کے پتی کو بھی دیکھ لیا ہے اور اس سے باتیں شائیں بھی کر لی ہیں۔ اتنی جلدی کسی بندے کے بارے میں ٹھیک ٹھیک اندازہ تو نہیں لگایا جاسکتا پر میرا تجربہ کہتا ہے کہ یہ بندہ چنگی طبیعت کا نہیں ہے۔ میں نے جو پور میں بھی تجھے اس کے بارے میں بتایا تھا نا۔“

”کیا بتایا تھا؟“

”وہی اس کے لچھن، اس کا بڑی مہنگی طوائف کے ساتھ رات گزارنا اور پھر اس پر بالکل لاٹو ہو جانا۔ اسے منہ مانگی رقم پر اپنے حق میں بٹھانے کی گل کرنا اور یہ تو اس کا بس ایک ہی کارنامہ ہے نا۔ ہو سکتا ہے کہ اس نے کئی اور بھی گل کھلا رکھے ہوں.....“

”تم کہنا کیا چاہتے ہو جگت؟“

وہ کھوئے ہوئے انداز میں بولا۔ ”یارا! یہ چھوٹی بڑی معصوم ہے۔ بالکل کوتری کی طرح ہے۔ یہ ایسے جنگلی بلے کے ساتھ جیون کیسے گزارے گی؟ ابھی تو ان کے دیاہ کو بہت زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ کوئی بچہ وغیرہ بھی نہیں ہے ان کا۔ یہ اپنے اپنے رستے وکھرے کر سکتے ہیں۔“

”وہ عاقل بالغ ہے جگت! وہ اپنے فیصلے خود کر سکتی ہے۔“

”بادشاہ زادے! فیصلے تو وہ تب کرے گی نا جب اس کو کچھ پتا ہوگا۔ وہ تو انجان ہے۔ تمہیں پتا ہے اور تم کچھ بتاتے نہیں ہو۔ یہ تو کوئی گل نہیں یار! ایک جن پیارا اندھے کھوہ میں گرنے والا ہو، ہمیں پتا بھی ہو اور ہم اسے کچھ بتائیں نہ..... اسے روکنے کی کوشش نہ کریں۔“

میں نے کہا۔ ”یار! وہ اتنی انجان بھی نہیں ہے۔ کچھ نہ کچھ اندازہ ہے اسے۔ مجھے تو لگتا ہے کہ اسے سب کچھ پتا چل جائے تب بھی وہ شاید اپنی آنکھیں بند کر لے گی۔ وہ شوہر پرستی میں بہت آگے نکلی ہوئی ہے۔ اس کے خلاف سوچنے کو بھی گناہ سمجھتی ہے۔“

”لیکن میری بات کا بُرا نہ ماننا..... وہ تم سے پریم بھی کرتی ہے۔“

”یہ کیسے کہہ سکتے ہو تم؟“ میں نے روکھے لہجے میں کہا۔

”وقت نے ان دو آنکھوں کو بہت کچھ دکھایا ہے بادشاہ زادے! چہرے اور من کے کنکشن کی بڑی جانکاری ہے آپاں کو۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ اس کے مضبوط دانت تھوڑا اندر کی طرف مڑے ہوئے تھے جو اس کی سخت جانی اور جسمانی طاقت کے غماز تھے۔

”ہر بندے کے بارے میں ہر اندازہ درست ثابت نہیں ہوتا جگت سنگھ۔“

”پر کچھ کبھی بڑے ایسے ہوتے ہی یارا جو ہر جگہ، ہر ملک میں ایک ہی جیسے ہوتے ہیں۔“

”پتی جیتی اور..... وہ“ والا کبھی بڑا بھی ایسا ہی ہے۔ بڑی پرانی اشنوری ہے۔ میں نے ان دو چار دنوں میں بڑا کچھ دیکھ لیا ہے یارا! یہ یوسف ان شوہروں میں سے ہے جو خود تو اپنے آپ کو ہر کام کے لیے آزاد سمجھتے ہیں لیکن اپنی پتیوں کی ذرا ذرا سی بات پر رشک کرتے ہیں اور جب شک کرنے کا چنگا بھلا کارن بھی ہو تو یہ شک اگ کا بھانہ بننے لگتا ہے۔ اب تم خود ہی سوچو، تم نے لاہور سے انڈیا تک کا سفر ”چھوٹی“ کے ساتھ کیا ہے۔ کیا ہے یا نہیں؟ رات دن اس کے ساتھ رہے ہو۔ میرے گھر بھی اکٹھے ایک کمرے میں رہتے رہے ہو۔ یہ ساری باتیں چھوٹی نے اسے بتائی ہوئی ہیں۔ مجھے نہیں لگتا کہ وہ ان باتوں کے لیے اسے شاکرے گا۔ ان کا جیون اور بھی کٹھنائی میں پڑنے والا ہے۔“

میں نے موضوع بدلتے ہوئے کہا۔ ”جگت! مجھے تمہاری عقل سمجھ پر شک نہیں۔ پر میں نے تمہیں بتایا ہے نا کہ یہ اور طرح کا معاملہ ہے۔ تمہاری چھوٹی کے دماغ میں کچھ ایسے وہم بیٹھ گئے ہیں جن کو نکالنا کسی کے بس کا روگ نہیں۔ تم اس بارے میں سوچ کر خواخواہ اپنا دماغ پولامت کرو۔ تم اگر کر سکتے ہو تو کسی طرح میرے لیے ایک کام کر دو۔“

”میرے سوہنے! تو ترلا منت کرتا ہے تو میں زمین میں دھنس جاتا ہوں۔ تو ایسا مت کیا کر۔ بس آرڈر دیا کر مجھے۔ بتا کیا کرنا ہے؟“

”کسی طرح ہمیں پاکستان واپس بھیجنے کا وسیلہ کر دے۔ میں جانتا ہوں، بارڈر کے آر پار تیرے جاننے والے ہیں۔ بی ایس ایف والوں سے بھی تیرا لنک ہے۔ کچھ ایسا کر کہ ہم جس طرح آئے ہیں، اسی طرح واپس چلے جائیں۔“

وہ اُداس ہو گیا۔ ”تو تُو واپس چلا جائے گا؟“

”اوئے تُو بھیجے گا تو جاؤں گا نا۔“

”اب تُو نے آرڈر کر دیا ہے تو کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“

”لیکن جو کچھ کر نادل سے کرنا۔“ میں نے کہا۔

”اوائے ظالماں! دل سے ہی کروں گا۔ پر ابھی نہیں۔ ابھی چھ سات دن ہمیں بالکل چپ چاپ رہنا پڑے گا۔ باہر والا معاملہ کچھ ٹھنڈا ہو جائے تو پھر کچھ تھہرہلاتے ہیں۔“

”اچھا یار! کسی طرح پاکستان سے کوئی ٹیلی فون کا رابطہ نہیں ہو سکتا؟“

”ہو نہ کو کیا نہیں ہو سکتا۔ تھوڑا سا خرچے والا کام ہو گا لیکن کوئی گل نہیں۔ میں پتا کر لیتا ہوں۔“ جگت نے کہا۔

”ہاں..... میں نے تمہیں ایک اور کام کہا تھا جگت! راجا کا کچھ پتا چلایا نہیں؟“

”یار! ابھی تک کوئی ٹھوس بات تو معلوم نہیں ہوئی۔ یہ جانکاری ملی ہے کہ انور گنجے کی پہلی حویلی سے تین چار فرلانگ دور تم لوگوں کی جیپ بند ہو گئی تھی اور وہاں پر جھڑپ ہوئی تھی۔ وہاں دو بندے زیادہ پھسل ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک کی حالت خراب تھی۔ اسے شاید ہارون آباد بھیجا گیا تھا۔ اب یہ پتا نہیں کہ وہ تمہارا بندہ تھا یا چودھریوں کا..... اگر میں اب تک جو پور میں ہوتا تو کوئی کھوج کھرا لگا چکا ہوتا لیکن اب میں یہاں آ گیا ہوں۔“

میں نے جگت کو ٹیلی فون کا انتظام کرنے کو کہا تھا۔ مجھے بالکل اُمید نہیں تھی کہ وہ اتنی جلدی اس کا حل نکال لے گا۔ اگلے روز صبح دس بجے کے لگ بھگ وہ ایک موبائل سیٹ لے کر آ گیا۔ اس میں کافی بیلنس بھی موجود تھا۔ جگت نے بتایا کہ وہ میری خاطر سویرے چھ بجے کا یہاں سے نکلا ہوا ہے۔ ایک ساتھ والے گاؤں میں اس کا ایک شہری دوست رہتا ہے۔ یہ اسی کا موبائل ہے اور میں اس کے ذریعے پاکستان میں چھوٹی سی کال کر سکتا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”یہ کال کسی اور ملک کے رستے پاکستان جائے گی۔ لمبا چکر کاٹے گی اس لیے کافی“ پیٹرول“ خرچ ہوگا۔“

میں نے کہا۔ ”میں سمجھ گیا ہوں۔ تم بس پرار تھنا کرو کہ رابطہ ہو جائے۔ رابطہ ہو گیا تو وہ لوگ مجھے خود ہی کال کر لیں گے۔“

میں نے عمران کا نمبر ڈائل کیا۔ پہلی دو کوششیں ناکام ہوئیں۔ تیسری کوشش کا رزلٹ سائنس اور میکانولوجی کی ترقی کا منہ بولتا ثبوت تھا اور ایسے ثبوت اس اکیسویں صدی میں ہمیں اکثر ملتے ہی رہتے ہیں۔ مشرقی پنجاب کے اس دور دراز گاؤں کے اس تاریک کمرے میں سے میں نے جو کال کی، وہ نہ جانے کہاں کہاں سے ہوئی اور کن سرحدوں کا چکر کاٹتی پاکستان پہنچی اور اس نے کروڑوں لوگوں میں سے اس شخص کو ڈھونڈ لیا جس کی آواز میں سننا چاہتا تھا۔ پہلے عمران کے نمبر کی مخصوص بیل ہوئی۔ اڈی اڈی جانواں ہوا دے نال۔ پھر کال ریسو

ہوئی۔ شور سے نڈازہ ہو رہا تھا کہ وہ کسی گاڑی میں ہے اور کسی سڑک پر رواں ہے۔ وہ عمران کی زندگی بخش آواز تھی۔ ”ہیلو! کون؟“

”میں تابش! ول رہا ہوں۔“ میں نے ٹھہری ہوئی آواز میں کہا۔

وہ چلا یا۔ ”اوشاہین! ذرا میرے بازو پر چٹکی تو کاٹا۔ کہیں میں کوئی سنڈر سپنا تو نہیں دیکھ رہا۔“

اس کا مطلب تھا کہ وہ اور اس کی گرل فرینڈ شاہین کسی گاڑی میں سفر کر رہے ہیں۔ میں نے کہا۔ ”عمران! میں اس وقت تمہاری مزاحیہ باتوں کا مزہ بالکل نہیں لے سکتا۔ بہت سیریس حالات ہیں۔ میں یہاں انڈیا میں فرید کوٹ کے قریب لنگڑی پورہ نام کے گاؤں میں ہوں۔ میں تمہیں ایک نمبر دے رہا ہوں۔ اس نمبر پر مجھے فون کرو فوراً.....“

میں نے اسے نمبر لکھوایا اور فون بند کر دیا۔

اس تھوڑی سی گفتگو میں ہی بیلنس کے پرچے اُڑ گئے تھے۔ میں نے وہ موبائل فون آن کر لیا جو شکاری چھوڑ کر بھاگے تھے۔ اس کی سم ابھی تک بلاک نہیں ہوئی تھی۔ جعلی پولیس انسپکٹر کی کال کے علاوہ اس پر کوئی کال بھی نہیں آئی تھی۔ ابھی میں نے عمران کو اسی موبائل کا نمبر لکھوایا تھا۔

پانچ منٹ بعد ہی اس فون کی بیل ہونے لگی۔ میں نے اسکرین پر دیکھا اور دل میں خوشگوار دھڑکنیں جاگ گئیں۔ یہ عمران ہی تھا۔ وہ اپنے پوسٹ پیڈ نمبر سے کال کر رہا تھا۔ ”ہیلو تاب! کہاں ہو؟“ وہ بہت جذباتی لہجے میں بولا۔ ”تم نے تو جینا حرام کر دیا ہے۔ شیخ (جیلانی) اور اقبال دیوانوں کی طرح تمہیں ہارون آباد اور فقیر والی میں ڈھونڈتے پھر رہے ہیں اور تم خیر سے انڈیا میں بیٹھے ہو۔ ثروت اور راجا تو ٹھیک ٹھاک ہیں نا؟“

”ثروت تو ٹھیک ہی ہے لیکن راجا کے بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ وہاں پہلی حویلی سے نکلے ہوئے ٹھیک ٹھاک فائرنگ ہوئی تھی۔ راجا زخمی ہو گیا تھا۔“

”اس فائرنگ کا تو ہمیں بھی پتا چل چکا ہے۔ کرشمہ کپور کی موت کی اطلاع بھی ہے لیکن تمہیں تو بھاگ کر ہارون آباد یا لاہور کی طرف آنا چاہیے تھا، تم ہنومان کے دیس کیسے جا پہنچے؟“

”یہ لمبی کہانی ہے عمران۔ چودھری انور کے پالتو کتوں نے ہمارا پیچھا کیا تھا۔ ہم غلطی سے بارڈر کی طرف نکل گئے تھے۔ بارڈر کے پاس چودھری کے غنڈوں سے ہماری بڑی سخت جھڑپ بھی ہوئی۔ ان سے پیچھا چھڑا کر میں اور ثروت ایک جگہ چھپ گئے۔ صبح ہمیں پتا چلا

کہ ہم انڈیا میں ہیں۔ یہ طویل زوداد ہے یار! اس میں وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے بتاؤ تم کیا کر سکتے ہو؟“

”یار! بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ ایک جھولے سے دوسرے جھولے پر چھلانگ لگا سکتا ہوں اور اس دوران میں تین قلابازیاں بھی کھا سکتا ہوں۔ ریوالور کے چیمبر میں ایک یادو گولیاں رکھ کر اور چرخی گھما کر خود پر فائر بھی کر سکتا ہوں۔ اس جانبازی کے بڑے فائدے ہیں جگر! یہ شاہین اسی امید پر مجھ سے چٹری رہتی ہے کہ میں نے کون سا زیادہ جینا ہے۔ کسی نہ کسی دن تو چرخی غلط گھومے گی اور گولی چلے گی۔ جو نہی یہ بیوہ ہوگی، کروڑوں کی جائیداد اسے مل جائے گی اور ایک چلا چلا یا نیوز چینل بھی۔“

شاہین کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ عمران کے لئے رہی تھی۔ عمرانی چکا۔ ”سن لیا نا تم نے..... یہ ابھی سے نیوز چینل کی سینٹر انٹرنل پرسن لگنے لگی ہے۔ نئے رواج کے مطابق اینٹکر پرسن بننے کے لیے جو سب سے ضروری چیز ہے، وہ ہے لمبی سانس۔ دراصل ٹاک شوز میں اصل مقابلہ تو لمبی سانس کا ہی ہوتا ہے۔ مخالف فریق کو بولنے کا موقع تب ہی ملتا ہے جب آپ کی سانس ٹوٹتی ہے۔ جب آپ سانس ہی نہیں لیں گے تو وہ بولے گا کیسے؟ میں نے تو سنا ہے کہ اب لمبی سانس والے غوطہ خور بھی اینٹکر پرسن بن رہے ہیں اور ٹاک شوز میں مہمان آ رہے ہیں۔ ایک نجی ٹی وی کے شوز میں حصہ لینے والا ایک غوطہ خور مہمان اتنا مشہور ہوا ہے کہ لوگ اش اش کر رہے ہیں۔ وہ پروگرام شروع ہونے کے فوراً بعد بولنا شروع کرتا ہے اور چوتھے ”بریک“ سے پہلے سانس نہیں لیتا۔ اس کے بعد وہ اکثر بے ہوش ہو جاتا ہے اور باقی کا پروگرام اسے سنبھالنے میں گزر جاتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا..... اب تمہیں بھی بے ہوش ہونا ہے یا میری بات سنی ہے؟“

اس نے گہری سانس لی۔ ”واقعی جگر! چکر تو مجھے بھی آ گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم کیا کر سکتے ہو؟ ہمیں پاکستان واپس لانے کے لیے؟“

”یار! تم پاکستان واپس لانے کی بات کرتے ہو، تم حکم کرو تو انڈیا کو ہی پاکستان بنا دوں۔ لیکن پہلے مکمل معلومات تو دو کہ میرا یار کس حال میں ہے۔ کیا واقعی شیر لوہے کے جال میں ہے؟“

”لوہے کے نہیں، فولاد کے جال میں۔ بڑے سخت لوگوں سے پالا پڑا ہے۔ بڑی

زہریلی قسم کی سردار فیملی ہے اوپر سے جاو اگر روپ کا ڈر بھی ہے۔“

”یار! جاو کا نام لے کر تم نے میرا خون گرما دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ لکارا مار کر انڈیا

کی فلم انڈسٹری میں گھس جاؤں اور ایسا بھ بچن سمیت سارے ڈانوں کا صفایا کر دوں۔“
شاہین کی چلائی ہوئی آواز آئی۔ ”خبردار! امیت کا نام لیا تو، وہ میرے فیورٹ ہیں ویسے بھی وہ اصل نہیں فلمی ڈان تھے۔“

”گندم کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے راج کماری۔ اس سنگل پسلی، لمبے بانس کو کو نے کہا تھا کہ ڈان بنے۔ ڈان تو ہوتا ہے اپنے مصطفیٰ قریشی اور شفقت چیمہ جیسا یا پھر۔ تابش جیسا۔ شکل دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ قتل کیے ہیں اور عزتیں وغیرہ لوٹی ہوئی ہیں۔“
”کیا میں فون بند کر دوں؟“

دھمکی کا گر رہی۔ وہ پٹری پر آ گیا۔ میں نے اسے مختصر طور پر سارے واقعات سے آگیا اور دیگر حالات بتائے۔ یہ جان کر وہ حیران ہوا کہ یوسف بھی انڈیا پہنچ چکا ہے۔ وہ بولا۔ ”یار! کتنا اچھا ہوتا کہ تیرے اس رقیب روسیہ کو گمشدگی راس آ جاتی۔ کہیں ایسا گم ہوتا کہ تاریخ میں نام لکھوایا جاتا لیکن لگتا ہے کہ آج کل کے لونڈوں کو نام کمانے کا شوق ہی نہیں ویسے مجھے ابھی تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ ان حضرات کو انڈیا پہنچایا کیوں گیا ہے؟“
”اس کی شکل ایک ایسے بندے سے ملتی ہے جسے کئی علاقوں کی پولیس ڈھونڈ رہی ہے تفصیل تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“

میں عمران کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ ساتھ ساتھ خود بھی سوال کر رہا تھا۔ مجھے دوسری طرف کے حالات کا بھی علم ہو رہا تھا۔ عمران کی باتوں سے معلوم ہوا کہ مہناز ابھرتک لاپتا ہے۔ وہ آخری بار راولپنڈی میں دیکھی گئی تھی۔ کالے شیشوں والی ایک بہت مہنگی گاڑی میں جا رہی تھی۔ عمران کے چند ساتھی پنڈی پہنچ چکے تھے اور اس کی ٹوہ میں تھے دوسرے لفظوں میں اس کے گرد گھیرا تنگ کیا جا رہا تھا۔

میں نے عمران سے پوچھا۔ ”جلالی صاحب کا کیا حال ہے؟“

”جلالی صاحب کے بارے میں بُری خبر ہے یار! بڑے بڑے سینئر ڈاکٹر ایک دوسرے کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ ان کے سارے دعوے دھرے رہ گئے۔ جلالی صاحب زندہ بچ گئے ہیں۔“

”زندہ بچ گئے ہیں؟“

”ہاں یار! مجھے نہیں لگتا کہ اب امریکہ انہیں زندہ چھوڑے گا۔ ان کا کوئی تحقیقی ادارہ ضرور انہیں اٹھا کر لے جائے گا اور کھوج لگائے گا کہ حیات بعد الموت کے کتنے رُخ ہیں اور اس اڑیل بوڑھے نے عزرائیل کی آمد کے وقت اپنی جان کو اپنے جسد خاکی کے کس تہ خانے

کہ ہم انڈیا میں ہیں۔ یہ طویل رُوداد ہے یار! اس میں وقت ضائع نہ کرو۔ مجھے بتاؤ تم کیا کر سکتے ہو؟“

”یار! بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ ایک جھولے سے دوسرے جھولے پر چھلانگ لگا سکتا ہوں اور اس دوران میں تین قلابازیاں بھی کھا سکتا ہوں۔ ریوالور کے چیمبر میں ایک یادو گولیاں رکھ کر اور چرخی گھما کر خود پر فائر بھی کر سکتا ہوں۔ اس جانبازی کے بڑے فائدے ہیں جگر! یہ شاہین اسی امید پر مجھ سے چسپی رہتی ہے کہ میں نے کون سا زیادہ جینا ہے۔ کسی نہ کسی دن تو چرخی غلط گھومے گی اور گولی چلے گی۔ جوہی یہ بیوہ ہوگی، کروڑوں کی جائیداد اسے مل جائے گی اور ایک چلا چلا یا نیوز چینل بھی۔“

شاہین کے بولنے کی آواز آئی۔ وہ عمران کے لتے لے رہی تھی۔ عمرانی چکا۔ ”سن لیا نا تم نے..... یہ ابھی سے نیوز چینل کی سینئر اینکر پرسن لگنے لگی ہے۔ نئے رواج کے مطابق اینکر پرسن بننے کے لیے جو سب سے ضروری چیز ہے، وہ ہے لمبی سانس۔ دراصل ٹاک شوز میں اصل مقابلہ تو لمبی سانس کا ہی ہوتا ہے۔ مخالف فریق کو بولنے کا موقع تب ہی ملتا ہے جب آپ کی سانس ٹوٹتی ہے۔ جب آپ سانس ہی نہیں لیں گے تو وہ بولے گا کیسے؟ میں نے تو سنا ہے کہ اب لمبی سانس والے غوطہ خور بھی اینکر پرسن بن رہے ہیں اور ٹاک شوز میں مہمان آ رہے ہیں۔ ایک نچی ٹی وی کے شوز میں حصہ لینے والا ایک غوطہ خور مہمان اتنا مشہور ہوا ہے کہ لوگ اش اش کر رہے ہیں۔ وہ پروگرام شروع ہونے کے فوراً بعد بولنا شروع کرتا ہے اور چوتھے ”بریک“ سے پہلے سانس نہیں لیتا۔ اس کے بعد وہ اکثر بے ہوش ہو جاتا ہے اور باقی کا پروگرام اسے سنبھالنے میں گزر جاتا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”اچھا..... اب تمہیں بھی بے ہوش ہونا ہے یا میری بات سنی ہے؟“

اس نے گہری سانس لی۔ ”واقعی جگر! چکر تو مجھے بھی آ گیا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”تم کیا کر سکتے ہو؟ ہمیں پاکستان واپس لانے کے لیے؟“

”یار! تم پاکستان واپس لانے کی بات کرتے ہو، تم حکم کرو تو انڈیا کو ہی پاکستان بنا دوں۔ لیکن پہلے مکمل معلومات تو دو کہ میرا یار کس حال میں ہے۔ کیا واقعی شیر لوہے جکے جال میں ہے؟“

”لوہے کے نہیں، فولاد کے جال میں۔ بڑے سخت لوگوں سے پالا پڑا ہے۔ بڑی زہریلی قسم کی سردار فیملی ہے اوپر سے جاوا گروپ کا ڈر بھی ہے۔“

”یار! جاوا کا نام لے کر تم نے میرا خون گرم دیا ہے۔ جی چاہتا ہے کہ لکارا مار کر انڈیا

کی فلم انڈسٹری میں گھس جاؤں اور ایسا بھجکچن سمیت سارے ڈانوں کا صفایا کر دوں۔“

شاہین کی چلاتی ہوئی آواز آئی۔ ”خبردار! امیت کا نام لیا تو، وہ میرے فیورٹ ہیں۔ ویسے بھی وہ اصل نہیں فلمی ڈان تھے۔“

”گندم کے ساتھ گھن بھی پس جاتا ہے راج کماری۔ اس سنگل پبلی، لمبے ہانس کوکس نے کہا تھا کہ ڈان بنے۔ ڈان تو ہوتا ہے اپنے مصطفیٰ قریشی اور شفقت چیمہ جیسا یا پھر اپنے تابش جیسا۔ شکل دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ قتل کیے ہیں اور عزتیں وغیرہ لوٹی ہوئی ہیں۔“

”کیا میں فون بند کر دوں؟“

دھمکی کا رگر رہی۔ وہ پٹری پر آ گیا۔ میں نے اسے مختصر طور پر سارے واقعات سے آگاہ کیا اور دیگر حالات بتائے۔ یہ جان کر وہ حیران ہوا کہ یوسف بھی انڈیا پہنچ چکا ہے۔ وہ بولا۔ ”یار! کتنا اچھا ہوتا کہ تیرے اس رقیب رو سیاہ کو گمشدگی راس آ جاتی۔ کہیں ایسا گم ہوتا کہ تاریخ میں نام لکھوایا جاتا لیکن لگتا ہے کہ آج کل کے لوٹوں کو نام کمانے کا شوق ہی نہیں۔ ویسے مجھے ابھی تک یہ سمجھ نہیں آئی کہ ان حضرات کو انڈیا پہنچایا کیوں گیا ہے؟“

”اس کی شکل ایک ایسے بندے سے ملتی ہے جسے کئی علاقوں کی پولیس ڈھونڈ رہی ہے۔ تفصیل تمہیں بعد میں بتاؤں گا۔“

میں عمران کے سوالوں کے جواب دے رہا تھا۔ ساتھ ساتھ خود بھی سوال کر رہا تھا۔ مجھے دوسری طرف کے حالات کا بھی علم ہو رہا تھا۔ عمران کی باتوں سے معلوم ہوا کہ مہنازا ابھی تک لاپتا ہے۔ وہ آخری بار راولپنڈی میں دیکھی گئی تھی۔ کالے شیشوں والی ایک بہت مہنگی گاڑی میں جا رہی تھی۔ عمران کے چند ساتھی پنڈی پہنچ چکے تھے اور اس کی ٹوہ میں تھے۔ دوسرے لفظوں میں اس کے گرد گھیرا جگ کیا جا رہا تھا۔

میں نے عمران سے پوچھا۔ ”جلالی صاحب کا کیا حال ہے؟“

”جلالی صاحب کے بارے میں بُری خبر ہے یار! بڑے بڑے سینئر ڈاکٹر ایک دوسرے کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہے۔ ان کے سارے دعوے دھرے رہ گئے۔ جلالی صاحب زندہ بچ گئے ہیں۔“

”زندہ بچ گئے ہیں؟“

”ہاں یار! مجھے نہیں لگتا کہ اب امریکہ انہیں زندہ چھوڑے گا۔ ان کا کوئی تحقیقی ادارہ ضرور انہیں اٹھا کر لے جائے گا اور کھوج لگائے گا کہ حیات بعد الموت کے کتنے رُخ ہیں اور اس اڑیل بوڑھے نے عزرائیل کی آمد کے وقت اپنی جان کو اپنے جسد خاکی کے کس تہ خانے

میں چھپایا تھا۔ اُف یار! عجیب آزاد مرد ہے۔ اپنے پاؤں پر چل کر ہسپتال سے نکلا ہے اور اپنی آثارِ قدیمہ مرسڈیز میں بیٹھا ہے۔ آج کل باقاعدگی سے ورزش کر رہا ہے اور لاہور سے حکیمی کشتے وغیرہ منگوا رہا ہے۔ پرسوں پتا چلا ہے کہ جناب نے اپنی ساس کو، جو ان سے بارہ تیرہ سال چھوٹی ہے، لاہور سے شیخوپورہ بلایا ہے اور اس کو رام کرنے کی کوشش فرما رہے ہیں۔

”مہناز کے ساتھ جلالی کی شادی کی خبر تو ایک راز تھی؟“ میں نے پوچھا۔

”ابھی تک تو راز ہی ہے لیکن لگتا نہیں کہ زیادہ دیر رہے گی۔ بزرگوار جوان بیوی کی فرقت میں بہت پریشان ہیں۔ خفیہ طور پر ہر کارے دوڑا رکھے ہیں تاکہ محترمہ کا کھوج مل سکے۔ دراصل جب انہوں نے آرا کوئے ڈاکٹر مہناز کے سپرد کیا تو اس وقت انہیں یقین تھا کہ وہ بچ نہیں پائیں گے لہذا ڈاکٹر صاحبہ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ اس مورتی کے ساتھ کہاں غرقاب ہوں گی۔ اب پچھتا رہے ہیں۔ دن رات اس انتظار میں ہیں کہ کہیں سے مہناز کا فون آئے۔ بہانے بہانے سے اس کا ذکر کرتے ہیں اور ذکر سننا پسند کرتے ہیں۔“

”تمہارا کیا خیال ہے عمران! مہناز، جلالی صاحب کے ساتھ وفادار ہے؟“

”لگتا تو ایسے ہی ہے لیکن یارانِ عورتوں کا کچھ پتا نہیں ہوتا۔ اندر سے کچھ باہر سے کچھ بندے پجڑے کاموں پر چلے جاتے ہیں۔ یہ ٹی وی ڈرامے دیکھ دیکھ کر اتنی فحری ہو جاتی ہیں کہ مردوں کو گتگی کا ناچ نچا دیتی ہیں۔“

شاہین کے چلانے کی آواز آئی۔ ”تابش بھائی! ہم تو ڈرامے دیکھتے ہیں اور ان جیسے حضرات ڈرامے کرتے ہیں۔ پتا نہیں باہر کیا کیا گل کھلاتے ہیں۔ سچ کہتے ہیں صرف ایک عورت کو ہر وقت پتا ہوتا ہے کہ اس کامیاں کہاں ہے؟ اور وہ ہے بیوہ عورت۔“

”دیکھ لو تابی! مجھے شوہر بنانے سے پہلے ہی کیا کیا سوچ رہی ہے۔ بھی اگر بیوہ بننے کا اتنا ہی شوق ہے تو پہلے بیوی بننا پڑے گا۔“

”میں آپ جناب کی نہیں ایک جنرل بات کر رہی ہوں حضور۔“

”دیکھنا، یہ بھی ایک خاتون رائٹر کے لکھے ہوئے ڈرامے کا فقرہ ہے۔ اُف یہ ڈرامے تو گھس گئے ہیں ان خواتین کے اندر۔“

مجھے راجا کا خیال آیا۔ میں نے کہا۔ ”عمران! میں راجا کے لیے پریشان ہوں۔ اس کا کچھ پتا کرو۔“

وہ ذرا سنجیدہ ہو کر بولا۔ ”آج صبح اقبال سے فون پر میری بات ہوئی ہے۔ میں نے اس سے کہا ہے کہ باقی طرف سے دھیان ہٹا کر راجا کا کھوج لگاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ وہ زخمی

حالت میں چودھری انور کی حویلی میں ہی ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اسے ہارون آباد کے کسی پرائیویٹ ہسپتال میں بھیج دیا گیا ہو۔ سرکاری ہسپتالوں میں تو اقبال اور جیلانی اچھی طرح دیکھ چکے ہیں۔“

”بہر حال ان سے کہہ دو کہ ہاتھ پاؤں بچا کر کام کریں۔ چودھری انور خطرناک بندہ ہے اور اب تو اور بھی خطرناک ہو گیا ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”میرے ساتھ لڑائی میں اس کے کچھ بندے مرے ہیں۔ تفصیل تمہیں پھر بتاؤں گا۔“

”اوئے خوش کیا ہے جگر پارے! شیر کا بچہ لگا ہے۔ تم سامنے ہوتے تو تمہارا منہ چوم لیتا۔ افسوس تم دور ہو۔ ہاں تم چاہو تو چوم سکتے ہو۔“

”وہ کس طرح؟“

”یار! شاہین سے کہو کہ تمہاری طرف سے میرا منہ چوم لے۔ یہ سامنے ہی تو دھرا ہے۔ آٹھ دس انچ کے فاصلے پر۔“

شاہین نے غالباً اسے کوئی پرس وغیرہ مارا تھا۔ اس نے منہ سے اوٹی کی باریک آواز نکالی۔

میں نے کہا۔ ”کال بہت لمبی ہو رہی ہے۔ ہزاروں روپے بل آجائے گا تمہارا۔“

وہ چپکا۔ ”تو یہ شاہین کس لیے ہے یار! بڑی موقع شناس لڑکی ہے۔ آج کل مجھے زنگس اور ریما کے چنگل سے نکالنے کے لیے بڑی کوشش کر رہی ہے۔ مالی، جانی، جسمانی، ہر طرح کی قربانی دے رہی ہے۔“ اس نے ”جسمانی“ پر زور دیا۔

شاہین ایک بار پھر اس پر جھپٹ پڑی تھی۔ چند سیکنڈ تک کشتی کی سی آوازیں آتی رہیں۔ غالباً وہ دونوں گاڑی کے اندر تھے اور گاڑی کسی تنہا جگہ پر پارک تھی۔ چند سیکنڈ بعد موبائل فون شاہین کے ہاتھ میں چلا گیا۔ وہ ہانپی ہوئی آواز میں بولی۔ ”السلام علیکم تابش بھائی! آپ کیسے ہیں؟“

”میں بالکل ٹھیک ہوں شاہین! ثروت بھی خیریت سے ہے۔ تم فرح اور عاطف کی سناؤ اور بالوکا کیا حال ہے؟“

”وہ تینوں ڈیفنس والے گھر میں ہیں، بالکل خیریت سے ہیں۔ یوں تو ہم سب ہی آپ کے بغیر اُداس ہیں لیکن فرح بہت زیادہ محسوس کرتی ہے۔“

”ثروت کی چھوٹی بہن کا کیا حال ہے؟“

آگیا۔ یہ فون جگت والے نمبر پر آیا تھا۔ عمران کی آواز میں مجھے ہلکا بوجھل پن محسوس ہوا۔ ”ہیلو عمران! خیریت تو ہے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ بولا۔ ”ویسے تو خیریت ہے لیکن ایک خبر اچھی نہیں۔“

”کیا ہوا؟“ میں نے پوچھا۔

وہ گھبر آواز میں بولا۔ ”راجا ہمیں چھوڑ گیا تابش۔ وہ زخمی ہونے کے دو دن بعد ہارون آباد کے ہسپتال میں دم توڑ گیا ہے۔“

میں کتنی ہی دیر سناٹے میں رہا۔ عمران بھی خاموش تھا۔ میری آنکھوں میں راجا کے آخری مناظر گھوم گئے۔ ہم اچھے بھلے چودھریوں کے جنگل سے نکل آئے تھے۔ ہم نے ان کی گاڑی کا ٹائر ناکارہ کر دیا تھا۔ وہ ہمارے پیچھے نہیں آ سکتے تھے۔ لیکن راجا کا ایک معمولی لالچ اس کے لیے موت کا پیغام بن گیا۔ وہ زیور والا رومال اٹھانے کے لیے جیب سے اُترا اور اسے گولی لگ گئی۔ پتا نہیں کیوں اس وقت میرے دل نے گواہی دے دی تھی کہ اب ہم راجا کو پھر نہیں دیکھ سکیں گے۔

عمران کی آواز فون سیٹ پر ابھری۔ ”میری زندگی ہے پیارے۔ اگلے موڑ پر کیا ہے، پلکھ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا۔ دیکھو ہم جلالی کے بارے میں ناامید تھے لیکن وہ ہڈیوں کا ڈھانچا ہسپتال سے خود چل کر باہر آگیا اور چنگا بھلا راجا چلا گیا۔ اب وہ اپنی ساری خامیوں، خوبیوں سمیت قبر میں لیٹا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”عمران! وہ جیسا بھی تھا لیکن اس کی آخری رات مجھے نہیں بھولے گی۔ سچ پوچھو تو اس نے مجھے حیران کر دیا۔ اس رات اس نے بہت تفریح بھی کی۔ کئی خطرے بھی مول لیے اور پھر موت کا سامنا بھی کیا۔ اس کی باتوں سے میں سمجھ رہا تھا کہ وہ چودھریوں کے ساتھ مل گیا ہے۔ ہمارے ساتھ ساتھ تمہیں بھی پکڑوانے کا ارادہ رکھتا ہے لیکن عین موقع پر اس نے اصل روپ دکھایا۔ ہمیں وہاں سے نکال لایا۔ اس نے ایک پہرے دار کو پہلے سے باندھ رکھا تھا۔ رکھوالی والے خونخوار کتے بھی اسے دیکھ کر رام ہو گئے۔ اس نے زبردست پلاننگ کر رکھی تھی۔“

عمران بولا۔ ”بس ہماری اپنی پلاننگ ہوتی ہے اور قدرت کی اپنی۔ اسے دو گولیاں لگی تھیں۔ اس کے باوجود وہ شاید بچ جاتا مگر پہلے چودھریوں نے پھر پولیس نے اسے ہسپتال پہنچانے میں بہت دیر کی۔ قریب ایک گھنٹہ تو وہ موقع پر ہی تڑپتا رہا۔“

”پولیس کو کیا بتایا گیا؟“

”ہاں..... نصرت کی طبیعت چند دن خراب رہی ہے۔ ثروت کی طرف سے کوئی خیر خبر نہیں آرہی تھی نا۔ پرسوں عمران اس کی طرف گئے تھے۔ تسلی بخشی دے کر آئے ہیں۔ آپ ثروت سے بھی کہیں کہ ایک بار نصرت سے بات کر لے۔“

”اچھا..... میں کہوں گا۔“

”ثروت سے بات ہو سکتی ہے؟“ شاہین نے پوچھا۔

”نہیں شاہین! اس وقت تو مشکل ہے۔ کل کوشش کروں گا مگر تم نے اسے نصرت کی

طبیعت کے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔ وہ پہلے ہی بہت پریشان ہے۔“

”ایسی کوئی بات نہیں تابش بھائی! اب نصرت کافی بہتر ہے۔ ہمیں زیادہ پریشانی آپ لوگوں کی طرف سے ہے۔ آپ اپنا بہت خیال رکھیں۔ آپ کہاں پھنس گئے ہیں؟“

اسی دوران میں عمران نے پھر فون پکڑ لیا۔ میں نے عمران سے سنجیدہ ہونے کی پُر زور درخواست کی جسے اس نے قبول کیا۔ میں نے اسے جگت سنگھ والا فون نمبر بھی لکھوا دیا۔ عمران نے کہا کہ وہ مجھ سے مسلسل رابطے میں رہے گا اور کل تک اپنا لائحہ عمل بتائے گا۔ اس نے یہ بھی کہا کہ وہ کل تک مجھے راجا کے بارے میں بھی حتمی رپورٹ دے گا۔

دوپہر کے فوراً بعد گو بندر سنگھ پھر اپنی ”جعلی“ بھابھو آشا کو لے کر لنکڑی پورہ پہنچ گیا۔ آشا بھی میرے چہرے کی چوٹوں اور سوجن کو دیکھ کر پریشان ہوئی۔ اس نے آتے ساتھ ہی کچن سنبھال لیا اور کام کاج میں لگ گئی۔ گاہے بگاہے رجنی نے بھی اس کی مدد کی۔ ثروت یوسف فاروقی کے ساتھ کمرے میں تھی۔ جگت نے یوسف پر مسلسل نظر رکھی ہوئی تھی۔ رات کا کھانا پُر تکلف تھا۔ آشانے دیسی مرغی کا پلاؤ بنایا تھا۔ ساتھ میں تورمہ اور میٹھی سویاں تھیں۔ ان ہوم میڈ سویوں کو پوٹوں کی سویاں کہا جاتا ہے۔ کھانے کے بعد پھر وہی دودھ پتی تھی جو آشا خاص چاؤ سے بناتی تھی اور اس میں واقعی مٹھاس بھر دی جاتی تھی۔

جگت اور آشا کا دل رکھنے کے لیے میں نے چند لقمے لیے۔ آیا کو بھی اب پتا چل چکا تھا کہ ثروت کا پتی میں نہیں بلکہ یوسف ہے اور میں یوسف کی تلاش میں ثروت کی مدد کر رہا تھا۔ ثروت کے شوہر کے طور پر یوسف، آشا کو کچھ زیادہ پسند نہیں آیا تھا۔

کھانے کے دوران میں بھی گو بندر اور اس کی فیشن ایبل منگیت رجنی کے درمیان چھیڑ چھاڑ جاری رہی۔ رجنی نے بڑی بے ججابی سے ہر کسی کو اپنے دودھیا بازو پر ”جوڈی“ کا نیلا نشان دکھایا۔ اس الہڑک کی سرپا میں عجیب سی جنسی حرارت تھی۔

عمران نے کہا تھا کہ وہ کل فون کرے گا۔ تاہم اس کا فون رات دس بجے کے قریب ہی

اس کی شکل سردار اوتار کے بیٹے، بدنام قاتل اشوکا سنگھ سے ملتی ہے۔ اشوکا سنگھ واقعی کئی صوبوں کی پولیس کو مطلوب ہے۔ پانچ سال ہو گئے ہیں پھر بھی اس کی تلاش کا کام نہ کابھیں۔ اب سفر کے دوران میں اگر کہیں چیکنگ وغیرہ ہوئی اور یوسف پولیس کی نظر میں آیا تو عین ممکن ہے کہ اسے واقعی اشوکا سمجھ لیا جائے۔“

”ہاں..... تمہارا یہ پوائنٹ واقعی غور کرنے والا ہے۔“

”کسی طرح کوشش کرنی ہے کہ یوسف، پولیس یا کسی بھی قانون نافذ کرنے والی ایجنسی کی نظر میں نہ آئے۔ ورنہ وہ اشوکا کی جگہ نقصان اٹھا سکتا ہے۔“

عمران نے مجھے میرے مددگاروں شہباز احمد اور ڈاکٹر رتن کے بارے میں کچھ مزید معلومات دیں اور پھر سلسلہ منقطع کر دیا۔ اندازہ ہو رہا تھا کہ عمران کو ان دونوں افراد پر بھرپور اعتماد ہے۔

جگت کا چھوٹا بھائی گوبندر بے شک شراب سے پرہیز نہیں کرتا تھا اور عورتوں میں بھی دلچسپی رکھتا تھا، اس کے باوجود اس میں کھلاڑی والی عادتیں بھی تھیں۔ سگریٹ بالکل نہیں پیتا تھا، خوراک کا خیال رکھتا تھا اور ورزش بھی باقاعدگی سے کرتا تھا۔ وہاں جو پور گاؤں میں اس نے اپنا ”جم“ بنا رکھا تھا۔ اس جم میں میرا اور اس کا باقاعدہ مقابلہ ہوا تھا۔ اب وہ مجھے میرے اصلی نام تابش سے ہی بلاتا تھا۔ شام کو بولا۔ ”آؤ تابش بھاجی..... ذرا جاگنگ کر کے آئیں۔“

اس کی منگیتر رجنی فوراً بولی۔ ”یہ جس کو تھوڑی سی جاگنگ کہتا ہے، یہ دس کچے میل کی دوڑ ہوتی ہے۔ رستے میں کوئی سوہنی کڑی مل جائے تو اس کے چاروں طرف بھی چکر لگاتا ہے۔ اس طرح یہ دوڑ پندرہ سولہ میل کی ہو جاتی ہے۔“

گوبندر اس پر چھپتا تو وہ بھاگ گئی۔ وہ بولا۔ ”بھاجی! تسی آپ ہی سوچو، نیشنل کھیلوں میں حصہ لینا ہے میں نے..... کوئی چھوٹے مقابلے نہیں ہوتے دہلی میں..... بڑے بڑے سو مار پڑے ہیں۔ کچھ کروں گا تو لڑوں گا نا..... آجائیں آپ بھی۔ پانچ چھ کلومیٹر کی دوڑ میں آپ کا کیا بگڑنا ہے۔“

”نہیں گوبندر! اس وقت موڈ نہیں۔ سوری یار۔“

وہ خود ہی چلا گیا۔ لیکن اس کی واپسی دس پندرہ منٹ بعد ہی ہو گئی۔ میں اسے اتنی جلدی واپس دیکھ کر حیران ہوا۔ ”کیا ہوا گوبندر؟“ میں نے پوچھا۔

وہ میرے سوال کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بولا۔ ”تابش بھائی! کچھ پتا ہے آپ کو۔“

”وہی جو ایسے چودھری بتاتے ہیں۔ راجا پرڈا کے اور قتل کا الزام لگا ہے۔ گہنوں والے رومال اور کرشمہ کی موت کو ثبوت بنایا گیا ہے۔ تم دونوں بھی شریک ملزمان کے طور پر نامزد ہو لیکن اس کی فکر نہ کرو۔ میں نمٹ لوں گا اس نامزدگی سے..... لیکن یہ بتاؤ کہ کیا واقعی نیو عرف کرشمہ کو راجا نے مارا؟“

میں نے ذرا توقف سے کہا۔ ”شاید ایسا ہی ہے لیکن راجا کی نیت ایسی نہیں تھی۔ دراصل کرشمہ نے راجا کو تار لیا تھا۔ وہ شور مچانا چاہتی تھی۔ راجا نے اسے دبوچ لیا اور اس کا منہ بند کر دیا۔ وہ مزاحمت کرنی رہی اور اسی میں اس کا دم گھٹ گیا۔“

ہم نے چند منٹ تک راجا کے سوگوار موضوع پر بات کی پھر عمران نے گفتگو کا رخ بدلتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے تابش! مجھے پتا چلا ہے کہ وہ کمینہ جاوا بھی بھارتی پنجاب میں ہی ہے۔ اپنے بھائی کے دو قاتلوں کو سرعام گولیاں مارنے کے بعد اس نے ان کی لاشوں کو انبالہ کی سڑکوں پر گھسیٹا ہے۔ اب وہ ان کے بچے کچے ساتھیوں کو ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ مجھے پتا چلا ہے کہ جاوا اور ترشولا کے سردار اوتار سنگھ میں پرانی واقف کاری ہے۔ سردار اوتار تو اپنی بیٹی کو بازیاب کرانے کے لیے رات دن بھاگا پھر رہا ہے۔ تمہاری اور یوسف کی تلاش کے لیے اس نے جاوا سے رابطہ کیا ہے۔ میری بات سمجھ رہے ہوں تم؟ یہ بڑی خطرناک صورت حال بن سکتی ہے۔“

”ٹھیک ہے۔ میں احتیاط کرتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

”کوشش کرو کہ اس گاؤں میں بھی کسی کو تمہاری اور یوسف کی موجودگی کا پتا نہ چلے۔“

”نہیں..... ابھی تک تو ہم کسی کے سامنے نہیں آئے۔“

عمران نے ذرا توقف سے کہا۔ ”میں تمہاری واپسی کا انتظام کر رہا ہوں۔ اس کام میں تھوڑے دن تو لگیں گے لیکن کام پرفیکٹ ہو گا۔ پہلے مرحلے میں تمہیں حفاظت سے نئی دہلی یا میرٹھ پہنچایا جائے گا۔ وہاں نئی دہلی میں اپنے دو بچے جن موجود ہیں۔ ایک کا نام شہباز احمد ہے، دوسرا ڈاکٹر رتن سنگھ۔ یہ دونوں کل یا پرسوں ایک ایسولینس گاڑی پر تم تک پہنچیں گے۔ آنے سے کم از کم چھ گھنٹے پہلے تمہیں فون کریں گے۔ اس کے بعد تمہیں تیار رہنا ہے۔ جس دیہاتی حلیے میں تم لوگ ہو، یہی آگے بھی کام دے گا۔ ہاں سفر کے دوران میں تم نے ایک اور ضروری بات ذہن میں رکھنی ہے۔ یہ بات میں شہباز اور ڈاکٹر رتن کو بھی بتا دوں گا۔“

”کیا؟“

”یہ بات تم ثابت کر چکے ہو کہ یوسف کو صرف اس لیے پکڑا گیا اور انڈیا پہنچایا گیا کہ

ایک بڑا ہی خطرناک بندہ ہمارے آس پاس ہے۔“
”خطرناک بندہ؟“

”جاوا کا نام سنا ہوا ہے آپ نے؟“

میری ریزہ کی ہڈی میں سنسناءٹ دوڑ گئی۔ اپنے تاثرات چھپاتے ہوئے میں نے کہا۔ ”نہیں..... کون ہے یہ؟“

وہ میرے قریب بیٹھ گیا اور دھیمی آواز میں بولا۔ ”بہت وڈی بلا ہے بھابی! بمبئی کے پانچ چھ بڑے ڈانوں میں سے ایک ہے۔ مہاراشٹر اور مدھیا پردیش وغیرہ میں لوگ کانپتے ہیں اس کے نام سے۔ میں تو حیران ہوں کہ وہ یہاں ہے۔“
”تمہیں کیسے پتا ہے کہ وہ یہاں ہے؟“ میں نے عام لہجے میں پوچھا۔

”مجھے لگتا ہے کہ یہاں کے بچے بچے کو پتا ہے۔ بڑی دہشت پھیلی ہوئی ہے اس کی وجہ سے۔ ہم تو باہر نہیں نکلے، ہمیں جانکاری ہی نہیں۔ میں ابھی کھیتوں تک ہی پہنچا تھا کہ نمبردار صاحب مل گئے۔ کہنے لگے، اس ویلے پنڈ سے باہر نہ نکلو۔ حالات خراب ہیں۔ میں نے پوچھا کیا خراب ہیں، تو انہوں نے جاوا کا نام لیا۔ تو مجھے وشواس نہیں ہوا لیکن جب انہوں نے تفصیل بتائی تو وشواس کرنا پڑا۔ کہنے لگے کہ یہ بندہ اور اس کے ساتھی اپنی کوئی دشمنی چکانے کے لیے مہاراشٹر سے یہاں آئے ہوئے ہیں۔ بندے کا نام بعد میں پوچھتے ہیں، پہلے گولی مار دیتے ہیں۔ لوکل پولیس ان کے نام سے کانپتی ہے۔ ایم پی اے تک کو کھڑے کھڑے ننگا کر دیتے ہیں۔ کچھ دن پہلے انہوں نے دو بڑے ٹکڑے بندوں کی ہتھیا کی ہے اور لاشوں کو انبالہ کی گلیوں میں گھسیٹا ہے۔ ساتھ ساتھ کئی پردہ دار ناریوں کو بھی ننگے سر گشت کرایا ہے۔“

عمران کی اطلاع درست ثابت ہو رہی تھی۔ دہشت کا نشان جاوا اس علاقے میں موجود تھا اور اپنا آپ دکھا رہا تھا۔ لاہور میں ہمیں پتا چلا تھا کہ جاوا کے چھوٹے بھائی کو کسی کرخت سکھ پولیس آفیسر نے قتل کر دیا ہے۔ یہ سارا وہی شاخسانہ تھا۔

کچھ دیر بعد میں نے یوسف کو دیکھا۔ وہ مٹی کی بنی ہوئی سیڑھیاں چڑھ کر گھر کی چھت پر جا رہا تھا۔ دیہاتی لباس تہ بند قمیص میں ہونے کے باوجود وہ ”نیم شہری“ سا لگتا تھا۔ جگت سنگھ نے ہر وقت اس پر نگاہ رکھی ہوئی تھی۔ اس نے مجھے آنکھ سے اشارہ کیا کہ وہ اوپر جا رہا ہے۔ میں خود بھی چاہتا تھا کہ یوسف سے دو منٹ تنہائی میں بات کر سکوں۔ میں اوپر گیا تو وہ چارپائی پر بیٹھا سگریٹ پھونک رہا تھا۔ دیہات میں گھروں کی چھتیں ایک دوسرے سے ملی ہوتی ہیں۔ منڈیر بھی نہیں ہوتی۔ یہاں بھی دور تک نظر آ رہا تھا۔ گاؤں سے آگے کھیت اور

کھیتوں سے آگے درختوں اور جھاڑیوں کے سلسلے۔ مدھم چاندنی نشیب و فراز کو نمایاں کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ گھر کے سامنے ہی گلی میں کوئی نشی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا اور اپنی بھونڈی آواز میں ہیر کی مٹی پلید کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اسے میں نے کل بھی دیکھا تھا۔

میں یوسف کے قریب بیٹھ گیا۔ میں نے کہا۔ ”یوسف! میں کوئی لمبی چوڑی بات کرنا نہیں چاہتا۔ صرف اتنا جانتا چاہتا ہوں کہ میں تمہیں کسی طرح کا نقصان پہنچانے کے لیے نہیں، تمہاری مدد کرنے کے لیے یہاں آیا تھا۔ مجھے بہت افسوس ہے کہنا پڑ رہا ہے کہ تم نے دشمن کو دوست اور دوست کو دشمن سمجھا ہے۔ تمہارا کیا خیال ہے، سردار اوتار سنگھ نے صرف تمہیں مہمان بنانے کے لیے اور تمہاری خاطر مدارات کرنے کے لیے تمہیں دہلی میں رکھا ہوا تھا۔“

یوسف روکھے لہجے میں بولا۔ ”اوتار سنگھ کا کہنا ہے کہ یہ ایک گہرا چکر ہے.....“
”گہرا چکر ہے؟“

یوسف نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بھی کچھ نہ کچھ اندازہ ہو گیا ہوگا کہ یہ لوگ معروف لوگوں کے ہم شکل یا ان سے ملتے جلتے چہرے ڈھونڈتے ہیں۔ انہوں نے مجھے بھی اسی طرح ڈھونڈا۔ ان کا کہنا ہے کہ میری شکل انڈیا کے ایک مقبول سنگر سے بہت زیادہ ملتی ہے۔ وہ مجھے ایک بڑے ٹی وی چینل پر مستقل کام کرنے کی آفر کر رہے ہیں۔ جو معاوضہ وہ دے رہے ہیں، وہ بھی میری توقع سے بہت بڑھ کر ہے۔ دو دن پہلے چینل کے مینیجر ڈائریکٹر سے میری ملاقات بھی کرائی گئی ہے۔ ڈائریکٹر صاحب نے اس بات پر بہت معذرت بھی کی ہے کہ درمیان کے کچھ لوگوں نے مجھے یہاں تک لانے میں زبردستی کا رویہ اپنایا بلکہ ایسا تاثر ملا کہ مجھے اغوا کیا گیا ہے۔ سردار اوتار بھی اس پر بہت شرمندہ تھا۔ اب یہ لوگ مجھے باعزت طریقے سے واپس پاکستان روانہ کر رہے تھے۔“

میں نے سر پکڑ لیا۔ ”یہی تو تمہاری غلط فہمی ہے یوسف! تم سمجھ نہیں رہے ہو۔ یہ سراسر بکواس اور جھوٹ ہے۔ تمہاری شکل کسی انڈین گلوکار سے نہیں ملتی۔ تمہاری شکل اس خبیث اوتار سنگھ کے مفرد بیٹے اشوکا سے ملتی ہے۔ اس بیٹے کو انڈیا میں کئی برسوں سے ایجنسیاں ڈھونڈتی پھرتی ہیں۔ اس کا نام ”ای سی ایل“ میں ہے۔ اس نے ایک دو دفعہ ملک سے فرار ہونے کی کوشش بھی کی مگر ناکام رہا۔ یہ لوگ تمہیں مار کر اشوکا کا پیچھا قانون سے چھڑانا چاہتے ہیں۔ انہوں نے پوری پلاننگ کی ہوئی تھی۔ تمہیں پولیس ناکوں کے درمیان سے گزارا جانا تھا

اور جب پولیس تمہیں پہچان لیتی تو تمہاری گاڑی کو ریموٹ کنٹرول بم سے اڑا دیا جاتا تھا۔ تاثر یہی ملتا کہ شاید اشوکا نے گرفتاری سے بچنے کے لیے خود کے پرچے اڑا لیے ہیں۔ اگر تم ایک بار اشوکا سنگھ کی تصویر دیکھ لو تو ساری بات تمہاری سمجھ میں آ جائے۔“

میں نے اس سازش کا سارا تانا بانا یوسف کے گوش گزار کیا۔ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میری کچھ باتیں اس کے دل کو لگ رہی ہیں۔ وہ یہ بھی جانتا تھا کہ کل رات میں نے اسے اور ثروت کو بچانے کے لیے کس طرح اندھا دھند فائرنگ کا سامنا کیا۔ وہ سب کچھ جان رہا تھا، اس کے باوجود اس کے چہرے کی تختی اور کدورت کم نہیں ہو رہی تھی۔

آخر اس نے چارپائی پر پہلو بدلا اور مجھے گہری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولا۔
”تابش! میں ایک بات کہوں، بُرا نہ ماننا۔“

”جو کہنا چاہتے ہو، کھلے دل سے کہو۔“ میں نے جواب دیا۔

”تابش! مجھے اندازہ ہے کہ تم دل کے بُرے نہیں ہو۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ کل رات تم نے ہمارا دفاع کیا اور سارا پریشراپنے اوپر لیا۔ میں اپنی غلطی بھی تسلیم کرتا ہوں کہ میں نے تم پر گولی چلائی۔ اس کے علاوہ اس میں بھی شک نہیں کہ تم نے مجھے ڈھونڈنے میں ثروت کا ساتھ دیا ہے لیکن..... لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں اپنا دل تمہاری طرف سے صاف نہیں پاتا۔ شاید..... اگر تم..... میری جگہ ہوتے تو تمہارا رویہ بھی یہی ہوتا۔ بات کڑی ہے پر حقیقت ہے تابش۔ میرے اور تمہارے درمیان رقابت کا رشتہ بنا ہے اور یہ بڑا ظالم رشتہ ہوتا ہے۔ معاف کرنا، تم مجھے سونے کا بن کر بھی دکھا دو گے تو میرا دل تمہیں قبول نہیں کرے گا۔“

میں نے کہا۔ ”یوسف! تم ہر چیز پر رقابت کو حاوی کیوں کر رہے ہو؟ ہم انسان بھی تو ہیں اور مشکل حالات میں ہیں۔ اگر تم ماضی کو بنیاد بنا کر میری شکل دیکھنا نہیں چاہتے تو میں واقعی تم دونوں کو کبھی شکل نہیں دکھاؤں گا لیکن..... کم از کم موجودہ حالات کی مجبوری تو سمجھو۔ ہمیں مل جل کر اس گھیرے کو توڑنا ہے۔ جگت جیسے لوگ ہماری بے لوث مدد کر رہے ہیں۔ وہ کیا اثر لیں گے جب ہمیں آپس میں ہی لڑنا جھگڑنا دیکھیں گے؟“

”تو میں اب کیا کہہ رہا ہوں تم سے؟ جو غلطی پرسوں مجھ سے ہوئی ہے اس کے لیے تم سے معافی مانگ لیتا ہوں۔ میں نے تم پر گولی چلائی، مجھے ایسا ہرگز نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ وہ روکھے لہجے میں بولا۔

”بات معافی کی نہیں یوسف! کل مجھ سے بھی زیادتی ہوئی جس کا مجھے افسوس ہے۔ اس وقت ہمیں مل بیٹھ کر سوچنا ہوگا۔ سچتی دکھائی ہوگی۔ دل سے کدورت کو ختم کرنا ہوگا۔“

وہ بولا۔ ”تابش! میں صاف گو بندہ ہوں۔ میں وہی بات دہراؤں گا۔ یہ بہت کڑی حقیقت ہے۔ ہمارے درمیان کدورت وغیرہ کا نہیں، رقابت کا رشتہ ہے اور یہ بہت تلخ رشتہ ہوتا ہے۔ اپنے دل پر میرا بس نہیں..... میں تمہیں دیکھتا ہوں تو.....“ وہ کہتے کہتے خاموش ہو گیا۔

میں نے کہا۔ ”رُک کیوں گئے؟ تم سے کہا ہے نا، جو کہنا ہے کہہ ڈالو۔“ وہ سگریٹ کے چند گہرے کش لے کر بولا۔ ”تم نے ثروت کے ساتھ سفر کیا ہے نا۔ دن رات اس کے ساتھ رہے ہو۔ تم ایک کمرے میں سوتے رہے ہو۔ جگت سنگھ کے گھر میں بھی خود کو میاں بیوی بتاتے رہے ہو۔ میں تمہیں دیکھتا ہوں تو میری آنکھوں میں وہ سارے نقشے پھر نے لگتے ہیں۔ تم نے کیا باتیں کی ہوں گی؟ کس طرح سوئے ہو گے؟ کس طرح جاگے ہو گے..... کس طرح ہنسے بولے ہو گے؟ مم..... میرا دماغ پھٹنے لگتا ہے۔ میں تمہیں سچ بتاتا ہوں تابش! تم جتنی بار میرے سامنے آؤ گے، یہی ہوگا۔ وہ میری بیوی ہے، اگر میری جگہ تم ہوتے تو تمہارے ساتھ بھی یہی ہوتا..... یہی ہوتا۔“

وہ تیزی سے اٹھا اور سیڑھیاں اتر کر نیچے چلا گیا۔ اس نے آج وہی بات کہی تھی جس کا اندیشہ جگت سنگھ نے ظاہر کیا تھا۔ میں اپنی جگہ بیٹھا سوچتا رہا۔ شاید ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ ہم مرد کبھی کبھی بڑے اندرون بین ہو جاتے ہیں۔ بس اپنی ذات کے حوالے سے سوچتے ہیں۔ یوسف بھی تو اپنی جرمن محبوبہ کو ثروت کی رقیب بنا کر گھر میں لایا تھا۔ تب اس نے رقابت کی نئی اور شدید کڑواہٹ کے بارے میں کچھ نہیں سوچا تھا۔ اب بھی وہ ایک خوبصورت لڑکی کو Keep رکھنے کا پروگرام بنا رہا تھا۔ اب بھی اسے ثروت کے حوالے سے کوئی فکر نہیں تھی۔

چند سال پہلے میرے سینے میں جدائی کے جو زخم لگے تھے، ان میں سے پھر خون رسنے لگا۔ میرے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ میں اس پہلی جدائی کو ہی آخری اور حتمی جدائی سمجھوں۔ جلد از جلد ثروت اور یوسف سے دور ہو جاؤں۔ یہاں میرے لیے تو ہین محبت اور ذلت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ عمران نے کہا تھا کہ جلد ہی اس کے پیچھے ہوئے مددگار ہم تک پہنچ جائیں گے اور چند روز کے اندر ہمیں یہاں سے نکال لیں گے۔ میرا دل چاہا کہ یہ چند روز بس جلدی سے ختم ہو جائیں۔ میں ثروت کی طرف سے سرخرو ہو کر اسے الوداع کہہ دوں۔ میں اٹھ کر مٹی کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا تو اچانک چونک گیا۔ کچھ فاصلے پر کھیتوں میں تین چار گاڑیوں کی روشنیاں نظر آئیں جو تیزی سے اُچھلتی کودتی گاؤں کی طرف آرہی تھیں۔ گاؤں کے نمبردار کے پاس تو گاڑی نہیں تھی۔ یہ کون لوگ تھے؟

بولنے کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔

دو حملہ آور جو اپنے طور اطوار سے ماہر نشانہ باز لگتے تھے، ہمیں گن پوائنٹ پر رکھتے ہوئے آہستہ آہستہ پیچھے ہٹے اور کمرے سے باہر نکل گئے۔ کمرے کا موٹا چوبی دروازہ باہر سے بند کر دیا گیا۔ یہ بڑی تشویشناک صورت حال تھی۔ ہم بڑی طرح گھر گئے تھے۔ کم و بیش دو درجن افراد یہاں موجود تھے۔ میں نے کمرے کی سلاخ دار کھڑکی میں سے دیکھا۔ دو رائفلیں اس جانب سے بھی ہمیں نشانے پر لیے ہوئے تھیں۔

وہ لوگ آشا کو کور کوبالوں سے پکڑ کر گھسیٹتے ہوئے ساتھ والے برآمدہ نما کمرے میں لے آئے۔ وہ ممبئی اسٹائل کی اردو بول رہے تھے۔ ان میں سے بیشتر کے رنگ سانولے تھے۔ میرے دل نے گواہی دی کہ یہ جاوا گروپ کے لوگ ہیں۔ گوبندر کا زرد رنگ بھی یہی گواہی دے رہا تھا۔ دو افراد نے آشا کو دونوں طرف سے دبوچ رکھا تھا اور اسے بار بار دھمکا کر خاموش کر رہے تھے۔ ان کی باتوں سے یہ پتا چلا کہ وہ ثروت کو نہیں پکڑ سکے۔ کم از کم وہ ابھی تو ان کے ہاتھ نہیں آئی تھی۔ بدترین صورت حال میں یہ ایک چھوٹی سی مثبت بات تھی۔ کیا وہ گاؤں والوں کی مدد حاصل کر سکے گی؟ کیا لوگ ہماری مدد کو آئیں گے؟ کیا پولیس متحرک ہو سکے گی؟ ایسے کئی سوالات تھے۔

میں، گوبندر اور یوسف جس کمرے میں تھے اس میں بند دروازے کے علاوہ فقط ایک کھڑکی تھی۔ اس میں لوہے کی موٹی سلاخیں لگی تھیں۔ کوشش کر کے بند دروازے کو شاید توڑا جا سکتا لیکن باہر پھر مسلح افراد موجود تھے۔ مزاحمت کا بہترین موقع وہی تھا جب ہم اس کمرے میں آئے تھے مگر اس وقت آشا اور ثروت بھی کمرے میں موجود تھیں۔ مزاحمت سے ان کی زندگی فوراً داؤ پر لگ جاتی۔

اچانک مجھے گوبندر کی سنگیتزر جنی کا خیال آیا۔ وہ بھی گھر میں ہی تھی مگر ابھی تک اس کی آواز سنائی دی تھی اور نہ وہ یہاں سے بھاگی تھی۔ شاید وہ خود کو کہیں گھر کے اندر ہی چھپانے میں کامیاب ہو گئی تھی۔

”یہ جاوا گینگ کے لوگ ہی ہیں۔“ گوبندر نے میرے کان میں لرزتی سرگوشی کی۔

”لیکن جاوا خود یہاں نظر نہیں آ رہا۔“ میں نے کہا۔

”کیا آپ نے اسے دیکھا ہوا ہے؟“

”ایک دفعہ تصویر دیکھی تھی۔“ میں نے بات بنائی۔

کھڑکی سے باہر برآمدے میں تین شاندار فولڈنگ کرسیاں اور ایک میز رکھ دی گئی۔ میز

میں نے جگت سنگھ کو آواز دی۔ ”جگت! اوپر آؤ۔“

جگت کے بجائے گوبندر اوپر آ گیا۔ ”کیا بات ہے جی؟ جگت بھائی تو باہر گئے ہیں۔“

”یہ کون لوگ آ رہے ہیں یہاں؟“ میں نے روشنیوں کی طرف اشارہ کیا۔

ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے یہ گاڑیاں گاؤں میں داخل ہو گئیں۔ آوارہ کتے ان کے ارد گرد شور مچا رہے تھے۔ ہیڈ لائٹس میں دھول کے بادل اڑتے نظر آتے تھے۔ یہ کُل تین گاڑیاں تھیں۔ دو بڑے سائزر کی شاندار جیپیں، ایک ہائی روف.....

”کہیں یہ..... جاوا کے لوگ ہی نہ ہوں۔“ گوبندر نے سرسراہٹ آواز میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد ہی گاڑیاں عین اس مکان کے سامنے آن کھڑی ہوئیں جس میں ہم سب موجود تھے۔ ہمارے ذہنوں میں خطرے کی گھنٹیاں بج اٹھیں۔ میری جیب میں پستول تھا۔ ایل ایم جی نیچے کمرے میں تھی۔ میرا چہیتا چاقو بھی وہیں تھا۔ میں سیڑھیاں پھلانگتا ہوا نیچے پہنچا۔ گوبندر میرے عقب میں تھا۔ اس سے پہلے کہ میں کمرے تک پہنچتا، کئی افراد اندر گھس آئے۔ انہوں نے میری توقع سے کہیں زیادہ پھرتی دکھائی تھی۔ دروازہ کھٹکھٹانے کے بجائے انہوں نے پانچ فٹ اونچی کچی چار دیواری پھلانگی تھی اور اندر آ دھمکے تھے۔ اندازہ ہوا کہ انہیں ہر چیز کی پہلے ہی خبر تھی۔ یہاں تک معلوم تھا کہ گھر میں کتنے افراد اور کہاں کہاں ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں جدید آٹومینک رائفلیں تھیں اور وہ شکلوں سے ہی خطرناک مجرم نظر آتے تھے۔ مجھے اندازہ ہوا کہ پستول نکالنا بیکار ہے۔ نصف درجن افراد مجھے بھون کر رکھ دیتے اور میرے ساتھ ہی یوسف، ثروت اور آشا وغیرہ کی زندگی بھی سخت خطرے سے دوچار ہو جاتی۔

”ہینڈ ز اپ..... ہینڈ ز اپ۔“ کئی لکارے گونجے۔ میں نے ہاتھ کھڑے کر دیئے۔

گوبندر اور یوسف نے بھی تقلید کی۔ ایک شخص نے بڑے کرخت انداز میں میری جیب سے پستول نکال لیا اور مو بائل بھی.....

”پکڑو جانے نہ پائیں۔“ اچانک ایک حملہ آور چلا یا۔

حملہ آوروں کی توجہ ہماری طرف تھی۔ ثروت اور آشا چلاتی ہوئی باہر بھاگ گئی تھیں۔ حملہ آور ان کے پیچھے لپکے۔ تاریک صحن میں دو گولیاں بھی چلیں۔ دو رائفلوں کے بیرل میرے سر سے چھو رہے تھے۔ میں اپنی جگہ سے حرکت بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کچھ یہی کیفیت گوبندر اور یوسف کی تھی۔

چند سیکنڈ بعد اندازہ ہوا کہ حملہ آوروں نے انہیں دوبارہ پکڑ لیا ہے۔ آشا کے رونے اور

جرات کر ہی نہیں سکتا تھا مائی باپ۔

جاوا بولا۔ ”لیکن اب تو جرات ہو چکی میاں مٹھو! اب کیا ہو سکتا ہے۔ اب تو معاملے کو ٹھیک کرنا ہی ہو گا نا۔“

سانو لے رنگ والے دبلے پتلے شخص نے تڑپ کر خود کو چھڑایا اور جاوا کے پاؤں میں گر پڑا۔ اس کے پاؤں پکڑ کر بولا۔ ”میں بے خبر تھا جناب! مجھے ایک دفعہ شام کر دیں۔ میں وچن دیتا ہوں سرکار! آپ کا غلام بن جاؤں گا۔ آپ جو کچھ کہیں گے کروں گا۔“ وہ جاوا کے پاؤں پر سر رکڑنے لگا۔ اس کی حالت دیدنی تھی۔ رنگ ہلکی ہو رہا تھا۔

مجھے اندازہ ہوا کہ نشئی کے روپ میں یہ بندہ شاید پولیس کا انفارمر تھا اور اس نے پولیس تک کوئی ایسی اطلاع پہنچائی جو نہیں پہنچانی چاہیے تھی۔

جاوا نے اطمینان سے کہا۔ ”میں مانتا ہوں میاں مٹھو کہ تم نے یہ غلطی نہیں کی لیکن ضروری نہیں ہوتا کہ بندے کو اسی کرم کی سزا ملے جو اس نے کیا ہے۔ اسے اپنے کسی پہلے کارنامے کی سزا بھی تو مل سکتی ہے۔“

”آپ کو اپنے بچوں کا واسطہ مجھے بخش دیں۔“ وہ گھگھکیا اور جاوا کے پاؤں سے چمٹ گیا۔

جاوا نے پریشانی کی اداکاری کرتے ہوئے کہا۔ ”اب یہ کیسے ہو سکتا ہے میاں مٹھو! تو انسپکٹر چاولہ کے بارے میں جان گیا ہے۔ اب تو لاکھ بھی قسمیں کھائے لیکن اپنی زبان بند نہیں رکھ سکے گا۔ تو ایسا کر ہی نہیں سکتا۔ تو خبر ہے میاں مٹھو! تیرا تو کام ہی سننا اور ٹیس ٹیس کرنا ہے۔“

”میری زبان کاٹ دیں سرکار! آپ کہیں تو میں اپنے ہاتھ سے کاٹ لیتا ہوں۔ میرا دشواس کریں سرکار۔“ وہ باقاعدہ بلکنے لگا۔ موت کے خوف سے اس کا پورا جسم لرزاں تھا۔ جاوا کے متمنائے چہرے پر سوچ کی لکیریں نظر آئیں۔ اس نے دو گھرے کش لیے پھر اپنے ایک کارندے کو اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ”چو پڑا! اسے ابھی لے جاؤ۔ اس کا فیصلہ بعد میں کریں گے۔“

جاوا کے لہجے میں پلک محسوس کر کے مخبر کی حالت ذرا سنبھلی۔ اس نے اپنا سر ایک بار پھر جاوا کے پاؤں پر رکھا اور اس سے جاں بخشی کی التجائیں کرنے لگا۔ جاوا نے ہاتھ کے اشارے سے اسے جانے کے لیے کہا اور بولا۔ ”ابھی جاؤ۔۔۔۔۔ کچھ سوچیں گے۔“ اس کے ساتھ ہی اس نے پاؤں کی حرکت سے مخبر کا سر پیچھے ہٹا دیا۔

پرمنرل وائر کی بوتل، سگریٹ کا پیگٹ، لائٹر اور اس طرح کی ایک دو اشیا رکھ دی گئیں۔ یہ سارا سامان یہ لوگ یقیناً ہائی روف گاڑی میں اپنے ساتھ ہی لے کر آئے تھے۔ سرکاری دربانوں کی طرح دو مسلح گارڈ دیوار کے ساتھ اٹین شین کھڑے ہو گئے۔ اندازہ ہوا کہ جاوا آرہا ہے۔ وہ غالباً ابھی تک گاڑی میں ہی بیٹھا تھا۔

کچھ دیر بعد اس کی آمد ہوئی۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا اندر آیا۔ اس کا نہایت گٹھا ہوا جسم پتلون قمیص میں سے پھٹا پڑ رہا تھا۔ آنکھوں میں وہی خونخوار سرخی تھی جو مجھے انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں نظر آئی تھی۔ اس نے سلاخ دار کھڑکی کے باہر سے مجھ پر ایک تسخربھری نظر ڈالی۔ پھر یوسف کو گھورا اور بڑے ٹھاٹ سے کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس کے قریباً ایک درجن مسلح ساتھی اس کے ارد گرد موجود تھے اور اس کے کسی بھی اشارے کے منتظر تھے۔

تب میں ایک بار پھر چونکا۔ میری نظر اس دوسرے شخص پر پڑی جو جاوا کے ساتھ ہی کرسی پر بیٹھا تھا۔ میں حیران رہ گیا۔ مجھے توقع نہیں تھی کہ میں اسے یہاں دیکھوں گا۔ یہ بارڈر پار وہی والا گاؤں کا چودھری انور تھا۔ جسے جگت سنگھ چودھری انور گنجا بھی کہتا تھا۔ چودھری انور کلف لگے سفید شلوار قمیص میں تھا۔ اس کی سفاکی اس کے چوڑے جڑے اور اس کی سوچی ہوئی آنکھوں سے عیاں تھی۔

جاوا نے بے تکلفی سے چودھری انور کے کندھے پر ہاتھ مارا اور بولا۔ ”واہ بھئی واہ۔۔۔۔۔ ایک بادام میں سے دو گریاں نکل آئی ہیں۔ اس کو کہتے ہیں کہ جب اوپر والا دیتا ہے تو چھت پھاڑ کر دیتا ہے۔“

”ایک بادام میں دو گریاں؟“ چودھری انور نے سوالیہ انداز میں کہا۔

”ہاں بھئی۔۔۔۔۔ دیکھو نا ایک ساتھ دو نیچے مل گئے اور دونوں کی تلاش تھی ہمیں۔ ایک یہ سردار اوتار سنگھ کا بھگوز امہان یوسف اور دوسرا یہ عمران کا جاگلیا تابی۔۔۔۔۔ ایک بادام میں دو گریاں۔“ اس نے زور کا قہقہہ لگایا اور سگریٹ کی طرف ہاتھ بڑھائے۔

اسی دوران میں دو مسلح افراد پھٹے پڑانے کپڑوں والے ایک نشئی کو پکڑ کر اندر لے آئے۔ میں نے پہچان لیا۔ یہ وہی شخص تھا جسے میں نے تھوڑی دیر پہلے گلی میں گاتے دیکھا تھا لیکن اب یہ شخص ٹھیک ٹھاک ہوش میں نظر آ رہا تھا۔ اس کا لب و لہجہ بھی قدرے بدلا ہوا تھا۔ اس نے جاوا کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے اور لرزتی آواز میں بولا۔ ”مجھے بالکل پتا نہیں تھا جناب کہ اس بندے کا سبندھ آپ سے ہے۔ میں سو گند کھاتا ہوں جی۔ بڑی سے بڑی سو گند کھاتا ہوں۔ مجھے پتا ہوتا کہ اس کی آپ کو ضرورت ہے تو کبھی تھا نہ نہ جاتا۔۔۔۔۔ میں اتنی

اگلے چار پانچ منٹ میں تھانیدار چاولہ اور جاوا وغیرہ کے درمیان جو گفتگو ہوئی، اس سے ساری بات کا پتا چل گیا۔ ابھی تھوڑی دیر پہلے جان کی بازی ہارنے والے پولیس کے انفارمر کا نام روئیل سنگھ تھا۔ ایسے انفارمرز کو عام طور پر شدید مطلوب افراد کے بارے میں معلومات ہوتی ہیں۔ بدقسمت روئیل کو بھی سردار اوتار کے مفور بیٹے اشوکا سنگھ کے بارے میں علم تھا۔ دودن پہلے جب ہم یہاں وارد ہوئے تو روئیل نے بھی کئی دوسرے لوگوں کی طرح یوسف کو دیکھا۔ وہ دنگ رہ گیا۔ اس نے اسے اشوکا ہی سمجھا۔ اگلے روز اس نے وہی کیا ججواسے کرنا چاہیے تھا۔ وہ مقامی تھانیدار چاولہ سے اس کے گھر پر جا کر ملا اور اسے بتایا کہ سردار اوتار کا مفور بیٹا کچھ دیگر افراد کے ساتھ گاؤں میں موجود ہے۔ تھانیدار چاولہ سے رابطہ کرنا روئیل کی بدقسمتی ثابت ہوا۔ اسے پتا نہیں تھا کہ یہ ہندو تھانیدار، جاوا کے پُرانے نمک خواروں میں سے ہے اور محکمے سے زیادہ جاوا کا وفادار ہے۔ اسے یوسف کی ساری رُوداد معلوم تھی۔ جانتا تھا کہ یوسف اپنی شکل و شبہت کی وجہ سے جاوا اور سردار اوتار کے لیے بہت کارآمد ثابت ہونے والا تھا۔ لہذا اپنے مخبر کی اطلاع پر تھانیدار چاولہ نے خود کوئی کارروائی کرنے کے بجائے جاوا کو اطلاع پہنچائی اور جاوا اپنے جانباڑوں کے ساتھ آنا فانا یہاں آدھمکا۔

یوسف بالکل گم صم کھڑا تھا۔ میں نے کوئی ایک گھنٹہ پہلے ساری صورتِ حال کھول کر اس کے سامنے بیان کر دی تھی۔ اب میرے سارے بیان کی تصدیق بھی ہو رہی تھی۔ گلوکار سے مشابہت والی ساری بات ڈھونگ تھی۔ اصل چکر وہی اوتار سنگھ کے بیٹے والا تھا۔ تھانیدار چاولہ کھڑکی میں سے یوسف کو اسی دلچسپی سے دیکھ رہا تھا جس دلچسپی سے پنجرے میں بند جانور کو دیکھا جاتا ہے۔ ”یہ تو کمال ہے جاوا صاحب!“ وہ مؤدب انداز میں بولا۔ ”یہ گال والے نشان کے بعد تو یہ اشوکا بابو کی کاربن کاپی لگنے لگا ہے۔ بس آواز اور قد کا ٹھکانہ تو بہت فرق ہوگا۔“

اس سے پہلے کہ جاوا جواب میں کچھ کہتا، ایک بندہ ہانپا ہوا اندر داخل ہوا۔ اس نے جاوا سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”نہیں جاوا صاحب! ابھی کچھ پتا نہیں چلا حرامزادی کا..... لیکن ہے گاؤں کے اندر ہی۔ ہم آس پاس کے گھروں میں دیکھ رہے ہیں۔“

جاوا پھنکارا۔ ”اگر وہ نہ ملی تو میں کاٹ دوں گا تجھے نیچے سے۔ حرام کے بچے! تین تین کلوز ایبھی گوشت دس منٹ میں اندر ڈال لیتے ہو۔ ایک جھوٹری نکل گئی تمہاری ٹانگوں کے نیچے سے۔ جاؤ ڈھونڈو اسے۔“ جاوا کے آخری الفاظ کسی دھماکے جیسا تھا۔ نہ دے گا

دونوں مسلح افراد مخبر کو لے کر روانہ ہوئے۔ چند قدم دور جا کر ایک مسلح شخص نے مڑ کر دیکھا۔ جاوانے اسے ایک خطرناک اشارہ کیا۔ یہ بار دینے کا اشارہ تھا۔ گلے پر انگلی سے خیالی چھری چلانے کا اشارہ کیا۔ مخبر یہ منظر نہیں دیکھ سکا اور مسلح افراد کے ساتھ باہر نکل گیا۔ میرے جسم میں سرد لہر دوڑ گئی۔

بمشکل ایک منٹ بعد کسی کمرے کے اندر سے گولی چلنے کی آواز آئی۔ یہ کوئی سائیلنسر لگے پستول سے چلائی گئی تھی۔ سب سمجھ گئے کہ مخبر کا کام تمام ہو چکا ہے۔

اس تماشے کے دوران میں ایک قریبی کمرے سے آتش کے پکارنے کی آواز آتی رہی تھی۔ وہ بار بار دروازہ بھی پیٹ رہی تھی۔ اسے کمرے میں بند کر دیا گیا تھا۔ میں ایک دم ہی بے دست و پا ہو کر رہ گیا تھا۔ شاید گوندر بھی یہی کیفیت محسوس کر رہا تھا۔ اسی دوران میں باہر ایک سکورٹز کئے کی آواز آئی۔ چند سیکنڈ بعد ایک لمبا ترنگا شخص اندر داخل ہوا۔ نہ جانے کیوں اس کی صورت دیکھ کر ہی مجھے لگا کہ وہ کوئی پولیس والا ہے۔ وہ بادامی رنگ کی شلوار قمیص میں تھا۔

”لو بھئی چاولہ! تمہاری پریشانی ختم ہو گئی۔ وہ میاں مٹھو گیا۔“ جاوانے کہا۔ چاولہ نے ہاتھ جوڑ کر دھنیا کر کہا اور جاوا کے سامنے مؤدب کھڑا ہو گیا۔ یقیناً یہی وہ مقامی تھانے دار تھا جس کا ذکر چند منٹ پہلے ہوا تھا۔

”بیٹھ جاؤ چاولے۔“ جاوانے خالی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ ”نہیں جناب! یہ گستاخی نہ کروائیں۔“ تھانیدار چاولہ نے کہا اور اسی طرح کھڑا رہا۔ جاوانے دو مسلح افراد کے سوا باقی سب کو باہر بھیج دیا۔

”اوتار سنگھ کے پتر کو نہیں دیکھو گے انسپکٹر؟“ چودھری انور نے مسکراتے ہوئے لہجے میں کہا۔

”کہاں ہے؟“

چودھری انور نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ تھانیدار چاولہ کی نگاہیں یوسف فاروقی پر جم کر رہ گئیں۔ چہرہ حیرت کی تصویر تھا۔ ”زبردست..... یہ تو چٹکار ہے جی! بس انیس بیس کا فرق ہوگا۔“ انسپکٹر چاولہ نے تحیر آواز میں کہا اور کھڑکی کے قریب آ گیا۔

”کیا خیال ہے، کام دے گا؟“

”ہنڈریڈ پرسنٹ دے گا جی! اس کے گال پر یہ گھاؤ.....؟“

”یہ دسی کام ہے بھئی۔“ جاوانے کہا۔

حل ہو گیا ہے۔ وہ چھوکر ایوسف پکڑ لیا ہے ہم نے..... ساتھ میں وہ جعلی اکبر علی بھی ہے۔ اس ماسٹر پیس کا اصل نام تابش ہے۔ اس چندا کے ٹوٹے سے اپنی پرانی واقف کاری نکل آئی ہے۔“

دوسری طرف سے یقیناً ثروت کے بارے میں پوچھا گیا تھا۔ جاوا نے کہا۔ ”وہ چھوکر بھی ساتھ ہی ہے لیکن ابھی کہیں کھسک گئی ہے۔ گاؤں کے اندر ہی ہے کہیں۔ لڑکے ڈھونڈ رہے ہیں۔ شکاری کتوں سے پالتو خرگوشی بھی بچ سکی ہے؟ یہ بھی نہیں بچے گی۔“

دوسری طرف سے سردار اوتار سنگھ نے کچھ کہا جسے جاوا نے غور سے سنا اور اپنے بھدے ہونٹ سکڑے۔ ساتھ ہی مجھے بھی گھورا۔ تھوڑی دیر بعد اس نے سلسلہ منقطع کر دیا اور مجھے مخاطب کر کے بولا۔ ”میرے بچے اور کتنے پنگے لے گاؤ؟ پنگے پر پنگا، دنگے پر دنگا..... وہاں سردار اوتار کے ایک بندے کو بھی پٹکایا ہے تو نے؟ حویلی کے اندر واٹر پمپ کے کھدے سے اس کی لاش ملی ہے۔“

میں سمجھ گیا کہ وہ سردار اوتار کے خاص ساتھی کیدار ناتھ کی بات کر رہا ہے۔ اس سے پہلے کہ جاوا کچھ اور کہتا، ایک بار پھر آواز زور سے دروازہ پیٹنے لگی اور مدد کے لیے پکارنے لگی۔ جاوا نے نیا سگریٹ سلگاتے ہوئے معنی خیز نظروں سے چودھری انور کو دیکھا۔ ”عورت زور دار ہے انورا۔ ذرا دیکھ تو جا کر کتنا ”زور“ ہے اس میں۔“

چودھری انور بس مسکرا کر رہ گیا۔ اس کے انداز سے پتا چلا کہ وہ رنگین مزاج ہونے کے باوجود فی الحال اس قسم کی مہم جوئی کا ارادہ نہیں رکھتا۔

جاوا نے سفاکی سے اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ ”جاؤ لڑکو! تم میں سے ہی کوئی چپ کر اؤ اس پنجا بن میار کو..... بلکہ تو ہی جا چو پڑا۔ تو کافی مہینوں بعد جیل سے نکلا ہے۔“

چو پڑا کی چوڑی ناک کچھ اور پھیل گئی۔ وہ واقعی فلمی ولن نظر آنے لگا۔ فرق صرف عمر کا تھا۔ اصلی پریم چو پڑا تو کافی بوڑھا ہو چکا ہے۔ یہ اتسی کی دہائی کا پریم چوڑا لگ رہا تھا۔

”جو حکم جاوا صاحب!“ چو پڑا نے ادب سے کہا اور واپس مڑا۔

میرے پہلو میں کھڑا گو بندر سنگھ چلایا۔ ”رک جاؤ..... خبردار جو اسے ہاتھ لگایا تو۔“

میں..... میں مار دوں گا اور مر جاؤں گا۔“

جاوا زہریلی مسکراہٹ کے ساتھ چودھری انور سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”دیکھو یہ کئی گردن والا مرغا کہہ رہا ہے کہ مار دوں گا یا مر جاؤں گا..... اوئے گندی ماں کے بچے، مرتو تو پہلے ہی چکا ہے، اب اور کیا مرے گا۔“

رنگ زرد ہو گیا۔ وہ بڑا جسیم اور رعب دار شخص تھا مگر جاوا کا غصہ دیکھ کر لڑکھڑا گیا۔ اپنے موٹے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا ہار نکل گیا۔

یقیناً یہ ثروت کا ذکر ہی ہوا تھا۔ رجنی کے بارے میں تو ابھی ان لوگوں کو علم ہی نہیں تھا۔ چودھری انور گنجے نے میری طرف کیونہ تو ز نظروں سے دیکھا اور بولا۔ ”ہمیں پتا چلا ہے کہ ایک اور کجبر سنگھ بھی تیرے ساتھ تھا۔ وہ کس ماں کے پاس ہے؟“ چودھری انور کا اشارہ یقیناً جگت سنگھ کی طرف تھا۔ اس کی بات سے اندازہ ہوا کہ وہ جگت سنگھ کو تھوڑا بہت جانتا ہے۔

میں نے کہا۔ ”مجھے کسی کے بارے میں کچھ پتا نہیں۔ جگت اپنے کسی کام سے نکلا تھا۔“

جاوا کا ایک کارندہ بولا۔ ”اور ایک اور چھوکر بھی تو تھی یہاں۔ گو بندر سنگھ کی منگیتر؟“

”وہ بھی جگت کے ساتھ ہی گئی تھی۔“ میں نے فوراً کہا۔

”یہی تو پوچھ رہے ہیں بچے کہ وہ دونوں گئے کہاں ہیں؟“ جاوا نے سفاک انداز میں پوچھا۔

”میں نہیں جانتا۔“

”تم جو کچھ نہیں جانتے، آج سب جان جاؤ گے۔ اگلی پچھلی ساری کسر نکلے گی۔“

وہاں پاکستان میں تو وہ گندے گوشت کا پہاڑ ریان اپنی ماں کا دلیمہ کھانے پہنچ گیا اور تم بچ نکلے مگر اس بار نہیں بچو گے بچے! تم اپنے ہاتھوں سے نادر کے ہتھیارے (عمران) کو گولی نہ مارو تو پھر مجھ خاکسار کو جاوا کون کہے گا۔“ پھر وہ اپنے کارندے سے مخاطب ہو کر بولا۔

”چو پڑا! ذرا سردار اوتار کو فون لگاؤ۔“

میں نے پہلی بار اس چو پڑا نام کے کارندے کو دھیان سے دیکھا اور یوں لگا کہ میں کسی انڈین فلم کا سین دیکھ رہا ہوں۔ یہ بندہ مشہور انڈین ولن پریم چو پڑا سے مشابہت رکھتا تھا۔ وہی پھیلی ہوئی ناک، وہی ابھرے ہوئے رخسار..... زیادہ نہیں تو ستراسی فیصد تک ضرور وہ انڈین اداکار سے ملتا تھا۔ اس کا جسم تھوڑا سا فربہ ہوتا تو یہ مشابہت مزید بڑھ جاتی۔

اس نے قیمتی موبائل فون پر کال ملائی اور پھر فون جاوا کی طرف بڑھا دیا۔ جاوا مخصوص انداز میں بولا۔ ”ہاں سردار! کیا حال ہے تیرا..... بیٹی والا معاملہ کچھ ٹھیک ہوا کہ نہیں؟“

دوسری طرف سے سردار اوتار سنگھ نے جو کہا، وہ جاوا نے قدرے بے پروائی سے سنا۔ جاوا کے چہرے پر چیچک کے مدھم نشان تھے جو اس کی ہیبت میں اضافہ کرتے تھے۔ سردار اوتار کی بات سننے کے بعد جاوا نے کہا۔ ”چل کوئی نہیں، زیادہ نراش نہ ہو۔ یہ تیرا ایک لفز اوتو

”دیکھو جاوا!.....م.....میں جانتا ہوں.....آپ بہت بڑے لوگ ہو۔ میرا تمہارا کوئی مقابلہ نہیں لیکن ہمیں اس طرح ذلیل کرنے سے پہلے ہمارا دوش تبادو۔ ہم نے کیا کیا ہے؟ آپ کی دشمنی اس تابش بھاجی سے ہوگی یا یوسف سے ہوگی۔“

”جو جاوا کے دشمن کو پناہ دے گا، وہ جاوا کا دشمن ہی ہوگا۔“ جاوا نے گلاس میں شراب اُنڈلی اور کرسی پر کچھ اور بھی پھیل کر بیٹھ گیا۔ کرسی اس کے صحت مند بوجھ کے نیچے چرچر رہی تھی۔

”میں سوگند کھاتا ہوں جی! اگر ہمیں شک بھی ہوتا کہ اس معاملے میں آپ کا نام آ رہا ہے تو ہم ان کے قریب بھی نہ پھٹکتے۔ ہمیں بالکل جانکاری نہیں تھی۔“ گو بندر بولا۔

”مگر بچے! تو تابش بھی دشمنی فرما رہا ہے۔ تیرا بھائی جگت اس گھر میں تیرے ساتھ تھا یا نہیں؟ وہ جہاں گیا ہوگا تم لوگوں کو بتا کر ہی گیا ہوگا۔“

”میں واہگر کی سوگند کھاتا ہوں۔ مجھے کچھ پتا نہیں۔ میں اس بارے میں زردوش میں۔ ہم دونوں بھائی زردوش ہیں۔“

جاوا شراب پیتے ہوئے بولا۔ ”دیکھ کا کے! میں ابھی تھوڑی دیر پہلے بک چکا ہوں کہ بالکل زردوش ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ بندے کو سزا بھی نہ ملے۔ سزا تو بندے کو کسی بھی سے کسی بُرائی غلطی کی وجہ سے مل سکتی ہے، جیسے ابھی اس سرے خنجر کو ملی ہے۔ اور دیکھ بچے! سزا کی وجہ سے من چھوٹا نہیں کرنا چاہیے۔ یہ آتما کے بوجھ کو ہلکا کرتی ہے۔“

پھر وہ چوپڑا سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”اوئے کتے! تو جا.....ٹوکھڑا منہ کیا دیکھ رہا ہے؟“

گو بندر چلایا۔ ”نہیں جاوا صاحب! ایسا نہ کرو۔ آپ کو بھگوان کا واسطہ۔ رحم کرو ہم پر.....“ اس نے کھڑکی کی سلاخوں کو پکڑ کر جھنجھوڑا۔

جاوا نے بڑے غور سے گو بندر کو دیکھا اور بولا۔ ”میرے بچے! یہ صرف تیری بھادج ہے یا کچھ اور بھی ہے؟ بڑا درد ہے تیری آواز میں۔ لگتا ہے سہگل صاحب تیری آواز میں گھس گیا ہے۔“

جاوا نے یہ بات نیم سنجیدگی سے کہی تھی لیکن یہ حقیقت بھی تھی۔ میں چندرات پہلے اس حقیقت کا گواہ بنا تھا۔ گو بندر اور اس کی جعلی بھادج میں ایک اور تعلق بھی تھا۔ اگلے چار پانچ منٹ میں گو بندر نے بہت منت سماجت کی۔ بیچ بیچ میں اس نے غضب ناک لہجے میں جاوا کو خطرناک نتائج کی دھمکی بھی دی لیکن جاوا تو جیسے ایک کا لے پتھر کا نام تھا جس پر کوئی دادرِ یاد

اثر کر ہی نہیں سکتی تھی۔ میں کچھ بولا تو نہیں مگر میرے سینے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ گہری نیلی آگ جو ارد گرد کی ہر شے کو جاوا سمیت راکھ کر دینا چاہتی تھی۔ اس آگ کو نکلنے کے لیے راستہ چاہیے تھا مگر راستہ کہیں نہیں تھا۔ عقب میں پختہ لکڑی کا بھاری دروازہ تھا اور سامنے سلاخ دار کھڑکی۔

قریبی کمرے سے پہلے آشاکا منت سماجت کی آوازیں آتی رہیں پھر وہ رونے چلانے لگی اور مدد کے لیے پکارنے لگی۔ دھیرے دھیرے اس کی یہ پکار مدھم ہو گئی اور پھر بالکل گھٹ کر رہ گئی۔ یقیناً پریم چوپڑا نے اکیلے یا اپنے کسی ساتھی کی مدد سے آشاکا کو پالیا تھا۔

گو بندر بہت تڑپا مچلا لیکن ہم تینوں آشاکا کے لیے کچھ نہ کر سکے۔ یہ ایک بھرا ہوا گاؤں تھا۔ اس گھر میں جو کچھ ہو رہا تھا، یقیناً ارد گرد والوں کو اس کی خبر ہو چکی تھی۔ اس کے باوجود کوئی مدد کے لیے نہیں آیا تھا۔ سب سے اہم بات یہ تھی کہ ثروت بھی یہاں سے نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ وہ ایسی نہیں تھی کہ خوف کی وجہ سے کہیں چھپ کر بیٹھ جاتی۔ اس نے یقیناً گاؤں والوں کو اندر کی صورت حال سے آگاہ کیا ہوگا۔ مگر ان کی طرف سے مکمل خاموشی تھی۔ ہر کسی کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ باقی رہی پولیس جس کو لوگوں کے جان و مال کی حفاظت کرنا ہوتی ہے تو پولیس کا کرتا دھرتا چاؤ کہ خود یہاں موجود تھا اور شراب پی رہا تھا۔ جاوا کے اصرار پر اب وہ اس کے پاس ہی مؤدب انداز میں بیٹھ گیا تھا۔

میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں۔ اگر خدا نخواستہ ثروت پکڑی جاتی اور اس کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جاتا تو کیا ہوتا؟ میں کیا چیتے جی یہ سب کچھ دیکھ سکتا اور جھیل سکتا؟ جب ثروت لاہور سے یوسف کی تلاش میں نکل رہی تھی، میں نے اسے بہت روکا تھا۔ ہارون آباد کے ہوٹل سے بھی میں نے اسے واپس لاہور بھیجنے کی کوشش کی تھی۔ میری چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ ہمارا پالائڈ لوگوں سے پڑنے والا ہے مگر حالات اس درجہ سنگین ہوں گے، یہ میں نے تب بھی نہیں سوچا تھا۔ یہ درندوں کا گروہ تھا، خونی قاتلوں کا جھنڈا تھا اور یہ لوگ کہاں سے آئے تھے؟ یہ فلم نگری ممبئی سے وارد ہوئے تھے۔ ممبئی، رنگ و بو اور روشنیوں کا مرکز لیکن اس کے ساتھ ساتھ جرائم کا تاریک ترین گڑھا۔ ایشیا کے ناسوروں میں سے ایک ناسور اور مشرقی پنجاب کے اس چھوٹے سے گاؤں میں ممبئی کا یہ کالا عفریت جاوا، ہمارے سامنے پھیل کر ایک فولڈنگ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور سرخ رنگ کی نہایت قیمتی شراب اپنے اندر اُنڈیل رہا تھا۔ شراب انسان کو جانور بناتی ہے اور جو پہلے ہی جانور اور درندہ ہو، اس کی بربریت کا کیا ٹھکانا ہوگا؟

یہاں کم از کم تین گولیاں بھی چلی تھیں۔ گولیوں کی آواز نے اہل دیہہ کو مزید سہا دیا تھا۔ میری نظر چودھری انور کے چہرے پر پڑی۔ وہ بھی جاوا کے ساتھ شراب نوشی میں مصروف تھا۔ اس کے سیاہی مائل ہونٹوں کا رنگ کچھ اور بھی گہرا ہو گیا تھا۔ میں نے دیکھا، وہ رجنی کو دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔ کھینچا تانی میں رجنی کا دوپٹا اتر چکا تھا اور وہ بے بسی کی تصویر نظر آتی تھی۔

جاوا نے غمور نظروں سے چودھری انور کو دیکھا۔ ”ہاں انور بھیا! یہ چھو کری چلے گی؟“ اس مرتبہ چودھری انور کے چہرے پر انکار نظر نہیں آیا۔ اس کی دو وجہ ہوسکتی تھیں۔ ایک تو اب اسے شراب چڑھ چکی تھی، دوسرے وہ شہری لڑکیوں کا رسیا تھا۔ آشنا دیہاتن تھی جبکہ رجنی گاؤں میں رہنے کے باوجود سرتاپا شہری نظر آتی تھی۔ چودھری انور نے تلے ہوئے آلو کے بہت سے قتلے ایک ساتھ اپنے منہ میں رکھے اور چاولہ کے کان میں کوئی بہکی ہوئی سرگوشی کی۔ چاولہ مودب انداز میں مسکرا دیا۔

جاوا نے اپنے کارندوں کو اشارہ کیا۔ وہ روتی چلاتی رجنی کو کھینچ کر اسی طرف لے گئے جدھر تھوڑی دیر پہلے بد قسمت آشنا گئی تھی۔ گوبندر اپنے سینے کی پوری قوت سے دھاڑنے لگا۔ ”جاوا صاحب! ایسا مت کرو۔ میں تمہارے گلے لگ کر مر جاؤں گا۔ میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ جاوا صاحب!.....“ وہ سلاخوں پر کئے برسائے لگا۔ انہیں جھنجھوڑنے لگا۔ میں جانتا تھا، اس ساری تڑپ پھڑک سے اسے کچھ حاصل ہونے والا نہیں۔

چودھری انور گنبے کے چہرے پر شیطانی چمک بڑھتی جا رہی تھی۔ لگتا تھا کہ اس نے ذہنی طور پر جاوا کی ”مہربان آفر“ قبول کر لی ہے۔ جگت سنگھ نے مجھے بتایا تھا، ماضی میں لاہور کی کسی شریف فیملی کی لڑکی نے چودھری انور کو دھتکارا تھا۔ اس دھتکار کا بدلہ اس نے کسی اور انداز میں لینا شروع کر دیا تھا۔ اس نے شہر سے تعلق رکھنے والی دولڑکیوں کو رکھیلوں کے طور پر پہلی حویلی میں رکھا ہوا تھا۔ بظاہر وہ اس کی بیویاں کہلاتی تھیں۔

کچھ دیر بعد چودھری انور اٹھا اور جھومتا ہوا سا ہماری نظروں کی ریخ سے نکل گیا۔ گوبندر کا اُہ حال تھا۔ وہ دھاڑیں مار رہا تھا اور خود کو دیواروں سے ٹکرا رہا تھا۔ اسی دوران میں پریم چوپڑا اپنا ”سیاہ کارنامہ“ انجام دے کر واپس آ گیا۔ اس کے چوڑے چہرے پر لعنت ٹوٹ کر برس رہی تھی۔

جاوا نے جھومتی آواز میں پوچھا۔ ”ہاں چوپڑے! کتنا زور تھا؟“ اس سے پہلے کہ چوپڑا اپنی گندی زبان کو حرکت دے کر کچھ منحوس بولتا، دھینگامشتی کی آوازیں آئیں۔ پھر کوئی شیشے کی

جاوا، چودھری انور اور چاولہ کے سامنے اب دو فولڈنگ میزوں پر کئی لوازمات سجادیے گئے تھے جن میں ڈرائی فردٹ کے علاوہ تلے ہوئے آلو اور اس قسم کی دوسری چیزیں شامل تھیں۔ جاوا اور چودھری انور کے درمیان جو باتیں ہو رہی تھیں، ان سے یہ خوشگوار انکشاف ہو رہا تھا کہ سردار اوتار کی بیٹی سرنیاں اپنے گھر والوں کے ہاتھ نہیں آسکی اور یہ بھی عین ممکن ہے کہ وہ کسی طرح سرحد پار کر کے پاکستان پہنچ چکی ہو۔ یکا یک کہیں پاس سے ایک بار پھر چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں نے غور سے سنا اور جسم میں سنسنہٹ دوڑ گئی۔ یہ گوبندر کی مگلیتر، چنچل رجنی کی آواز تھی۔ وہ ”بچاؤ بچاؤ“ پکار رہی تھی۔

چند ہی سیکنڈ بعد جاوا، اے کارندے اسے کھینچتے ہوئے جاوا کے سامنے لے آئے۔ رجنی کے تراشیدہ بالوں میں بھوسے کے بہت سے تنکے اٹکے ہوئے تھے۔ اس کے شوخ رنگوں والے لباس پر بھی تنکے تھے۔ جاوا کے کارندے نے رجنی کو سر کے بالوں سے دبوچا ہوا تھا۔ دوسرا کارندہ اسے عقب سے زور دار ٹھوکے دے رہا تھا۔ ان ٹھوکوں کے لیے وہ رائفل کا کندھا استعمال کر رہا تھا۔

کارندے نے کہا۔ ”جاوا صاحب! یہ وہاں کوٹھڑی میں پرالی کے اندر چھپی ہوئی تھی۔“ جاوا نے اسے سرتاپا گھورا اور بولا۔ ”کیا نام ہے تیرا؟“

وہ اس کا سوال نظر انداز کرتے ہوئے بولی۔ ”مجھے چھوڑ دو۔ مجھے جانے دو۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا۔“ پھر اس کی نظر کھڑکی میں سے گزر کر گوبندر پر پڑی۔ کچھ بھی سوچے سمجھے بغیر وہ گوبندر کی طرف بڑھی۔ اس کے بال کارندے کی مٹھی میں تھے۔ اس نے بے رحمی سے جھٹکا دیا۔ رجنی کا سر دیوار سے ٹکرایا۔ وہ ایک بار پھر چلانے لگی۔ ”بچاؤ..... رب کا واسطہ ہے بچاؤ۔“ اس کی آواز باریک تھی۔ خوف کی وجہ سے کچھ اور بھی باریک ہو گئی تھی۔

جاوا نے کہا۔ ”یہ چھو کری بول رہی ہے یا سیٹی بج رہی ہے۔“

کارندے نے رجنی کی آواز بند کرنے کے لیے اس کے منہ پر ہاتھ رکھا تو جاوا زہریلے انداز میں بولا۔ ”بولنے دو اس کو۔ دیکھتے ہیں کہ کون آتا ہے اس کی سیٹی سن کر۔“

چودھری انور ہلکا سا قہقہہ لگا کر بولا۔ ”کوئی نہیں آئے گا جاوا صاحب! کسی کے کانوں تک آواز نہیں پہنچے گی اور اگر پہنچے گی تو وہ سنے گا نہیں۔ لگتا ہے کہ اس پنڈ میں بس ایک ہی جی دار بندہ ہے اور وہ یہ چاولہ صاحب ہمارے ساتھ بیٹھا ہے۔“

شاید انور ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ ارد گرد موجود سب لوگوں نے اپنے کان بند کر لیے تھے۔ یقیناً وہ پر شکوہ گاڑیاں دیکھتے ہی جاوا کی آمد کے بارے میں جان گئے تھے۔ اس آمد کے بعد

جاوا چند سیکنڈ کے لیے ساکت و جامد رہ گیا۔ پھر اس کا چہرہ متغیر ہوا۔ یوں لگا کہ اس کی آنکھوں میں واقعی انگارے دکھنے لگے ہیں۔ جاوا کے کارندوں نے درانتی آشا کے ہاتھ سے نکال لی۔ وہ اسے بے رحمی سے مارتا پٹینا چاہ رہے تھے مگر جاوا نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روک دیا۔ اس نے تھانیدار چاؤلہ کو بھی روک دیا جو خطرناک انداز میں آشا کی طرف بڑھتا تھا۔

جاوا نے اپنے گرتے کے نیچے سے پستول نکالا۔ اس نے آشا کی گردن پر ذرا دباؤ ڈالا تو آشا کا منہ بے ساختہ کھل گیا۔ اس نے پستول کا لمبا بیرل آشا کے منہ میں گھسیڑ دیا۔ دو افراد نے دو اطراف سے آشا کا سر پکڑ رکھا تھا۔ جاوا کسی شیش ناگ کی طرح پھنکارا۔ ”بتا کہاں سے تھو کا تھا؟ یہاں سے یا کچھ اور آگے سے؟“

آشا پھٹی پھٹی نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ وہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن گلے سے بس غوں غاں کی آواز ہی نکال پارہی تھی۔ کمرے میں گوبندر، جاوا سے رحم کی درخواستیں کر رہا تھا۔

جاوا کا دھیان فقط آشا کی طرف تھا۔ وہ دوبارہ جنوبی آواز میں بولا۔ ”بتا کہاں سے تھو کا تھا؟“ اس کے ساتھ ہی اس نے پستول کا بیرل کچھ اور بھی آشا کے گلے میں گھسیڑ دیا۔ وہ اُبکائیاں کرنے لگی۔ جاوا نے اوپر تلے دو فائر کیے اور پستول آشا کے منہ سے کھینچ لیا۔ وہ لہرا کر گری اور ساکت ہو گئی۔ ایک گولی غالباً اس کی گردن کے پچھلے حصے سے باہر نکل گئی تھی۔ ”آخ تھو۔“ جاوا نے اس پر تھو کا اور پھر اپنے پستول کے لعاب آلود بیرل کو آشا کے گرتے سے صاف کیا۔

کمرے کے اندر گوبندر سنگھ جیسے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ وہ دھاڑیں مار رہا تھا۔ پھر اس نے خود کو کمرے کے چوبی دروازے سے ٹکرائی شروع کر دیا۔ میں نے دو منٹ پہلے دیکھا تھا کہ گوبندر نے آہنی سرے کا ڈیڑھ دو فٹ لمبا ایک ٹیلی ٹکڑا اپنی شرٹ کے نیچے چھپایا تھا۔ وہ ایک زبردست فائٹر تھا۔ وہ کسی طرح باہر نکل جاتا تو کھلبلی مچا سکتا تھا مگر یقینی بات تھی کہ وہ لوگ اسے باہر نہیں نکلنے دیں گے۔ اور پھر یہی ہوا، جاوا نے اسے بس ایک وارننگ دی پھر گولی چلا دی۔ گولی اس کی ٹانگ میں لگی، وہ گر کر تر پنے لگا۔ دوسری گولی عین اس کی پیشانی پر لگی اور اس نے اسے فوراً ہی ساکت کر دیا۔ ہم دم بخود کھڑے تھے۔ جاوا نے خونی نظروں سے مجھے اور یوسف کو دیکھا۔ موت جیسے سرد لہجے میں بولی۔ ”تم میں سے بھی کسی کو دروازے کے ساتھ زور آزمائی کرنی ہے؟“

چیز چھنا کے سے ٹوٹی۔ اس کے بعد آشا کی آوازیں اُبھریں۔ وہ ایک بار پھر چلا رہی تھی لیکن اب اس کے چلانے کی نوعیت مختلف تھی۔ اندازہ ہوا کہ وہ جاوا کے کارندوں کو نو عمر رجنی سے دور رکھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ اس کا کہا ہوا کوئی کوئی فقرہ ہمارے کانوں تک بھی پہنچ رہا تھا۔ بے توقیری اور ذلت کے مرحلوں سے گزرنے کے بعد اس نے حجاب کو بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ وہ جاوا کے کارندوں سے کہہ رہی تھی کہ وہ اس سے منہ کالا کر لیں لیکن رجنی کو چھوڑ دیں۔ پریم چو پڑا بھی کھڑکی کے سامنے سے ہٹ کر آوازوں کی طرف لپک گیا۔ بے شک آشا بھی اخلاقی طور پر ایک گری ہوئی عورت تھی لیکن ان آفت کی گھڑیوں میں اس کا کردار قدرے مختلف نظر آ رہا تھا۔ وہ رجنی کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی۔ پھر یوں لگا جیسے آشا کو پیٹا اور گھسیٹا جا رہا ہے۔ میں نے ایک بار پھر بے بسی کے عالم میں چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔ مزاحمت کا کوئی راستہ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دل سینے میں سوکڑے ہو رہا تھا۔

چند سیکنڈ بعد جاوا کے کارندے آشا کو کھینچتے ہوئے جاوا کے سامنے لے آئے۔ اس کا بالائی جسم نیم عریاں تھا اور اسے اس عریانی کی پروا بھی نہیں تھی۔ وہ سرخ انگارہ نظر آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں ایک درانتی تھی۔ تاہم درانتی والے ہاتھ کو ایک ہٹے کئے شخص نے مضبوطی سے دبوچ رکھا تھا۔ اس کا دوسرا بازو بھی ایک تو مند ڈشکرے کی گرفت میں تھا۔ ہم نے دیکھا، پریم چو پڑا کے کندھے پر ایک گہرا زخم تھا۔ اس نے کندھے کو ہاتھ سے دبا ہوا تھا اور خون ہاتھ کی انگلیوں کے درزوں سے اُبل رہا تھا۔ چو پڑا کا چہرہ اذیت سے پیلا ہو رہا تھا۔ ایک کارندہ بولا۔ ”اس کتیا نے حملہ کیا ہے جی۔ اپن اس کو پکڑنا نہیں تو یہ اور نقصان کرتی۔“

جاوا کھڑا ہو گیا۔ چاؤلہ بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔ رنگ میں بھنگ پڑ گئی تھی۔ چودھری انور گنجا بھی اندر سے آ گیا۔ جاوا کی آنکھیں دہک رہی تھیں۔ اس نے آشا کا منہ اپنے ہاتھ سے دبوچا اور اس کی شکل کو بگاڑتے ہوئے بولا۔ ”بلیدان دے رہی ہو؟ اس چھوکر کی بد لے خود کو بھینٹ چڑھانا چاہتی ہو؟ لیکن تیرے کھوپڑے میں شاید بھس بھرا ہوا ہے۔ جوان ہرنی کی جگہ جوان ہرنی ہی بھینٹ چڑھائی جاسکتی ہے۔ بدھی بھینس نہیں.....“

آشا کو غم و غصے نے نیم دیوانہ کر دیا تھا۔ اس نے درانتی سے جاوا پر حملے کی کوشش کی لیکن تو مند کارندوں نے اسے اپنی جگہ سے ہلنے بھی نہیں دیا۔ وہ نتائج سے بے پروا ہو کر جاوا پر چلائے گی۔ اس کو گالیاں اور بد دعائیں دینے لگی۔ پھر بے بسی کے عالم میں اس نے جاوا پر تھوک دیا۔ اس کا خون آلود تھوک..... آخ تھو..... کی آواز کے ساتھ جاوا کے کندھے پر پڑا۔

یوسف نے چہرے کو ہاتھوں میں چھپایا اور سسکنے لگا۔ میں خاموش کھڑا رہا۔ گوبندر دروازے کے قریب ہی گرا تھا۔ اس کے سر سے بہنے والا خون دروازے کی چٹلی درز سے باہر کی طرف رینگنے لگا جیسے وہ بھی اس کمرے سے آزادی کا خواہاں ہو۔ سریے کا ٹکڑا اس کی شرٹ کے نیچے سے نکل کر فرش پر لڑھک گیا تھا۔

جاوانے یہ ٹکڑا دیکھ لیا۔ اس نے جنونی لہجے میں مجھے حکم دیا کہ میں یہ ٹکڑا اٹھا کر اسے دوں۔ میں نے ٹکڑا اٹھا کر سلاخ دار کھڑکی سے باہر پھینک دیا۔

بے شک گوبندر نے صدمے کے زیر اثر سنگین غلطی کی تھی۔ اس وقت ہم کسی بھی طرح مزاحمت کے قابل نہیں تھے۔ جاوا گرجا۔ ”اگر تم دونوں کے پاس بھی کوئی ایسی شے ہے تو نکال دو۔“

”نہیں..... کچھ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔

”چلو دشو اس کر لیتے ہیں۔ جو بندہ ایک دو گھنٹوں میں بھگوان کو پیارا ہونے والا ہو، اس کی بات پر دشو اس کر لینا چاہیے۔“

پریم چو پڑانے آشا کی لاش پر ایک کپڑا ڈالا پھر دو افراد اسے اٹھا کر لے گئے۔ خون پر پہلے چو لہے کی راکھ ڈالی گئی پھر جھاڑو سے صاف کر دیا گیا۔ گوبندر کی لاش اسی طرح پڑی رہی اور ماحول کی سراسیمگی میں اضافہ کرتی رہی۔ یقین نہیں آ رہا تھا کہ زندگی سے بھرپور یہ نوجوان اپنے تمام تر ہنر اور زندگی کے سارے منصوبوں سمیت مٹی کا ڈھیر بن چکا ہے۔

مجھے اندازہ ہوا کہ رجنی شاید وقتی طور پر بچ گئی ہے۔ چودھری انور اب جاوا اور تھانیدار چاولہ کے قریب ہی بیٹھا تھا۔ یہاں آنا فانا جو خون خرابا ہوا تھا، اس نے غالباً چودھری انور کا موڈ بھی بدل دیا تھا۔ اس کی توجہ اب رجنی کی طرف سے ہٹ گئی تھی۔ بہر حال توجہ ہٹنے کی ایک وجہ کچھ اور بھی تھی، جس کا پتا ہمیں تھوڑی دیر بعد چلا..... رجنی کی کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ نہ ہی گھر میں کسی جگہ سے جدوجہد کے شواہد مل رہے تھے۔ جاوا موبائل فون پر کسی فلمی بندے کی ماں بہن ایک کر رہا تھا۔ اسے کہہ رہا تھا کہ اگر وہ فلاں کیس کی پیروی سے باز نہ آیا تو ممبئی واپس پہنچتے ہی سب سے پہلے وہ اس کو اٹلٹا لٹکا دے گا۔ اس کی فلم ڈبوں میں بند ہو جائے گی اور اس کی فیملی کا کوئی بندہ کسی فلم سٹوڈیو میں کبھی قدم نہیں رکھ سکے گا۔

اسی دوران میں پینٹ شرٹ والا ایک سکھ نوجوان گھر میں داخل ہوا۔ اس نے عینک لگا رکھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں لٹکتا ہوا اسٹیٹھو سکوپ گواہی دے رہا تھا کہ وہ اس گاؤں کا کمپاؤنڈر یا ڈاکٹر ہے۔ بعد ازاں پتا چلا کہ وہ ڈاکٹر ہی تھا۔ اسے ایک مسلح شخص لے کر آیا تھا۔ ڈاکٹر کا

رنگ ہلدی ہو رہا تھا۔ وہ اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیرتا ہوا اندرونی کمروں کی طرف چلا گیا۔ اس کا میڈیکل باکس بھی اس کے پیچھے پیچھے گیا۔ قریباً دس منٹ بعد ڈاکٹر دوبارہ کھڑکی کے سامنے نظر آیا۔ تھانیدار چاولہ نے بائرب آواز میں اس سے پوچھا۔ ”ہاں جسونت! کیا رپورٹ ہے؟“

ڈاکٹر لڑزاں آواز میں بولا۔ ”میں نے انجکشن دے دیا ہے جی، ہوش میں آ رہی ہے۔ تھوڑی دیر میں ٹھیک ہو جائے گی۔ چنتا کی کوئی بات نہیں جی۔“

اسی دوران میں دبلے پتے ڈاکٹر کی نظر کھڑکی سے گزر کر اندر آئی اور گوبندر کی لاش پر پڑی۔ وہ کچھ اور بھی ہراساں دکھائی دیا۔

تھانیدار چاولہ نے کڑے لہجے میں کہا۔ ”جسوتے! یہاں جو کچھ دیکھا ہے۔ اس کے بارے میں باہر کسی سے ایک شبہ (لفظ) بھی نہیں بولنا۔ بہت تکلیف میں آ جاؤ گے۔“

”نن..... نہیں جی۔ بالکل نہیں۔“

جاوانے کہا۔ ”جو لڑکی یہاں سے بھاگی ہے، اس کے بارے میں کوئی جانکاری ہے تمہیں؟“

”جی بس اتنا پتا چلا ہے کہ کوئی لڑکی بھاگی ہے اور آپ لوگ اسے ڈھونڈ رہے ہیں۔“ ”دھیان رکھو کوئی جانکاری ملے تو فوراً بتاؤ۔“ تھانیدار نے حکمانہ انداز میں کہا۔

ڈاکٹر نے شد و مد سے اثبات میں سر ہلایا۔ پھر ہاتھ جوڑ کر نمسے کیا اور لڑکھڑاتا ہوا سا باہر نکل گیا۔ ایک مسلح شخص میڈیکل باکس کے ساتھ اس کے ہمراہ تھا۔

بہت جلد ہمیں اندازہ ہو گیا کہ بیہوش ہونے والی گوبندر کی منگیتر..... بلکہ ”سابقہ منگیتر“ رجنی کور ہے۔ وہ صورت حال کی سختی نہیں جھیل سکتی تھی۔ اسے آوازوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ آشا پر کیا ہوتی ہے۔ وہ اس وقت بیہوش ہوئی تھی جب جاوانے آشا پر دو فائر کیے تھے۔ غالب گمان یہی تھا کہ ابھی اسے گوبندر کی موت کا پتا نہیں۔

جاوا کے قریب دو موبائل فون رکھے تھے۔ گاہے بگاہے کسی فون کی بیل ہونے لگتی تھی اور وہ گفتگو میں مصروف ہو جاتا تھا۔ اس کی یہ ساری گفتگو ممبئی کے ایک خطرناک ڈان کی ”شان“ کے عین مطابق تھی۔ اس کے اکثر فقروں میں گندی گالیوں کی بوچھاڑ ہوتی تھی۔

ہمارے سامنے ہی ممبئی کی ایک معروف ہیروئن کی کال بھی آئی۔ جاوانے اس سے قدرے بہتر انداز میں بات کی۔ تاہم گندی گالیوں سے مکمل پرہیز اس نے پھر بھی نہیں کیا۔ اس نے ہیروئن سے کہا کہ اگر اب اسے انکم ٹیکس آفیسر کا فون آئے تو وہ اسے بتائے۔ وہ اس کی پتلون

ہے، وہ ثروت کے بارے میں ہی ہے۔ وہی ہو رہا تھا جس کا بدترین اندیشہ میرے دل میں موجود تھا۔ ثروت یہاں سے تونج نکلنے میں کامیاب ہو گئی تھی لیکن وہ گاؤں والوں کی بے حسی اور کم ہمتی کے جال سے نہیں نکل پائی تھی۔

باہر نمبردار کا نمائندہ خوف زدہ لہجے میں جاوا سے کہہ رہا تھا۔ ”جناب! آپ جیسا حکم کریں گے دیا ہی ہوگا۔ لیکن اگر اس طرح ہو جائے تو ہماری تھوڑی سی عزت رہ جائے گی۔ آپ چاہیں تو ابھی آجائیں۔ بے شک ایک دو گولیاں بھی چلا دیں۔ تھوڑا سا ماحول بن جائے گا۔“

جاوا سفاک مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔ ”ایک دو گولیاں مار ہی نہ دیں نمبردار کے بھجروں کو؟“

نمائندے نے ہاتھ جوڑے۔ ”آپ مائی باپ ہیں جی! اپنے چاکروں پر کرپاہی کریں گے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔ تم جاؤ۔ میں بھیجتا ہوں بندے تھوڑی دیر میں..... اس دوران میں اس کا دھیان رکھو۔ وہ بھاگ گئی تو تم میں سے کسی کو اپنی چھوکری دینی پڑے گی۔“

نوادرد نے بار بار جھک کر نمستے کیا اور اُلٹے قدموں چلتا ہوا باہر نکل گیا۔ اس ساری گفتگو کے دوران میں اس نے بڑی نیاز مندی سے اپنی گردن جھکائے رکھی تھی۔ نہ اس نے ہماری شکلیں دیکھی تھیں نہ کمرے کے فرش پر پڑی گوبندر کی لاش پر اس کی نظر پڑی تھی۔

جاوا نے یوسف سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”لے بھی آگئی تیری پتی بھی ہمارے اس بوچڑ خانے میں۔ لیکن تجھ سے زیادہ پریشانی تو تیرے اس یار تابش کو ہوگی۔ اس کا اصل پتی تو یہی ہے نا..... تو تو بس کاغذی خاوند ہے چھوکری کا.....“

لگتا تھا کہ میرے اور عمران کے بارے میں جاوا کا بی معلومات حاصل کر چکا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ ماضی میں ثروت میری منگیتر رہی ہے۔

یوسف بالکل خاموش اور ساکت بیٹھا تھا۔ یوں لگتا تھا کہ اس وقت اسے اپنی جان سے زیادہ کسی چیز کی فکر نہیں ہے۔ وہ گوبندر کی لاش سے نگاہیں چرانے کی کوشش کر رہا تھا لیکن گاہے گاہے نگاہ لاش پر پڑ ہی جاتی تھی۔ اس صورت میں اس کے چہرے پر گہرا زرد سایہ لہرا جاتا تھا۔

چودھری انور نے کہا۔ ”جاوا صاحب! یہ تابشا اصل پتی بھی ہے اور پُرانا عاشق بھی۔ ہمارے پنڈ میں یہ دونوں ایک کر یا نہ فروش کے گھر میں میاں بیوی کی طرح اکٹھے رہتے رہے

گئی کرنے کا مکمل انتظام کر دے گا۔

کچھ دیر بعد تھا نیدار چاولہ تو جاوا سے اجازت لے کر اور اس کے پاؤں چھو کر واپس چلا گیا تاہم باقی افراد وہیں موجود رہے۔ وہ زرخیز غلاموں کی طرح جاوا کے ارد گرد جدید رانفلٹیں اٹھائے کھڑے تھے اور جاوا کی ابرو کے ایک اشارے پر کسی کو بھی چھلنی کر سکتے تھے۔ جاوا اور چودھری انور مسلسل شراب پی رہے تھے۔ گاہے بگا ہے وہ مدھم آواز میں بات بھی کرنے لگتے تھے۔ نہ جانے کیوں مجھے لگ رہا تھا کہ اس گفتگو کا محور میں ہوں۔

اسی دوران میں زخمی کندھے والا پریم چوڑا اندر آیا۔ اس نے بڑے ادب سے جھک کر جاوا کے کان میں سرگوشی کی۔ جاوا نے سر اثبات میں ہلایا۔

پریم چوڑا واپس چلا گیا اور چند سیکنڈ بعد ایک درمیانی عمر کے سکھ کو لے کر اندر داخل ہوا۔ اس نے چادر کی بکل مار رکھی تھی۔ سر پر پگڑی کے بجائے جوڑا تھا۔ وہ ڈراڈرا سا جاوا کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”کیا بات ہے؟“ جاوا نے اکھڑ لہجے میں پوچھا۔ نووارد نے پریشان نظروں سے دائیں بائیں دیکھا جیسے دوسروں کی موجودگی میں بات نہ کرنا چاہتا ہو۔ جاوا پھنکارا۔ ”جو بکنا ہے سب کے سامنے بک دے۔ سمجھ لے یہاں ہر جگہ میں ہی تیرا باپ کھڑا ہوں۔“

نووارد نے تھوک نکالا۔ ”جناب! مجھے پنڈ کے نمبردار چودھری گلاب نے بھیجا ہے۔ کڑی کا پتا چل گیا ہے جی۔“

”کہاں ہے؟“ جاوا کی بے قراری نمایاں تھی۔

”ہماری بیٹھک میں ہے جی۔ پناہ لینے کے لیے آئی تھی۔“

”تو پھر کیا خیال ہے؟ پناہ دینی ہے اس کو؟“ جاوا نے پوچھا۔

نووارد نے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”نمبردار صاحب ایسا سوچ بھی نہیں سکتے جی! آپ کی دوستی کو چھپا کر ہم نے اپنی گردن اُتروانی ہے۔“

”تو پھر وہ تمہارے ساتھ کیوں نہیں ہے؟“

”نمبردار جی نے ایک ہفتی کی ہے جی! اگر آپ مان لیں تو..... ان کا خیال ہے کہ وہ خود کڑی کو یہاں لائے تو پنڈ والے بعد میں باتیں بنائیں گے۔ آپ اپنے دو چار بندے بھیج کر کڑی کو پکڑ لیں۔“

میری دھڑکنیں زیر و زبر ہو رہی تھیں۔ یوں لگتا تھا کہ جسم کے ہر ماسم سے پسینہ بہہ نکلا ہے۔ اس بات میں شبہ کی کوئی گنجائش نہیں تھی کہ نمبردار کا نمائندہ جاوا کو جو اطلاع دے رہا

ہیں۔ سنا ہے کہ اس کتے جگت سنگھ کے گھر میں بھی یہ پُرانے عاشق معشوق ایک ہی کمرے میں سوتے رہے ہیں۔“

جاوانے شرابی انداز میں ہاتھ ہلایا اور بولا۔ ”ہاں بھئی ہاں وہ کیا گانا ہے اپنے کشور کمار کا جس کی دھن اس بنگلہ بھائی آرڈی برسن نے بنائی تھی۔ پیار دیوانہ ہوتا ہے مستانہ ہوتا ہے۔ پرانی عاشقیاں ہیں بھئی، پرانی شراب کی طرح تیز اور پکے نشے والی۔ کوئی بات نہیں، اس عاشقی کا بھی حساب کتاب فرما لیتے ہیں۔ دیکھ لیتے ہیں کہ یہ عاشق بچہ اپنی لیلیٰ کے لیے کتنی بڑی اوکھلی میں سرگھسیر سکتا ہے۔ ابھی دیکھتے ہیں۔“

ذرا توقف کرنے کے بعد وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”اوئے پریم کپور! ٹو بولتا کیوں نہیں؟ منہ میں کیا اٹلی لگائی ہوئی ہے؟“

چودھری انور نے کہا۔ ”جاوا صاحب! یہ جتنا اوپر ہے اس سے زیادہ نیچے ہے۔ بڑا خطرناک ہے۔ آپ کی طرح مجھ پر بھی ایک چڑھاوا چڑھایا ہوا ہے اس نے۔“

”کیسا چڑھاوا؟“ جاوانے پوچھا۔

”میں نے آپ کو بتایا تو تھا۔ اس نے اپنی معشوق کے ساتھ مل کر جب بارڈر پار کیا تو میرے بندے اس کے پیچھے تھے۔ اس نے جگت کے ساتھ مل کر گھات لگائی اور میرے پانچ بندوں کی جان لی۔ ان کا خون میری چھاتی پر دھرا ہوا ہے جی۔“

”کوئی بات نہیں انورے! سارے حساب ایک جگہ جمع کر لیں گے۔ پورا بل بنا دیں گے اس کو۔ تم چننا مت کرو۔ لیکن ایک بات میں بھی تمہیں بتا دوں۔ یہ اکیلا کچھ نہیں کر سکتا۔ اس کے پیچھے ایک بڑا ہائی پاور انجن ہے جو اس کو چلاتا ہے۔ جب تک اس انجن کی ٹینگی میں چینی ڈال کر اس کا ”بولورام“ نہیں کریں گے، کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ اس انجن کا نام شاید تم نے بھی سنا ہو۔ عمران..... عمران ہیرو۔ اصل کام یہی ہے کہ اس کو ہیرو بنانے والے اس کے سارے پوشیدہ تارکات دیئے جائیں۔ اس کو ایک دم پاور لیس، ہجڑا انجن بنا دیا جائے۔ نہ خود چلے، نہ اس بچے کو دھکا لگائے۔ اوہو ہو ہو..... ہجڑا انجن۔“ جاوانے اپنے فقرے پر خود ہی لطف لیا۔

میں نے دل ہی دل میں چودھری انور گنجے کے جھوٹ پر لعنت ارسال کی۔ اپنے پانچ بندوں کی موت کا ذکر کرتے ہوئے اس نے میرے ساتھ جگت وغیرہ کو بھی نہٹی کر دیا تھا۔ شاید اسے جاوا کو یہ بتاتے ہوئے شرم محسوس ہوئی تھی کہ میں نے اکیلے ہی اس کے پانچ بندوں کو ٹھکانے لگایا تھا۔

ثروت کے حوالے سے اب امید کی کوئی کرن نہیں تھی۔ پھر بھی یہ آس ختم نہیں ہو رہی تھی کہ شاید وہ کسی طرح بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائے۔

کچھ دیر بعد جاوا اور چودھری انور اٹھ کر کمرے میں چلے گئے۔ پریم چوہڑا اور اس کے مسلح خوگوار ساتھی ہمارے ارد گرد موجود تھے۔ یوسف سرگھنٹوں میں دیئے یکسر خاموش بیٹھا تھا۔ وہ صورت حال سے سخت خوف زدہ اور مایوس نظر آتا تھا۔ ان باتوں کی خجالت بھی اس کے چہرے پر موجود تھی جو تھوڑی دیر پہلے جاوا اور چودھری انور نے کی تھیں۔ چودھری انور نے بڑی بے شرمی سے یہ الزام عائد کر دیا تھا کہ میں اور ثروت ایک ہی کمرے میں اکٹھے سوتے رہے ہیں۔ یقیناً ان باتوں نے یوسف کے دل و دماغ میں رقابت کے زہریلے نقش کچھ اور گہرے کیے تھے۔ وہ میری طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ میں نے دھیمی آواز میں اس سے کہا۔ ”یوسف! تم پر کم از کم یہ بات تو ثابت ہو گئی ہے ناکہ تمہاری شکل کسی گلوکار وغیرہ سے نہیں اسی کتے سردار اوتار کے بیٹے سے ملتی ہے اور اسی لیے تمہارے لیے موت کا اسلج بھی تیار کیا جا رہا تھا۔“ اس نے میری بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میں نے سرگوشیوں میں اسے حوصلہ دینے کی کوشش کی مگر اس نے جیسے کچھ سنا ہی نہیں۔

اسی دوران میں گھر سے باہر ایک گاڑی رکنے کی آواز آئی۔ میری رگوں میں خون کی گردش تیز ہو گئی۔ وہی ہوا جو ہونا تھا۔ ثروت یہاں پہنچ گئی تھی۔ میں نے اس کے چلانے کی کھٹی کھٹی آواز سنی پھر شاید کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ کوئی شخص گرج کر بولا۔ اندازہ ہوا کہ وہ لوگ ثروت کو پہنچ کر اندر لے آئے۔ بہر حال ہم اسے دیکھ نہیں سکے۔

میری بس ایک ہی خواہش تھی۔ میں کسی طرح اس پنجرہ نما کمرے سے باہر نکل سکوں۔ ثروت کو بچالوں یا خود ختم ہو جاؤں۔ میں نے جاوا کو پکارنا شروع کر دیا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں اس سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ مجھے ہرگز توقع نہیں تھی کہ میری پکار کا اتنی جلدی جواب ملے گا۔ زخمی پریم چوہڑا اندر سے آیا۔ اس نے مجھے خونی نظروں سے گھورا اور کرخت لہجے میں بولا۔ ”دومنٹ چھری کے نیچے سانس لو۔ بھیا صاحب (جاوا) خود تم سے بات کریں گے۔“

قریباً پندرہ بیس منٹ بعد مجھے حیرت کا ڈھچکا لگا، جب واقعی مجھے اس منہوں کمرے سے باہر نکال لیا گیا۔ یوسف اندر ہی رہا۔ ایک رانفل کی نال میرے سر سے لگی ہوئی تھی۔ دو اور رانفلیں مجھے دائیں بائیں سے نشانے پر لیے ہوئے تھیں۔ وہ لوگ ذرا سار رسک لینے کو بھی تیار نہیں تھے۔ پریم چوہڑا بولا۔ ”تمہارے لیے بچت کی ایک راہ نکل رہی ہے۔ اپنی کسی بے

دقنی سے اسے ضائع مت کر دینا۔ جو کہہ رہے ہیں، چپ چاپ کرتے جاؤ۔“

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ میرے ہاتھوں کو پشت پر ایک ہینڈ کف لگا دیا گیا اور پھر دو تین کمروں کے اندر سے گزار کر جادا کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ جادا ایک پلنگ پر گاؤ تکیے کے سہارے بیٹھا شراب پی رہا تھا۔ ایک کارندہ اس کے پاؤں دبانے میں مصروف تھا۔ میں پہنچا تو جادا نے اسے بھی کمرے سے نکال دیا۔ اس نے مجھے اپنے سامنے ایک موڑھے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں بیٹھ گیا۔ اب اس بند کمرے میں جادا اور میں تہا تھے۔

جادا بولا۔ ”میں لمبی چوڑی بات نہیں کروں گا بچے! تیرا اور عمران ہیرو کا سارا حساب کتاب میں نے اس چٹ پر لکھ دیا ہے، ایک نظر ڈال لے۔“ اس نے ایک کاغذ میری طرف بڑھا دیا۔

میں نے نظر دوڑائی۔ ایک فہرست سی بنائی گئی تھی۔ اوپر سے نیچے اس طرح لکھا تھا۔ مال روڈ لاہور والی کوٹھی میں نادر ٹی ٹی اور اس کے ایک ساتھی کی ہتھیا کی۔ سلطان چٹا کے کان میں گولی سے سوراخ کیا۔ انڈسٹریل ایریا کی کوٹھی میں دو بندوں کو زخمی کیا۔ شیخوپورہ کے قریب ایٹوریا رائے کی عزت خراب کی۔ اندرون لاہور کے ہوٹل لالہ زار میں سیکرٹری ندیم کی ٹانگ توڑ کر اسے جس بے جا میں رکھا اور اسی ہوٹل میں سلطان کے دو بندوں کو شوٹ کیا، دونوں کی موت ہوئی۔ چودھری انور کی پہلی حویلی میں نیو عرف کرشمہ کپور کی جان لی۔ میں نے سوالیہ نظروں سے جادا کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ”یہ صرف میرا حساب کتاب ہے۔ چودھری انور اور سردار اوتار وغیرہ کے ہی کھاتے اس کے علاوہ ہیں۔ اس میرے حساب کتاب کے مطابق ہی تمہیں دو تین دفعہ کتے کی موت مارا جاسکتا ہے اور تیری اس سندرمعشوقہ پر اسی گاؤں میں بیس بیس روپے کا ٹکٹ لگایا جاسکتا ہے اور میں اپنے سر پر ہاتھ رکھ کر تمہیں دشواں دلاتا ہوں، یہاں دو دو کوس تک کوئی تمہاری مدد کو نہیں آئے گا۔ چٹایت سے لے کر پولیس تک..... اور بی ایس ایف سے لے کر فوج تک کوئی نہیں۔“

”کیا چاہتے ہو تم؟“

”ایک سودا۔ میں اپنی سوگند واپس لے لوں گا۔ عمران ہیرو کی اور تمہاری زندگی بخش دوں گا اور ساتھ ساتھ تمہاری سندرمعشوقہ کی بھی۔ چودھری انور اور سردار اوتار کو بھی سمجھا بجھا لوں گا۔ وہ لفز اکریں گے لیکن سنبھال لوں گا۔“

”بدلے میں مجھے کیا کرنا ہوگا؟“

”اس گوشت کے پہاڑ حرامی ریان ولیم کے منہ میں شکست کا گوبر بھرنا ہوگا۔ اسے

یادگارات دینا ہوگی۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

جادا نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”اگلے مہینے ممبئی کے ایک بڑے جوا خانے میں ایک بہت بڑا گیم ہو رہا ہے۔ اس کو ”گریٹ گیم“ کا نام دیا جا رہا ہے۔ اس میں دنیا کے مانے ہوئے قریباً دو درجن یکمبلر حصہ لیں گے۔ وہ چنے ہوئے نڈر لوگ جن کو اپنی (Luck) پر دشواں ہے اور قسمت کی دیوی جن پر اپنی مہربانیوں کی بوچھاڑ رکھتی ہے۔ گیم بھی کوئی ایسا انوکھا نہیں ہے۔ تمہارا ہیرو عمران قسمت کا دشمن ہے۔ ایک خلقت اس کی خوش بختی کو مانتی ہے۔ اور جو کچھ اس گریٹ گیم میں کیا جانا ہے، وہ بھی تمہارے ہیرو کے لیے نیا نہیں ہوگا۔“

”میں سمجھا نہیں۔“

”ریوالور میں گولی رکھ کر کپٹی پر فائر کرنا لیکن اس میں رسک کچھ زیادہ ہوگا۔ ظاہر ہے اگر انعام بہت بڑا ہے تو رسک تو ہو گا نا۔“

”کیسا رسک؟“ میں نے پوچھا۔

وہ اطمینان سے بولا۔ ”پانچ خانے میں گولی، ایک خانہ خالی۔ ہر بندے کو بس ایک فائر کرنا ہوگا۔ جو بچے گا، وہ دولت میں غرق ہو جائے گا۔“

”جادا صاحب! تم اپنے ہوش میں تو ہو؟ ایسا کون کر سکتا ہے..... ایسا کون کرے گا؟“

جادا کی آنکھوں میں زہریلے ناگ پھن پھیلانے کھڑے تھے، وہ بولا۔ ”بہت سے لوگ کریں گے جیسے کہ تم.....“

میں نے کہا۔ ”مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ کیا تم نے یہی کہا ہے کہ پانچ خانوں میں گولی ایک خانہ خالی؟“

”میں سنسکرت نہیں بول رہا۔“ جادا نے زہریلے انداز میں کہا۔ ”یہ بڑا مقابلہ ہے۔ انٹرنیشنل بازی ہے۔ اس پر بہت بڑی بڑی رقمیں لگیں گی۔ بہر حال، چوٹس تو ہر پر کھشا (استحان) میں ہوتی ہے۔ اس میں بھی تھوڑی بہت ہے۔“

”وہ کیا؟“

”ہر کھیلنے والے کے پاس ایک اختیار ہوگا۔ وہ پانچ خانوں میں گولی رکھ کر خود پر ایک دفعہ فائر کرے گا یا پھر چار خانوں میں گولی رکھ کر دو دفعہ فائر کرے گا۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”ریوالور کے چار خانوں میں گولی اور کپٹی پر نال رکھ کر دو دفعہ ٹریگر دبانا..... یہی کہہ رہے ہو تم؟“

کھڑے تھے۔ میں نے خود کو سنبھالا اور ذرا سنبھلتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ”جو شرط تم بتا رہے ہو وہ بہت کڑی ہے۔“

بے شک عمران اس سے پہلے سرکس میں یہ رویا اور والا کھیل کھیلتا رہا ہے۔ اس میں گولی کنپٹی پر نہیں بلکہ پیٹ پر رکھ کر چلائی جاتی تھی اور چھ گولی والے چیمبر میں ایک یا دو گولیاں رکھی جاتی تھیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی ہوش مند بندہ چیمبر میں چار گولیاں رکھ کر اپنی کنپٹی پر فائر کر سکتا ہے اور وہ بھی ایک نہیں دو دفعہ۔“

جاوا نے سگریٹ کا گاڑھا دھواں میرے منہ پر چھوڑتے ہوئے کہا۔ ”بچے! اس ہیرو نے مرنا تو ویسے بھی ہے۔ تم سے بڑا بے وقوف پورے جگ میں کوئی نہیں ہوگا اگر تم یہ سمجھو کہ میں اسے زندہ چھوڑ دوں گا۔ لیکن جو طریقہ میں تمہیں بتا رہا ہوں، اس میں اس کے بچنے کے امکانات ہیں، وہ بچ سکتا ہے، اس کی لک کام کر سکتی ہے اور بھگوان جانے کیوں مجھے لگتا ہے کہ وہ کتنا بچ جائے گا اور میرے سینے پر مونگ دلنے کے لیے زندہ رہے گا لیکن اگر وہ ہمارے لیے کوئی بڑا کارنامہ انجام دے کر زندہ رہا تو میں اس کا جینا جیسے تیسے برداشت کر ہی لوں گا۔“

میں نے پوچھا۔ ”اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ آپ جو کہہ رہے ہیں، ویسا ہی ہوگا۔ اسے صرف مقابلے کے لیے ہی بلایا جائے گا؟“

”ہاں..... یہ تم نے کام کی بات کی ہے۔ اس طرح کی ڈیل میں اس طرح کی گارنٹی تو ہونی چاہیے۔ میں تمہیں جو گارنٹی دے سکتا ہوں، وہ میری زبان ہی ہے۔ پورے ممبئی میں بلکہ پورے انڈیا میں اس زبان کی گارنٹی مانی جاتی ہے۔ کھیل میں حصہ لینے کے بعد نہ صرف تمہاری اور ہیرو کی جان کی گارنٹی ہے بلکہ اتار کوڑا بھی ملے گا کہ تمہاری سات پشتیں سونے چاندی میں دب جائیں گی۔“

”میں پھر بھی چاہتا ہوں کہ مجھے کچھ سوچنے کا موقع دیا جائے۔“

”سوچ لو لیکن کوئی حرامزدگی نہیں چلے گی۔ کوئی ہیرو پن، کوئی بروکلی پن، کوئی جیمز بانڈ اسٹائل، کچھ نہیں۔ اگر ایسا ہوا تو تمہیں تو شاید ابھی ہم کچھ نہ کہیں لیکن تمہاری اس معشوقہ کا بیڑا غرق و خانہ خراب ہو جائے گا۔“

میں خاموشی سے جاوا کو دیکھتا رہا۔

وہ بولا۔ ”میرے سامنے ایسے دیدے نہ بھاڑا کرو۔ میرا میٹر گھوم جاتا ہے۔ میں غلطی سے قتل کر دیا کرتا ہوں۔“

میں نے ناگواری سے زرخ پھیر لیا۔

”کیوں؟ یہ کم مہربانی ہے؟“

”نہیں جی..... اس سے بڑی مہربانی اور کیا ہو سکتی ہے..... کیا آپ نے کبھی اپنے بارے میں اس طرح کی بات سوچی ہے؟ چار خانوں میں گولی رکھی جائے اور آپ سے کہا جائے کہ دو نہیں چلیں ایک دفعہ ہی خود پر ٹریگر دبائیں۔“

”میں گیمبلر نہیں ہوں۔ جس کا کام اسی کو ساجے۔ ہاں میں کچھ اور قسم کے کام بڑی اچھی طرح سے کر سکتا ہوں۔ اب دیکھو نا، تم جیسے زہریلے سانپ کا سر میرے پاؤں کے نیچے ہے۔ بس تم اپنی دم ہلا سکتے ہو اور کچھ نہیں کر سکتے۔ دم بھی اگر زیادہ ہلاؤ گے تو کاٹ ڈالیں گے اور تمہاری وہ ناگن بھی ہمارے قبضے میں ہے۔ تمہارے سامنے اس کا زہر نکالیں گے۔ زہر نکل جائے گا تو وہ ایک دم مچھلی بن جائے گی..... ناگ یا ناگن میں زہر نہ ہو تو وہ ایک دم مچھلی کی طرح کھانے کے قابل ہوتے ہیں۔ ہم اس ناگن کو کھانے کی میز پر سجائیں گے۔ ہر کوئی اسے کچھ سکے گا۔ اگر وہ کینہ پسیرا عمران تمہارے پیچھے آیا تو اس کی تو ایسی بینڈ بچے گی کہ دیکھنے والے کانوں کو ہاتھ لگائیں گے۔ بڑی زبردست قسم کی نس بندی ہوگی اس کی۔“



جاوا واقعی ایک بے رحم ڈان تھا۔ اس میں وہ تمام خصوصیات موجود تھیں جو کسی بھی جنونی قاتل میں ہو سکتی ہیں۔ وہ بندے کو کبھی کی طرح مارتا تھا۔ آج رات کے ایک پہر کے دوران میں ہماری آنکھوں کے سامنے اس نے تین جیتے جاگتے انسانوں کو لاشوں میں تبدیل کر دیا تھا اور وہ تینوں لاشیں ابھی اسی چار دیواری میں ہی موجود تھیں۔ مخمر ڈیل سنگھ اور جو اس سال آشا کور کی لاشیں ایک پچھلے کمرے میں رکھی گئی تھیں۔ گو بندر ابھی تک اس پنجرہ نما کمرے میں بے گور و کفن پڑا تھا۔

میں نے لمبی سانس لیتے ہوئے کہا۔ ”میں تمہاری ساری بات سمجھ گیا ہوں جاوا صاحب! مجھے کچھ سوچنے کا موقع دو۔“

”سوچنے کی کیا بات ہے بچے۔ سب کچھ تو تیرے سامنے ہے۔ تو بھی یہیں ہے اور تیری معشوقہ بھی۔ انکار کی گنجائش تو تیرے پاس ہے ہی نہیں۔ انکار کرے گا تو ابھی اس چھو کری کے ساتھ میرے لوٹنے کھیل تماشا شروع کر دیں گے۔ نہ وہ جی سکے گی، نہ مر سکے گی۔“

میرا جی چاہا، سارے اندیشے بالائے طاق رکھ کر جاوا پر جا پڑوں..... مار دوں، یا مر جاؤں لیکن میرے ہاتھ پشت پر بندھے تھے اور تھوڑے ہی فاصلے پر دو رائفیل بردار چوکس

آپ کی مدد کے لیے بھی باہر نکلیں گے۔ مگر وہ بزدل نکلے اور دھوکے باز بھی۔ انہوں نے یہاں اطلاع پہنچادی۔ یہ لوگ مجھے پکڑ لائے۔ مجھے..... لگتا ہے، یہ بہت خطرناک لوگ ہیں تابش! یہ کون ہیں؟ ہم سے ان کی کیا دشمنی ہے؟“

میں نے کہا۔ ”ثروت! یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے یوسف کو لاہور کے ہسپتال سے اٹھایا اور یہاں پہنچایا۔ ہم سردار اوتار کی حوفلی سے تو نکل آئے لیکن ان لوگوں کے چنگل سے نہیں بچ سکے۔“

”مجھے اس بڑی آنکھوں والے سے بڑا خوف آرہا ہے۔ جس کے چہرے پر ہلکے داغ سے ہیں۔ وہ انسان نہیں کوئی جانور لگتا ہے۔“

”مجھے یہ سوچ کر ہی ڈراتا ہے کہ مجھے پھر اس کی شکل دیکھنا پڑے گی۔“

”جو کچھ بھی ہے ثروت! میرے ہوتے تمہیں اور یوسف کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ میں تم دونوں کو ان شاء اللہ حفاظت سے پاکستان پہنچاؤں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے کچھ بھی کرنا پڑے۔“

”آپ..... اپنی بات بھی کریں۔ ہم تینوں یہاں سے جائیں گے۔“

”تم دعا کرو کہ ایسا ہو سکے۔ ان لوگوں سے ایک معاملے پر بات چل رہی ہے۔ یہ کچھ شرطیں بتا رہے ہیں۔ میری کوشش ہے کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم تمہارے اور یوسف کے لیے کچھ رعایت حاصل کر سکوں۔“

وہ ڈبڈبائی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ ”تابش! آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میں یوسف کی طرف سے آپ سے معافی مانگتی ہوں۔ یوسف یقیناً غلط فہمیوں کا شکار ہے۔ انہوں نے راستے میں آپ پر گولی چلائی۔ مجھے اس کا بے حد رنج ہے۔ انہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ اللہ نہ کرے ان کی گولی سے آپ کو کچھ ہو جاتا تو میں زندگی بھر خود کو معاف نہ کر سکتی۔“

”یوسف سے میری جان پہچان پُرانی نہیں ہے ثروت! بندہ ایک دوسرے کو زیادہ جانتا نہ ہو تو اس طرح کی بدگمانیاں ہو جاتی ہیں۔“

وہ میرے لہجے سے چونکی اور میرا اشارہ سمجھ کر بولی۔ ”مم..... میں بہت شرمندہ ہوں تابش! میں بھی تو آپ کی طرف سے بدگمان ہوئی۔ میں نے وہاں سردار اوتار کی حویلی میں آپ سے غلط باتیں کہیں۔ میں نے بہت غلط کیا تابش! میرا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ میں کئی دن سے خود کو ملامت کر رہی ہوں۔ میں نے ایسا کیوں سوچا کہ آپ یوسف کا بُرا چاہیں گے۔“

وہ بولا۔ ”میں تمہارے لیے علیحدہ کمرے کا انتظام کر دیتا ہوں تاکہ تم تسلی سے سوچ سکو..... بلکہ اگر تم چاہو تو تمہاری سیملی کو بھی تمہارے پاس ہی بھیج دیتا ہوں۔ مل کر سوچ لینا اور اپنا بُرا بھلا سمجھ لینا۔“

قریباً آدھ گھنٹے بعد میری الٹی جھکڑی کھول کر مجھے پھر اسی کمرے میں پہنچا دیا گیا جہاں میں یوسف اور گوبندر کے ساتھ بند تھا۔ لیکن اب وہاں یوسف موجود نہیں تھا۔ گوبندر کی لاش بھی وہاں سے ہٹائی جا چکی تھی۔ کچے فرش سے خون اچھی طرح صاف کر کے وہاں ایک چٹائی بچھا دی گئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد ثروت بھی اس کمرے میں پہنچ گئی۔ اس کی آنکھیں رونے سے سرخ تھیں۔ حسب توقع اس نے سب سے پہلے یوسف کے بارے میں پوچھا۔

میں نے اسے بتایا کہ یوسف بالکل اخیریت سے ہے۔

”انہیں کہاں رکھا گیا ہے؟“ ثروت نے دوسرا سوال پوچھا۔

مجھے ٹھک سے معلوم نہیں تھا لیکن میں نے بتایا کہ وہ یہیں اسی گھر میں موجود ہے۔ وہ میری طرف دیکھتی تھی تو اس کی آنکھوں میں ایک بیگانگی آمیز خوف نظر آتا تھا۔ اس خوف کا تعلق یقیناً میرے بدلے ہوئے لائف اسٹائل اور میرے اجنبی مزاج سے تھا۔

وہ روتے ہوئے بولی۔ ”مجھے ان لوگوں نے بتایا ہے کہ انہوں نے آشا کو گولی مار دی ہے۔ اگر ہم میں سے کوئی دوسرا بھی ان کی بات نہیں مانے گا تو وہ اس کے ساتھ بھی یہی کریں گے۔ کیا واقعی آشا.....؟“

میں خاموش رہا۔ میری خاموشی نے اسے سمجھا دیا کہ یہ دل ہلا دینے والی اطلاع درست ہے۔ اس کی خوبصورت آنکھوں سے پھر آنسو گرنے لگے۔ وہ بھیگی آواز میں بولی۔ ”اور رجنی کیسے بے ہوش ہوئی ہے؟ میں نے ابھی اسے ساتھ والے کمرے میں دیکھا ہے۔“

”آشا کو گولی لگی تو اس نے دیکھ لیا۔ بس اسی صدمے سے وہ گر گئی۔“

”آپ سچ کہہ رہے ہیں؟ میرا مطلب ہے کہ اس کے ساتھ کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں ہوئی؟“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”اور گوبندر نظر نہیں آ رہا۔ وہ کہاں ہے؟“

”وہ بھی یہیں ہے۔ مگر تم نے اپنے بارے میں کچھ نہیں بتایا۔ یہ لوگ کہہ رہے ہیں کہ تمہیں نمبردار کے گھر سے پکڑا ہے؟“

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”مم..... میرا خیال تھا کہ وہ لوگ مجھے پناہ دیں گے اور

”آپ بتا رہے ہیں کہ یہ جاوا کوئی بہت با اثر شخص ہے۔ اس کو آپ کے دوست سے کیا کام ہو سکتا ہے؟“

”بس کوئی ایسا کام ہے جو عمران کر سکتا ہے۔“

اس نے ایک اچھٹی سی نظر مجھ پر ڈالی۔ جیسے خاموشی کی زبان میں کہہ رہی ہو، آپ کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔ کیسے لوگوں سے ناتے ہو گئے ہیں آپ کے۔“

کچھ دیر تک ہم دونوں خاموش رہے۔ جیسے کہنے کو کوئی بات ہی نہیں رہ گئی تھی۔ بہت قریب رہنے کے بعد پتھر جانے والوں کے ساتھ شاید ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ کہیں قریب ہی کسی کچے راستے سے کوئی ٹریکسٹرالی گزری۔ لاؤڈ اسپیکر پر اونچی آواز میں گانا چل رہا تھا۔ کسی بھارتی پنجابی فلم کا گانا تھا جس میں سردیوں کی چاندنی رات کا ذکر تھا اور چینیلی کے پودوں میں کم ہو جانے والے دو پریسوں کی بات تھی۔

کچھ چاندنی راتیں میرے تصور میں بھی گھوم گئیں۔ وہ پھولوں کے گہنے، وہ ہونٹوں کی نرم پگھڑیاں، وہ ریشمی سرگوشیاں، دوپل میں ایک پورا منظر نامہ نگاہوں کے سامنے چمک گیا۔

ثروت نے کہا۔ ”ایک بات کہوں، آپ برا نہ مانے گا۔“

”میں تمہاری کسی بات کا برا نہیں مان سکتا ثروت۔“

”اگر میں آپ کے پاس اس کمرے میں رہوں گی تو میرے لیے مزید مشکلیں پیدا ہو جائیں گی۔“

”کیا مطلب؟“

وہ ذرا توقف سے بولی۔ ”آپ جانتے ہیں تابش! یوسف میرے بارے میں ضرورت سے زیادہ حساس ہیں۔ شاید آپ ٹھیک ہی کہتے تھے۔ مجھے یوسف کو نہیں بتانا چاہیے تھا کہ ہم اکٹھے سفر کرتے رہے ہیں اور اس سفر کے دوران میں رات دن ایک ساتھ رہے ہیں۔ مجھ پر بھروسہ رکھنے کے باوجود وہ شبہات کا شکار ہو جاتے ہیں۔ شاید اس سلسلے میں انہیں اپنے دل پر بس نہیں۔“

میں اس کا اشارہ سمجھ گیا۔ میں نے کہا۔ ”کیا تم یہ چاہتی ہو کہ تمہیں میرے ساتھ نہ رکھا جائے۔ دوسرے کمرے میں یوسف کے پاس بھیج دیا جائے؟“

”اگر ایسا ممکن ہو تو پلیز..... ضرور کر لیجیے۔“

میں نے سلاخ دار کھڑکی سے باہر دیکھا۔ دو مسلح افراد چند میٹر دور کھڑے تھے اور ہمیں ہی گھور رہے تھے۔ جاوا اور چودھری انور مجھے کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ نہ ہی ان کی آواز سنائی

اپنی اس سوچ پر میں آپ سے معافی مانگتی ہوں تابش!“ اس کی آواز بھر گئی۔
میں خاموش رہا۔ وہ بولی۔ ”میری عقل مار کھا گئی تھی تابش! آپ ہم دونوں کو بچانے کے لیے اپنی جان خطرے میں ڈال رہے ہیں۔ آپ نے زخم کھائے ہیں اور میں اتنا سخت بولی آپ کے ساتھ۔“

میں نے کہا۔ ”چلو پھلی باتیں چھوڑو ثروت! تمہیں احساس ہو گیا، میرے لیے اتنا ہی کافی ہے۔ اب آگے کے بارے میں سوچو۔“

”مجھے یوسف کے بارے میں بہت فکر ہے تابش! وہ اتنے مضبوط نہیں ہیں۔ اس قسم کے حالات سے کبھی ان کا واسطہ نہیں پڑا۔ یہاں پر ان لوگوں کا اصل شکار تو یوسف ہی ہیں۔ وہ ان کے ساتھ کیا کرنا چاہتے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”پانچ پچھ دن پہلے تک مجھے بھی کچھ پتا نہیں تھا ثروت کہ اصل میں یہ چکر ہے؟ پھر میں نے سردار اوتار کے بیمار والد کے پاس ایک فوٹو اہم دیکھا۔ اس میں گھر کے لوگوں کی تصویریں تھیں۔ انہی تصویروں میں مجھے سردار اوتار کے بڑے بیٹے اشوکا سنگھ کی تصویر بھی نظر آئی۔ میں حیران رہ گیا۔ وہ شکل صورت میں بہت حد تک یوسف سے ملتا تھا۔

اس کے چہرے پر زخم کا نشان بھی تھا جیسا یوسف کے چہرے پر بنایا گیا۔ میں سمجھ گیا کہ یہ سردار اوتار کے بیٹے کا کوئی چکر ہے۔ جس کی وجہ سے یوسف کو یہاں لایا گیا ہے۔ میں نے حویلی کے ایک خاص ملازم کو پکڑا اور اس سے ساری معلومات حاصل کیں۔ سردار اوتار کے قاتل بیٹے کا پیچھا پولیس سے چھڑانے کے لیے یہ لوگ یوسف کی جان لینا چاہ رہے تھے۔ یہ لوگ یوسف کو اس کالی جیب پر بارڈر کی طرف بھیجتے۔ یوسف کو پولیس والے اشوکا کے طور پر پہچان لیتے اور اس کے فوراً بعد یوسف کی گاڑی کے ٹکڑے ہو جاتے۔ بڑا تفصیلی منصوبہ تھا اور یقیناً اس کے پیچھے جاوا کا دماغ ہی تھا۔ سردار اوتار سنگھ نے اس خونی ڈرامے کے لیے جاوا کو ایک بھاری رقم دی ہے۔“

”تو اب یہ لوگ یوسف کو کیسے چھوڑیں گے؟“ وہ روہانسی ہو گئی۔

”میں نے کہا ہے نا..... دعا کرو۔ کام مشکل ہے لیکن ایک سبب لگ رہا ہے۔“

”کیسا سبب؟“

”جاوا! میرے دوست عمران سے ایک خاص کام لینا چاہ رہا ہے۔ اس سلسلے میں کچھ بار گینگ ہوگی۔ میں نے سوچا ہے کہ اس بار گینگ میں یوسف والا معاملہ شامل کروں گا۔ مجھے اُمید ہے کہ کوئی راستہ نکل آئے گا۔“

اگر درمیان میں آہنی سلاخیں نہ ہوں تو وہ جنگلی بلی کی طرح مجھ پر پل پڑے گی۔
میں اس کی اس کیفیت کا سبب اچھی طرح سمجھ رہا تھا۔ لاہور کے تھانے میں عمران نے
شاربہ بائی سے سچ اُگوانے کے لیے اسے آڑے ہاتھوں لیا تھا۔ اس نے لیڈی سب انسپکٹر
سے شاربہ کی اچھی خاصی چھترول کروائی تھی۔ نہ اس کی کوئی سفارش چلنے دی تھی نہ چھکارے
کا کوئی اور طریقہ استعمال کرنے دیا تھا۔ مجبوراً شاربہ بائی نے ہمیں یوسف کے اغوا اور روانگی
کے بارے میں اہم معلومات مہیا کر دی تھیں، اس ساری کارروائی کے دوران میں، ہمیں بھی
عمران کے ساتھ رہا تھا۔

وہ دانت پیس کر بولی۔ ”وہ بھگیاڑ کی شکل والا دوسرا مردود کہاں ہے؟“ اس کا یہ
”مہربان“ اشارہ یقیناً عمران ہی کی طرف تھا۔

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے شعلہ جوالا بن کر اپنے پینڈ بیک
میں ہاتھ ڈالا اور ایک چھوٹا پسل نکال لیا۔ وہ دھاڑی۔ ”میں مار دوں گی تمہیں، تمہاری
کھوپڑی توڑ ڈالوں گی۔ بتاؤ کہاں ہے وہ ماں کا.....“

اس کو جذباتی حالت میں دیکھ کر اس کے ایک ساتھی نے پسل اس کے ہاتھ سے چھین
لیا۔ وہ گالیاں بکتی ہوئی برآمدے کی طرف بڑھی۔ وہاں ایک لمبے دستے کی کلباڑی پڑی تھی۔
اس نے کھڑکی کی سلاخوں کے درمیان سے مجھ پر کلباڑی کا وار کرنے کی کوشش کی۔ یہ بالکل
ناکام کوشش ثابت ہوئی۔ وہ جھنجھلاہٹ میں کھڑکی کی سلاخوں کے اوپر ہی کلباڑی کے وار
کرنے لگی اور گالیاں بکنے لگی۔ اس کے پان سے رنگے ہونٹوں کے اندر سے پیک کے چھیننے
اُڑ رہے تھے۔ شور سن کر جاوا کا ملازم خاص پریم چو پڑا باہر نکل آیا۔ اس نے شاربہ کو کندھوں
سے تھاما اور ذرا سختی سے بولا۔ ”باٹی جی! یہ کیا کر رہی ہو؟ یہ فی الحال جاوا صاحب کا مہمان
ہے۔ پیچھے ہٹ جاؤ۔“ اس نے بمشکل شاربہ کو سلاخ دار کھڑکی سے دور کیا۔ ثروت جو پہلے ہی
خوف زدہ تھی، اس افتاد سے اور بھی سکڑ سمٹ کر رہ گئی۔

جاوا کا ملازم خاص پریم چو پڑا، شاربہ بائی کو سنبھالتا ہوا دوسرے کمرے میں لے گیا۔
چند منٹ بعد ہمارے ارد گرد پھر سکون ہو گیا۔ لیکن اس سکون کے اندر کئی طرح کا تلاطم بھی
تھا۔ یقیناً ثروت کے ذہن میں کئی طرح کے سوالات ابھر رہے تھے۔ شاید اسے یہ جان کر
ماپوسی بھی ہوئی تھی کہ میرے تعلقات شاربہ بائی جیسی عورتوں سے ہیں۔ اس بیچاری کو یہ معلوم
نہیں تھا کہ شاربہ سے میرا تعلق یوسف کی وجہ سے ہی تھا۔ شاربہ میری نہیں یوسف کی ”واقف
کار“ تھی۔

دے رہی تھی۔ اس سے پہلے کہ میں کسی کو آواز دیتا، گھر سے باہر ایک بار پھر کسی گاڑی کے
رُکنے کی آواز آئی۔ دروازے بند ہونے کی آواز سے پتا چلا کہ یہ کوئی بھار بھرم لکڑی گاڑی یا
جیپ ہے۔ ایک منٹ بعد گھر کا بیرونی دروازہ کھلا اور دو تین افراد اندر آ گئے۔ ان میں ایک
عورت بھی تھی۔ اس فربہ اندام عورت کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ یہ وہی لاہور کے بازارِ حسن والی
نایکا شاربہ بائی تھی۔ مجھے ہرگز امید نہیں تھی کہ میں اسے یہاں دیکھوں گا۔ چودھری انور کو
یہاں دیکھ کر بھی میری کچھ ایسی ہی کیفیت ہوئی تھی۔

شاربہ بائی کے ٹھاٹ دیکھنے والے تھے۔ اس نے شوخ شلواری میں سے اوپر ایک ہلکی
پھلکی جیکٹ پہن رکھی تھی۔ پاؤں میں سینڈل وغیرہ کی جگہ جوگرشوز تھے۔ گھنگریالے بال اس
کے کندھوں پر لہرا رہے تھے۔ ایک ہاتھ میں موبائل فون، دوسرے میں سگریٹ تھامے وہ
بڑے طنطنے سے اندر داخل ہوئی۔ اچانک اس کی نظر مجھ پر پڑ گئی۔ اس نے رُک کر ذرا دھیان
سے مجھے دیکھا، پھر تیر کی طرح میری طرف آئی۔ سلاخ دار کھڑکی کے ساتھ اپنا تھوڑا ٹکا کر
اس نے اپنی ناک کو غصیلے انداز میں پھلایا اور بولی۔ ”میرا دل کہتا تھا کہ تم سے ملاقات ہوگی
اور جلد ہی ہوگی لیکن یہ پتا نہیں تھا کہ تم یہاں ملو گے۔“ پھر وہ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ
ہوئی اور ان سے پوچھا۔ ”یہ خبیث کس طرح آیا ہے یہاں؟“

لمبی گردن والے ایک شخص نے کہا۔ ”یہ لمبی سنوری ہے باٹی جی! یہ لوگ اپنا بندہ
چھڑانے کے لیے لاہور سے یہاں پہنچے ہیں۔ پہلے سردار اوتا سنگھ کی حویلی میں تھے.....“
”وہ ساری رام کہانی جانتی ہوں میں لیکن یہ لوگ یہاں اس گاؤں میں کیسے
آئے؟“

”سردار صاحب کی حویلی میں لمبا لفوا ہو گیا تھا جی۔ سردار کی بیٹی کے رشتے کا جھگڑا تھا۔
کئی بندے مارے گئے ہیں۔ بس اسی لفوے میں یہ لوگ بھی وہاں سے بھاگ نکلے۔ ان کے
بُڑے لیکھ کہ یہاں اس گاؤں کے تھانیدار صاحب اپن کے بھیا صاحب کے چاہنے والوں
میں شامل ہیں۔ ان کی وجہ سے یہ بھگوڑی اور دونوں بھگوڑے پکڑے گئے۔“
”دوسرا بھگوڑا کون؟“

”وہی لوٹنڈا یوسف جس کا سارا ٹینٹا تھا۔ یہ اس کی جتنی ہے۔ کم از کم کہا تو یہی جاتا
ہے۔“

شاربہ بائی نے جیسے آخری چند الفاظ سنے ہی نہیں۔ اس کی ساری کی ساری توجہ مجھ پر
تھی۔ اس کی آنکھوں میں جیسے خون اُتر آیا تھا۔ وہ شاید نشے میں بھی تھی۔ یوں لگ رہا تھا کہ

وہ میرے حوالے سے اتنا بگڑا ہوا تھا کہ "اچھے بھائی تمہاری ساری باتوں کو سنا کر میں نے شاربہ دھڑکے دھڑکے سنا کر کوئی بھڑک اٹھا۔ ہاں اور اس بار سے میں نے اس سے کوئی سوال نہیں کیا۔ میں سر جھکانے لگی تھی۔ میں ابھی تک حیرت میں تھی کہ شاربہ کی یہ واسطی سے اظہار کے اس چہرے سے گاؤں تک کا سفر شاربہ دہلی نے معلوم نہیں کیسے کیا۔ کیا کر کے کیا تھا؟

ثروت کی کڑواہٹیں حرم آباد نے لکھے خیالوں سے چھٹکاوا۔ "آپ ابھی کسی کام کا ذکر کر رہے تھے جو اب آپ کے دوست سے لیتا چاہ رہے ہیں یا میرا مطلب ہے کہ وہ ضرور کوئی خطرناک کام ہی ہو گا۔"

"کام یہ ہے ثروت ابھی تم کے لوگوں سے ادا واسطہ چاہ رہے ہیں۔ یہ سب سے کام تھا کرنے والے نہیں۔"

"کوئی۔۔۔ میرا قانونی کام ہو گا؟"

"جی ہاں جو بگڑا ہوا ہے ثروت میرا قانونی ہی ہے۔ دوست کے گم ہونے سے بے کر اب تک کیا چیز قانون کے دائرے میں چلی ہے؟ اور ہمارا کیا دور کوشہ پھر کی جاتی گی۔ میں سے پاکی چھیننے کا قانون ہمارا سرور ہمارا کی حویلی میں جو بگڑا ہوا ہوں۔ سا قانونی تھا۔"

وہ سب غوروں سے بگڑے بیٹھے تھے۔ ان غوروں میں تم گنت مہمت کی بھٹک تھی۔ ایک ٹول آ میرا حیرت بھی تھی ہمارا سونوں کی چٹک بھی۔ لکھے لکھے اس کی سب سے انگوٹوں میں سب بھی وہ خوشی نظر چمکنے آزار رہے جب میں چاہتا ہوں وہاں وہاں پاکی غوروں سے لڑا گیا تھا جنہوں نے ہمارا دامن کے قریب لکھے اور ثروت کو گھیرا تھا۔

وہ بولی۔ "آپ کتنے جلد گئے ہیں؟ ابھی آپ نے کہا ہے کہ میں ابھی تو میں آپ کو پہچان ہی نہیں پاتی۔ میں آپ کے اندر اس جہلی کو اور خوشی دہاتی ہوں جو چار پاکی سال پہلے تک ہماری جہلی کا حصہ تھا۔ اب اس کا حصہ ہمارا ہے جیسا تھا۔"

"لکھے ابھی وہ جہلی ابھی ابھی تھا ثروت ابھی ایک دن اس جہلی نے زخم دے کر کانٹن کھودا۔ وہ جب ہماری حفاظت نہ کر سکے تھے انہیں چاند کو لگا لپٹی داس کی جہان نہ چھوڑا۔ ہمارے لوگوں نے زخم دے دیا اس سے مرئی ہوا چاہیے تھا۔"

"حالات اسے نہ سہتے نہیں تھے جہلی ابھی آپ نے کر دیے ہیں۔ آپ تو وہ ہے جی نہیں ہیں جو کبھی تھے۔"

"اب تم سے جہلی ابھی ثروت اتنا بگڑا ہوا ہے جہلی ابھی۔ ہمارا کوئی اپنا نہ رہا۔"

”وہ..... جدائی بھی تو ایک حادثہ ہی تھی۔ اور اس حادثے کو بڑھاوا بھی آپ ہی کی طرف سے ملا تھا تاہم! میرے ساتھ جو کچھ ہوا، اس میں میرا تو کوئی قصور نہیں تھا۔ لیکن آپ کے گھر والوں نے..... خاص طور سے خالہ جان نے مجھے قصور وار ٹھہرایا تاہم! میں باعزت گھر واپس آ گئی تھی لیکن میرے ساتھ وہ رویہ اختیار کیا گیا جو کسی لڑکی کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ مجھے ہر قدم پر احساس دلایا گیا کہ میں اب آپ کے بلکہ شاید کسی کے قابل بھی نہیں رہی۔“

”ثروت! تم دوسروں کے بارے میں تو شاید ایسا کہہ سکو لیکن ہمارے گھر والوں کے بارے میں نہیں کہہ سکتی ہو، ہاں میں اتنی بات ضرور مانتا ہوں کہ اس واقعے کے بعد امی کچھ دن تک الجھن میں رہی تھیں اور ان کو الجھانے میں بھی زیادہ کردار دوسروں ہی کا تھا۔ میں نے اور فرح، عاطف نے مل کر انہیں بالکل ٹھیک کر لیا تھا۔ وہ تم سے ملنے آرہی تھیں۔ ہم تینوں بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ تمہیں سینے سے لگا کر بہت بہت پیار کرنا چاہتی تھیں۔ تمہارے سارے شکوے دور کر دینا چاہتی تھیں لیکن جب ہم تمہارے گھر کے دروازے پر پہنچے ہم پر انکشاف ہوا کہ تم سب لوگ تو بڑی خاموشی سے ملک ہی چھوڑ کر جا چکے ہو.....“

اس نے عجب شکوہ کناں نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”اور آپ واپس چلے گئے.....“ میری آواز بھر اگئی۔ ”میں کہاں واپس گیا تھا ثروت! میں نے تمہیں بتایا ہے نا، میں ڈھائی تین سال کے لیے ایسے حالات میں جکڑا گیا تھا جن سے مفر کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں تھی۔ وہ میری زندگی کا بدترین دور تھا ثروت.....“

”اب ان باتوں کو دہرانے سے کیا فائدہ؟“ اس نے سر جھکایا اور دو آنسو اس کی آغوش میں گم ہو گئے۔

